۲

خطبات حکیم الامت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
کی مؤثر اور انقلاب آفریں تقریروں کا اہم مجموعہ

آداب انسانیت
خواہش نفس کی مذمت
خواہش نفس اور ہدایت
خود فراموشی
حسن تدبیر
دوسرے کو دیکھ کر نصیحت قبول کرنا
غصہ
غصہ کی ہلاکتیں
آپسی اختلاف کی اصلاح
فساد کی روک تھام
اتفاق
مصیبت زدوں کی غمخواری
ہر چھوٹے بڑے اعمال پر جزا و سزا



زمزم بک ڈپو دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

عرض ناشر

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

امّا بعد!

اللہ تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

کہ مواعظِ اشرفیہ (بترتیبِ جدید) کے گراں مایہ سلسلہ کی دوسری جلد آدابِ انسانیت تزئین اور کتابت وطباعت کے مراحل سے گزر کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔

ان مواعظ کی ترتیب توحسبِ سابق محترم مفتی عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم کی ہے۔

تزئین و عنوانات کا تمام تر کام ہمارے محترم دوست جناب قاری محمد ادریس صاحب ہوشیارپوری نے انجام دیا ہے۔

فجزاھم اللہ ——— دعاؤں کا طالب

محمد اسحاق

ترتیبِ مواعظ

خواہشِ نفس کی مذمت	يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى
خواہشِ نفس اور ہدایت	وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ
خود فراموشی	اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ
حسنِ تدبیر	ـــــ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ -
دوسرے کو دیکھ کر نصیحت قبول کرنا	ـــــ اَلسَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهٖ ۔
غصّہ	اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِيْ قَالَ لَا تَغْضَبْ ۔
غصّہ کی ہلاکتیں	اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِيْ قَالَ لَا تَغْضَبْ ۔
آپسی اختلاف کی اصلاح	ـــــ قَالَ اِيَّاكُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَاِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ
فساد کی روک تھام	ـــــ قَالَ اِيَّاكُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَاِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ
اتفاق	ـــــ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا
مصیبت زدوں کی غمخواری	ـ اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ
ہر چھوٹے بڑے اعمال پر جزا و سزا	ـ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۔

تفصیل عنوانات

۶ - الغضب (غصہ)

۷ - غوائل الغضب

۸ - اصلاح ذات البین

—— ۱۰ الاتفاق ——

اتفاق

دعوات عبدیت جلد اوّل کا وعظ دہم

ملقب بہ

ذم ہویٰ

جامع مسجد تھانہ بھون شعبان ۱۳۲۹ھ میں اتباع ہویٰ کے علاج کے سلسلہ میں بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔
مولانا محمد عبداللہ صاحب مرحوم گنگوہی نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہٖ و نتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا محمدًا عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یٰداؤدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ۔

تمہید

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے داؤد (علیہ السلام) بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش نفسانی کا اتباع مت کرو۔ یہ تم کو اللہ کے راستہ سے بے راہ کر دے گی۔ بے شک جو لوگ اللہ کی راہ سے گم ہوئے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہوگا۔ بسبب اس کے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے۔

خواہشات کے رنگ میں دین

اس آیت شریفہ میں ہر چند کہ خطاب داؤد علیہ السلام کو ہے لیکن مضمون عام ہے کچھ داؤد علیہ السلام کی تخصیص نہیں ہے بلکہ داؤد علیہ السلام کی طرف خطاب کرنے سے معنی اس مضمون کے اور زیادہ تقیم ہوگئے اس لئے کہ جب بڑوں کو کسی امر کا خطاب کیا جاتا ہے اور ان کو باوصف ان کی عظمت کے اس امر پر وعید کی جاتی ہے تو چھوٹے بطریق اولیٰ مخاطب ہو جاتے ہیں مثلاً.. طبیب اگر صحیح قوی کو کہے کہ فلاں شئے نہ کھاؤ تم کو مُضر ہوگی تو مریض ضعیف کو تو بطریق اولےٰ اس پرہیز کرنے کی ضرورت مفہوم ہوگی۔ اس طرح سے یہاں داؤد علیہ السلام کو خطاب ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ جب داؤد علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے اس حکم کے مامور ہیں اور مضمون بھی کوئی خصوصیات نبوت سے نہیں تو اوروں کو بطریق اولےٰ اس حکم کی پابندی کرنی چاہیئے اور وہ حکم جو کہ داؤد علیہ السلام کو اس آیۂ شریف میں کیا گیا ہے اتباع ہوے سے نہی ہے اور اتباع ہوے کی مذمت ہے یعنی اپنی جی چاہی بات پر عمل کرنا۔

اب ظاہر ہے کہ داؤد علیہ السلام پیغمبر ہیں اور پیغمبر بھی صاحب کتاب کہ زبور شریف ان پر نازل ہوئی ہے اور انبیاء علیہم السلام عموماً اور ان میں جو صاحب کتاب

ہیں خصوصًا ان کے تمام ملکات محمود اور جذبات طاہر مطہر اور نفوس نہایت مہذب ہوتے ہیں جب باوجود ان کے ان کو منع کیا جاتا ہے کہ تم اپنی نفسانی... خواہش کی پیروی مت کرنا حالانکہ ان کا نفس بالکل مہذب ہے اگر اس میں خواہش بھی ہوگی تو ظلمانی نہ ہوگی تو ہم تو جو کہ سر سے پا تک گندہ در گندہ ہیں اگر... خواہش نفسانی کی پیروی کریں گے تو بالکل ہلاک ہی ہو جائیں گے اَللّٰھُمَّ احفظنا [اے اللہ ہم کو اس سے محفوظ رکھ] اور آج اس مضمون کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مضمون وہ قابل بیان ہوتا ہے کہ جس کی ضرورت ہو اور یوں تو ہر وقت ہر حکم کی ضرورت ہے لیکن ازمنہ اور حالات ناس کے اختلاف سے بعض احکام دوسرے بعض کے اعتبار سے زیادہ مہتم بالشان ہو جاتے ہیں۔ جیسے اگر طبیب جو مریض کو غیر موسم آم میں کہے کہ دیکھو ترش آم نہ کھانا تو یہ حکم یعنی ترش آم کی ممانعت طبًا فی نفسہٖ ضروری ہے لیکن اس وقت اس کا ممانعت کرنا بالکل امر زائد ہے اس وقت تو اس چیز سے منع کرنا چاہیے جو موجود ہو اور مضر ہو۔ اسی طرح ناصح کا حق یہ ہے کہ جس وقت جو مرض پائے اس کی اصلاح کے متعلق بیان کرے اور اگر چند امراض ہوں تو ان میں اہم کو مقدم کرے اور استیعاب کے ساتھ احکام بیان کرنا اس وقت ہوگا جبکہ کوئی طالب علم مخاطب ہو۔ مثلاً ہدایہ میں پڑھتے پڑھتے کتاب الحج ماہ ربیع الثانی میں آئے تو یہ نہ کہا جائے گا کہ اس وقت اس کی کیا ضرورت ہے اس کی ضرورت تو ماہ ذی الحجہ میں ہے اور وہ بھی جبکہ کوئی حج کو جانے لگے اس وقت ہوگی۔ کیونکہ اس کا تو صاحب فن بننا مقصود ہے بخلاف وعظ کے کہ اس میں وقتی ضرورت پر نظر ہوتی ہے اس لئے کہ مخاطبین کو جامع الفن اور محقق بننا مقصود نہیں۔ بلکہ محض اصلاح مقصود ہے مجھ کو ہمیشہ اسی قاعدہ کی وجہ سے اُن مضامین کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوا کرتا ہے جو اس وقت

ضروری ہوں۔ سرِ دست مجھ کو یہ خیال ہوا کہ منجملہ امراض کے کہ جن میں عام ابتلاء ہے اتباعِ ھوٰی بھی ہے جو اصل ہے تمام امراض کی کہ اس مرض میں عوام و خواص یعنی جہلاء اور علماء بلکہ اخص الخواص بھی یعنی علماء میں جو اہل اللہ اور صاحبِ ارشاد ہیں۔ سب ہی مبتلا ہیں اگر ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو واللہ سچ عرض کرتا ہوں کہ اپنے اندر اتباعِ شریعت کا بہت کم حصہ پائیں گے۔ زیادہ تر اتباعِ ہوٰی ہی نظر آئے گا۔ کیونکہ جس امر میں ہم شریعت سے استدلال کرتے ہیں ان میں اصل محرک اکثر ہوائے ہی ہے۔ اتباع نہیں ہے اتباعِ شریعت کا محض حیلہ ہے۔

منفعتِ خواصِ طبع

اور یہ مرض عوام میں اور رنگ میں ظاہر ہوتا ہے اور علماء میں اور رنگ میں عوام میں جو دنیا دار کہلاتے ہیں وہ تو کھلے مہار معاصی میں اتباعِ ہوئے کا کرتے ہیں۔ مگر جو اتقیاء اور دیندار کہلاتے ہیں وہ دین میں اتباعِ ہوئے کرتے ہیں۔ اس کا یہ رنگ ہے کہ مثلاً مولوی صاحب سے کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کوئی مسئلہ ایسا بھی ہے جس میں یہ کام اس طرح ہو جاوے کیوں صاحب تم سے اپنی حالت کو قانونِ شرعی کے تابع نہیں بنایا جاتا قانون کو چاہتے ہو کہ تمہاری موافقت کرے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ مولوی صاحب کوئی روایت ہمارے موافق کہیں سے نکال دیں۔ کچھ دن ہوئے کہ ایک شخص آئے اور کہا کہ رضاعی بھائی بہن کا آپس میں نکاح ہو گیا ہے اور نکاح کے وقت علم نہ تھا بعدِ نکاح معلوم ہوا۔ اب کیا کیا جاوے میں نے کہا کہ تفریق کرا دو۔ یہ حکم سن کر وہ شخص سہم گیا اور کہنے لگا کہ صاحب اس میں تو بڑی بدنامی ہے۔

افسوس! صد افسوس! کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے سامنے مسلمان

کی یہ حالت ہو اور فرمائش کی جاوے کہ ہمارے موافق مسئلہ مل جاوے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی اس میں تو نیک نامی ہوگی کہ بڑے اچھے آدمی ہیں ایک غلطی ہوگئی تھی جب حقیقت پر اطلاع ہوئی حق کو اختیار کر لیا۔ اور بدنامی تو اب ہو رہی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ بھائی بہن دونوں جمع ہو رہے ہیں اور یہ جواب تو علی سبیل التبرع تھا۔ ورنہ جواب حقیقی تو یہ ہے کہ بلا سے بدنامی ہو ہونے دو اگر ایسا ہی... بدنامی کا خوف ہمارے بزرگوں کو ہوتا تو آج ہم مسلمان نہ ہوتے مگر ہمارے بزرگوں نے اسلام لانے میں کیسی کیسی مصیبتیں اور بدنامیاں اٹھائیں ہیں کیونکہ جب کوئی مذہب باطل کو چھوڑتا ہے تو اہلِ باطل اس پر ایسی ہی ملامت کرتے ہیں جیسے حق کو چھوڑتے وقت اہلِ حق ملامت کرتے ہیں۔ کیونکہ اہلِ باطل بھی اپنے گمان فاسد میں اپنے طریق کو حق اور محبوب سمجھتے ہیں۔

ایک مرتبہ موضع سونہ گیا۔ وہاں ایک بوڑھے چمار کو دیکھا کہ بہت پاک صاف ستھرا رہتا ہے اور رات کو اٹھ کر رام رام بھی کرتا ہے اور معلوم ہوا کہ اس کے اولاد وغیرہ بھی کچھ نہیں ہے میں نے اسے کہلایا کہ مسلمان ہو جا۔ اس نے کہا کہ میں اپنے لوگوں سے صلاح کر کے جواب دونگا صلاح کر کے اس نے جواب دیا کہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ بڑھاپے میں کیوں ایمان کھوتا ہے۔ سچ ہے ۔

گر از بسیط زمین عقل منعدم گردد ÷ بخود گماں نہ برد ہیچ کس کہ نادانم

[اگر تمام دنیا سے عقل معدوم ہو جائے تو کوئی شخص اپنے آپ کو نادان گمان کریگا]

تو میں نے اس سائل سے کہا کہ اگر جناب سب کے سب آپ کے مذاق پر ہوتے اور حق کے اختیار کرنے میں بدنامی سے ڈرتے تو اس وقت آپ بھی کافر ہوتے مسلمان کی تو یہ شان ہونی چاہیے کہ ۔

نسازد عشق را کنجِ سلامت ÷ خوشا رسوائی کوئے ملامت

[عشق کو گوشۂ سلامتی موافق نہیں اسکی مناسب کوچہ ملامت کی رسوائی بہت اچھی ہے]

بلکہ طالب حق کو تو ملامت میں اور زیادہ مزا آتا ہے اور ملامت میں ایک عجیب نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ اس دین میں پختگی ہو جاتی ہے جب تک ملامت نہ ہو خامی رہتی ہے وجہ یہ کہ جب چاروں طرف سے ملامت کی بوچھاڑ پڑنے لگتی ہے تو اس کو طبعاً چڑ ہو جاتی ہے اور اپنے فعل پر اصرار پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے اس کام میں اور پختہ ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے شادی میں کوئی رسم نہیں کی۔ اس پر اس کو لوگوں نے ملامت شروع کی تو یہ شخص ترک رسوم میں اور زیادہ پختہ ہو جائے گا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ حق تعالٰے نے کوئی شے بے حکمت پیدا نہیں فرمائی خواہ وہ شئے آفاقی ہو یا انفسی مثلاً چڑ کہ بظاہر موذی اور مضر معلوم ہوتی ہے مگر اس میں یہ نفع نکلا کہ اس دین کو پختگی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح جس قدر خواص طبعی ہیں سب نافع ہیں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ بخل اور جبن بھی مطلقاً بُری خصلتیں نہیں بلکہ کبھی اچھی بھی ہیں جب کہ اچھے مصرف میں صرف کریں۔ مثلاً ایک سائل آیا کہ مجھ کو سو روپے دیدیجئے شادی میں ناچ کراؤں گا۔ سو یہاں بخل ہی بہتر ہے۔ اسی طرح غصہ پہلے مسلمانوں کو آیا کرتا تھا بعد اصلاح کے اپنے نفس اور شیطان پر اور اعداء اللہ پر غصہ آنے لگا۔ پس محل بدل گیا۔ اور تزکیہ کے بعد اخلاق بدلتے نہیں۔ بلکہ اخلاق طبعیہ بحالہا باقی رہتے ہیں۔ صرف ان کا محل بدل جاتا ہے۔

اسی طرح انسان کے اندر ایک چیز چڑ بھی ہے کہ وہ بھی نافع ہے اگر اپنے محل میں ہو جیسا مثال مذکور میں بیان ہوا۔ ہاں اگر اس کا مصرف بھی برا ہو تو یہ چڑ

دوزخ میں لے جانے والی ہے۔ کفار عرب کو چڑ ہی تو ہو گئی تھی۔ حالانکہ حق اُن کو واضح ہو گیا تھا۔

چنانچہ ایک شخص نے خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ میں ایمان تو لے آتا لیکن قریش کی بڑھیاں کہیں گی کہ دوزخ سے ڈر گیا۔ بہادری میں فرق آجائے گا۔ چنانچہ اسی حال میں مر گیا۔ آپ کو بہت رنج ہُوا۔ اس پر آیت نازل ہوئی کہ اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ۔ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے۔ لیکن اللہ جس کو چاہے ہدایت کرتا ہے۔ تو ایسی چڑ بُری ہے دراندہ حق پر ملامت ہونے سے چڑ بڑھ جائے تو خیر ہے۔ بہرحال اللہ کے بندوں نے ملامت سر پر لی اور حق کو اتباع ہوٰے پر ترجیح دی۔ غرض اتباع ہوٰے کا سخت مذموم ہونا ثابت ہو گیا۔

معیارِ اتباع

اب یہ بات رہی کہ اتباع کے لئے کوئی معیار ہونا چاہیے سو وہ معیار بجز وحی کے اور کچھ نہیں اس لئے کہ طبیعت تو کافی نہیں جیسا ابھی واضح ہوا کہ خواہش نفسانی اُبیلہ کی بھی ان کے لیے متبوع نہیں رہی۔ عقل سو ظاہر ہے کہ عقول میں خود اختلاف ہے تو آخر کس کی عقل کو ترجیح دی جاوے اگر عام کی عقل کو چھوڑ کر حکمار کی عقل کو لیا جاوے تو خود ان میں بھی اختلاف پھر کس کو لیا جاوے۔

اور دوسرے یہ کہ خود عقل پر اکثر تسلط ہو جاتا ہے طبیعت اور رسوم کا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات رسم و رواج کے غلبے سے عقلار بلکہ بڑے بڑے علماء بھی بے وقوفی کے کام کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب بیاہ ہوتا ہے تو نائی کے سامنے شکرانہ بنا کر رکھا جاتا ہے اور کھانے کے بعد جوڑا کے ساتھ اس کے

سامنے سو روپیہ خوان میں ڈالتے ہیں۔ اور وہ اس میں سے ایک دو اٹھا لیتا ہے باقی پھیر دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ واقع میں اس کو اتنی بڑی رقم دینا منظور نہیں مگر پھر بھی اس کے سامنے یہ سو روپے نہ معلوم کس غرض سے رکھے جاتے ہیں۔ اس میں تو ریا بھی نہیں۔ اسلئے کہ ریا تو دوسرے کے دکھاوے کو کہتے ہیں یہاں وہ بھی .. نہیں۔ اس لیے کہ یہ سب جانتے ہیں کہ دینا منظور نہیں ہے۔ یہ تو نرا لڑکوں کا کھیل اور محض لغو بے ہودہ حرکت ہے۔

مگر بڑے بڑے عقلاء جو دوسروں کو عقل سکھاتے ہیں وہ بھی اس میں مبتلا ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقول پر بھی رسوم غالب ہو جاتی ہیں۔ پس ہماری عقل بھی معیار نہیں بن سکتی۔ اور وحی ان سب شوائب سے منزہ ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ لائق اتباع کے صرف وحی ہے لیکن اس شرط سے کہ خود وحی میں اپنی ہوائے نفسانی سے کچھ تصرف یا تغیر نہ کر لیا ہو جیسا آجکل اکثر اہل علم اور غیر اہل علم قصداً تو اتباع کرتے ہیں ہوائے نفسانی کا۔ اور وحی کو صرف آڑ بنا لیتے ہیں۔ سو یہ کتنا بڑا حیلہ و فریب ہے اس سے صرف اتنا تو نفع ہو جاتا ہے کہ خلق کے اعتراض سے بچ جاتے ہیں مگر خالق تعالیٰ شانہ تو ظاہر اور باطن کا جاننے والا ہے اس کیسے بچیں گے

ے

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام	در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست	با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار ہا او راست باید داشتن	رایت اخلاص و صدق افراشتن

[میں نے فرض کر لیا اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ سب تیرے کام درست ہیں خدا تعالٰی کے ساتھ مکر و حیلہ کب جائز ہے حق تعالٰی کے ساتھ سب کام

درست رکھنے چاہئیں۔ اخلاق اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیئے)

خدائے تعالیٰ کے ساتھ فریب کرنا نہ چاہیئے اور نیک نامی اور بدنامی کو بالائے طاق رکھ کر سچا اتباع کرنا چاہیئے۔

عاشقِ بدنام کو پرواہ ننگ و نام کیا　　جو کہ خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

اور عاشق کو جو ناکام اور بے مراد کہہ دیا ہمارے حضرتؒ اس کی تفسیر فرماتے تھے کہ بے مرادی عشق کو کہتے ہیں کیونکہ عاشق کا خاصہ ہے کہ وصل کے جس مرتبہ پر پہنچے اس کو آگے کی ہوس ہوتی ہے اور اشتیاق بڑھتا ہے ہاں جس کے محبوب کا جمال متناہی ہو اس کی مرادیں ختم ہو سکتی ہیں۔ اور جہاں جمال غیر متناہی ہو وہاں نہ حسن ختم نہ طلب ختم بلکہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے اشتیاق اور زیادہ ہوتا جاتا ہے اور وہ حالت ہوتی ہے جس کو شیخ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

دلارام دربر دلا رام جو ....　　لب از تشنگی برطرف جو ....

نہ گویم کہ برآب قادر نیند　　کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(محبوب گود میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈ رہے ہو، نہر کے کنارے پر کھڑے ہو اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں یہ تو ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ جلندھر والے کی طرح دریائے نیل کے کنارے پر ہیں)

غرض ناکام کو بدنامی سے کیا ڈر حافظ صاحب فرماتے ہیں ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　∴　مانمی خواہیم ننگ و نام را

.... (اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے تو ہم ننگ و نام کے خواہاں نہیں ہیں)

جو بدنامی سے ڈرے وہ عاشق نہیں ہوسناک ہے۔

نامرادیٔ عشق

آجکل یہ کیفیت ہے کہ دین پر بھی عمل اسوقت کریں گے کہ جب وہ حکم اپنی خواہش کے خلاف نہ ہوا اور نہ اس میں کچھ خرچ ہو،

اور نہ کسی مصلحت دنیوی کے خلاف ہو اور اس پر پھر دعویٰ دینداری کا سہ

وَجَائِزَۃٌ دَعْوَی الْمَحَبَّۃِ فِی الْہَوٰی ﴿ وَلٰکِنْ لَا یَخْفٰی کَلَامُ الْمُنَافِقِ

(عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے لیکن منافق کا کلام چھپا نہیں رہتا)

چنانچہ ان سائل صاحب نے فرمایا کہ کوئی ایسا مسئلہ نکال دو کہ جس میں یہ عورت حلال ہو جاوے میں نے کہا کہ دیوانہ ہوئے ہو میں کون حلال کہنے والا ہوں اور اگر کہہ بھی دیا تو اس سے حلال تو نہیں ہو جاوے گی۔ جب تک شرعی دلیل سے حلال نہ ہو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور سوال کیا کہ فلاں مرد عورت کی آپس میں یہ قرابت ہے ان میں نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں حضرت نے فرمایا نہیں۔ وہ کیا کہتا ہے کہ ہم نے تو کیا تھا ہو گیا تھا تو د ہونے کا:۔ مطلب یہ سمجھے کہ زبان سے الفاظ نہ نکل سکتے ہوں گے۔

اسی واسطے فرماتے ہیں کہ ہم نے کیا تھا اور ہو گیا تھا یعنی منہ بند نہیں ہو گیا تھا۔ اسی طرح یہ سائل صاحب بھی اسی رضاعی بھائی بہن کو حلال کرانا چاہتے تھے جب ان سائل صاحب نے مجھ سے صاف جواب سنا تو اب تاویل کی فکر ہوئی کہ کوئی تاویل کرنی چاہیے تو فرمانے لگے کہ اس لڑکے نے دودھ پیا تو تھا مگر تھوڑا سا پیا تھا وہ عقلمند یہ سمجھے کہ بہت سا پینے سے حرمت ہوتی ہوگی تھوڑا پینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے کہا کہ جناب ایک قطرہ پینے میں بھی حرمت ہو جاویگی اس پر فرمانے لگے کہ جی جو کچھ پیا تھا وہ بھی تے ہو گیا تھا۔ اندر نہیں رہا وہ سمجھا کہ بس دودھ کے ساتھ حرمت بھی نکل پڑی۔ میں نے کہا کہ بھائی حلق کے نیچے اترتے ہی حرمت ثابت ہو گئی اور ثبوت کے بعد اس کا سقوط نہیں ہوتا۔ اس پر وہ نا امید ہو کر چلے گئے اور دہلی پہنچے۔ اہل حدیث سے جا کر رجوع کیا تو اہل حدیث اور نیز شافعیؒ کا مذہب ہے کہ پانچ گھونٹ سے کم میں حرمت نہیں

چوتی۔
یہ مسئلہ سُن کر ان سائل صاحب نے ایک سوال اسی قید کے ساتھ تیار کیا کہ ایک لڑکے نے پانچ گھونٹ سے کم دودھ پیا ہے آیا حُرمت رضاعت ثابت ہوئی یا نہیں۔ ان میں سے کسی نے جواب لکھ دیا کہ اس صورت میں حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔ بس آپ راضی رضا آگئے اور بہن بھائی کو اسی حالت پر ہنسی خوشی جمع رکھا۔ دیکھئے! اس مسئلہ میں ان سائل صاحب نے کس قدر اپنے نفس کی پیروی کی ہے۔ جیسا اُس کے مکالمہ مفصلہ سے ثابت ہوتا ہے۔ پھر بھی امید نہیں کہ موافق.. مذہب شافعیؒ کے یہ نکاح جائز ہوا ہو۔ اس لیے کہ بچے کے دودھ پینے کے وقت جب ان امور کی اطلاع بھی نہ تھی تو کس نے گنا تھا کہ اس نے پانچ گھونٹ پیئے ہیں یا کم ...... دوسرے یہ کہ یہ شخص حنفی تھا اور پہلے سے اس کا یہ عقیدہ نہ تھا جس پر عمل کیا اگر پہلے سے شافعی ہوتے تو اس فتوے پر عمل کرنا مضائقہ نہ تھا یا اس ابتلاء ورضاع سے پہلے اپنی تحقیق یا کسی کی تقلید سے اس مسلک کی ترجیح ثابت ہو جاتی تب بھی مضائقہ نہ تھا۔ اب تو کھلا اتباع ہوائے کیا۔

اسی طرح ہم فرائض میں دیکھتے ہیں کہ اگر اپنے آپ کو ملتا ہوا دیکھتے ہیں تو.. فرائض نکلواتے ہیں اور بعضے تو اول ہی پوچھ لیتے ہیں کہ ہمارا بھی کچھ حصہ ہے یا نہیں اگر کچھ حصہ ہوا تو مسئلہ نکلواتے ہیں اور اگر نہ ہوا تو چل دیتے ہیں اور بعضے اس امید پر مسئلہ نکلوا لیتے ہیں۔ مگر جب ان کو مسئلہ نکال کر سُنایا جاتا ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا اس میں کچھ نہیں ہے تو بہت بددل ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات فرائض بھی مفتی ہی کے پاس چھوڑ کر چلے جاتے ہیں یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ نکالنے والے کا جی بُرا ہوگا اس کی خاطر ہی سے لے جاویں۔

ایک شخص میرے پاس ایک فرائض لائے اور پوچھا کہ میرا کتنا حصہ ہے۔ میں نے

بتلا دیا کہ اس قدر ہے ان کو وہ بہت کم معلوم ہوا کہنے لگے کہ میرا حصہ کیوں گھٹ گیا۔ میں نے کہا کہ فلاں وارث کی وجہ سے کم ہوگیا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو تم کو زیادہ ملتا تو کہنے لگے کہ جناب پھر اس کو نہ لکھئے۔ اور اکثر فرائض وہی پوچھتا ہے جس کے قبضہ میں کچھ نہ ہو اور قبضہ چاہتا ہو اور جو قابض ہوتا ہے وہ کبھی فرائض نہیں نکلواتا.. کیونکہ جانتا ہے کہ تقسیم کرنی پڑے گی اور قبضہ سے شے نکل جاویگی۔

غرض لینے کے لیے فرائض نکلواتے ہیں دینے کے لیے کوئی نہیں نکلواتا الا ماشاء اللہ تمام عمر میں ایک ایسے شخص آئے کہ بڑے رئیس تھے اور تمام ریاست پر قابض تھے۔ انہوں نے فرائض لکھوائے تھے تاکہ جائداد موافق شرع شریف تقسیم کردیں۔ گڑ گانواں کے رہنے والے تھے کئی بار آئے اور گئے جو ضروری بات اس میں کوئی رہ جاتی تھی اسکو دریافت کرنے کے لیے مکرر سکرر آتے اور جاتے اور ان کے سوا جو آتا ہے ایسا ہی آتا ہے جو لینا چاہتا ہے اور دینا نہیں چاہتا۔

ایک بار ایک ایسے ہی شخص آئے اور انہوں نے مسئلہ پوچھا کہ ہماری بہن بے اولاد مر گئی اور خاوند اس کا شیعی ہے آیا اسکے خاوند کو بھی عورت کے ترکہ میں سے کچھ ملے گا۔ میں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ملے گا نصف ترکہ اس کا ہے تو وہ بھائی یہ چاہتے تھے کہ خاوند کو نہ ملے مال بہت تھا اور انہوں نے کہیں سنا تھا کہ شیعہ پر کفر کا فتوے ہے تو اس لیے چاہتے تھے کہ اس تاویل سے اس کے خاوند کو کچھ نہ ملے۔ سب مال ہمارے قبضہ میں آوے کہنے لگے کہ سنی کا تو شیعی سے بوجہ کفر شیعی کے نکاح نہیں ہوتا پھر وہ شوہر کب ہے۔ میں نے کہا کہ تم کو کچھ خدا کا خوف بھی ہے کہ دوسرے کا حق رکھنا چاہتے ہو اور اگر خوف نہیں تو اچھا حمیت اور غیرت کہاں اڑ گئی کہ تھوڑی سی دنیا کے لیے یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہاری بہن تمام عمر حرامکاری میں مبتلا رہی۔ اور دوسرے یہ تو بتلایئے کہ آپنے نکاح کے وقت کیوں نہ پوچھا کہ

کہ یہ خاوند شیعی ہے۔ اس سے نکاح جائز ہے یا نہیں۔ اور تیسرے یہ کہ سچ سچ کہنا اگر یہ مال خاوند کے قبضہ میں ہوتا اور وہ مرتا اور تمہاری بہن کو ملنے کے بعد پھر تمہاری طرف سے منتقل ہونے کا احتمال ہوتا تو کیا اس وقت بھی تم اس نکاح کے صحیح نہ ہونے کی... کوشش کرتے۔ میرے پاس کثرت سے ایسے سوال آتے ہیں کہ کوئی بات نکال دو۔

چنانچہ ابھی ایک مسئلہ آیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں۔ اس کی درخواست تھی کہ کوئی ایسی صورت نکالدو کہ حلالہ نہ کرنا پڑے یہ تو عوام الناس کی... کیفیت ہے جو بیان ہوئی کہ ہر امر میں اتباع ہویٰ کرتے ہیں — حتیٰ کہ مسائل شریعت میں بھی علماء سے فرمائش کرتے ہیں کہ ہماری مرضی کے موافق فتوے دیدیں۔

معیارِ اقتداء

رہے علماء ان سے تو کسی سے کہنے سننے کی ہی ضرورت نہیں۔ ہدایہ شرح وقایہ، درمختار ان کے سامنے ہے جس طرح چاہیں عمل کریں۔ اور میں سب علماء کو نہیں کہتا۔ بلکہ صرف ان کو جو حُبِّ جاہ ومال میں مبتلا ہیں۔ سو ایسے عالم کا فتوے بھی معتبر نہیں جو دنیا کا حریص اور محب ہو اور ہمیشہ گمراہی ایسے ہی لوگوں سے پھیلی ہے ؎

بدگہر را علم و فن آموختن — دادن تیغ ست دستِ راہزن

(نااہل کو علم وفن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ تلوار دیدینا ہے)

پہلے زمانہ میں جو رسم تھی کہ ہر ایک شخص کو مقتدا وعالم بننے کی اجازت نہیں تھی اس میں بڑی مصلحت تھی مگر اس میں اتنی کمی تھی کہ انتخاب غلط تھا۔ خاص خاص قوموں کا انتخاب کر رکھا تھا کہ ان ہی کو علم دین پڑھنے کی اجازت تھی البتہ انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ اساتذہ طلبہ کے زمانۂ تحصیل میں اس کا اندازہ کیا کریں کہ کس شخص میں حرص دنیا کی غالب ہے۔ اور کس شخص میں نہیں ہے۔ جس میں حرص دنیا کی غالب دیکھیں اس کو رخصت کریں اور مدرسہ سے خارج کریں۔ اور جس میں حُبِّ دنیا

نہ ہو اس کو مقتدائے دین بنائیں۔

بغداد میں ایک مدرسہ نظامیہ تھا کہ جس سے بڑے بڑے علماء جیسے امام غزالی اور شیخ سعدیؒ پڑھ کر نکلے اور وجہ اس مدرسہ کی بناء کی یہ ہوئی تھی کہ اس زمانہ میں قضاء اور افتاء اور دیگر بڑے بڑے عہدے علماء ہی کو دیئے جاتے تھے تو جس کا باپ مثلاً قاضی ہوتا تھا۔ وہ کوشش کرتا تھا اور دعویٰ استحقاق تقاضا کا کرتا تھا خواہ وہ اہل ہو یا نہ ہو تو سلطانِ وقت نے بمشورہ وزراء و ارکانِ دولت اس لیے یہ مدرسہ تیار کیا کہ جو اس مدرسہ میں پاس حاصل کر لے اس کو یہ عہدے دیئے جاویں گے تاکہ نا اہلوں کو اور جہلاء کو حوصلہ ایسے عہدوں کی درخواست کا نہ ہو تو جس روز اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی اس روز علماء بخارا میں ماتم ہوا تھا کہ آج کی تاریخ سے علم دین دنیا کے لیے پڑھایا جائے گا۔ لیکن تاہم ایسے بڑے علماء اس میں سے پڑھ کر نکلے کہ فخرِ علماء ہوئے اور جن کا نظیر اس وقت روئے زمین پر نہیں۔

ایک روز بادشاہ اس مدرسہ کے دیکھنے کے لیے تشریف لائے اور مخفی طور سے طلبہ کے خیالات کی آزمائش کی کہ دیکھیں علم پڑھنے سے ان کی کیا غرض ہے چنانچہ ایک طالب علم سے پوچھا کہ آپ کس لیے پڑھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اس لیے پڑھتا ہوں کہ میرا باپ قاضی ہے میں اگر عالم بن جاؤں گا تو میں بھی قاضی ہو جاؤں گا اس کے بعد دوسرے سے پوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ میرا باپ مفتی ہے میں مفتی بننے کے لئے پڑھتا ہوں۔

غرض جس سے پوچھا اس نے کوئی غرض دنیا ہی کی بتلائی۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا کہ افسوس کہ علم دین دنیا کے لیے پڑھا جا رہا ہے اور ہزاروں روپیہ مفت میں برباد ہو رہا ہے۔ ایک گوشہ میں امام غزالی بھی خستگی کی حالت میں بیٹھے کتاب دیکھ رہے تھے۔ اس وقت تک یہ طالب علم تھے نہ کوئی جانتا تھا نہ شہرت تھی ان

سے دریافت کیا کہ تم کیوں پڑھتے ہو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے دلائل عقلیہ و نقلیہ سے معلوم کیا ہے کہ ہمارا ایک مالک حقیقی ہے جو سمٰوٰت و ارض کا مالک ہے اور مالک کی اطاعت ضروری ہوتی ہے کہ اسکی مرضیات پر عمل کرے اور نامرضیات سے بچے۔ سو میں اس لیے پڑھتا ہوں کہ اس کی مرضیات و نامرضیات کی اطلاع حاصل ہو۔ بادشاہ سن کر خوش ہوئے اور ظاہر کر دیا کہ میں بادشاہ ہوں اور کہا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں اس مدرسہ کو توڑ دوں مگر تمہاری وجہ سے یہ مدرسہ رہ گیا۔ پس تحصیل علم اس غرض سے ہونی چاہیئے جو امام غزالیؒ نے ظاہر کی۔

حُبّ دُنیا کا امتحان

اور جس کی غرض تحصیل دنیا اور باعث حبِ دُنیا ہوگا اسکو علم سے کچھ نفع نہ ہوگا اور حُبِ دنیا کا امتحان سلف سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں اساتذہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ طلباءؔ میں کون ایسا ہے جو امراء کی طرف راغب ہے اور کون نہیں ہے جو امراء کی طرف راغب ہوتا تھا اس کو اپنے حلقہ میں آنے سے روک دیتے تھے کیونکہ امراء کے پاس سوائے دنیا کے کیا ہے جو امراء سے مانوس ہوگا معلوم ہوتا ہے کہ طالب دنیا ہے چنانچہ امراء کے دربار میں جو علماء ہوتے ہیں وہ ان کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے ہیں خواہ حق ہو یا ناحق ہو۔ ہاں جو عالم حق گو ہو اور مغلوب ہوتا ہو وہ اگر امراء کے یہاں جائے اور حق بات کہے وہ مجاہدہ ہے۔

ایک شخص ایک بزرگ کی ملاقات کے لیے سفر کر کے گئے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ بزرگ بادشاہ کی ملاقات کے واسطے گئے ہیں۔ یہ شخص بہت نادم ہوئے اور سمجھے کہ بزرگ سن کر آئے تھے یہ تو دنیا دار نکلے اور وہاں سے واپس ہو کر جا رہے تھے اس بادشاہ کے لوگوں نے ان کو جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا اور بادشاہ کے دربار حاضر کر دیا۔ وہ بزرگ اس وقت وہاں تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے بادشاہ

فرمایا کہ یہ جاسوس نہیں ہے ہمارا مہمان ہے یہ چھوڑ دیئے گئے۔ وہ بزرگ بھی وہاں سے چلے اور اس شخص سے کہا کہ میں اس لیے بادشاہ کے یہاں آیا کرتا ہوں مگر لیے فیصدی ایک بھی نہیں۔ ہماری اور امراء کی مثال تو چھری اور خربوزہ کی سی ہے۔ خربوزہ کی سلامتی چھری سے الگ ہی رہنے میں ہے۔ خواہ خود ان کے پاس جاؤ یا وہ تمہارے پاس آویں۔ اور تم اُن کے آنے سے متاثر ہو۔

اُمراء سے اجتناب

اُمراء سے ملنا اور ثابت قدم رہنا بڑے قوی آدمی کا کام ہے۔ جس کی شان حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کی سی ہو۔ ان کی حکایت ہے کہ ایک بار ایک موقع پر چلے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے دجلہ کے کنارے پہنچے دیکھا کہ شراب کے مٹکے کشتیوں سے اُتر رہے ہیں پوچھا کہ ان میں کیا ہے کشتی والے نے کہا کہ شراب ہے۔ خلیفہ وقت معتصم باللہ کے لیے آئی ہے اور وہ دس مٹکے تھے شیخ کو غصہ آیا اور کشتی والے کی لکڑی مانگ کر انہوں نے نو مٹکے یکے بعد دیگرے توڑ ڈالے اور ایک مٹکا... چھوڑ دیا۔ چونکہ یہ شراب خلیفہ کے لیے لائی گئی تھی اس لیے ان کا براہ راست خلیفہ کے ہاں چالان کر دیا گیا۔ معتضد نہایت ہیبت ناک صورت میں بیٹھ کر اجلاس کیا کرتا تھا۔ لوہے کی ٹوپی اوڑھتا تھا اور لوہے کی زرہ اور لوہے کا گرز ہاتھ میں ہوتا تھا اور لوہے کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔

معتضد نے نہایت کڑک کر ہولناک آواز سے پوچھا کہ تم نے یہ کیا کیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ جو کچھ میں نے کیا ہے آپ کو بھی معلوم ہے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ میں یہاں تک نہ لایا جاتا۔ معتضد یہ جواب سن کر برہم ہوا اور پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی کیا تم محتسب ہو۔ شیخ نے فرمایا کہ ہاں محتسب ہوں خلیفہ نے پوچھا کہ تم کو کس نے محتسب بنایا ہے۔ فرمایا کہ جس نے تجھ کو خلیفہ بنایا ہے خلیفہ نے

نے پوچھا کہ کوئی دلیل ہے فرمایا کہ

يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَاصْبِرْ عَلٰى مَا أَصَابَكَ

[قائم کر نماز کو حکم کر نیک باتوں کا۔ اور روک لوگوں کو بری باتوں سے اور اس سے جو تجھ کو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر]

معتضد یہ بلیا کی باتیں سن کر متاثر ہوا اور کہا کہ ہم نے تم کو آج سے محتسب بنایا۔ مگر ایک بات بتاؤ کہ ایک مٹکا تم نے کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ جب میں نے نو مٹکے توڑ ڈالے تو نفس میں خیال آیا کہ اے ابوالحسن! تو نے بڑی ہمت کا کام کیا کہ خلیفہ وقت سے بھی نہ ڈرا میں نے اسی وقت ہاتھ روک لیا کیونکہ اس سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے توڑے تھے۔ اگر اب توڑوں گا تو وہ نفس کے لیے ہوگا اسلئے دسواں مٹکا چھوڑ دیا۔

ایسی ہی حکایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لکھی ہے کہ آپ ایک کافر کے قتل کرنے کے واسطے اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھے۔ الخ آپ کے چہرۂ مبارک پر... تھوک دیا آپ فوراً اتر پڑے اور اس کو چھوڑ دیا۔ اس نے پوچھا کہ آپ باوجود اس کے کہ مجھ پر غالب ہو گئے تھے۔ اور میں پوری طرح آپکے قبضہ میں آگیا تھا، پھر گستاخی بھی سخت کی باوجود ان مقتضیات کے پھر کیا وجہ پیش آئی کہ الگ ہو گئے اور قتل نہیں کیا۔ فرمایا کہ تیرے تھوکنے سے پہلے تو میری نیت اللہ کے واسطے تجھ کو مارنے کی تھی اور جب تو نے تھوکا تو غصہ آگیا اور نفس نے کہا کہ جلدی اس گستاخ کا کام تمام کردو۔ تو اب نفس کی آمیزش ہو گئی اگر قتل کرتا تو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہوتا۔ اسلئے میں نے چھوڑ دیا وہ یہ دیکھ کر مسلمان ہوگیا۔

یہ حکایت خلوص کی مناسبت سے بیان کی گئی۔ اصل قصہ حضرت ابوالحسن نوریؒ

کی حق گوئی کا بیان کیا گیا تھا۔

حاصل یہ کہ اگر علماء امراء کے پاس جاکر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر سکیں تو خیر ان سے ملنے کا ڈر نہیں اور اگر ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑے اور حق گوئی نہ کر سکے تو اجتناب ہی بہتر ہے۔

دین کے راہزن

حدیث میں ہے۔ اَلْعُلَمَاءُ اُمَنَاءُ الدِّیْنِ مَالَمْ یُخَالِطُوْا الْاُمَرَاءَ فَاِذَا خَالَطُوْا الْاُمَرَاءَ فَھُمْ لُصُوْصُ الدِّیْنِ۔ یعنی علماء دین کے امانت دار ہیں جب تک کہ اُمراء و حکام سے میل جول نہ کریں اور جب امراء و حکام سے میل جول کرنے لگیں تو وہ دین کے راہزن ہیں۔

چنانچہ تھوڑے دنوں کا قصہ ہے کہ ایک عورت کی ایک مرد سے آشنائی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح خاوند سے چھوٹ کر آشنا سے نکاح ہو جاوے ایک ایسے ہی مولوی صاحب نے جو دین کے راہزن تھے اس کو ترکیب سکھائی تو کافر ہو جا نکاح ٹوٹ جاویگا۔ پھر توبہ کر کے دوسرے سے نکاح کر لینا۔ نعوذ باللہ ایسے ہی ظالموں نے علماء کو بدنام کیا ہے۔ غرض اہلِ علم میں یہ مرض اس رنگ سے ظاہر ہو رہا ہے۔

درویشی میں عیاری

اور اہلِ علم میں اخص الخواص ہیں ان میں بھی یہی مرض موجود ہے اگرچہ وہ نہ مال کے طالب ہیں اور نہ جاہ ان کو مطلوب ہے۔ مگر ان میں بھی ایک وسیلہ اتباع ہوٰی کا موجود ہے مثلاً کسی کے ساتھ سختی کی اور اس کو بُرا بھلا کہا تو نفس یہ تاویل کرتا ہے کہ سختی سے اصلاح ہوتی ہے۔ اسلئے تم پر کچھ مواخذہ نہیں۔ تمہاری نیت اس میں اچھی ہے لیکن یہ تاویل اس وقت صحیح ہو سکتی ہے کہ جس وقت سختی کی تھی اس سے پہلے یہ بات ذہن میں ہوتی اور یہی محرک تشدد کا ہوتی سو اس وقت تو بجز غیظ کے کچھ بھی دل میں

نہ تھا۔ اب فرصت میں تاویلیں گڑھتے ہیں اور دھبہ دھونے کے لیے بعض مرتبہ زبان سے بھی کہتے ہیں کہ کیا کہیں بڑی سختی ہوگئی یہ اس لیے کہ معتقدین و متبعین کے دل میں شبہ نہ رہے اور یہ سمجھیں کہ حضرت بڑے متواضع ہیں اور بڑے صاف ہیں خود اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہیں پھر اس پر معتقدین بناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں ہماری ہی اصلاح کے واسطے آپ کی اس میں کیا غرض ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ کہتا ہے۔

غرض ایسے معتقدین اس کے دماغ اور زیادہ خراب کر دیتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکلست اما خار جاں ۔۔۔ از فریبِ داخلاں و خارجاں
اینش گوید نے منم ہمراز تو ۔۔۔ آتش گوید نے منم انبار تو
او چو بیند خلق را سرمست خوش ۔۔۔ از تکبر می رود از دست خویش

[تن قفس کے مثل ہے اسی وجہ سے وہ جان اور روح کے لیے مثل خار کے ہو رہا ہے ایک اس کو کہہ دیا ہے میں آپ کا ہمراز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا شریک حال ہوں وہ شخص بے چارہ جب ایک مخلوق کو اپنا سرمست و عاشق دیکھتا ہے بس تکبر کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے]

ایسے لوگوں کو یہی چاہیئے کہ کام کرنے سے پہلے غور کر کے دیکھا کریں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس میں خواہش نفسانی کس قدر ہے اور اتباع شریعت کس قدر خواہش نفسانی کا حصہ ترک کر دینا چاہیئے۔ ایک مثال اور لیجئے مثلاً ایک امیر آیا اور اس کی تعظیم و تکریم کی گئی اب بعض کا نفس کہتا ہے کہ اس میں دنیوی غرض نہیں ہے بلکہ شرعاً بھی اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ مناسب ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاوے تو اس کی دل شکنی ہوگی اور حدیث میں آیا ہے اِذَا جَاءَکُمْ کَرِیْمُ قَوْمٍ فَاَکْرِمُوْہُ (جب تمہارے

پاس کسی قوم کا بڑا آئے اس کا اکرام کرو) درحقیقت یہ سب مقدمات فی نفسہا بالکل صحیح ہیں۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ آیا ہم نے جو اس کی تعظیم کی ہے کیا انہی مصلحت سے کی ہے یا اور کوئی وجہ ہے تو غور کر کے جو دیکھا جاتا ہے تو یہ وجہ ہرگز محرک نہیں ہوتی یہ تو بحث بعد الوقوع کے طور پر تصنیفی وجہ ہے اصل وجہ وہی دنیا کی خوشامد بتوقع نفع ہے۔

غرض یہ کہ نفس میں اکثر کے شرارتیں ہی ہیں۔ مگر بدمعاشوں میں اور طرح کی ہیں اور نیک بختوں میں نیک بختی کے رنگ میں ہیں اور علماء۔ اور طلبا میں اور رنگ سے ہیں اور درویشوں میں دوسرے رنگ سے ہیں اسی واسطے مولانا فرماتے ہیں ؎

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا	ما چو مرغانِ حریصِ بے نوا
دم بدم پابستۂ دامِ تو ایم	ہر یکے گر باز و سیمرغے شویم
میرہانی ہر دمے ما را و باز	سوئے دامے میرویم اے بے نیاز

[اے خدا لاکھوں دام دانے موجود ہیں اور ہماری حالت مرغانِ حریص کی سی ہے وقتاً فوقتاً ایک نئے دام میں پھنس جاتے ہیں گو ہم باز و سیمرغ ہی کیوں نہ ہو جائیں آپ کی یہ عنایت ہے کہ ہر وقت ہم کو ان داموں سے نکالتے رہتے ہیں مگر ہم پھر دوسرے دام میں چلنے لگتے ہیں]

لیکن یہ ضروری امر ہے کہ جو شخص عمل کرتا ہے اور اخلاص کی سعی میں رہتا ہے اس کو غلطی پر تنبیہ ضرور ہوتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر تنبیہ پر بھی تدارک نہیں کرتے۔ تدارک کرنے سے عار آتی ہے نفس کہتا ہے کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے اور اب تدارک خلافِ مصلحت ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر اس وقت تدارک کر لیا جاوے اور علی الاعلان غلطی کا اقرار کر لیا جاوے تو آئندہ کو عمل کی توفیق ہوتی ہے اور تدارک نہ کرنے سے پستی ہوتی جاتی ہے اور توفیق کم ہوتی جاتی ہے یہ تجربہ کی بات ہے

لطافت کا دھوکہ

ایک دھوکہ اور ہو جاتا ہے وہ یہ کہ جب کچھ... نشیب و فراز ہو جاتا ہے تو نفس کہتا ہے کہ تمہارے اندر اللہ کے نام سے لطافت پیدا ہو گئی ہے تمہارے وجدان میں جو کچھ آتا ہے وہ صحیح ہی ہوتا ہے تم سے غلطی نہیں ہوتی۔ سو یہ امر فی نفسہٖ تو صحیح ہے کہ واقعی مومن کے اندر عمل اور تقویٰ کی بدولت فراست صحیح پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ آیا ہے کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی (مومن کی فراست سے ڈرو اس لیے کہ وہ نور خدا سے دیکھتا ہے) میں نے سنا ہے کہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ کی خدمت میں ایک شخص آئے انہوں نے مشورہ کیا کہ مجھے مدینہ جانا ہے کس طرف کو جاؤں۔ فرمایا کہ ینبوع کو جاؤ۔ دوسرا ایک اور آیا اس نے بھی مشورہ لیا اس کو فرمایا کہ سلطانی راستہ کو جاؤ۔ سو جس کو ینبوع کے راستہ سے جانے کے لیے فرمایا۔ وہ بھی کسی مصلحت سے سلطانی ہی راستہ کو گیا اور حضرت کے مشورہ پر عمل نہ کیا اس کو ویسے بھی بہت تکلیف ہوئی اور بدوؤں سے بھی سابقہ پڑ گیا اور ان سے الگ تکلیف پہنچی اور جس کو سلطانی راستہ کا مشورہ دیا تھا وہ راحت سے چلا گیا حضرت سے اس کی وجہ دریافت کی گئی کہ آپ نے اس کو اس راستہ کا مشورہ دیا۔ اور اس کو دوسرے راستہ کا اس میں کیا حکمت تھی۔

فرمایا جب پہلا آیا میرے دل میں وہی آیا جو اس کو بتایا اور جب دوسرا آیا میرے دل میں اس وقت یہی آیا جو اس کو مشورہ دیا۔ سو ایسے شخص سے واقعی غلطی کم ہوتی ہے۔ اسی کے مناسب ایک اور حکایت ہے کہ

ایک بزرگ کی خدمت میں چند آدمی جو سفر کرنے والے تھے ملنے اور رخصت ہونے آئے جب وہ جانے لگے تو انہوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم کو کچھ وصیت کیجیے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاتھی کا گوشت مت کھانا انہوں نے عرض کیا کہ حضرت

ہم کو تو ہاتھی کے گوشت کھانے کا خطرہ بھی نہیں گذرتا۔ یہ آپنے کیوں فرمایا ــــ فرمایا کہ میرے منہ سے اس وقت ایسا ہی نکلا واللہ اعلم۔ کیا وجہ ہے وہ لوگ رخصت ہو گئے اتفاقاً راستہ بھول گئے اور ایک بیابان میں پہنچ گئے اور بھوک اور پیاس سے بے تاب ہوئے۔ اتفاق سے ایک ہاتھی کا بچہ سامنے سے دکھائی دیا سب نے اتفاق کیا کہ اس کو کاٹ کر کھانا چاہیئے ایک نے اُن میں سے منع کیا کہ تم کو کیا حضرت کی وصیت یاد نہیں ہے انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی اور سب نے خوب اس کا گوشت کھایا لیکن اس ایک نے نہیں کھایا۔ اور گوشت کھا کر سو رہے کیونکہ تھکے ماندے ہو رہے تھے۔ مگر جس نے نہیں کھایا تھا اس کو نیند نہیں آئی جاگتا رہا۔ تھوڑی دیر میں ایک جماعت ہاتھیوں کی آئی اور ان میں ایک ہتھنی بھی تھی۔ اس ہتھنی نے اپنے بچہ کو تلاش کرنا شروع کیا تلاش کرتے کرتے وہاں بھی آئی جہاں یہ لوگ سوتے تھے اور ان سونے والوں میں سے ہر ایک کا منہ سونگھا تو اس کو گوشت کی بو آئی اسکی ایک ٹانگ پر پاؤں رکھا اور دوسری سونڈ سے پکڑ کر اس کو چیر ڈالا اسی طرح سب کا کام تمام کر دیا۔ پھر آخر میں اس کے پاس آئی چونکہ اسکی منہ سے بو نہ آئی اس کو سونڈ سے اٹھا کر اپنی کمر پر بٹھا لیا اور ایک جانب کو لے چلی اور ایک میوہ دار درخت کے نیچے لے گئی اور ٹھہر گئی اس نے خوب سیر ہو کر میوے کھائے اسکی بعد اس کو راستہ پر چھوڑ آئی ان حضرات کی یہ شان ہو جاتی ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اس کا کہا ہوا اللہ تعالےٰ کا کہا ہوا ہے اگرچہ بندے کے منہ سے نکلا ہو)

لیکن گفتگو اس میں ہے کہ تم بھی اُن میں ہو یا محض تمہارے نفس کی تسویل ہی ہے

؎ اے مُری کردہ پیادہ با سوار ٭ سر نخواہی برد اکنوں ہوش دار

[اے شخص جو پیادہ ہو کر سوار کا مقابلہ کرتا ہے تو اپنا سر سلامت لے جائیگا ذرا سنبھل]

چونکہ تو یوسف نیستی یعقوب باش ٭ ہمچو او باگریہ و آشوب باش

ناز را روئے بباید ہمچو ورد ٭ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد روئے نازیبا و ناز ٭ عیب باشد چشم نابینا و باز

(جب تم یوسف علیہ السلام یعنی مطلوب نہیں ہو تو یعقوبؑ یعنی طالب ہی رہو اور اس کی طرح گریہ در شوب یعنی درد و طلب میں رہو۔ ناز کے لیے گلاب جیسا چہرہ چاہیئے جب ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس نہ پھٹکو نابینا آنکھ کا کھلا رکھنا عیب ہے، بدشکل کا ناز کرنا بُرا معلوم ہوتا ہے)

کیدِ نفس

پس ناقصین کا اپنے کاملین پر قیاس کرنا اور اپنی نفسانی خواہش کو ان حضرات کی فراست و وجدان پر قیاس کرنا سخت غلطی ہے تم کو چاہیئے کہ اپنے نفس پر ہر وقت بدگمانی رکھو اگر کسی وقت اس میں خواہش کو مفقود بھی پاؤ تب بھی اس کو نفس مُردہ ہرگز نہ جانو۔ اس کی مثال اژدھے کی سی ہے۔ کوئی شخص پہاڑ پر چلا گیا کہ دیکھا کہ اژدھا مردہ پڑا ہے اور وہ جاڑے کی وجہ سے ٹھٹھر رہا تھا مُردہ نہیں تھا۔ اسنے اسکو پکڑ لیا اور شہر میں لایا اور سرِ مجمع اس کو لے کر بیٹھا تھوڑی دیر میں جو آفتاب نکلا اور اس کو گرمی پہنچی اور افسردگی اس کی جاتی رہی تو اس نے حرکت شروع کی اور لوگوں نے بھاگنا شروع کیا اور سینکڑوں اوپر تلے گر کر ہلاک ہو گئے۔

یہی حال نفس کا ہے اس کے پاس سامان نہیں ہے اس لیے یہ بظاہر مردہ ہے سامان ہونے پر یہ دیکھنے کے قابل ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

؎ نفس اژدہاست او کے مُردہ ست   از غم بے آلتے افسردہ ست

(نفس اژدہا ہے۔ وہ نہیں مرا۔ غم بے آلتی سے افسردہ ہو رہا ہے)

ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ دو چار روز ذکر و شغل کیا تہجد پڑھنے لگے سمجھنے لگے کہ ہم ولی کامل ہو گئے اور نفس پر اعتماد ہو جاتا ہے حالانکہ نفس خواہ کیسا ہی ہو جائے مگر اس سے بدگمان ہی رہنا چاہیئے جو خیال آوے اور جو عمل کرو پہلے سوچ لو اور غور کر لو کہ اس میں کوئی آمیزش نفس کی تو نہیں ہے۔ بعض اوقات خلوص کے رنگ میں نفس اپنی خواہش پوری کرتا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کو ذکر جہر تعلیم فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو خفی کی اجازت دیدیجیئے کیونکہ جہر میں ریا ہو جاتی ہے حضرت نے فرمایا۔ سبحان اللہ! اس میں تو ریا ہو گی اور ذکر خفی میں ریا نہ ہو گی جب آنکھیں بند کر کے بیٹھو گے اور لوگ سمجھیں گے کہ خدا جانے حضرت کہاں کی سیر میں ہیں۔ عرش کی یا کرسی کی اور ذکر جہر میں تو بجز اس کے کوئی بھی کچھ نہ سمجھے گا۔ کہ اللہ اللہ کر رہا ہے۔

سو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے سو ایک وسوسۂ نفس تو اس میں یہ ہوا کہ چھوٹی ریا کو چھوڑ کر بڑی ریا تجویز کی۔ اور دوسری شرارت نفس کی ذکر جہر نہ کرنے میں بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ نفس یہ سمجھتا ہے کہ اگر ذکر جہر شروع کیا تو اگر کسی روز آنکھ نہ کھلی تو بھانڈا پھوٹے گا اور فضیحتہ ہو گی۔ دوسروں کو معلوم ہو جائے گا کہ میاں رات نہیں اُٹھے اور خفی میں کسی کو راز کی خبر ہی نہ ہو گی۔ سب سمجھیں گے کہ خفی کیا کرتے ہیں آج بھی کیا ہو گا تو اس رُسوائی سے بچے رہیں گے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ نفس بھی مولوی ہے یعنی بڑے دور کے احتمالات

نکالتا ہے ہاں اگر مطیع ہو جاوے اور اس کی خواہش محض خیر ہی خیر ہو تو سبحان اللہ لیکن اعتماد کسی حالت میں نہ کرنا چاہیئے۔ اکثر اس کی تجویز میں کچھ نہ کچھ مکر ضرور ہوتا ہے۔

ایک بزرگ ایک حجرہ میں عزلت نشین تھے اور ذکر اللہ کیا کرتے تھے۔ اتفاقاً کفار و مسلمین میں مقابلہ پیش ہوا۔ ان بزرگ کے نفس میں خیال آیا کہ چلو جہاد کریں اور شہید ہوں گے پھر سوچا کہ یہ کیا بات ہے نفس نے یہ کیوں تجویز کیا ضرور اس میں کوئی کید خفی ہے بہت سوچنے سے معلوم ہوا کہ نفس نے اس میں اپنے لیے نجات سمجھ کر یہ بات تجویز کی تھی اور سوچا تھا کہ یہ شخص رات دن مجھ کو ستاتا ہے اور میرے سر پر ناگوار امور کے ہر وقت آرے چلاتا رہتا ہے اور طاعات میں ہر وقت مجھ کو گھونٹتا ہے اور کسی وقت چین لینے نہیں دیتا۔ شہید ہونے میں ایک دفعہ پاپ کٹ جاوے گا اور اس مصیبت سے نجات ہو جاوے گی جب یہ مکر معلوم ہوا تو انہوں نے نفس کو جواب دیا کہ میں تجھ کو اس مصیبت سے کبھی نجات نہ دونگا۔ میں تجھ کو یہاں حجرہ ہی میں شہید کروں گا۔

دینی رنگ میں دھوکہ

بعض لوگوں پر حج فرض نہیں ہوتا اور ان کو حج کی ہوس ہوتی ہے اس میں بھی نفس شیطان کی یہ تسویل ہوتی ہے کہ ایک نفل کی تحصیل میں بہت سے فرائض برباد ہوتے ہیں کیونکہ بہت لوگ حج کے سفر میں نمازیں چھوڑ بیٹھتے ہیں اور رفقاء سے جنگ و جدال اور سب و شتم میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعضے اس لیے حج کرتے ہیں کہ حاجی صاحب بن جائیں گے لوگ تعظیم سے پیش آئیں گے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے حضرت مسعود فرماتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید معشوق دراینجاست بیائید بیائید

یعنی اے قوم حج میں گئی ہوئی تم کہاں ہو تم کہاں معشوق تو یہاں ہے یہاں آؤ یہاں آؤ

یعنی محبوب حقیقی کی رضا تو حالات خاصہ میں وطن رہنے میں ہے اس لئے کہ حج تم پر فرض نہیں ہے اور حج نفل ادا کرنے میں بہت سے واجبات و فرائض ترک ہوتے ہیں ۔ غرض شیطان ہر شخص کو اسکے مذاق کے موافق دھوکا دیتا ہے۔

ترکِ تنخواہ کی خواہش

تھوڑے روز ہوئے کہ ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے ان کے نفس نے یہ تجویز کیا تھا کہ نوکری چھوڑ کر اللہ کے واسطے پڑھائیں اس لیے کہ تنخواہ لینے سے خلوص نہیں رہتا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے کہ شیطان نے دیکھا کہ دین کے کام میں لگے ہوتے ہیں ان سے یہ کام کسی تدبیر سے چھڑوانا چاہیئے تو اگر یہ کہتا کہ پڑھانا چھوڑ دو تو اس کی ہرگز نہ چلتی اسلئے اس کی وہ صورت تجویز کی جو دینداری کے رنگ میں ہے کہ اس میں خلوص نہیں ہے ۔ نوکری چھوڑ کر پڑھاؤ تو سمجھ لو کہ اب تو پابندی تنخواہ سے بھی کام ہو رہا ہے اور اگر نوکری چھوڑ دو گے تو پابندی تو ہو گی نہیں رفتہ رفتہ پڑھانا ہی چھوٹ جائے گا ۔ اور شیطان کامیاب ہو گا ۔ اور یہ جو تم کو وسوسہ ہے کہ ہم نے معاوضہ لے لیا ہے خلوص نہیں رہا ۔ تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم کو اب مثلاً صد ۲۵ ملتے ہیں سو بتلاؤ کہ اگر تم کو ۵۰ یا ۴۰ پر بلا دیں تو تم اس صورت موجودہ کو چھوڑ کر وہاں چلے جاؤ گے یا نہیں کہنے لگے کہ میں تو ہرگز نہ جاؤں گا ۔ میں نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا کہ تم روپیہ کے لیے نہیں پڑھاتے بلکہ اللہ کے واسطے پڑھاتے ہو اور روپیہ گذران کے لیے لیتے ہو دنیا تم کو مقصود نہیں ۔ بس خلوص نہ ہونے کا وسوسہ غلط ثابت ہوا اس لیے نوکری ہرگز مت چھوڑو بلکہ میری رائے تو یہ ہے اگر عالم امیر ہو اور تنخواہ ملنے لگے تب بھی اس کو چاہیئے کہ تنخواہ لے کر پڑھاتے اگر ایسا ہی امارت کا جوش اٹھے وہ تنخواہ پھر مدرسہ میں دیدے مگر لے ضرور تاکہ پابندی سے کام ہوتا رہے ۔ ہمارے فقہاء جزاہم اللہ خیرا نے لکھا ہے کہ اگر

قاضی امیر کبیر ہو تو اس کو بھی تنخواہ لینا چاہیئے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی قاضی تنخواہ نہ لے اور دس برس تک وہ قاضی رہا۔ اور اسکے بعد کوئی غریب قاضی ہو کر آیا تو اب تنخواہ کا اجراء مشکل ہو گا سبحان اللہ! فقہاء کا کیا فہم ہے یہ حضرات حقائق شناس تھے اس شان کا علم و فہم یہ اخلاص و تقویٰ کی برکت تھی مولانا فرماتے ہیں

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معین و اوستا

(انبیاء جیسے علوم بلا کتاب استاد اور معاون کے اپنے قلوب پر قابض پاؤ گے)

علم چوں بر دل زنی یارے بود علم چوں برتن زنی یارے بود

(علم جب قلب پر اثر کرے کہ خشیت اور خلوص پیدا ہو جائے تو وصول الی اللہ میں معین ہو گا اور اگر تن پر اثر ہو یعنی زبان پر تقریر رہی ہو یا اسکو تن پروری کا ذریعہ بنایا تو نیز بوجھ اور وبال ہے)

ان حضرات کے خلوص کی یہ کیفیت تھی کہ صاحب ہدایہ کی تصنیف تمام نہیں ہوئی روزہ برابر رکھتے تھے اور طرفہ یہ کہ کسی کو روزہ رکھنے کی خبر نہیں ہوئی۔ خدا جانے کتنے سال میں ہدایہ لکھا ہو گا برابر روزہ رکھنا اور کسی کو خبر نہ ہونا کس قدر اخلاص کی بات ہے مردانہ مکان میں بیٹھ کر لکھتے تھے لونڈی مکان سے کھانا لاتی تھی اور رکھ کر چلی جاتی۔ جب کوئی مسافر ناآشنا سامنے سے گذرتا اس کو وہ کھانا دیدیتے لیکن چونکہ اپنے مخصوصین سے پردہ نہیں ہوتا۔ اسلئے تحدث بالنعمت کے طور پر کبھی خاص سے یہ سب قصہ ذکر فرمایا ہو گا۔ اس لیے ہم تک منقول ہوا۔ اس خلوص کی برکت سے جن کو نور فہم عطا ہوا ہے یہ ان کی تحقیق ہے کہ تنخواہ لینے میں مصلحتیں ہیں ــــ پس نفس بعض اوقات ان مصلحتوں کے برباد کرنے کے لیے یہ رائے دیتا ہے کہ تنخواہ مت لو۔ غرض شیطان اور نفس ہر شخص کو اسی کے مذاق کے موافق بہکاتا ہے اور فقیہ اور محقق اسلیے شیطان پر گراں ہے کہ وہ اسکے مکائد سے واقف

ہوتا ہے اور ان کو مطلع کرتا ہے حدیث میں ہے۔

فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ ۔

(یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے)

ذوق شوق کی خواہش

ذاکر شاکر لوگوں کو اس طرح ابتلاء ہوائی میں گرفتار کرتا ہے کہ ان کو ذوق وشوق وجد وکیفیت ومحویت کا طالب بناتا ہے خوب یاد رکھو۔ مقصود ذکر سے قرب ہے اور جس عمل میں مجاہدہ زیادہ ہوگا اس میں زیادہ قرب ہوگا نفس اپنی جان بچانے کے لیے یہ حیلہ نکالا ہے کہ ذوق شوق کی تحصیل میں پڑ گیا۔ کیونکہ ذوق شوق ہونے سے پھر طاعت میں مشقت نہیں ہوتی ہاں ذوق شوق کا بھی ایک وقت ہے اس وقت مربی حقیقی خود عطا فرما دیں گے لیکن ابھی وقت نہیں آیا تو اس کی فکر فضول ہے کیونکہ تمہاری تجویز سے مربی حقیقی کی تجویز بہتر ہے مثلاً ایک مریض ہے اس کے لیے حکیم صاحب نے خمیرہ گاؤزبان جواہر والا چاندی سونے کے ورق میں لپیٹ کر تجویز کیا۔ اور ایک دوسرے مریض کے لیے املتاس لکھا اگر یہ دوسرا مریض کہنے لگے کہ حکیم صاحب بھی عجیب شخص ہیں اس کے واسطے مزیدار مفرح دوا تجویز کی اور میرے واسطے ایسی بدمزہ تو یہ احمق ہے یہ نہیں سمجھتا کہ اسکی اندر سے تو مادہ فاسد نکل چکا ہے اور املتاس کے پیالے پی چکا ہے اب اسکی لیے یہی مناسب ہے اور میرے اندر ہنوز مادہ فاسدہ موجود ہے وہ بغیر ایسی بدمزہ دواؤں کے نہ نکلے گا۔ اسکی لئے یہی مناسب ہے اس طرح مبتدی منتہی کی۔ جوکہ اپنی اصلاح کر چکا ہے حرص کرے اور اپنے کو اس پر قیاس کرے تو اس کی حماقت ہے عاشق کی تو یہ شان ہونا چاہیے کہ ہر حال میں راضی رہے جیسا فرمایا گیا ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش اگر ریش بینند وگر مرہمش

گدایانے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں)

دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بینند دم درکشید

(ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں)

حضرت سرمد فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار مے باید کرد

(سرمد شکایت کو مختصر کرو اور دو کاموں میں سے ایک کام کرو۔ یا تو تن کو محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وقف کردو یا محبوب سے قطع نظر کرو)

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ؛ دل بدست دگرے دادن و حیران بودن

(عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے یعنی محبوب کے قبضہ میں دیدینا اور حیران رہنا)

سوئے زلفش نظر کردن و رلیش دیدن ؛ گاہ کافر شدن وگاہ مسلمان بودن

(محبوب کی زلف یعنی تجلی کی طرف نظر کرنا کبھی فانی ہونا کبھی باقی ہونا۔)

اس شعر میں اسلام سے مراد بسط ہے اور کفران سے مراد قبض ہے۔ یعنی قبض و بسط دونوں کو جھیلے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون محبوب ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تین سال کامل قبض کی کیفیت رہی بارہا ارادہ فرمایا کہ پہاڑ سے نیچے گرادیں کیونکہ ؎

ذوقے چناں ندارد بے دوست زندگانی ؛ بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد
(بے دوست کے جینے کا کچھ مزہ نہیں بے دوست کے زندگانی بالکل بے مزہ ہے)
لیکن سنبھال لئے جاتے تھے پس اگر قبض علامت بُعد ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں ہوتا۔ جب علامت بعد نہیں پھر اس پر کاہے کو پریشان ہو امام غزالیؒ جب مدرسہ نظامیہ سے فارغ ہو کر نکلے ہیں تو بہت بڑے عالم ہوئے تین سو علما ان کے ساتھ چلتے تھے، ایک مدت تک اسی حالت میں رہے اسکے بعد خدا طلبی کا جوش ہوا اور دل میں آیا کہ سب چھوڑ کر خلوت اختیار کریں ایک مدت امروز و فردا میں رہے۔ آخر ایک بار سب ترک کر کے صحرا قدس میں جا کے معتکف ہو گئے اور مدت تک سخت مجاہدہ و ریاضت کی۔ اور دس برس تک ان پر قبض واقع رہا اور بجز پوست اور استخواں کے کچھ باقی نہ رہا۔ قریب المرگ ہو گئے بعض آس پاس کے رہنے والے ان کی حالت دیکھ کر کسی نصرانی ڈاکٹر کو لائے اور ان کی نبض دکھائی اس نے نبض دیکھ کر کہا کہ ان کو محبت کا مرض ہے اور محبت بھی مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی ہے جب تک ان کو وصل میسر نہ ہوگا شفا نہ ہوگی ؎

قَدْ لَسَعَتْ حَيَّةُ الْهَوٰى كَبِدِیْ ؛ فَلَا طَبِيْبٌ لَهَا وَلَا رَاقِیْ
اِلَّا الْحَبِيْبُ الَّذِیْ شَغَفْتُ بِهٖ ؛ فَعِنْدَهٗ رُقْيَتِیْ وَتِرْيَاقِیْ

(میرے جگر کو عشق کے سانپ نے کاٹ لیا ہے نہ اس کے لیے کوئی طبیب ہے، نہ جھاڑ پھونکنے والا بجز اس محبوب کے جس کی محبت نے میرے دل میں جگہ کر لی ہے اسی کے پاس میری جھاڑ پھونک اور میرے لیے تریاق ہے)

امام غزالی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے غرض مدتوں کے مجاہدہ و ریاضت کے بعد کامل ہوئے اور پھر بغداد میں آئے تو اور ہی شان سے آئے کہ علما و طلبا و صوفیہ

سب کے امراض روحانی بیان فرماتے تھے۔ اس پر بعض علماء دشمن ہوگئے اور کفر کا فتوے ان پر لگایا گیا۔ احیاء العلوم جلائی گئی۔

الحمدللہ! یہ سنت امام غزالی کی ہم کو بھی نصیب ہوئی کہ مجھ پر کفر کا فتوے بھی دیا گیا اور میری کتاب "بہشتی زیور" جلائی گئی۔ حاصل یہ کہ کسی کے لیے ذوق وشوق مصلحت ہے کسی کے لیے گھلنا اور پگھلنا ہی حکمت ہے۔ اس لیے ان خیالات کو چھوڑ کر کام میں لگنا چاہیئے۔

اقسام ہوی

غرض کہ مختلف طبقوں میں مختلف اقسام کی ہوی پائی جاتی ہے اور کلیات ان سب قسموں کی تین ہیں ایک ہوی متعلق علوم سے دوسرے متعلق اعمال کے تیسرے متعلق امور تکوینیہ کے علوم کے متعلق جو ہوی ہے اس کا نام بدعت ہے جس کی حقیقت غیر دین کو دین سمجھنا ہے اور بدعات بہت سی ہیں۔

بدعات شب برات

لیکن شب برات جو عنقریب آنے والی ہے اس کے متعلق کچھ بیان کیا جاتا ہے

شب برات میں دو قسم کی بدعتیں ہیں ایک علمی دوسری عملی۔ علمی یہ ہے کہ حلوہ پکانے کو ضروری یا مثل ضروری کے جانتے ہیں اور اس کے متعلق مختلف روایتیں گھڑی ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید ہوا تھا اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حلوا کھایا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ جب شہید ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حلوے پر ان کی فاتحہ دلائی تھی۔

حالانکہ یہ دونوں واقعے غزوہ اُحد کے ہیں اور وہ شوال میں ہوا ہے اور شب

برات شعبان میں ہوتی ہے تو یہ عقل کے بھی خلاف ہوا اور نقلاً بالکل بے اصل ہی ہے۔

بعضے کہتے ہیں کہ شب برات میں روحیں آتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ روحوں کو آنا یا تو مشاہدہ سے ثابت ہوگا اور یا وحی سے تو مشاہدہ تو ظاہر ہے کہ نہیں ہے رہ گئی وحی سو اس سے بھی کہیں ثابت نہیں بلکہ وحی تو اس پر دال ہے کہ روحیں یہاں نہیں آتیں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۝

حاصل یہ کہ روح اور اس عالم کے درمیان قیامت تک کے لئے ایک پردہ ہے جو اس کو اس طرف نہیں آنے دیتا۔ ہاں اگر خرق عادت کے طور پر بعض کو اجازت ہو جاوے تو وہ دوسری بات ہے۔

جیسے شہداء کو تو یہ آنا بطور کرامت کے ہوگا لیکن کرامت دائمی اور اختیاری نہیں ہوتی۔ اور وہ جو اختیاری ہوتا ہے اس کا نام تصرف ہے کیونکہ کرامت تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے کسی ولی کا کسی طور سے بذریعہ کسی خارق کے اعزاز ظاہر فرما دیں اسی لیے بعض مرتبہ صاحب کرامت کو بھی کرامت کی خبر تک نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی نے بادشاہ کو ان کے متعلق کچھ کہدیا۔ بادشاہ نے ان کو طلب کر کے اپنے سامنے بُلایا اور جو سوال اُن سے بادشاہ کرتا تھا۔ براہ جرأت وہی سوال وہ بزرگ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آخر میں بادشاہ نے کہا کوئی ہے ان بزرگ نے بھی فرمایا کہ کوئی ہے۔ اسی وقت ایک شیر غراتا ہوا ایک گوشہ سے نمودار ہوا بادشاہ اور سب لوگ بھاگ گئے سب کے ساتھ یہ بھی بھاگ گئے۔

جیسے جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ عصا کو ڈال دو اور ڈالنے سے اژدہا ہو گیا تو موسےٰ خود ڈر گئے اگر اختیاری فعل ہوتا تو خوف نہ کرتے غرض کہ کرامت

اختیاری اور دائمی نہیں ہوا کرتی اور تصرفات اختیاری روح کے لیے کسی دلیل سے ثابت نہیں اور بلادلیل اعتقاد جائز نہیں کہ خلاف ہے قال اللہ تعالیٰ

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ

[اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عملدرآمد مت کر]

بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی اس رات میں ایصال ثواب نہ کرے تو روحیں کوستی ہوئی جاتی ہیں۔ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ مُردہ کو ایصال ثواب کرنا یہ نفل ہے اور نفل کے چھوڑنے پر ملامت کرنا یا بددعا کرنا گناہ ہے اس عقیدہ سے تو لازم آتا ہے کہ مردہ بھی گناہ کرتا ہے۔ حالانکہ مرنے کے بعد انسان گناہ نہیں کرسکتا کیونکہ اس وقت تو کشف عطا ہو جاتا ہے غرض یہ سب امور بے اصل ہیں۔

مستحباتِ شبِ برات

شبِ برات میں صرف تین امر حدیث سے ثابت ہیں اوّل یہ کہ اس شب میں قبرستان میں جاکر اموات کے لیے دعا کریں اور اُن کو پڑھ کر بخشیں لیکن گروہ بن کر نہ جانا چاہیئے بلکہ کیف ما اتفق اپنے اپنے طور پر جاوے اور سنت میں اسی قدر منقول ہے مگر چونکہ اس کی غرض ایصال ثواب تھا مردہ کے لئے اس پر دوسرے طریق کو قیاس کرسکتے ہیں کہ عبادت مالیہ کا بھی کچھ ثواب پہنچا دیں۔ پس اگر کچھ کھانا وغیرہ بلاقید حلوے وغیرہ کے پکاکر ایصال ثواب کریں تو مضائقہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ پندرہ تاریخ کو روزہ رکھیں پس یہ سب امور منقول ہیں باقی سب خرافات ہیں۔

جس وقت میں یہ رسوم ایجاد ہوتی ہوں گی ممکن ہے کہ اس وقت کوئی مصلحت ہو۔ لیکن اب چونکہ ان کو ضروری سمجھنے لگے ہیں اسلیے اگر کوئی مصلحت بھی ہوتی تب بھی بوجہ مفسدہ کے اس مصلحت کا اعتبار نہ کیا جاتا جیسا فقہی قاعدہ ہے کہ امور غیر مقصودہ شرع میں دفع مفسدہ کے لیے مصلحت کو ترک کردیتے ہیں اس لیے اب وہ

واجب الترک ہیں۔

اور اگر وہ بزرگ جو اس کے موجد ہیں اب زندہ ہوتے تو یقیناً ان رسوم کو وہ خود بھی منع کرتے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے بعض عادات کو جو کسی مصلحت سے تھیں اور ضروریاتِ دین سے نہیں تھیں منع فرما دیا تھا جیسا عورتوں کا جماعات و مساجد میں آنا سو اگر ہم بھی پہلے بزرگوں کی ان رسوم کو روک دیں تو کیا حرج ہے۔

علماء کا یہی کام ہے کہ زمانہ کے رنگ اور ہوا کو دیکھتے ہیں زمانہ کے بدلنے سے اس قسم کے احکام نہ کہ تمام احکام ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ بقراط مطب کے نسخے اگر کوئی طبیب آج کل برتتے تو ہرگز نفع نہ ہوگا۔ بلکہ ضرر ہونے کا احتمال ہے۔ حاذق طبیب نسخہ وہ تجویز کرتا ہے کہ مریض کے مزاج اور اس وقت کی آب ہوا کی موافق ہو البتہ قواعد وہی ہیں جو متقدمین نے مدوّن کیے

ایجادِ مُلّاں

حاصل یہ کہ حلوٰی اور آتشبازی وغیرہ سب خرافات ہیں اسکے علاوہ ایک اور التزام کر رکھا ہے کہ اس روز مسور کی دال بھی ضرور پکتی ہے معلوم نہیں حلوے اور مسور کی دال کا کیا جوڑ ہے ایک مناسبت تو دونوں میں معلوم ہوتی ہے کہ حلوے اور مسور کی دال کے لیے (دو ضرب المثل ہم معنی بولے جاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے "حلوا خوردن را روئے باید (حلوا کھانے کے لئے منہ چاہیئے) اور یہ بھی ہماری زبان میں بولتے ہیں یہ منہ اور مسور[عہ] کی دال۔ اس کے سوا اور کوئی مناسبت تو سمجھ میں آتی نہیں۔

عہ لطیفہ میرے ایک دوست نے اسی مثل کی ایک عجیب اصل بیان کی کہ یہ اصل میں اسی طرح ہے یہ منہ اور منصور کی دار یعنی انا الحق کا ہر ایک کا منہ نہیں واللہ اعلم ۱۲ منہ

ایک اعتقاد بعض لوگوں کا شبِ برات کے متعلق یہ ہے کہ جو مردہ اس سال میں مرتا ہے وہ مردوں میں شامل نہیں ہوتا جب تک اس کو شب برات سے ایک روز پہلے حلوا دے کر مردوں میں شامل نہ کیا جاوے اس کا نام عرفہ رکھا ہے۔

ان تمام تر اعتقادات کے موجد یہ مسجد کے ملاں ہیں انہوں نے ایسی ایسی ایجاد کی ہیں جس میں آمدنی ہو ان ملانوں کی حرص اس قدر ہوتی ہے کہ ان کو جائز ناجائز کی بھی کچھ تمیز نہیں ہوتی۔ ان کی بدنیتی اور حرص پر ایک حکایت یاد آئی۔

ایک بھانڈ نے دوسرے سے پوچھا سب سے بہتر فرقہ کون ہے اور سب سے بدتر کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ سب سے بہتر فرقہ تو ہمارا ہے کہ ہمیشہ خوشی ہی مناتے ہیں کہ خدا کرے کسی کے یہاں شادی ہو اور ہماری پوچھ ہو اور سب سے بدتر فرقہ مسجد کے ملانوں کا ہے کہ ہمیشہ غمی مناتے ہیں کہ کوئی مرے تو ہم کو ملے

واقعی اس فرقہ کی یہی حالت ہے اگر کوئی موٹا سا آدمی بیمار ہوتا ہے اور ان ملانوں سے کہا جاوے کہ دعا کرو کہ اللہ تعالٰے اس کو صحت دے تو ہرگز دل سے دعا نہ کریں گے بلکہ دل سے یہ چاہیں گے کہ یہ مرے تو اچھا ہے تاکہ ہماری مونچھیں تر ہوں۔ یہ شب برات کا حلوہ اور محرم کا کھچڑا سب ان ہی اکالین کی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔

اسی لیے ایصال ثواب میں ایسی پخیں لگائی ہیں کہ بغیر ان کے کوئی کچھ کسی کو دے ہی نہ سکے مثلاً کھانا پانی سامنے رکھ کر پنج آیت وغیرہ پڑھنا کہ عوام تو خود پڑھنا نہیں جانتے لامحالہ ان ہی کو بلا دیں گے اور جب بلا دیں گے تو حصہ بھی ضرور ملے گا۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ جہاں بدعات سے منع کرنے میں لوگوں میں لوگوں کو وحشت ہو تو یوں کہنا چاہیے کہ تم سب کچھ کرو مگر ان ملانوں کو کچھ مت دو

اللہ کے واسطے فاتحہ دلوایا کرو پھر دیکھ لینا یہی لوگ بدعات کو منع کرنے لگیں گے کیونکہ ملنا ملانا تو کچھ رہے گا نہیں اور فاتحہ کے لیے جگہ جگہ سے گھسیٹے جاویں گے بدعات خود چھوٹ جاویں گی دوسری قسم ہوٰی کے متعلق اعمال کی ہے یعنی کوئی عمل کسی غرض فاسد مثلاً جاہ مال وغیرہ کے لیے کیا جائے جیسا کہ اوپر مفصل اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے۔

امور تکوینیہ میں رائے زنی

تیسری قسم ہوٰی کے متعلق احکام تکوینیہ کی ہے احکام کی دو قسمیں ہیں ایک احکام تکلیفیہ تشریعیہ جیسے روزہ نماز زکوٰۃ وغیرہا۔

دوسری قسم تکوینیہ احکام تکوینیہ احکام وہ ہیں جو قضا و قدر کے متعلق ہیں۔ مثلاً بارش ہونا یا نہ ہونا مفلس ہونا یا غنی ہونا وغیرہ وغیرہ اس کے متعلق جو ہوٰی ہے اس کا نام رائے ہونا مناسب ہے گو لفظ رائے عام ہے۔ مگر بہ نسبت بدعت وغیرہ کے یہ لفظ اس کے زیادہ مناسب ہے۔

غرض یہ کہ ان احکام میں بھی لوگ اپنی خواہش نفسانی کے موافق رائے لگاتے ہیں مثلاً آج کل بارش نہیں ہوئی ادب کی بات تو یہ ہے کہ دعا کریں۔ گناہوں سے استغفار کریں یہ تو ہوتا نہیں بلکہ رائے لگایا کرتے ہیں کہ صاحب اگر ساون اتر گیا تو بس کھیتی گئی ان سے کوئی پوچھے یہ مشورہ کس کو سناتے ہو ہم کو سنانا تو بیکار ہے کوئی نفع نہیں اس لیے کہ ہمارے قبضہ کی تو بات نہیں۔ اور خدا تعالٰی عالم الغیب والشہادۃ ہیں ان کو ہر امر کی اطلاع ہے ان کو بھی سنانا مقصود نہیں تو بس یہ محض اعتراض ہوا اور خدائے تعالٰی کو رائے دی کہ بارش ہونا چاہیئے اللہ اکبر کیسی سخت بے ادبی اور گستاخی ہے۔

حق تعالٰی کی حاکمیت اور حکومت کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر ان کا اذن نہ ہوتا ان کے

سامنے درخواست کے طور پر زبان ہلانا بھی روا نہ ہوتا اور دعا نہ کرنے کی بھی ... اجازت نہ ہوتی چہ جائیکہ اعتراض کرنا اور رائے مشورہ دینا ان کی تو یہ شان ہے۔

ے ہست سلطانی مسلم مر ورا نیست کس را زہرۂ چون وچرا
(بادشاہی اسی کی مسلم ہے کسی شخص کو چون چرا کی طاقت نہیں ہے)

خود فرماتے ہیں۔

قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا۔

"یعنی آپ فرما دیجئے کہ کون اختیار رکھتا ہے خدائے تعالیٰ کے سامنے کچھ بھی اگر وہ مسیح بن مریم اور ان کی والدہ اور تمام دنیا بھر والوں کو ہلاک کرنا چاہیں اور آسمانوں اور زمین کی اور ان کی درمیانی چیزوں کی سلطنت خدا ہی کے لیے ہے۔"

اور بعضے ایسے بیباک ہوتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جوان مر جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اسکی عمر تو مرنے کی نہ تھی کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو اچھا تھا۔ دوسرے صاحب آتے ہیں وہ کہتے ہیں ----- ارے میاں! خدا کے سامنے کس کی مجال ہے کہ کچھ بولے یہ بات فی نفسہ تو سچی ہے۔ مگر مطلب ان جہلا کا تو اسکے یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا مرنا ہے تو بے موقع لیکن نعوذ باللہ اگر خدائے تعالیٰ بے موقع کام ہی کرے تو اس کے سامنے کون دم مار سکتا ہے گویا نعوذ باللہ حق تعالیٰ کے یہاں بڑی بے انتظامی ہے مصلحت پر نظر نہیں ہے اسکے مرنے کے دن نہ تھے اس کو موت دیدی۔ یاد رکھو کہ یہ نہایت ہی بے ادبی اور گستاخی ہے حق تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں وہی مصلحت اور حکمت ہے ع

ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود
(جو کچھ بادشاہ حقیقی کرتے ہیں وہی بہتر ہے)

ایک بزرگ ایک جنگل میں خلوت گزیں تھے ایک روز بارش ہوئی وہ کہنے لگے کہ سبحان اللہ آج کیا موقع پر بارش ہوئی غیب سے آواز آئی او ! بے ادب ! اور بے موقع کس روز ہوئی تھی۔ دیکھئے بزرگوں کو ایسی مدح پر بھی جس میں ابہام بعید گستاخی اور بے ادبی کا ہو ڈانٹا جاتا ہے ؎

مقربان را بیش بود حیرانی

(مقربین کو حیرانی بہت ہوتی ہے)

مگر ہم لوگ تو شب روز کھلم کھلا بے ادبیاں ہی کر رہے ہیں۔۔۔۔ غرض حکمت اور حکمت کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم کو دعا کی بھی اجازت نہ ہوتی ۔مگر ہمارے ضعف کو دیکھ کر دعا کی اجازت دی یہ غایت رحمت ہے اور پھر اس اجازت اسکی طور سے تکمیل فرمائی کہ ہم کو مغیبات کی خبر نہیں کی ورنہ اگر خبر ہو جاتی تو ہرگز دعا نہ کر سکتے کہ ایک گونہ صورت مزاحمت کی تھی قدر کے ساتھ مثلاً اگر مکشوف ہو جاتا کہ بارش فلاں دن تک نہ ہوگی اور بعد میں ہوگی تو دعا کیسے کرتے اور جب دعا نہ کرتے تو حق تعالٰی کی ایک خاص ہمکلامی کی لذت سے محروم رہتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ احکام تکوینیہ کا مکشوف نہ ہونا بھی رحمت ہے البتہ احکام تکلیفیہ میں مکشوف ہونا اور معلوم ہونا ہی رحمت ہے۔

حاصل یہ کہ بڑی رحمت ہے کہ ہم کو دعا کی اجازت مل گئی حکام مجازی سے بات کرنے میں لوگ سینکڑوں روپیہ خرچ کر ڈالتے ہیں اور محبوبانِ مجازی سے دو باتیں کرنے کے لیے سب کچھ دے بیٹھتے ہیں اور پھر بھی کامیاب نہیں ہوتے اور احکم الحاکمین اور محبوب حقیقی کے یہاں نہ فیس ہے نہ کسی زبان کی قید ہے نہ وقت کی قید ہے۔ نزدیک دور، اندھیرے اجالے جس وقت چاہو ہمکلام ہو اور دعا کر دو اس سے زیادہ کیا رحمت ہوگی پھر حکام مجازی اور محبوبانِ مجاز زیادہ بولنے

سے ناخوش ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں کیوں جان کھائی ہے۔ اور حاکم حقیقی درخواست اور دعا نہ کرنے سے ناخوش ہوتے ہیں اور جو زیادہ دعا کرے اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے

إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُلِحِّيْنَ فِي الدُّعَاءِ

(بے شک اللہ تعالیٰ دعا میں اصرار کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں)

پس دعا بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی میسر ہوتی ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

از دعا نبود مرادِ عاشقاں ۔۔۔ جز سخن گفتن بآں شیریں زباں

(عاشقوں کی دعا سے مراد محبوب حقیقی کی ہمکلامی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی)

حاصل یہ کہ اتباعِ ہوٰے کی تین قسمیں ہوئیں بدعت جو متعلق علوم اور عقائد کے ہے دوسری معصیت جو متعلق اعمال کے ہے۔ تیسری قسم رائے جو احکام تکوینیہ کے متعلق ہے۔

خاصیت ہوٰی

اور ہر ہوٰے میں یہ خاصیت ہے کہ راہ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے لقولہ تعالیٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ (سو اللہ کے راستہ سے تجھ کو گمراہ کر دیتی ہے) جو ہوٰی اعلیٰ درجہ ہے یعنی کفر و شرک وہ تو اسلام ہی سے خارج کر دیتی ہے اور جو ادنیٰ درجہ کی وہ کمال اتباع سے ڈگمگا دیتی ہے۔ تو يُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ (اللہ کے راستہ سے تم کو گمراہ کر دیتی ہے) دونوں کو شامل ہے کیونکہ ضلال کے مراتب مختلف ہیں مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

با ہواؤ آرزو کم باش دوست ۔۔۔ چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست ۔۔۔ چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

تازہ کن ایماں نہ از گفت زباں ۔۔۔ اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں

(یعنی آرزو اور ہوائے نفسانی کے پیرو مت بن۔ چونکہ اس کی یہ حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے بہکا دیتی ہے جب تک خواہش نفسانی کے تابع ہے تیرا ایمان تازہ نہیں ہے۔ مانند ہوا کے ... نے قفل کے اس کا دروازہ نہیں ہے ایمان کو صدق دل سے تازہ کر و صرف بار بار سے کہنا کافی نہیں تم نے تو باطن میں ہوائے نفسانی کو تازہ کر رکھا ہے)

اب یہ بات رہ گئی کہ اس کا علاج کیا ہے سو علاج اس کا منصوص میں تو ترک ہویٰ ہے اور غیر منصوص اتباع ان حضرات کا ہے۔ جنہوں نے اپنے کو فنا کر دیا مولانا اشعار مذکورہ کے بعد فرماتے ہیں ؎

دیں ہوا را بشکند اندر جہاں ہیچ چیزے ہمچو سایہ ہمرہاں

(دین ہی ہوائے نفسانی کو شکست کر دیتا ہے اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں توڑ سکتی)

یار باید راہ را تنہا مرو بے رفیقے اندریں صحرا مرو

(راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہیئے اس میں تنہا قدم مت رکھو بلا مرشد کے اس عشق کی وادی میں مت چلو)

وصول بے اتباع

یہاں شبہ ہو سکتا تھا کہ بے اتباع بھی تو بعضے بزرگ واصل ہوتے ہیں مولانا اس کا جواب دیتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادریں رہ را برید ہم بعونِ ہمت مرداں رسید

(اتفاقاً جس شخص نے اس راہ سلوک اکیلے خود طے کیا وہ بھی مردانِ خدا کی توجہ سے طے کیا ہے)

اس میں اس شبہ کے دو جواب دیئے ایک تو یہ کہ بے اتباع کے پہنچنا نادر ہے اور نادر پر حکم کرنا اور اس کو قاعدہ بنانا اور اس کے بھروسہ رہنا قبیح

نہیں۔ فرض کرو کوئی شخص مفلس ہو نہ اس کو کھانے کو ملتا ہے نہ پینے کو میسر ہوتا ہو۔ اور اہل و عیال رکھتا ہو نہایت دق ہو کر خودکشی کرنے کا ارادہ کرے اور اس کے لیے کنواں کھودے کہ اس میں ڈوب کر مر رہوں گا یا زندہ درگور دفن ہوں گا وہ کھود ہی رہا تھا کہ وہاں سے ایک ہنڈیا اشرفیوں سے بالب نکل آئی۔ اب اس طرح ہنڈیا نکلنا ایک اتفاقی بات ہے۔ اس پر کوئی قیاس کر کے چاہے کہ میں بھی کنواں کھود کر ہنڈیا نکال لوں یہ محض اس کا خیال خام ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی اتفاقاً بے اتباع شیوخ واصل ہوگیا تو اس پر اپنے کو قیاس کر لینا اور اس کو قانون بنا لینا بڑی غلطی ہوگی۔ دوسرا جواب یہ دیا کہ اے معترض تجھ کو دھوکا ہوا ہے جن کو تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ بغیر اتباع کے پہنچے ہیں وہ بھی بغیر واسطے مردانِ خدا کے نہیں پہنچے

اقسام فیوض

اس لیے کہ مردانِ خدا کے فیوض دو قسم کے ہیں۔ ایک بلا اطلاع اور بے طلب طالب کے اور دوسرے طلب سے اور اتباع سے اور جو بلا اطلاع اور بے طلب طالب کے فیوض ہوتے ہیں انکی بھی دو قسم ہیں ایک وہ جو باختیار ان حضرات کے ہو جیسے دعا کرنا اور توجہ ہمت لوگوں کے حال پر مبذول کرنا دوسرے وہ جو بلا اختیار اور بلا اطلاع ان حضرات کے ہو صرف ان کے وجود با جود سے وہ فیض بلا ان کے اختیار سے ہر ایک کو پہنچتا ہے اسکی ایسی مثال ہے جیسے آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو جہاں جہاں اس کی شعاعیں پہنچتی ہیں سب کو نفع پہنچتا ہے مگر شمس کو اطلاع بھی نہیں ہوتی۔ پس جن کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بلا اتباع پہنچے ہیں تو یہ محض غلط خیال ہے وہ بھی مردانِ خدا کے فیض باطنی اختیاری سے جیسے دعا و ہمت یا جبراً اختیاری سے واصل ہوئے اور اس قسم کا فیض بڑوں سے ہوتا ہی ہے۔ بعض اوقات چھوٹوں سے بھی ہوتا ہے امت محمدیہ کا عجیب حال ہے ان میں ہر ایک سے فیض ہوتا ہے۔ اور یہ اس واسطے ہے تاکہ بڑوں کو کبر نہ ہو چھوٹوں کے محتاج نہیں ہے ان کا حال تو

وہ ہے کہ کسی عورت کے کئی بیٹے تھے اس سے پوچھا تھا کہ ان میں کون افضل ہے اس نے کہا کہ ہم گا اَلْحَلْقَۃِ الْمُفْرَغَۃِ لَا یُدْرٰی اَیْنَ طَرَفَاھَا (مثل حلقہ مفرغہ کے کہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں اس کی طرف)

کسی میں کوئی بات کم ہے تو دوسری بات زیادہ ہے جیسے آئینہ ایک سُرخ ہو ایک زرد ہو ایک سبز ہو اور سب ایک دوسرے کے مقابل رکھے ہوں تو ہر ایک کا عکس دوسرے میں پڑتا ہو۔ ایسی ہی حالت اس اُمت مرحومہ کی ہے اور جماعت کے نماز میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ایک کو دوسرے سے نفع پہنچے اور نیز جماعت میں کوئی تو مقبول ہوگا۔ اس کی وجہ سے کیا عجب ہے سب کی نماز مقبول ہوجاوے بعض برکات ایسے شخص سے پہنچتی ہیں جس پر گمان بھی نہیں ہوتا۔

ایک شخص رہزنی کا پیشہ کیا کرتا تھا حق تعالیٰ نے اس کو ہدایت فرمائی وہ ایک بزرگ سے بیعت ہوگئے اور اُن کے حلقۂ خدام میں شامل ہو کر ذکر و شغل میں مشغول ہوگئے۔ سب لوگ ان کو رہزنی کی وجہ سے حقیر سمجھا کرتے تھے ایک روز ایک شخص نے ان بزرگ کی مع سب مریدین کے دعوت کی۔ جب اس شخص کے مکان پر سب چلے تو سب کے اوپر ایک ابر نے سایہ کرلیا اور آفتاب کی تمازت سے بچ گئے۔ پیر یہ سمجھے کہ یہ میری برکت کا فیض ہے اور بھی بڑے بڑے خلفا ومرید تھے وہ اپنی کرامت سمجھے اور اس راہزن کو تو خیال تک بھی نہ تھا۔ اسلیے کہ جانتا تھا میں سیہ کار گنہگار ہوں۔ جب وہاں سے دعوت کھا کر واپس ہوئے تو وہ ابر پھر بھی موجود تھا سب سے پیچھے اس راہزن کا راستہ پھٹا اور یہ ان سے الگ ہو کر اپنے راستہ پر ہُوا۔ اس وقت وہ ابر ان کے ساتھ چلا اور پیر صاحب مع دیگر مریدین سب دھوپ میں رہ گئے تب سب کو

معلوم ہوا کہ یہ ان کی برکت تھی حق تعالیٰ کو اس کی تواضع اور عجز پسند آیا اس سے یہ برکت ہوئی۔

حضرت حاجی صاحب قبلہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں ہم اس نیت سے بیعت کر لیتے ہیں کہ وہ زور ہو گا تو ہم کو لے جاویگا اور ہم زور ہوں گے تو اس کو لے جاویں گے۔ سے

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف ۔۔۔ گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(قسمت اگر یاوری کرے تو کسی طرح اس کا دامن ہاتھ میں آجائے پھر اگر وہ مجھے کھینچ لے تو نہایت خوشی اور اگر میں اسے کھینچ لوں تو نہایت عزت) ۔ ۔ ۔

جو مشائخ اہلِ ادراک ہیں وہ رات دن دیکھتے ہیں کہ مریدین سے ان کو کیا کیا فیض ہوتے ہیں لیکن ان سے کہتے اس لیے نہیں کہ کہیں ان کا دماغ نہ بگڑ جائے اور عجب کبر کی بلا میں مبتلا نہ ہو جاویں۔ غرض یہ کہ جب چھوٹوں سے فیوض پہنچتے ہیں تو اپنے اکابر سے استغنا کرنے کی گنجائش نہیں اس لیے کسی اہل اللہ کا اتباع کرنا یہ علاج اعظم ہے اتباع ہوائے کا خلاصہ یہ کہ اتباع شریعت اور اہل اللہ کے پاس رہنا اور ان کا اتباع اختیار کرنا اس سے انشاء اللہ ہوائے نفسانی سے نجات ہو جاوے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب:۔

معروضہ قارئین سے التجا ہے کہ دعا فرماویں کہ ناشر کی کوشش و غیرہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں اور مقبولانِ حق کے ساتھ محشور فرماویں اور تمام زندگی بعافیت پوری فرماویں آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم:۔

الہوٰی والہدٰی

۲۵ رجب المرجب ۱۳۳۶ھ الہ آباد - خانۂ مسجد عبداللہ والی میں "ھوٰی اور ھُدٰی" کے موضوع پر پونے تین گھنٹہ تک بیان فرمایا۔ حضرت والا کرسی پر تشریف رکھتے تھے۔ سامعین کی تعداد تقریباً دو ہزار ۲۰۰۰ تھی۔
حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم نے یہ وعظ قلم بند فرمایا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحبہ وبارک وسلم

اما بعد ــــــــــــــــ

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

ومن اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ ان اللہ لا یھدی القوم الظٰلمین ٥

تمہید یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس میں حق تعالیٰ نے ہمارا ایک ایسا مرض ذکر کیا ہے جو قریب قریب اکثر طبائع میں عام ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے مدارج مختلف ہیں جیسے کسی خاص قسم کے بخار کو ایک عرض مشترک ہے مگر اسکے مدارج مختلف ہیں کسی کا بخار تیز ہے ۔ اور کسی کا ہلکا ہے لیکن نفس بخار ایک جماعت میں مشترک ہے پھر امراض جسمانی میں ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کسی کو خفیف مرض ہو تو عقلاء کے نزدیک اس کی خفت کی طرف نظر نہیں کی جاتی اور یہ خیال نہیں کر لیا جاتا کہ یہ تو خفیف سا مرض ہے اس کا معالجہ نہ کیا جاوے بلکہ وجود

خفیف ہونے کے اس کے علاج سے بے فکری نہیں ہوتی اور اُس کے حالی ضرر کے علاوہ اس کے مآلی شدید ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے مگر امراض روحانی کے باب میں علاوہ اس کے جسمانی امراض کی طرح اس کا اہتمام نہیں۔

استخفافِ معصیت

ایک مرض اور بھی ہے وہ یہ کہ اُس میں یہ تفتیش ہوتی ہے کہ یہ بڑا مرض ہے یا خفیف۔ چنانچہ عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیوں صاحب کیا یہ بڑا گناہ ہے یا چھوٹا ـــــ میں پوچھتا ہوں کہ اس سوال سے مقصود بجز اس کے اور کیا ہے کہ اگر بڑا گناہ ہوگا تو اس سے بچیں گے ورنہ نہیں۔

مگر اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص آپکے پاس آکر یوں کہے بھائی میں تمہارے چھپر میں آگ لگاؤں گا مگر چھوٹی سی چنگاری رکھوں گا۔ بڑا سا انگارہ نہ رکھوں گا تو اس کو سُنکر ہرگز آپکو بے فکری نہ ہوگی اور آپ اُس سے یوں نہ کہیں گے کہ ہاں جی چھوٹی سی چنگاری کا کیا مضائقہ ہے رکھ بھی دو۔ بلکہ یہ سنکر فوراً اس کی مزاحمت کرو گے روکو گے اور احتجاج کرو گے کہ یہ اپنے خوب کہی کہ بڑا انگارہ نہ رکھوں گا۔ آپنے یہ نہ سمجھا کہ چھوٹی چنگاری بھی بجھنے سے پہلے بڑی بن جاتی ہے۔ دوسرے چھوٹی چنگاری گو جثتاً چھوٹی ہے مگر نوعیت تو مشترک ہی ہے جو کام بڑا انگارہ کرتا ہے وہی یہ کر سکتی ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ بڑا انگارہ جلد کام کرتا ہے اور چھوٹی چنگاری ذرا دیر میں کام کرتی ہے مگر دونوں کا اثر تو یکساں ہے اس لیے یہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اُس کے چھوٹا ہونے سے کیا کچھ بے فکری ہو سکتی ہے۔ حالانکہ دونوں میں فرق بھی ہے مگر یہ فرق ظاہری مضرات میں معتدبہ شمار نہیں ہوتا۔ مگر حیرت ہے کہ مضرات باطنی میں اس چھوٹے بڑے فرق کو معتبر اور مؤثر سمجھا جاتا ہے وجہ صرف اسکی یہ ہے کہ مضرت باطنی کو لوگ مضرت ہی نہیں سمجھتے اگر مضرت سمجھتے تو گناہ کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی تحقیق کیوں کی جاتی۔ البتہ تحقیق علمی کا مضائقہ نہیں

جس کے مقصود صرف فرق مراتب اور درجات عمل کا معلوم کرنا ہوتا ہے۔ مگر یہ حق صرف اہل علم کو ہے عوام کو اس تحقیق کا حق نہیں نہ اُن کو اس تحقیق سے کچھ فائدہ کیونکہ جب ان کو اعمال مباحہ و مامور بہا کے درجات معلوم نہیں نہ اُن کے ذمہ لازم تو وہ گناہوں کے درجات معلوم کر کے کیا لیں گے اُن کی غرض اس سوال سے بجز اس کے کچھ نہیں کہ اگر بڑا گناہ ہو تو نہ کریں اور چھوٹا ہو تو اس کی جرأت کر لیں۔

سو اس غرض سے یہ سوال سراسر ناجائز اور نہایت مضر سوال ہے مگر دیکھا جاتا ہے کہ آج کل عموماً اس قسم کے سوالات علماء سے کئے جاتے ہیں جو علامت ہے گناہوں کے ہلکا سمجھنے کی اسی لیے میں کہتا ہوں کہ امراض روحانی میں تو لوگوں کی یہ عادت ہو گئی ہے اور امراض جسمانی میں خفیف مرض کی بھی زیادہ فکر کرتے ہیں اُن کو ہلکا نہیں سمجھتے مثلاً خفیف بخار میں یوں سمجھتے ہیں کہ بخار کا جسم میں رُکا ہوا ہونا بہت بُرا ہے۔ یہ جو تھوڑا تھوڑا بخار رہتا ہے۔ بعض اوقات تیز بخار سے بھی زیادہ فکر کی بات ہے۔

غرض امراض جسمانی میں قلیل و کثیر دونوں سے یکساں خطرہ اور خوف ہوتا ہے اس قاعدہ کا مقتضا تو یہ تھا کہ امراض روحانی میں بھی شدید اور خفیف معصیت سے دونوں قسم کی معصیت سے یکساں خوف ہوتا مگر اس میں اس کے خلاف دیکھا جاتا ہے وہ یہ کہ جو معصیت شدید ہوتی ہے اس کو تو معصیت سمجھتے ہیں مثلاً زنا کو گناہ بھی سمجھتے ہیں اُسکو طبعاً یا عرفاً عیب بھی سمجھتے ہیں۔ اُس کا ارتکاب بھی اکثر مسلمان نہیں کرتے اور کبھی غلطی سے زنا سرزد ہو جائے تو بہت پریشان اور پشیمان ہوتے ہیں بخلاف غیبت کے کہ اُسکو خفیف سمجھا جاتا ہے اور خفیف سمجھ کر اس کا ارتکاب بھی کر لیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ علماء اور مشائخ بھی اس سے خالی نہیں۔ بلکہ عوام الناس تو اس کو بُرا سمجھ کر کرتے ہیں اور ہم کچھ تاویل کر کے اچھا سمجھ کر کرتے ہیں۔ نیز عوام الناس تو اُن لوگوں کی غیبت کرتے ہیں جو اکثر ذنوب و عیوب میں مبتلا بھی ہیں گو ان کی غیبت بھی حلال نہیں اور

ہم لوگ جو اہلِ علم اور اہلِ ارشاد کہلاتے ہیں ہماری یہ کیفیت ہے کہ ہم غیبت کے لیے بھی علماء وصلحاء کو منتخب کرتے ہیں اگر مولوی صاحب غیبت کریں گے تو کسی مولانا ہی کی کریں گے۔ اور پیر صاحب غیبت کریں گے تو پیر ہی صاحب کی کریں گے۔

رہی یہ بات کہ ان کو عوام اور جہلاء سے تعرض کیوں نہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ان کے مال وجاہ میں شریک نہیں ہیں اور اہل علم وصلاح ان کے مال وجاہ میں شریک ہیں ان کا وہم یہ ہے کہ دوسرے علماء ومشائخ ہمارے جاہ ومال میں شریک ہوجاویں گے تو ان کی وجہ سے ہماری جاہ ومال میں کمی آجائیگی اس لیے انکو غیبت کے لیے خاص کیا جاتا ہے۔ غرض اس گناہ میں مشائخ تک بھی مبتلا ہیں اور وجہ وہی ہے کہ اس کو خفیف سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ غضب یہ ہے کہ ایک گونہ عبادت قرار دیجاتی ہے یعنی یوں کہا جاتا ہے کہ ہم دوسرے علماء ومشائخ کی اسلیئے غیبت کرتے ہیں۔ اور اُن کے عیوب کو اس لیے ظاہر کرتے ہیں تاکہ اللہ کے بندے ان کے اثر اور ضرر سے محفوظ رہیں۔ وہ لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اسلیئے لوگوں کو ان کے عیوب فتن سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔

غرض یہ کہ ہم غیبت بھی کرتے ہیں پھر اُس کو عبادت قرار دیکر کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کی یہ حالت عوام سے بھی بدتر ہے بہر حال اس کی بناء کیا ہے بناء وہی ہے کہ اس کو خفیف سمجھا جاتا ہے اسی لیے بے دھڑک اس کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور محققین نے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ جس گناہ کو خفیف سمجھا جائے وہ گناہ کبیرہ سے بھی اشد ہے کیونکہ اُس سے توبہ بھی نہیں کی جاتی۔ اسکی توبہ کی توفیق ہونا بھی مشکل ہے۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ایسا گناہ زیادہ قابل اہتمام کے ہے اور عجب نہیں کہ یہی مبنیٰ ہو اس حدیث کا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الغیبۃ اَشَدُّ

من الزنا - کہ غیبت زنا سے بھی اشد ہے۔ حالانکہ ظاہراً مفسدہ اور تشنیع زنا کا زیادہ ہے مگر پھر بھی آپ غیبت کو اشد فرما رہے ہیں۔ اس میں بہت سے اسرار ہیں منجملہ ان کے ایک یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ زنا جو شخص کرتا ہے وہ اس کو برا بھی سمجھتا ہے اور غیبت کو اکثر حالات میں برا نہیں سمجھا جاتا۔ اور ظاہر ہے کہ جس گناہ کے ساتھ استخفاف کیا جاوے وہ اس گناہ سے اشد ہے جس کے ساتھ استخفاف نہ کیا جاوے کیونکہ اس سے توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اور اگر اس دلیل یعنی عدم توفیق توبہ سے بھی اس کی اشدیت کو مستنبط نہ کیا جاوے۔

تاہم قاعدہ شرعیہ یہی ہے کہ جس گناہ کو خفیف سمجھا جائے وہ شدید ہو جاتا ہے خواہ وجہ اس کی کچھ ہی ہو اس لیے بہت زیادہ ضروری تھا کہ اس سے بہت احتیاط کی جاتی۔ مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ تفاوت درجہ کی وجہ سے بعض گناہوں کو خفیف سمجھ کر بے دھڑک انکا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ حالانکہ مقتضائے عقل تو یہ تھا کہ جتنا خفیف مرض ہو تساہل کے خوف سے اُس سے زیادہ احتراز ہوتا۔ جیسا کہ امراض جسمانی میں کیا جاتا ہے۔ مگر یہاں ثقیل گناہ سے تو کچھ رکاوٹ ہوتی بھی ہے۔ مگر خفیف سے بالکل نہیں۔

پس سمجھ لیجئے کہ درجہ کا تفاوت سبب جرأت نہ ہونا چاہیئے کہ یہ تو صغیرہ گناہ ہے اور یہ بات تو مکروہ ہے اسکو کر لیا جاوے اور یہ کبیرہ ہے اس کو نہ کرنا چاہیئے ہر چند کہ گناہوں میں درجہ کا تفاوت ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اسکی اجازت ہے اور اسکی اجازت نہیں۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ جب درجہ متعین ہو جائیگا تو اس سے یہ معلوم ہوگا کہ کبیرہ کی سمیت شدید ہے اس کا تدارک بہتم بالشان تدابیر سے ہونا چاہیئے اور اس کے لئے زیادہ اہتمام کی ضرورت ہے اور یہ معلوم ہو جائے کہ جو گناہ خفیف ہیں ان کی تدابیر آسان ہیں اس وجہ سے تحقیق تفاوت درجہ کی کیجاتی ہے نہ اس

وجہ کہ اسکو کیا جاوے اور اس کو نہ کیا جاوے۔

خلاصہ یہ ہے کہ منجملہ اور امراض کے ہمارے اندر ایک بدیہی مرض ہے کہ خفیف سمجھ کر بعض گناہوں سے بچنے کا اہتمام بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔

مذمت اتباع ہوی

اسی مرض کو حق تعالیٰ ایک خاص عنوان سے جس سے اس مرض کا منشا بھی معلوم ہو جاویگا۔ اس جگہ بیان فرماتے ہیں چنانچہ وہ مضمون اور اس کا منشا ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گا سو ارشاد ہے ومن اضل ممن اتبع هواه بغير هدى من الله یعنی کون زیادہ گمراہ ہے اس شخص سے جس نے اتباع کیا اپنی خواہش کا بدون اس کے کہ اُس کے متعلق اللہ تعالےٰ کی کوئی ہدایت یعنی دلیل شرعی ہو یعنی بغیر ہدایت اور دلیل شرعی کے اُس نے اتباع کیا اپنی خواہش نفسانی کا۔ ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ حق تعالیٰ کس بات کی مذمّت فرما رہے ہیں۔ اور بیذرا توجہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ واقعی ہم لوگوں میں یہ مرض عام ہے یا نہیں۔ سو حق تعالیٰ مذمت فرماتے ہیں خواہش نفسانی کی کہ جس چیز کو جی چاہا کر لیا۔ اور ظاہر ہے کہ خواہش نفسانی کا جب ایسا اتباع ہو گا گناہ اس کی نگاہ میں ثقیل اور عظیم نہ ہو گا بلکہ خفیف اور سرسری ہو گا اس سے دونوں باتیں معلوم ہو گئیں مرض بھی یعنی استخفاف معاصی اور اس کا منشا بھی یعنی اتباع ہوائے اور اس کا مرض عام ہونا بھی ظاہر ہے۔

چنانچہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری حالت یہی ہے کہ جو جی میں آیا کر لیا پس ہمارے یہاں مرجح محض اتباع ہوی ہے خواہ فعل ہو یا ترک فعل دونوں میں مرجح یہی ہے اور کچھ نہیں۔ اور مرجح کا اشتراط ظاہر ہے کیونکہ یہ مسئلہ مسلم ہے کہ القدرة تتعلق بالضدين یعنی قدرت کا تعلق ضدین کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ضد پر تو قدرت ہو دوسری پر نہ ہو

مثلاً کوئی شخص نماز پڑھنے پر قادر ہے تو اس کے ترک پر بھی ضرور قادر ہوگا۔ افعال مقدورہ میں دونوں جانبوں یعنی فعل و ترک پر قدرت ہوتی ہے اور ایک وجہ کو دوسری جانب پر ترجیح کسی خاص وجہ کر دی جاتی ہے۔

غرض فعل ہو یا ترک فعل ہر ایک کے لئے مرجح ہونا چاہیئے یعنی کوئی ایسا داعی ہونا چاہیئے جس کی وجہ سے انسان اپنی قوت ارادیہ کو ایک جانب کی طرف منصرف کرے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے افعال یا تروک میں وہ داعی کون ہے۔ عقلاً دو حال سے خالی نہیں یا داعی مذموم ہے اور وہ ہوٰی ہے یا داعی محمود ہے اور وہ ہدیٰ ہے۔ یہی دونوں چیزیں اس آیت میں بھی مذکور ہیں اور دونوں کے لفظ ہم قافیہ بھی ہیں۔ پس سے داعی بننے کے قابل یہی دو چیزیں ہیں مگر بندہ کی شان اتباع ہدیٰ ہونا چاہیئے یعنی حق تعالٰے کی اجازت اور شریعت کی دلیل سے ایک جانب کو ترجیح دینا چاہئیے۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے اتباع ہویٰ کو مرجح بنا رکھا ہے پس اس آیت میں اسی بات کی مذمت کی ہے کہ ہوٰی کو ہدیٰ پر ترجیح دیجاتی ہے۔ اب ہم لوگوں کو چاہیئے کہ اپنی حالت کو ٹٹول کر دیکھیں کہ یہ بات ہمارے اندر ہے یا نہیں۔

ہر چند یہ آیت بدلالت سباق وسیاق کفار کی شان میں ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ مناطِ مذمت کیا ہے سو ظاہر ہے کہ مناط مذمت وہ صفت ہے جو اس آیت میں مذکور ہے اس لیے جس میں بھی یہ صفت ہوگی وہ قابل مذمت ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی کی ذات من حیث الذات سے نفرت نہیں ہے۔ اگر ذات سے بغض ہوتا تو حق تعالیٰ کفار کو ایمان کا مکلف نہ فرماتے کیونکہ اس حالت میں ایمان کا مکلّف بنانا محض بے سود ہوتا کیونکہ اگر کوئی کافر ایمان لے آوے تو ذات تو وہی رہتی ہے اور ذات سے ہوتا بغض تو ایمان لانے سے کوئی نفع نہ ہوتا اور اُس کی مخاطبت کو عبثیت لازم ہوتی (یعنی حق تعالیٰ کا اسکو مخاطب بایمان بنانا ایک

فعل عبث ہونا۔ اور حق تعالیٰ فعل عبث سے منزہ ہیں بس ثابت ہو گیا کہ حق تعالےٰ کو کسی کی ذات سے بُغض نہیں بلکہ جس سے بُغض ہے اُس کے افعال کی وجہ سے ہے خواہ افعال باطنی ہوں یا ظاہری۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی تو اس آیت میں جو کفار کی مذمت ہے تو وہ کسی خاص فعل اور خصلت پر ہے اس لیے جہاں وہ خصلت ہو گی وہاں مذمت بھی ہو گی خواہ وہ خصلت مسلمان میں ہو یا کافر میں اسلیے آیت کا کفار کی شان میں ہونا بے فکری کا سبب نہیں ہو سکتا۔

مقصود طرز خطاب

بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو مسلمان کو ایسی خصلت سے زیادہ نفرت ہونا چاہیئے کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک کفار مکلّف بالفروع نہیں ہیں بلکہ محض ایمان کے مکلّف ہیں اس واسطے.. احتمال ہے کہ کفار سے افعال فروع پر مواخذہ نہ کیا جاوے اور مسلمان تو ہر حالت میں اصول و فروع سب کا مکلّف ہے تو جس فعل کو کفار کے بارہ میں باوجود ان کے مکلّف نہ ہونے کے مذموم کہا گیا ہے وہ مسلمان کے لیے جو کہ مکلّف ہے بدرجہ اولیٰ مذموم ہو گا اسلیے مسلمانوں کو اس سے زیادہ نفرت ہونا چاہیئے۔

اسکی ایسی مثال ہے جیسے چمار سے کوئی بے جا فعل سرزد ہوا اور اس پر کہا جائے کہ تو بڑا نالائق ہے کہ تو نے ایسی نالائق حرکت کی تو کیا کوئی شریف آدمی اسکو سن کر بے فکر ہو سکتا ہے کہ یہ شریف کو تھوڑا ہی خطاب ہے یہ تو چمار کو خطاب ہے۔ اور کیا وہ اس حرکت کو اختیار کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس کے لیے تو یہ فعل زیادہ نازیبا ہو گا کہ چمار کی سی حرکت کرنے لگے۔

اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ گو آیت میں خطاب کفار کو ہے مگر مسلمان بدرجہ اولیٰ اُس کے مخاطب ہیں مگر ہم نے تو ایک یہ بھی سستا سا نسخہ یاد کر لیا ہے کہ ایسی آیات کو سُنکر یوں کہدیتے ہیں کہ یہ آیت تو کفار کے بارہ میں ہے مسلمانوں کے بارہ

ہیں ہے مسلمانوں کے بارہ میں تھوڑا ہی ہے۔

بہر حال جتنی آیتیں کفار کے حق میں ہیں اُن میں مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے کہ جہاں وُہ خصلت ہوگی وہاں مذمت بھی ہوگی اس لیے اُس سے بچنا مسلمانوں کو بھی ضروری بلکہ زیادہ ضروری ہے جیسا ابھی مذکور ہوا۔ حق تعالٰے نے جہاں کہیں کسی فعل پر کفار کی مذمت فرمائی ہے تو یہ مقصود نہیں کہ مسلمانوں کو ان افعال سے بے فکر کر دیا جاوے بلکہ ہم کو کفار کے واقعات سے سبق دینا مقصود ہے چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ؕ

کہ ان مذکورہ واقعات میں جن میں کفار کے قصے بھی ہیں عقل مندوں کے لیے عبرت ہے اور ظاہر ہے کہ عبرت جبھی ہوگی جب ہم اُن سے سبق لیں بعض اوقات کسی مصلحت سے ایک کو مخاطب بناتے ہیں اور مقصود خطاب سے دوسرا ہوتا ہے عارف رومی کا قول ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اور بعض اوقات کسی کی شرافت کا لحاظ کر کے اس کی قدر و وقعت محفوظ رکھنے کی غرض سے دوسرے کو خطاب کیا جاتا ہے مگر اس کو بھی سنانا مقصود ہوتا ہے پس ایسے خطاب کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم عاشق ہو جاتے اور سمجھتے کہ حق تعالٰی کی کیا رحمت ہے کہ خطاب دوسرے کو ہو رہا ہے اور ہماری پردہ پوشی فرما رہے ہیں اور اس کا اثر یہ ہوتا کہ ان افعال سے ہم کو ذرا بے فکری نہ ہوتی بلکہ زیادہ نفرت ہو جاتی اور اسی لیے ہم ان افعال سے زیادہ رُکتے۔ غرض ہم کو اپنی حالت میں غور کرنا ضروری ہوا اگر ہماری بھی وہی حالت ہے جو آیت میں کفار کی حالت مذکور ہے تو اس کا تدارک سخت ضروری ہے۔

احوالِ اتباع

پس غور کرنے کے لیے سمجھنا چاہیئے کہ افعال اختیاریہ میں مرجح تین چیزیں ہوتی ہیں - ایک اتباع ہوای محض - ایک اتباع ہدی محض - ایک اتباع ہدی ممزوج باتباع ہوای -

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اوپر غالب کون سی چیز ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے اندر اتباع ہدی ہے ہی نہیں - اتباع ہدی ہے مگر ممزوج ہے اتباع ہوای کے ساتھ - اور مسلمانوں میں غالب یہی صورت ہے اور کہیں کہیں ان میں اتباع ہوای بھی ہے باقی خالص اتباع ہدی تو بہت ہی کم ہے - کہیں صورت ہدی کو ہدی حقیقی سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں وہ غیر ہدی ہی میں داخل ہے -

چنانچہ ہمارے بعض افعال میں محض شہوت وغضب کا اتباع ہے مثلاً کسی نامحرم کے دیکھنے کو جی چاہا اس کو دیکھ لیا - کسی کا گانا سننے کو جی چاہا اس کا گانا سن لیا - کبھی جی چاہا تو کسی کے حسن وجمال کا تصور کر کے مزہ لینے لگے - اس سے بحث نہیں ہم جائز کام کر رہے ہیں یا ناجائز - حالانکہ یہ سب صورتیں زنا میں داخل ہیں -

حدیث میں ہے العینان تزنیان وزناھما النظر والاذنان تزنیان وزناھما الاستماع الخ آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں انکا دیکھنا زنا ہے کان بھی زنا کرتے ہیں ان کا زنا سننا ہے - چنانچہ اجنبی عورت کی آواز یا امرد کی آواز شہوت کے ساتھ سننا زنا میں داخل ہے - زبان بھی زنا کرتی ہے اس کا زنا نطق ہے غیر محرم سے بے ہودہ باتیں کرنے کی اجازت نہیں - کیونکہ نفس لذت حاصل کرنے کو ایسی باتیں کرتا ہے - قلب بھی زنا کرتا ہے اسکی شکل وصورت سوچ کر مزا لیا جاتا ہے - اس کو کوئی سمجھتا ہی نہیں کہ یہ بھی کوئی گناہ ہے اگر کوئی بڑا ثقہ ہوا تو بدنامی سے بچنے کے واسطے یا تدین کی راہ سے اگر کبھی تحرز و احتیاط ہوتی ہے تو آنکھ کے زنا سے تو احتیاط ہو جاتی ہے مگر قلب کے زنا سے

متقی بھی اکثر تحرز نہیں کرتے اسکو تو معصیت ہی نہیں سمجھتے۔

مراتب افعال قلب

عموماً یہ اعتقاد ہو رہا ہے کہ جو افعال دل کے متعلق ہیں وہ حلال ہیں ان میں گناہ ہی نہیں کیونکہ دل پر اختیار نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں آپ سے غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ افعال قلب کے مراتب بھی مختلف ہیں کہ بعض افعال اختیاری ہیں اور بعض غیر اختیاری تو جن افعال کے اختیاری ہونے کو عقل بتلا رہی ہے کہ اختیاری ہیں اُن کی نسبت یہ کہنا کہ اختیار میں نہیں غلط ہے۔ مثلاً ہم کو یہ اختیار ہے کہ کسی بات کو سوچیں اور یہ بھی اختیار ہے کہ نہ سوچیں۔ ہاں بے سوچے خیال آجائے تو یہ غیر اختیاری ہے پس جو مرتبہ غیر اختیاری ہے اس پر بے شک مواخذہ نہیں مگر تم تو اختیاری کو غیر اختیاری سمجھے ہوئے ہو۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ۔ مراد اس سے وہی خیالات ہیں جو قدرت اختیار میں ہوں۔ مثلاً یہ آپ کی وسعت میں ہے کہ ایک خطرہ قلب میں آئے اور آپ کو اسکو مٹا کر دوسرے خیال میں لگ جائیں۔ اب دوسری طرف توجہ کرنے کے بعد بھی اگر وہ پہلا خیال رہے یہ بے اختیاری ہے۔

اور جو درجہ بے اختیاری ہے اس کے لیے حدیث میں ہے ان اللہ تجاوز عن امتی ما وسوست بہ صدورہا۔ یہ ہے اس کی تفصیل باقی یہ سمجھنا کہ دل پر اختیار نہیں بالکل غلط ہے اور اسی غلطی نے لوگوں کو رذائل قلب کے ازالہ سے مایوس کر دیا ہے۔ مثلاً یہ بات انسان کے قبضہ میں ہے کہ نماز میں کھڑا ہو اور قلب کو اسکی طرف متوجہ کرے مگر اس کی پرواہ نہیں کیونکہ اسکو اپنے جہل سے غیر اختیاری سمجھے ہوئے ہیں۔

اے صاحبو! اگر قلب کا متوجہ کرنا اختیار میں نہ ہوتا تو حدیث میں نماز کے باب میں

مقبلا علیھما بقلبہ لایحدث فیھما نفسہ کیوں ہوتا۔ اگر قلب کا متوجہ کرنا اختیار میں نہیں تو اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے۔

صاحبو! نماز کی طرف توجہ کرنے سے ضرور توجہ ہوگی۔ مگر توجہ کا ارادہ بھی تو ہو۔ ارادہ کر کے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ احضارِ قلب اختیار میں ہے اور جب یہ اختیار میں ہے تو حضورِ قلب بھی اختیار میں ہوگا کیونکہ وہ احضار کا مطاوع ہے البتہ اس کے بعض مراتب اختیار میں نہیں۔ مثلاً یہ تو اختیار میں ہے کہ نماز کی طرف قلب کو متوجہ کر دے اور یہ توجہ واقع بھی ہو جاویگی لیکن دوسری طرف جو پہلے سے توجہ تھی اسکا زائل ہو جانا یہ اختیار میں نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نماز کی طرف توجہ کی گئی مگر دوسری چیز بھی پہلے سے دل میں موجود رہ جاتی ہی نہیں یہ غیر اختیاری ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک چیز کو قصداً آنکھ سے دیکھا تو عادتاً دیکھنے والے کی شعاع بصری فقط اُسی چیز تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ شعاع پھیل کر اور چیزیں بھی بلا قصد کے نظر آنے لگتی ہیں۔ سو ایک تو نظر آنا ہے یہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک نظر میں لانا ہے یہ اختیاری ہے۔ اسی طرح ذہن کو جس وقت کوئی شخص ایک جانب متوجہ کرتا ہے تو مقصود بالتصور تو وہ چیز ہوتی ہے مگر دوسری چیزیں بھی بلا اختیار خیال میں آجاتی ہیں۔ جن کو یہ قصداً ذہن میں نہیں لایا بلکہ بلا قصد آگئیں اس پر کچھ مواخذہ نہیں۔ پس ذہن میں لانا یہ تو اختیاری ہے اور آنا اختیاری نہیں۔

حقیقتِ حضورِ قلب

بعض لوگوں کو اس مقام پر یہ غلطی واقع ہوگئی ہے کہ وہ قلب کا متوجہ کرنا اسکو سمجھتے ہیں کہ دوسری چیز کا تصور ہی ذہن میں نہ رہے اور کوئی چیز حاضر ہی نہ ہو اور

اسی لیے اپنے کو اس میں ناکام دیکھ کر توجہ مامور بہ کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ تو ایسا ہے جیسے کسی چیز کو قصداً دیکھیں اور شعاع کا قصدی تعلق بھی اُسی سے ہو کسی اور چیز سے نہ ہو مگر ایسا ممکن نہیں کہ شعاع کسی اور چیز کی طرف بلا قصد بھی متصرف نہ ہو۔ اسی طرح ذہن کی شعاع بھی ایک ہی چیز پر مقصود نہیں رہتی۔ بس یہاں بھی قصد کیجیے کہ توجہ نماز کی طرف ہو اگر اس کے بعد دوسری چیزیں بھی آپ کے ذہن میں از خود آجائیں تو اسکو مانع حضور قلب سمجھیئے۔ یہ دوسری چیزوں کا آجانا لوازمِ عادت سے ہے اب تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ حضورِ قلب ایسا ہو جسے ہم حضورِ قلب سمجھیں حالانکہ حضورِ قلب کے یہ معنی نہیں جس کو لوگ سمجھے ہوئے ہیں۔

دیکھئے ناواقفیت سے کتنی بڑی خرابی ہو گئی کہ امر اختیاری کو غیر اختیاری سمجھ لیا گیا۔ اور اس کا اہتمام چھوڑ دیا۔ بس ایک سبب حضورِ قلب سے مایوس ہو جانے کا یہ بھی ہے کہ ذہن پر اُس کے حصول کے لیے اس قدر زور ڈالتے ہیں کہ ذہن اِدھر اُدھر جانے ہی نہ پائے۔ حالانکہ ذہن میں خطرات کی لہریں اُٹھتی ہیں جیسے سمندر میں مدوجزر (جوار بھاٹا) کہ اس کے لیے سخت بند کی ضرورت ہے اور بند میسّر نہیں ہے مبالغہ تو بہت کرتے ہیں اُس کی روک تھام کا مگر کہاں تک کر سکتے ہیں آخر ذہن تھک جاتا ہے اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ حضورِ قلب ہو ہی نہیں سکتا اس لیے چھوڑ بھی دو۔ اس کے بعد ارادہ ہی نہیں کرتے۔ یہ مبالغہ کرنے کا نتیجہ ہے اسلیے مبالغہ نہ کرنا چاہیئے۔ میں اسکی ایک مثال واضح عرض کرتا ہوں کہ قلب کا کتنا حاضر کرنا ضروری ہے۔

دو حافظ تجویز کر لیجئے ایک تو ایسا جسے قرآن مجید اسطرح یاد ہے کہ شروع کرتے وقت تو توجہ اور قصد کی ضرورت پڑتی ہے پھر سوچنے کی ضرورت نہیں مشین کی طرح

نکلتا ہوا چلا جاتا ہے جیسے ہم الحمد پڑھتے ہیں کہ ادھر شروع کی اور ادھر ختم سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اور ایک وہ حافظ ہے جسے قرآن کچا یاد ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر لفظ کو سوچ کر پڑھے گا جیسے ناظرہ خواں میں سے کسی کو کوئی سورت کچی یاد ہو تو وہ ہر ہر لفظ کو سوچ کر پڑھے گا۔ بے سوچے نہیں پڑھ سکتا تو اس کچے حافظ کو جتنی توجہ ہر لفظ کے پڑھنے میں ہوتی ہے بس اتنی ہی توجہ کا نماز میں انسان مکلف ہے اور یہی کافی ہے۔

بتلائیے اتنا متوجہ کر دینا قلب کا کیا محال ہے اور کیا دشوار ہے بس یہی درجہ مامور بہ ہے۔ بہر حال یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دل پر مطلقاً اختیار نہیں۔ بلکہ اس میں تفصیل ہے کہ بعض مراتب اختیار میں ہیں اور بعض نہیں جس کو میں نے مفصل عرض کر دیا۔

اسی طرح یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ جس کا خیال قصداً دل میں لائے گا خواہ کسی اجنبی عورت کا یا کسی امرد کا۔ تو اس پر مواخذہ ہوگا۔ کیونکہ قلب کو دوسری طرف متوجہ کرنا اس کے اختیار میں تھا اسی کو فرماتے ہیں والقلب یزنی کہ دل بھی زنا کرتا ہے یعنی سوچ سوچ کر مزے لیتا ہے ایسے وقت میں واجب ہوگا کہ اپنے قلب کو دوسری طرف متوجہ کر دے پھر اگر دوسری طرف متوجہ کرنے کی حالت میں بھی پہلی توجہ کا اثر رہے جس کا دور کرنا اس کے اختیار میں نہیں تو اس پر مواخذہ نہیں اسی کے بارہ میں ہے لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔ یہ حقیقت ہے اس کی۔ اب بتلائیے یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ قلب پر اختیار نہیں بے شک قلب پر اختیار ہے مگر بہت لوگ اس سے غافل ہیں وہ فعل قلب کو مطلقاً گناہ ہی نہیں سمجھتے اور بعض اس کو گناہ تو سمجھتے ہیں مگر ہدیٰ کا اتباع یعنی اس کی شرعی تدبیر نہیں کرتے۔

آنکھ کی خیانت

چنانچہ شہوت کے باب میں ہماری یہی حالت ہے کہ ہوائے کا اتباع کرتے ہیں۔ ہُدیٰ کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اپنی نگاہ تک کو محفوظ نہیں رکھتے حالانکہ لازم یہ تھا کہ جس وقت شہوت کا تقاضا ہوا سوقت ہُدیٰ کو پیش نظر کریں۔ یعنی ایسے وقت میں خدا تعالےٰ کے ارشاد کو سوچیں حق تعالےٰ فرماتے ہیں

قُل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم ذٰلک ازکیٰ لھم۔

حالانکہ سب سے اول مقدمہ اس بیہودگی (یعنی زنا) کا بھی نظر ہے۔ اوّل نظر ہی پڑتی ہے پھر وسوسے آتے ہیں۔ اسلیے چاہیئے کہ ابتدائی مقدمہ کا پورا انسداد کرے یعنی نگاہ کو پست رکھے پھر اور مفاسد اس پہ مرتّب ہی نہ ہوں گے۔ اسی واسطے ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا ہے النظر سھم من سھام ابلیس کہ نظر ایک تیر ہے شیطان کے تیروں میں سے۔ یہ ایسا تیر بے کمان ہے کہ نشانہ سے خطا ہی نہیں کرتا۔ اور پھر یہ کہ تیر تو چلایا اسکی طرف مگر لوٹ کر اسی کے چبھ گیا۔ یہ ایسے غضب کی چیز ہے کہ اس کا مارا ہوا بہت کم بچتا ہے۔

اسی لیے حق تعالٰی نے اوّل اسی کا انسداد فرمایا ہے چنانچہ فرمایا۔

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم

آپ مؤمنین سے کہیئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو پست رکھیں۔

یہ غضِّ بصر مقدمہ ہے زنا سے محفوظ رہنے کا۔ باقی اگر کوئی شخص کہے کہ اندھے بھی تو زنا میں مبتلا ہوتے ہیں تو میں جواب میں حصر کا دعوٰی کرتا ہوں کہ بدوں نگاہ کے وہ بھی زنا میں مبتلا نہیں ہوتے جہاں کہیں بھی زنا میں ابتدا ہوگا نگاہ ہی کی وجہ سے ہوگا۔ البتہ نگاہ عام ہے خواہ نگاہ حقیقی ہو یا تقدیری۔

اندھوں کی نگاہ تقدیری ہوتی ہے۔ اندھے سوچتے ہیں۔ تصور کرتے ہیں صورت کو نگاہ میں لاتے ہیں۔ یعنی نگاہ قلب سے اسکو دیکھتے ہیں اور تصور سے مزے لیتے ہیں پھر زنا پر اقدام کرتے ہیں۔ عادۃً یہ ممکن نہیں کہ صورت کی طرف... بالکل التفات نہ ہو اور پھر ایسی بیہودگی سرزد ہو محض توجہ بلا واسطہ صورت سے کسی کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اندھے اپنے تصور میں امور خارجیہ سے استدلال کرتے ہیں اس کی صورت پر کہ وہ ایسی ہے اور ویسی ہے اس طرح دل کو رغبت ہوتی ہے۔

غرض میں حصر کا دعوی کرسکتا ہوں کہ شہوت کے متعلق جو خرابی ہوتی ہے نگاہ ہی سے ہوتی ہے اسلئے نگاہ کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ نگاہ تو برائے نام نیچی کر لیتے ہیں مگر دزیدہ نظر سے کام کر رہے ہیں بزعم خود... یغضوا من ابصارھم پر عمل ہے مگر خدا کے خوف سے نہیں بلکہ محض نمائش کے لیے کہ لوگ یوں کہیں گے کہ نگاہ بازی کرتے ہیں نگاہ تو نیچی کرلی مگر شعاعوں کو نہیں ہٹاتے حالانکہ شعاعوں کے ہٹانے پر قدرت ہے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ خود ادھر ادھر گوشہ چشم سے شعاعوں کو نکالتے ہیں اور اُن ہی سے اپنا مقصود حاصل کر لیتے ہیں۔ اسکی بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں یعلم خائنۃ الاعین خوب یاد رکھنا چاہیے کہ مخلوق کے دکھانے کو نیچی نظر کر لینا کافی نہیں مخلوق کو تو جھکا لوگے مگر خدا کو کیسے دھوکہ دے سکتے ہو۔

گہ گہے آہے و دوغے میزنی — از برائے مسکہ دوغے میزنی
خلق راگیرم کہ بفریبی تمام — در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست — باخدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن — رایتِ اخلاص و صدق افراشتن

خداتعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھنا چاہیئے اسی واسطے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور کہ اللہ تعالیٰ خیانت والی... آنکھوں اور دلوں کے بھید کو بھی جانتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے کہ اُن کی نگاہ تو ایسی آزاد نہیں نہ دیدہ بازی ہے نہ دُزدیدہ نظری ہے مگر اُن کا مذہب یہ ہے ؎

دل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار   جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

دل ہی دل میں خیال جماکر مزہ لے رہے ہیں اس کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا تخفی الصدور کہ جو تمہارے دل میں چھپا ہوا ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

دیکھو! سنبھلو! تعجب ہے کہ تم نے آنکھ کی حفاظت تو مخلوق کی وجہ سے کرلی۔ مگر جس کی اطلاع محض خدا تعالیٰ کو ہے اس کی حفاظت نہ کی یعنی دل کی ـــ تو ہم کو خدا تعالیٰ کی شرم نہ ہوتی بلکہ لوگوں کی شرم ہوئی۔

یہ امور ہیں پیش نظر کرنے کے قابل۔ ان امور میں ہڑی کو ہڑی پر ترجیح دینے کا یہ طریقہ ہے کہ ایسے مواقع میں شریعت کے حکم پر عمل کرے محض اپنی... خواہش و ہوٰی پر عمل نہ کرے۔ اس طرح انتظام رکھو گے تو نگاہ پست ہو... جائے گی۔

طریقِ علاج

اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جب تک منشا معاصی کا قلب میں موجود ہے اس وقت تک علاج کامل اور راسخ نہیں ہوتا کیونکہ محض افعال کے علاج کرنے کا تو یہ اثر ہوگا کہ چند روز کے لیے گناہ سے بچ جائے گا۔ اور اگر کسی وقت تقاضائے نفس سے مغلوب ہوگیا تو پھر معصیت میں مبتلا ہوجائے گا۔

چنانچہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کا تقوائے چند روز کے لیے کچھ دُور تک چلتا ہے پھر کُلُّ شئٍ یرجع الٰی اصلہٖ کے قاعدہ سے نفسانیت کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ اُنہوں نے محض افعال کا علاج کیا تھا سبب کا علاج نہیں کیا حالانکہ صحیح معالجہ کی حقیقت یہ ہے کہ سبب کا ازالہ کیا جائے محض آثار کے علاج سے پورا علاج نہیں ہوتا گو مصلحت تربیت کی بنا پر اثر کو پہلے روک دیا جاتا ہے مگر اسباب کا ازالہ بھی ضروری ہے اسلیے گو افعال کا علاج بھی ضروری ہے مگر ضرورت اس کی بھی ہے کہ سبب کا بھی ازالہ ہو کہ وہ تقاضا جو قلب میں ہے اُس کو زائل کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ پھر کسی بلا میں مبتلا کر دے اسلئے ضرورت ہے کہ منشا کو دور کیا جاوے اور چونکہ... تقاضے کا محل قلب ہے اسلئے علاج یہ ہے کہ قلب کی اصلاح کی جائے۔

مراقبۂ خشیت

حق تعالےٰ نے اسی جگہ یعنی غضِّ بصر کی آیت میں قلب کی اصلاح کے لیے بھی ایک طریقہ ارشاد فرمایا ہے یعنی ہم کو ایک مراقبہ سکھلایا ہے اس مراقبہ کو پختہ کر و تو اس مراقبہ سے خشیت پیدا ہو گی اور وہ خشیت ہی امراض قلب کا علاج ہے۔ خشیت کا ملکہ راسخ ہو جائے تو تقاضا معصیت کا نہیں رہتا اس مراقبہ کو اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے قُل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم ذٰلک ازکیٰ لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون ۝

یہ ان اللہ خبیر بما یصنعون وہ مراقبہ ہے۔ بس معصیت کے وقت اس کا مراقبہ کر لیا کرو کہ اللہ کو سب خبر ہے ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ سب سے خبردار ہیں اسکی خدا تعالےٰ کا خوف دل میں پیدا ہو گا پھر معصیت کی ہمت نہ ہو گی کس قدر جامع تعلیم ہے سبحان اللہ! مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محض یہ

یہ اعتقاد کرلو اللہ میاں کو سب خبر ہے بلکہ اس کا استحضار و استمرار کرنا چاہئے یعنی دل میں ہر وقت یہ خیال حاضر رکھو کہ خدا تعالیٰ کو سب خبر ہے اس سے خوف پیدا ہوگا ہیبت ہوگی یہ ہے اصلاح قلب جو علم باطن کے متعلق ہے پس علم ظاہری تو محض افعال کا انتظام کرتا ہے۔

اور علم باطن اسباب کا علاج کرتا ہے اور جب تک یہ مضمون حال کے درجہ میں نہ ہو اس وقت تک قابل اعتبار نہ سمجھا جاوے

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے اپنے بعض خدام کو الم یعلم بان اللہ یری کا مراقبہ تعلیم فرمایا تھا کہ اس کا مراقبہ کیا کرو انہوں نے دو چار دن ہی کے بعد آکر عرض کیا کہ وہ تو پورا ہوگیا۔ اب اور کچھ بتلایئے وہ بزرگ ٹال گئے اور فرمایا کہ اچھا بتلائیں گے۔ ان بزرگ نے چاہا کہ اس کا امتحان اس طور پر لیں کہ ان کو خبر بھی نہ ہو۔ چنانچہ ایک دن ان کو خالی الذہن دیکھ کر بلایا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک کبوتر اور ایک ایک چھری دے کر فرمایا کہ ان کو ایسی جگہ ذبح کرو جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو۔ چنانچہ سب لے کر چلدیئے اور ذبح کر کے آئے۔ بجز ایک شخص کے کہ اس نے زندہ کبوتر حاضر کیا۔ شیخ نے امتحان کے طور پر اس شخص سے کہا کہ ایک تو یہ لوگ ہیں کہ جیسا میں نے کہا تھا ویسا ہی کر لائے ایک تم مہمل ہو کہ ذرا سا کام بھی تم سے نہ ہوسکا۔ اس نے عرض کیا کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو۔ میں کبوتر لیئے ہوئے ہر طرف پھرا مگر کوئی جگہ ایسی نہ ملی جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو کیونکہ حق تعالیٰ تو ہر جگہ دیکھتے تھے۔ پھر میں کیسے ذبح کرتا۔ شیخ نے فرمایا کہ بس مراقبہ اسکا درست ہوا ہے باقی سب ناکامیاب ہیں۔

غرض یہ کہ جس مضمون کا مراقبہ کیا جائے وہ اس شخص کا حال ہو جانا چاہیئے

صرف یہ اعتقاد کر لینا کہ اللہ میاں دیکھ رہے ہیں کافی نہیں پس اہل اللہ اس کا اہتمام کرتے ہیں اس کی مشق کرتے ہیں اس پہ ذہن کو جماتے ہیں اس واسطے کہ قلب کی اصلاح بدوں اس کے نہیں ہو سکتی۔ جب یہ چیز دل میں جم جاتی ہے تو پھر معصیت نہیں ہوتی یعنی یہ مرتبہ ہے جو معصیت سے مانع ہوتا ہے نہ یہ کہ صرف اعتقاد کر لیا جائے یہ مرتبہ معاصی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

غلبۂ خشیت

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی منافات کو اس عنوان سے بیان فرماتے ہیں لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن، یعنی زنا کرنے والا زنا نہیں کرتا اس حالت میں کہ وہ مومن ہو اور چوری کرنیوالا چوری نہیں کرتا اس حالت میں کہ وہ مومن ہو۔

ظاہراً اس حدیث پہ ایک اشکال ہے وہ یہ کہ کیا ان افعال سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے حالانکہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ جب تک مسلمان گناہ کو گناہ سمجھے گا کافر نہ ہوگا۔ اور حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زنا کرنے سے چوری کرنے سے کافر ہو جاتا ہے۔ یہ اشکال ہے۔

جواب یہ ہے کہ حدیث میں ایمان کا خاص مرتبہ مراد ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی مرتبہ ایمان اور زنا میں منافات کو بیان فرما رہے ہیں اور وہ ایمان خاص یہ ہے کہ جن باتوں کا اعتقاد ہے وہ درجۂ حال میں ہر دم پیش نظر رہنے لگیں یہی ہے ایمان کا کمال۔

پس مطلب حدیث کا یہ ہے کہ کمال ایمان کے ساتھ زنا جمع نہیں ہوتا یعنی کامل مومن ہو کر زنا نہیں کر سکتا۔ حضرات اہل اللہ اسی کی تدابیر کرتے ہیں کہ گناہ کا مانع راسخ ہو جائے جب وہ مانع راسخ ہو جاتا ہے تو اس حالت میں

گناہ نہیں ہوتا۔ جس کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ جس پر خدا تعالیٰ کی خشیت غالب ہو اور اُن کے وعدے وعید بھی پیش نظر ہوں۔ شرم بھی دامن گیر ہو اور خوف بھی غالب ہو تو پھر اُس سے گناہ نہیں ہوگا۔ بلکہ جس شخص میں ان چیزوں کا غلبہ ہوا ہے اُس نے اگر قصد بھی کیا ہے گناہ کا تو ان چیزوں نے اس کو بچا لیا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق اہل اللہ کے بہت سے قصے ہیں کہ کسی نے معصیت کا ارتکاب بھی کرنا چاہا اور ان چیزوں کا غلبہ ہوا تو چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

غرض اہل اللہ زیادہ تر اسکی کوشش کرتے ہیں کہ قلب کی ایسی اصلاح ہو جائے ——— حدیث میں بھی اس اصلاح کا بڑا اہتمام آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ان فی الجسد مضغۃً اذا صلحت صلح الجسد کلّہ واذا فسدت فسد الجسد کلّہ یعنی بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ فاسد ہو تو تمام بدن فاسد ہوتا ہے الا وھی القلب سُن لو وہ دل ہے۔

واقعی قلب کی درستی سے تمام جوارح درست ہو جاتے ہیں اور اس کے بگڑنے سے سب بگڑ جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اتنے بڑے اہتمام کی چیز اور اُس سے اسقدر غفلت! ہوٰی جس کا نام ہے اُس کا محل قلب ہی تو ہے قلب سے جب تک ہوٰی نہ نکالی جائے گی اُس وقت تک کامل اصلاح قلب کی نہ ہوگی۔

یہاں ایک ضروری بات مبحث کے متعلق سمجھنے کے قابل ہے کہ ہوائے نفسانی کے زائل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکلیہ جاتی رہے۔ بلکہ زائل ہونے کے معنی اُس کا مغلوب ہو جانا اور مضمحل ہو جانا ہے۔ یعنی یہ نہیں ہوتا کہ شہوت و ہوائے نفس کا یا نفس کے کسی داعیہ کا بالکل استیصال ہو جائے۔ کیونکہ یہ امور

فطری ہیں اور فطری امور زائل نہیں ہوتے اور یہ مسئلہ بدیہیات بلکہ حسیات میں سے ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا کامل ہو جاوے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اُس میں معاصی کا میلان ہی نہ رہے۔ میلان تو اخیر عمر تک رہتا ہے مگر خوف حق سے مغلوب ہو جاتا ہے البتہ کسی خاص حالت کے غلبہ سے کبھی نفس میلان بھی محسوس نہیں ہوتا مگر وہ حالت دائمی نہیں یہ ہے وہ مسئلہ ضروریہ اور اُس کے نہ جاننے سے یہ خرابی ہوتی ہے کہ اہل سلوک جب ہوائے نفس کو اپنے اندر موجود دیکھتے ہیں اس سے پریشان ہو جاتے ہیں اُن کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ ہم کو اتنا زمانہ ہو گیا ریاضت و مجاہدہ کرتے ہوئے مگر شہوت و ہویٰ وغیرہ کا استیصال نہ ہوا اس پر سخت تاسف و قلق ہوتا ہے۔ جس کا سبب حقیقت سے بے خبری ہے۔

اور بعض کو اس سے بڑھ کر ایک بات پیش آتی ہے وہ یہ کہ بعض اوقات جبکہ آثار ذکر کا یا کسی خاص حالت کا غلبہ ہوتا ہے اُس کی وجہ سے پہلے حالات ایسے مضمحل اور مغلوب ہو جاتے ہیں گویا معدوم ہو گئے پھر جب اُس کے بعد وہ غلبۂ حال رفع ہو جاتا ہے۔ تو وہ پہلی کیفیات پھر عود کر آتی ہیں اب جب اُن کا... اُبھار شروع ہوا تو سالک کو اس پر افسوس ہوتا ہے کہ ہائے میں تو بنکر بگڑ گیا۔ ترقی سے تنزّل ہو گیا مقبول ہو کر مردود ہو گیا کامیاب ہو کر ناکام ہو گیا۔

بعض اوقات شدتِ قبض سے خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے بعض اوقات شیخ سے بھی غیر معتقد ہو جاتا ہے۔ پس سمجھ لیجئے کہ یہ چیزیں یعنی نفسیات زائل نہیں ہوتیں۔ ہاں مغلوب ہو جاتی ہیں۔ پس ریاضت سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پہلے اُن کا اتنا غلبہ تھا کہ سالک کو مقاومت میں سخت پریشانی آتی تھی۔ ریاضت و مجاہدہ کے بعد ایسی حالت ہو گئی کہ مقاومت کی تو ضرورت ہو گی۔ مگر قصد کرنے پر آسانی سے نفس قابو میں آجاویگا جیسے شریر گھوڑا کہ پہلے تو دشواری سے قابو میں

آتا ہے مگر شائستگی کے بعد قابو میں آجاتا ہے۔

غرض یہ چیزیں اخیر عمر تک رہتی ہیں البتہ ریاضت سے مضمحل اور مغلوب ضرور ہو جاتی ہیں وجہ وہی ہے جو ابھی مذکور ہوئی یعنی یہ امور طبعیہ ہیں جو زائل نہیں ہوا کرتے حدیث میں ہے۔

اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل زال عن جبلتہ فلا تصدقوہ

یعنی اگر تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کا یقین کر لو اور جو یہ سنو! کہ کسی شخص کی فطرت بدل گئی ہے تو اس کا یقین مت کرو۔

اسے۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ جب فطرت نہیں بدلتی تو پھر ریاضت بیکار کیوں مشقت اٹھائی جائے۔ جواب وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی ریاضت سے رذائل کا بالکلیہ ازالہ نہیں ہوتا۔ البتہ اخلاق میں تعدیل ہو جاتی ہے اس لیے ریاضت بیکار نہیں ہے اس کا نفع مشاہد ہے یعنی پہلے جو نفس میں اتنی خرابی تھی کہ اس کی مقاومت دشوار تھی۔ ریاضت کے بعد اس درجہ کی خرابی نہیں رہتی بلکہ مقاومت آسان ہو جاتی ہے مگر قصد پھر بھی کرنا پڑتا ہے معاصی کے چھوڑنے کا۔

محلِ ہوی لوگوں کا یہ جو گمان ہے کہ شیخ کی توجّہ سے گناہ کا تقاضا ہی بالکل جاتا رہتا ہے اسی بناء پر اُن سے درخواست کی جاتی ہے کہ حضرت ایسی توجّہ فرمائیے کہ ہم سے گناہ ہی نہ ہو۔ یہ مہمل خیال ہے۔ غرض اس حقیقت کے نہ جاننے سے سالکین پریشان ہو جاتے ہیں اس کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ ہوائے نفس کے زائل ہو جانے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اُس کا غلبہ جاتا رہے نہ یہ کہ بالکلیہ ازالہ ہو جائے۔

اور اس میں (یعنی داعیہ کے باقی رہنے میں) حق تعالیٰ کی ایک بڑی حکمت ہے۔ وہ یہ کہ اگر داعیہ کا بالکل ازالہ ہو جاتا تو انسان صبر کی صفت سے مثلاً محروم ہو جاتا۔ دیوار کا کوئی کمال نہیں کہ وہ زنا نہیں کرتی۔ کیونکہ اُس میں تو داعیہ ہی نہیں کمال انسان کا ہے کہ داعیہ موجود ہے اور پھر بچتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ تقاضا ہو گناہ کا اور پھر بچے تاکہ فضیلت حاصل ہو۔ تقاضا رہنے پر ایک قصہ یاد آیا وہ یہ کہ ایک چور کسی شیخ سے بیعت ہوا اور چوری سے توبہ کی مگر خانقاہ میں اُس کے رہنے سے یہ آفت نازل ہوئی کہ لوگ صبح کے وقت دیکھتے کہ کسی کے جوتے اپنے موقع پر نہیں یہاں کے وہاں ہیں اور وہاں کے یہاں ہیں ہر روز یہی آفت نازل ہونے لگی۔ لوگوں نے آپس میں کہا کہ یہ کون شخص ہے اس کی تحقیق کرنا چاہیے کہ کسی کے جوتے اپنے موقع پر نہیں ملتے۔ آخر لوگوں نے پہرہ دیا۔ معلوم ہوا کہ یہی نئے مرید صاحب ہیں جو چوری سے تائب ہوئے ہیں۔ شیخ کو اطلاع کی شیخ نے اس کو بلایا اور فرمایا تبلاؤ کہ یہ کیا قصہ ہے۔ مرید نے عرض کیا کہ... حضور چاہے ماریئے چاہے چھوڑیئے۔ میں نے آپ کے ہاتھ پر چوری سے توبہ کی تھی ہیرا پھیری سے تھوڑا ہی کی تھی۔ اور اصل قصہ یہ ہے کہ جب اخیر رات ہوتی ہے تو میرے نفس میں حسب عادت سابقہ بڑا تقاضا پیدا ہوتا ہے چوری کرنے کا۔ اور نفس کہتا ہے کہ آج چوری کر لے پھر توبہ کر لیجیو۔ میں بہت سمجھاتا ہوں مگر کسی طرح قابو میں نہیں آتا۔ اس میں بڑی دیر تک نفس سے مناظرہ ہوتا ہے جب بہت ہی تقاضا ہوتا ہے مجبور ہو کر یہ کرتا ہوں کہ لوگوں کے جوتوں کو لوٹ پوٹ اور ادھر اُدھر کر دیتا ہوں۔ اس سے نفس کو کچھ چوری کا مزہ آجاتا ہے اور تقاضا دب جاتا ہے اگر میں اس سے توبہ کر لوں گا تو پھر چوری کرنے لگ جاؤں گا اور پہلی عادت کی طرف عود کر دوں گا۔ اب آپ دیکھ لیجئے۔ شیخ نے کہا اچھا

بھائی تم ایسا کر لیا کرو اور خانقاہ والوں سے فرمایا کہ تم اس مصیبت کو ایک مسلمان کی خاطر گوارا کر لو۔

ریاضت کا فائدہ

ممکن ہے کہ بعض لوگ شیخ کی اس تجویز پر یوں کہیں کہ شیخ نے اس بات کی کیونکر اجازت دے دی اس کو اجازت نہ دینی چاہیئے تھی۔ بات یہ ہے کہ یہ حضرات حکیم ہوتے ہیں جانتے ہیں کہ بعض اوقات تقاضا کو بالکل روک دینے سے انسان پھر اصلی عادت پر چلا جاتا ہے اس لیے بعض اوقات شیخ ایسی بات کی اجازت دیدیتا ہے جس کی دلیل یہ قاعدہ فقہیہ ہے۔

من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما۔

اس کی تائید میں ایک شخص کی حکایت سنی ہے کہ اس کا ایک گھوڑا تھا بڑا عیبی کہ لید کر کے کھڑا ہو جاتا اور لوٹ کر لید کو سونگھنے لگتا پھر آگے چلتا اور کسی طرح نہ مانتا۔ اتفاق سے ایک دن ایک سوار اس کا رفیق سفر ہوا اُس نے گھوڑے کی یہ عادت دیکھی تو اُس نے اپنا گھوڑا پیچھے کیا۔ پس جب گھوڑا لید سونگھنے کو مڑتا دو چار کوڑے زور زور سے رسید کرتا۔ اسی طرح خوب رستہ قطع ہوا گھوڑے والا بہت ممنون ہوا کہ آج خوب سفر قطع ہوا۔ آخر ایک موقع پر پہنچکر وہاں سے دونوں کے راستے بھٹتے تھے اسلیئے وہ سوار الگ ہونے لگا۔ اس نے کہا خدا تیرا بھلا کرے تو نے میرے گھوڑے کو درست کر دیا مگر جب وہ سوار دُور نکل گیا تو گھوڑا پیچھے کو لوٹا اور کئی کوس تک لوٹ کر گیا اور جہاں جہاں لید کی تھی سب کو سونگھا۔ اس طرح سے سارا دن آنے جانے میں گذر گیا۔

غرض بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت زیادہ سختی کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی زیادہ سختی کرنے سے ایک کام تھوڑے دنوں کو تو چھوڑ دیتے ہیں

پھر جتنا تقاضا جمع ہو رہا تھا۔ سب کی ایک دم سے قضا کرتے ہیں اسی واسطے مشائخ کی نظر ہمیشہ اس حقیقت پر رہتی ہے کہ طالب کی تربیت کس طرح کرنا چاہیئے۔

اسلیئے مشائخ کبھی تدریجاً تربیت کرتے ہیں کہیں عجلت کرتے ہیں اسکا مدار اُن کے اجتہاد اور ذوق پر ہے۔ طبیب بھی بعض دفعہ علاج میں تدریج کرتا ہے کہ منضجات پلا کر مسہل دیتا ہے اور بعض اوقات فوراً مسہل دیدیتا ہے۔ باقی اس کا موقع اور محل کہ تدریج کہاں چاہیئے اور عجلت کہاں اس کو طبیب ہی سمجھتا ہے۔

اسی طرح یہاں بھی موقع اور محل کو شیخ ہی سمجھتا ہے دوسرا کوئی اس معاملہ میں اُس کا شریک یا مزاحم نہیں ہوسکتا۔ غرض اخیر تک ضعیف سا داعیہ ضرور رہتا ہے مگر وہ ایسا مضمحل ہوجاتا ہے کہ اگر تھوڑا سا بھی بچنے کا قصد کرے تو وہ داعیہ اس کو گناہ میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ یہ سب اصلاح کے سلسلہ میں مضمون بیان کیا گیا۔

حاصل یہ کہ اصلاح نفس کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اتباع ہوٰی پر قرآن میں وعید ہے اور ہوٰی کا محل ہے نفس اسلیئے نفس کی اصلاح خاص طور پر لازم ہے اور اس ہوای کا ایک فرد تو شہوت ہے جس کا کسی قدر بیان ہوچکا۔

ازالۂ ہوٰی کا مطلب

اسی طرح ایک فرد اُس کا غضب ہے۔ اس میں بھی ہم ہوای کا اتباع کرتے ہیں ہدیٰ کا اتباع نہیں کرتے۔ اس بارہ میں ہماری حالت یہ ہے کہ غصہ کے وقت سوچتے ہی نہیں کہ اس معاملہ میں ہدیٰ اور شریعت کا حکم کیا ہے فوراً غضب کے مقتضا پر عمل کر بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں شریعت کے موافق ہے یا نہیں۔ اس غضب میں بھی ایک ہوٰی ہے اور ایک ہدیٰ ہے

غصہ میں گالی دینے کو مارنے کو سب کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے یہ تھوڑے ہے مگر اس میں بھی شریعت کا ایک حکم ہے وہ بڑی ہے۔ شریعت نے غصہ کے بھی حدود بتلائے ہیں۔ پس جس کو غصہ جاری کرنے پر قدرت ہو جیسے حاکم کو محکوم پر اور رئیس کو رعایا پر اور میاں جی کو لڑکوں پر شریعت میں ان سب کے لیے حدود ہیں کیونکہ بعض جگہ بے جا غصہ جاری کرنے سے ہلاکت ہو جاتی ہے انکو غصہ میں ہوش نہیں رہتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں یہ بے اتباع ہوئی۔ یہاں بھی بڑی کو ترجیح دینی چاہیئے اور شریعت پر عمل کرنا چاہیئے۔ سو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جس بات پر غصہ آیا ہے وہ بات غصہ کی ہے یا نہیں۔ اس میں قاعدہ شرعیہ سے کام لینے کی ضرورت ہے مثلاً ایک شخص نے ہمارے عیوب بیان کئے یا کسی بیجا امر پر متنبہ کیا ہم کو غصہ آ گیا کیونکہ دوسرے کا نصیحت کرنا ہماری شان کے خلاف ہے تو ایسے موقع پر شریعت سے کام لینا چاہیئے۔ مگر ہم اس میں بھی اتباع ہوی ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ کالپی کا ایک قصہ ہے کہ

ایک سب انسپکٹر صاحب نے مسجد میں نماز پڑھی جس میں رکوع و سجود و تعدیل ارکان ٹھیک طور سے نہیں کیا تھا۔ ایک غریب شخص بھی وہاں موجود تھے انہوں نے اُن سے کہا کہ آپ نماز پھر پڑھئے آپ کی نماز نہیں ہوتی وہ اُن پر بہت خفا ہوئے اور بُرا بھلا کہا۔ انہوں نے کہا کہ آپ چاہے مجھے مار لیں۔ مگر مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ خراب نماز پڑھنے سے آپ مستحق عذاب ہوں۔ میں آپ سے پڑھوا کر چھوڑوں گا۔ اس شور و غل میں کچھ لوگ جمع ہو گئے اور سب انسپکٹر سے کہا کہ بھلے مانس یہ تو آپکے فائدہ کو کہہ رہے ہیں دوبارہ پڑھ لینے میں آپ کا کیا حرج ہے۔

غرض انہوں نے نماز دُہرائی۔ یہ نصیحت کرنیوالے صاحب ایک غریب آدمی

عطر تیل کی تجارت کرتے تھے۔ لوگوں نے اس واقعہ کے بعد اُن کی بڑی قدر کی اُن کو تبرکاً اپنی دکانوں پر بٹھاتے اور اُن سے عطر تیل خریدتے۔ اور جو دام کہتے وہی دیتے۔ دیکھو دین بھی جو کہ اتباع ہدیٰ ہے کیسی برکت کی چیز ہے کہ دنیا بھی درست ہوگئی۔ مگر ان صاحب کو (یعنی سب انسپکٹر صاحب کو) کتنا غصہ آیا کہ ناصح کو بُرا بھلا بھی کہا مارا پیٹا بھی...... یہاں تک لوگوں میں اتباع ہویٰ تھا کہ داروغہ جی کو نصیحت پر بھی غصہ آگیا۔ حدود شریعت کو نہ دیکھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں

طرزِ تربیت اور زیادہ تر سبب ایسے غصہ کا کبر ہے اس کا علاج اپنی حقیقت میں غور کرنا ہے۔ جیسا امام غزالیؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص فاخرہ لباس میں اکڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک بزرگ نے ناصحانہ کہا کہ میاں ذرا تواضع کے ساتھ چلو۔ تو وہ کہتا ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔ میں کون ہوں۔ یہ بولے ہاں جانتا ہوں آپ کون ہیں تمہاری حقیقت یہ ہے۔ اولك نطفة قذرة وآخرك جيفة مذرة وانت بين ذلك تحمل العذرة تمہاری ابتدائی حالت تو یہ ہے، کہ ایک نطفہ ناپاک تھے اور آخری حالت یہ ہوگی کہ ایک سڑے ہوئے مردار ہو جاؤ گے اور درمیانی حالت یہ کہ دو سیر سے کم پاخانہ تمہارے پیٹ میں نہیں۔ حقیقت میں یہ باتیں ایسی ہیں کہ غضب کے وقت ان پر غور کرنا چاہیے کیونکہ منشا غضب کا اکثر کبر ہے اور کبر کا منشا اپنی حقیقت سے بے خبری ہے یہ تو علمی علاج ہے۔

ہوائے غضب اب میں غصہ کے بارہ میں ایک گُر بتلاتا ہوں جو عملی علاج ہے جو دستور العمل بنانے کے لائق ہے وہ یہ کہ غصہ آتے ہی فوراً نافذ کرنا شروع نہ کرے۔ ذرا ٹھہر جائے اور جس پر غصہ آیا ہے اُس کو اپنے سامنے سے ہٹا دے یا خود وہاں سے ہٹ جائے جب جوش جاتا رہے اب فیصلہ کرے کہ اس شخص کو کیا سزا دی جائے۔ مگر اس فیصلہ کے لئے علم دین کی ضرورت

ہوگی وہ بتلائے گا کہ یہ موقع غصہ نافذ کرنے کا ہے یا نہیں پھر موقع ہونے پر سزا کتنی ہونا چاہیئے اس کے بعد جو کچھ فیصلہ ہوگا وہ بجا ہوگا اور ان سب باتوں کا فیصلہ سکون کی حالت میں کرے غصہ میں نہ کرے کیونکہ حدیث میں ہے

لا یقضی القاضی وھو غضبان

کہ قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے بلکہ خوب سوچے اور معاملہ پر نظر ثانی بھی کرے۔ یہاں بھی علم دین کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح میاں جی کو چاہیئے کہ فوراً سزا دینا نہ شروع کر دیں۔ یہ بھی سکون کی حالت میں فیصلہ کریں جب جُرم ثابت ہو جائے تو سزا بھی حکم شرعی سے تجویز کریں کہ ایک لکڑی مارنی چاہیئے یا دو یا تین۔ گو نفس اس پر راضی نہ ہوگا کیونکہ اس کا مزہ تو اس میں ہے کہ دھنیے کی طرح دھنتا چلا جائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مزے کے لیے مارتے ہیں سزا کے لئے نہیں ایک بات جو پہلی بات کا تتمہ ہے یہ بھی ہے کہ جب غصہ آئے تو یہ بھی سوچیں کہ آیا سزا دینا واجب ہے یا جائز۔ اگر واجب ہو تو اس آیت پر عمل کرے

ولا تاخذکم بھما رأفۃ فی دین اللہ۔

زناکار کے لیے فرماتے ہیں کہ اس پر شفقت غالب نہ آنی چاہیئے پس اگر شرعاً سزا واجب ہو تو سزا دینا واجب ہے شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

بے حکم شرع آب خوردن خطاست　　　وگر خوں بفتوی بریزی رواست

اور یہ اس صورت میں ہے جب موجب سزا اپنا حق نہ ہو بلکہ حق اللہ ہو اور اگر اپنا حق ہو کہ کسی نے ہمارا نقصان کیا تھا یا ہماری نافرمانی کی تھی تو اس وقت کامل درجہ اتباع ہدی کا یہ ہے

فمن عفیٰ و اصلح فاجرہ علی اللہ

یعنی اپنا حق معاف کر دے گو یہ بھی جائز ہے کہ بدلہ لے لے لیکن اگر معاف کر دے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور معاف کرنا چونکہ نفس پر شاق ہے اسکے لیے بعض مراقبات کی بھی ضرورت ہے مثلاً یہ سوچے کہ اے نفس کیا تو مجرم نہیں ہے پھر یہ کہ جتنی تجھ کو اس پر قدرت ہے خدا تعالیٰ کو تجھ پر اس سے زیادہ قدرت ہے۔ پھر یہ سوچے کہ تو اپنے جرم کے لیے کیا چاہتا ہے معافی چاہتا ہے یا سزا۔ یقیناً معافی چاہتا ہے تو جیسے تو اپنی لیے معافی چاہتا ہے۔

اسی طرح تجھ کو دوسروں کے لئے بھی معافی کو پسند کرنا چاہیئے۔ اور یہ بھی سوچے کہ اگر تو خطا معاف کر دیگا تو حق تعالیٰ تیری خطا معاف کر دیں گے۔

ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ زیادہ پابند اعمال کا نہ تھا۔ مگر ایک کام یہ کیا کرتا تھا کہ جب لوگوں کو قرض دیتا تو مہلت بھی دیدیتا۔ اگر مقروض کے پاس ادا کرنے کو نہ ہوا تو معاف کر دیتا جب اس کا انتقال ہو گیا تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ گو اس کے اعمال زیادہ نہیں مگر جب یہ باوجود عجز و احتیاج کے ہمارے بندوں کے ساتھ سہولت کرتا تھا تو ہم تو قادر ہیں ہم بھی اسکے ساتھ سہولت ہی کریں گے اسلئے ہم نے اپنا سب حق معاف کیا۔ بہر حال ان مراقبات کے بعد غصہ کو ضبط کر دینا یا مجرم کو معاف کر دینا سہل ہو جاویگا۔

غصہ کا عمومی سبب

اور یہ ضبط اور معافی علاوہ تکمیل اخلاق کے موجب اجر و ثواب بھی ہے اور واقعی قدرت کے وقت غصہ کو پی لینا اور معاف کر دینا ہے بھی بڑا کام اس کے فضائل بھی بہت وارد ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت عیسیٰ را یکے ہشیار سر　　چیست در ہستی زجملہ صعب تر

گفت اے جاں صعب تر خشم خدا　　کہ ازو دوزخ ہمے لرزد چو ما

گفت از خشم خدا چہ بود اماں　　گفت ترکِ خشم خویش اندر زماں

حق تعالیٰ نے فرماتے ہیں

والکاظمین الغیظ والعافین عن النّاس

اس میں علاوہ فضیلت ضبط کے ایک دلیل بھی ہے اس دعوٰی کی جو اوپر کیا گیا ہے کہ داعیۂ انتقام تو نفس میں رہتا ہے مگر ریاضت سے مقاومت آسان ہو جاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے الکاظمین فرمایا ہے کہ وہ غصہ کے پینے والے ہیں یعنی غصہ تو آتا ہے مگر پی جاتے ہیں۔ فاقدین الغیظ نہیں فرمایا کہ اُن کو غصہ ہی نہیں آتا۔

حضرت امام حسین رضؓ کی حکایت ہے کہ آپ کے یہاں چند مہمان تھے کھانے کا وقت آیا۔ غلام کھانا لایا۔ اتفاق سے شوربے کا پیالہ لیے ہوئے تھا کہ فرش پر پاؤں پھسلا۔ پیالے میں سے گرم گرم شوربا آپ کے چہرہ مبارک پر گر پڑا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیسا منظر تھا۔ اس وقت کے اہلِ جاہ اپنے دل میں ٹٹولیں کہ ایسے موقع پر وہ کیا کرتے آپ نے کچھ نہیں کیا۔ مگر بمصلحت تعلیم نظرِ تادیب سے اُس کی طرف دیکھا اُس کی زبان پر فوراً یہ جاری ہوگیا والکاظمین الغیظ۔ اللہ کے خاص بندے غصّہ کو پینے والے ہیں آپ نے فرمایا کظمت غیظی کہ میں نے اپنا غصہ پی لیا پھر غلام نے کہا والعافین عن الناس اور وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں آپ نے فرمایا عفوت عنك کہ میں نے تجھے معاف کیا پھر اُس نے کہا واللّٰہ یحب المحسنین اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا قد اعتقتك لوجه اللّٰه کہ میں نے تجھ کو اللہ کے واسطے آزاد کیا۔ حضرت یہ نمونے ہیں اقتدار کے لیے اب یہ سوچو کہ ہم میں ان حضرات سے زیادہ کون سی فضیلت ہے جو غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

غصہ کا عملی علاج

اور غصہ فرو ہونے کے لیے علاوہ مراقبات و اعمال مذکورہ کے بعض اور اعمال بھی ہیں ایک یہ کہ جب غصہ آئے تو زمین پر لیٹ جائے حدیث میں ہے

فلیتلبسہ بالارض

کھڑا ہو تو بیٹھ جائے بیٹھا ہو تو لیٹ جائے اس سے غصہ کم ہو جاوے گا گو گم نہ ہوگا مثل جس وقت اس کے شباب کی حالت تھی وہ نہ رہے گی اور راز اس کا یہ ہے کہ غصہ جاری کرنے کے لیے دست و پا کی حرکت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس نے اسکو بیکار کر دیا تو غصہ کم ہو جاویگا۔ دوسرے اسکو قرب ہوا زمین سے اور زمین میں خاصیت ہے خاکساری اور عجز پیدا کرنے کی جو غصہ کی ضد ہے۔ دوسری تدبیر یہ ہے کہ پانی پی لے۔ تیسری تدبیر یہ ہے کہ کچھ دیر تک اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھتا رہے اور فقط زبان سے پڑھنا کافی نہیں بلکہ یہ بھی سوچے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور بری چیز ہے اور غصہ کے برے ہونے کی ایک کھلی دلیل یہ ہے کہ جب کبھی آپ نے غصہ جاری کیا ہوگا تو بعد میں پشیمانی ضرور ہوئی ہوگی الا نادرًا۔ ایک تدبیر یہ ہے کہ جس پر غصہ آیا ہے اس کو سامنے سے ہٹا دے اگر وہ نہ ہٹے تو تم ہٹ جاؤ۔

یہ تدابیر ہیں غصہ فرو کرنے کی۔ اور یہ ہے اس باب میں اتباع ہدی بزرگان دین نے اللہ والوں نے نفس کے ایسے ایسے علاج کئے ہیں اور بڑے بڑے موقع پر ضبط کیا ہے۔

فضیلت ضبط

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید نصیحت کرنے میں تیز مشہور تھے بعض لوگوں کا گمان یہ تھا کہ یہ تیزی نفسانیت کا جوش ہے آپ ایک دفعہ مجمع میں وعظ فرما رہے تھے کہ ایک بے ادب شخص نے عرض کیا کہ حضرت میں نے سنا ہے کہ آپ حرام کی پیدائش ہیں آپ نے اسی لہجہ میں

جو وعظ کا لہجہ تھا نہایت متانت سے جواب دیا کہ بھائی کسی نے تم سے غلط کہا ہے میرے ماں باپ کے نکاح کے گواہ تو اب تک موجود ہیں تمہارا جی چاہے تو میں اُن سے گواہی دلوا دوں کہ ان کے سامنے نکاح ہوا تھا اور نکاح کے بعد الولد للفراش حکم شرعی ہے۔ کیا انتہا ہے اس تواضع کی۔

اس شخص کی یہ بات تمام سامعین کو سخت گراں گذری خصوصاً جاں نثاروں کو تو نہ معلوم کیسا ہیجان ہوا ہوگا۔ مگر مولانا نے استقلال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ تحمل سے کام لیا اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ شخص آپ کے قدموں میں گر پڑا اور کہا کہ میرا گمان یہ تھا کہ آپ کا غصہ نفس کے لیے ہے آج معلوم ہوگیا کہ آپ غصہ نفس کے لیے نہیں کرتے۔

غرض بزرگوں کی بڑی بڑی حکائتیں ہیں کہ انہوں نے کس طرح غصہ کو ضبط کیا ہے۔ ایک شخص ایک[1] بزرگ کی خدمت میں گئے اور یہ کہا کہ آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے اور آپ کی والدہ صاحبہ بیوہ رہ گئیں اور سُنا ہے کہ وہ نہایت حسین ہیں۔ آپ اُن سے میرا نکاح کر دیجئے وہ بزرگ جواب میں فرماتے ہیں کہ میری والدہ نابالغ نہیں ہیں۔ بلکہ بالغ اور ثیبہ ہیں میں اُن سے پوچھتا ہوں اگر وہ راضی ہو جائیں تو مجھے کیا انکار ہے اُس نے کہا تو پھر گھر میں جا کر پوچھ لیجئے۔ آپ گھر میں جانے لگے مگر وہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے تھے اتفاق سے ان بزرگ نے چلتے چلتے مڑ کر جو دیکھا تو وہ شخص گرا ہوا مرا ہوا پڑا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو میرے صبر نے قتل کیا۔ اس کا مقصود نکاح کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ان بزرگ کے ساتھ تمسخر و استخفاف ہنسی کرنا تھا کیا انتہا ہے اس حلم و ضبط کی؟ مگر یہ حضرات جتنا حلم کرتے ہیں اتنا ہی خدائے تعالیٰ اُن کی طرف سے انتقام لیتے ہیں۔ حدیث میں ہے مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ۔

---

[1] مراد ابو حنیفہ رح ہیں۔ ۱۲ مصحح

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات ⁂ با دُرد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

کسی شخص کو اوّل تو کسی کے ساتھ بھی دل آزاری کا برتاؤ نہ کرنا چاہیئے خاص کر اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ تو ہرگز ایسا برتاؤ نہ کرنا چاہیئے۔ مولانا فرماتے ہیں

؎ چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد ⁂ میلش اندر طعنۂ پاکاں بُرد

جب طعنہ بھی جائز نہیں تو بھلا اور ایذا۔ تو کیسے جائز ہوگی۔

ازالۂ غضب کی تدابیر

اوپر ذکر تھا غصہ میں بے اعتدالی کا اُسی کا خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ غصہ کو جاری کرنے میں حدود سے خارج ہو جانا بہت بُرا ہے۔ مگر ہماری یہ کیفیت ہے کہ جب غصہ آتا ہے تو کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ بس یہ چاہتے ہیں کہ دل ٹھنڈا کرلیں۔ خصوص میاں جی صاحبان کی تو عموماً یہی حالت ہے۔ آجکل اسکولوں میں تو کسی کی مجال نہیں کہ ایسی کارروائی کرے مگر مکاتیب میں طرح طرح کی سزائیں ایجاد کی جاتی ہیں۔ اُس پر طرہ یہ کہ بیوی سے تو لڑکر آئے اور غصہ اتاریں لڑکوں پر۔ پھر جرم تو کیا ایک لڑکے نے اور پیٹیں گے سب کو۔

اسی طرح بعض ظالم نوکروں کی بری طرح خبر لیتے ہیں اُن کے ٹھوکریں مارتے ہیں۔ اس کا نتیجہ عنقریب یہ ہوگا کہ آج وہ مظلوم اور مغلوب ہیں مگر قیامت میں غالب ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ میرے غلام چوری کرتے ہیں خیانت کرتے ہیں۔ میں اُن کو مارتا ہوں میرا اُن کا کیا معاملہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت میں ترازو کھڑی کی جاویگی ایک پلہ میں اُن کی خطائیں اور ایک پلہ میں تمہاری سزا رکھی جاوے گی جو پلہ بھاری ہوگا اُسی کے موافق عمل ہوگا۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے سب

کو آزاد کیا۔ میں اپنا کام آپ کر لیا کرونگا۔ یہ ان صحابی کا غلبۂ حال تھا۔ حضورؐ کا یہ مطلب نہ تھا۔ بلکہ مقصود یہ تھا کہ اعتدال ہونا چاہیئے۔ کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے ماتحتوں کی کتنی خطائیں معاف کیا کروں۔ آپ نے فرمایا دن رات میں سو دفعہ۔ مراد یہ ہے کہ کثرت سے معاف کیا کرو۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ایسی نہیں کہ اس تعلیم پر عمل کرنے سے کسی کی مصلحت میں کسی قسم کا بھی خلل پڑے اس میں سب کی رعایت ہے اسلئے خاص سو کا عدد مراد نہیں۔ مراد یہ ہے کہ بعض لوگ جو خفیف خفیف باتوں پر تشدّد کرتے ہیں اور تسامح جانتے ہی نہیں یہ نہیں چاہیئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی امر میں اتباعِ ہوائے سے کام نہ لے بلکہ اتباعِ ہُدیٰ کا اہتمام رکھے۔ یہ حالت مذکورہ ہماری شہوت اور غضب کی ہے۔

حکایاتِ حلم وضبط

اسی طرح ہماری اور باتیں بھی ہیں کہ اُن میں زیادہ حصہ اتباعِ ہویٰ کا ہے۔ چنانچہ خرچ ہی کو دیکھو لوگ چھوٹی چھوٹی تقریبوں میں کیسی دھوم دھام کرتے ہیں۔ اس کا منشا صرف جوشِ مسرّت ہی نہیں، بلکہ تفاخر بھی مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ شادی کے علاوہ غمی میں بھی کیا کچھ نہیں کرتے۔ شادی میں تو خیر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ خوشی کا موقع ہے۔ مگر غمی میں دل تو غم میں مبتلا ہوتا ہے پھر چالیسواں اور چھ ماہی اور برسی وغیرہ سب کچھ دھوم دھام سے کیوں کیا جاتا ہے اگر اس کا سبب تفاخر نہیں تو اور کیا ہے۔

ایک رئیس نے ایک موقع پر خوب حقیقت کھولی۔ قصہ یہ ہے کہ اُن کے باپ مر گئے اُس مقام پر چالیسویں کی رسم حسب حیثیت بڑے پیمانے پر ادا کی جاتی تھی۔ چنانچہ اُن کے یہاں بھی چالیسویں کا بڑا سامان ہوا۔ ان کے احباب اور

اور قرابت دار جمع ہوئے کوئی مہمان ہاتھی پر چڑھ کر آیا کوئی گھوڑے پر کوئی رتھ میں کوئی بہلی میں کوئی پالکی میں۔ ان کو مجبوراً سب کا سامان کرنا پڑا کھانے کے لیے ایک وسیع ہال تجویز کیا گیا۔ فرش بچھا کر کھانا چننا شروع کیا۔ بہت دیر میں کھانا چنا گیا۔ عمدہ عمدہ اور نفیس رنگ برنگ کے کھانے تھے۔ بسم اللہ کا وقت آیا تو اس رئیس نے کہا کہ صاحبو مجھے کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ کہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ کاہے کی تقریب ہے آپ سب صاحب جانتے ہیں کہ میرے والد کا سایہ میرے سر پر سے اٹھ گیا اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ کتنی بڑی مصیبت ہے۔ پس مجھ پر یہ مصیبت پڑی ہے کیوں صاحبو کیا مصیبت زدہ کا یہی حق ہے کہ اس کو اور مصیبت پہنچاؤ کیوں صاحبو! کیا یہی ہمدردی ہے کہ میرا تو باپ مرا اور تم آستینیں چڑھا کر کھانے کو تیار ہو بیٹھے پھر کہا اچھا بسم اللہ کیجئے۔ بھلا اس مجمع کس کی غیرت تھی کہ کھانا کھاتا سب عقلاء تھے سب نے اس بات پر غور کیا اور سب نے اس پر اتفاق کیا کہ آج سے یہ رسم موقوف کر دینی چاہیے واقعی نہایت بری اور بالکل ہمدردی کے خلاف حرکت ہے چنانچہ ایک عہدنامہ لکھا گیا اور اس پر سب نے دستخط کیے۔ اور بغیر کھائے چل دیئے۔ اس کے بعد اُن رئیس زادہ نے خدمت گاروں سے کہا کہ مساکین اور محتاجوں کو بلا لاؤ سب کھانا اُن کو کھلا دیا گیا۔ اُن کے تو سات پشت نے بھی ایسا کھانا نہ کھایا ہوگا۔ بہت دعائیں دیں۔

واقعی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو شادی غمی سب ہی میں ہم نے تمام خرافات اور لغو رسمیں اختیار کر رکھی ہیں اور اس قدر لغو اور بے ہودہ رسوم ہیں جس کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں اور جس کا منشا محض اتباع ہوتی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

غصہ میں بے اعتدالی

یہ تو دنیا کے کام ہیں مگر ہمارے اوپر یہاں تک اتباع ہوی کا غلبہ ہے کہ ہماری عبادت بھی اس سے خالی نہیں۔ ٹٹول کر دیکھ لیجئے ہم جتنے کام دین کے کرتے ہیں اُن کی کیا کیفیت ہے مثلاً جیسے قومی مذہبی انجمن ہے فی نفسہٖ دین کا کام ہے طاعت کی چیز ہے مگر اس میں بھی وہی اتباع ہوائے ہے دینی مدرسہ جاری کرنا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ خدمت دین کے واسطے اور ثواب کے لیے ہے مگر ہم کس لیے کرتے ہیں اس کا اندازہ امتحان سے ہو سکتا ہے۔

واقعی امتحان کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ للّٰہیت سے مدرسہ جاری کیا ہے یا نفسانیت سے وہ امتحان یہ ہے کہ اگر مقابلہ میں کوئی اور مدرسہ ہو جائے تو ارباب کارکنانِ مدرسہ کو دیکھو کہ اس کا ہونا اُن کو گراں ہے یا نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے یہ کام ہے تو گرانی نہ ہونا چاہیے اگرچہ یہ بھی اندیشہ ہو کہ ہمارا مدرسہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ اسکی جگہ دوسرا مدرسہ موجود ہے وہ بھی وہی کام کرے گا جو یہ کرتا ہے اور کام ہی مقصود ہے اگر کسی کی نیت میں یہ بات ہے تو بے شک وہ کام اللہ کے واسطے ہے مگر اس کا کہیں نشان بھی نہیں خواب میں بھی اس کا منظر نظر نہیں آتا بلکہ فوراً ان کو فکر پڑ جائے گی کہ بس جی اب تو چندہ گیا گزرا ہمارے مدرسہ کی شہرت بھی گئی گذری اب اس کی فکر میں ہوں گی کہ دوسرے مدرسہ کی مذمت کریں گے اس کا نام مدرسۂ ضرار کہیں گے اُس کی عیب جوئی کریں گے رات دن اُس کے اکھاڑنے کی فکر میں پڑ جاویں گے اور اپنے مدرسہ کی بابت یہ فکر ہوگی کہ اس کا نام بڑھا رہے۔ اپنے مدرسہ کے طلبا کو بھیجکر دوسرے مدرسہ کے طلباء سے مباحثہ کرائیں گے اور نیت یہ ہوگی کہ یہ اُن پر غالب ہوں تاکہ یوں کہہ سکیں کہ وہاں خاک لیاقت نہیں ہوتی ہمارے مدرسہ کے طلباء ایسے

لائق فائق ہیں اور یہ فکر ہوگی کہ ہمارے مدرسہ میں بہت سے طلبار کی دستار بندی ہو تاکہ نام ہو کہ ہم نے اتنوں کو قابل کر دیا۔ اور وہاں کچھ بھی نہیں۔ بس یہ خلوص اور یہ دین ہے افسوس!

حضرات یہ حالت ہے ہمارے دین کے کاموں کی کہ وہ کام بھی نفسانیت سے ہی کئے جاتے ہیں اس کا نام تدین نہیں بلکہ اتباع ہوی ہے۔ اسی طرح آجکل کے پیروں کی حالت دیکھئے کہ اگر ایک پیر ہوں شہر میں اور کوئی دوسرا پیر آجائے تو اب وہ اس فکر میں ہیں کہ ان کی عیب جوئی کریں۔ کہیں خاص جلسہ میں اُن کی مذمت کی جارہی ہے کہیں مجمعوں میں ان کی برائیاں ہو رہی ہیں بس ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ یہاں سے یہ اکھڑ جائیں حضرت یہ دین ہے؟

خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر کام میں خلوص ہو اور دوسرا شخص وہی کام کرنے لگے جو پہلا شخص کر رہا تھا تو یہ پہلا شخص خدا تعالیٰ کا شکر کریگا کہ میرا اور مددگار پیدا ہو گیا یہ تو خوش ہونے کی بات ہے اس پر مسرت ہونی چاہیئے کہ اپنا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ مگر ایسے لوگ اب کہاں؟

بس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دین نہیں بلکہ اغراض ہیں اور یہی اتباع ہوی ہے۔ علی خواصؒ فرماتے ہیں کہ علامت خلوص کی یہ ہے کہ اگر دوسرا کام کرنے والا آجائے تو یہ اُس کام کو چھوڑ دے۔ اب دیکھ لیجئے کہ یہ علامت کہاں کہاں پائی جاتی ہے الا ماشاءاللہ اور ان مستثناؤں میں بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر اُن کے پاس کوئی بیعت ہونے آتا ہے تو یوں کہہ دیتے ہیں کہ دوسری جگہ جاؤ بس جسے مقصود کام ہوگا تو وہ کام ہی چاہے گا کوئی کرے کسی جگہ ہو۔ بس مخلصین کی علامت یہ ہے مگر ہماری تو عام طور پر یہ حالت ہے کہ دین کا کام بھی کریں گے تو اس میں خواہش نفسانی ملی ہوئی ہوگی۔

غرض ہر چیز میں وہی اتباع ہوٰی کی علت ہے

جوشِ تفاخر

اور یہ سب تو اہلِ ظاہر کی کیفیت تھی جس کو میں نے عرض کیا اب اہلِ باطن کے متعلق ایک باریک بات رہ گئی اُس کو عرض کر کے بیان ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ استیعاب کی ضرورت نہیں نمونہ کافی ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ سب سے بڑا طبقہ مشائخ اور سالکین کا ہے جو اہلِ باطن ہیں اور سب سے بڑا کام ذکر اللہ اور اصلاحِ نفس ہے یہ تو بالکل صدق ہی پر مبنی ہونا چاہیئے اغراض کا اس میں کیا دخل۔ مگر افسوس اس میں بھی ہم لوگوں کی خرابی سے یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ یہ بھی اتباع ہوٰی سے خالی نہیں رہا شرح اسکی یہ ہے کہ اوّل یہ سمجھنا چاہیئے کہ مقصود اس طریق کا کیا ہے سو وہ وصول الی الحق یعنی رضائے حق ہے اور ثمرہ اصلاح کا یہی ہے مگر ہم لوگوں نے نادانی سے

طریقت میں خواہشات کا رنگ

اس وقت اس ثمرہ کو چھوڑ کر اپنی طرف سے دوسرا ثمرہ اختراع کیا ہے کسی نے لذات و انوار کو مقصود سمجھا ہے کسی نے کشف و کرامت کو یہ کیفیت تو مخلصین کی ہے اور دنیا پرستوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کو تو ہر حال میں مقصود دنیا ہی ہے ان مخترع ثمرات کو مقصود بنانے میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ اگر وہ مقصود مرتب نہ ہوا تو ناکامی کا شبہ ہو کر بعض وقت تعطّل کی نوبت آجاتی ہے۔ چنانچہ بعض کو کشف و کرامت و انوار وغیرہ نہ ہونے سے ایسے قبض کی نوبت آگئی کہ اپنے کو قتل کر لیا۔ یہ سب خرابی تجویز کی ہے کہ ثمرات خود تجویز کر لیتے ہیں عارف شیرازیؒ اسی کی مذمت میں فرماتے ہیں ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست ٭ کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

دیکھئے عارف نے خود رائی کو کفرِ طریق فرمایا ہے۔ اس طریق کا حاصل تفویض

محض ہے یعنی کام کرے اور ثمرات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرے حتیٰ کہ یہ شان ہونا چاہیئے سے

ارید وصاله ویرید ہجری　　فاترک ما ارید لما یرید

عارف شیرازیؒ نے ترجمہ اس کا خوب کیا ہے سے

میلِ من سوئے وصال و میل او سوئے فراق ؛ ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

نیز عارف شیرازی کہتے ہیں سے

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ؛ کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

وصل حقیقی اس شعر پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ قیامت کا عذاب بھی تو فراق ہی ہے جیسا خود حافظ ہی دوسری جگہ فرماتے ہیں

سے شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت ؛ فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر ؛ کنایتے ست کہ از روزگار ہجراں گفت

تو کیا اُس کی بھی پرواہ نہ کرنا چاہیئے حالانکہ اس کلام میں اس فراق کا محذور عنہ ہونا مصرح ہے جواب یہ ہے کہ ایک تو فراق حقیقی ہے اور ایک فراق صوری ہے اور عارف کی مراد پہلے کلام میں فراق صوری ہے اور عذاب قیامت فراق حقیقی ہے جو دوسرے کلام میں مذکور ہے۔ عارف شیرازی کے کلام سابق میں وہ مراد نہیں۔ مطلب یہ کہ جس فراق و وصل کے تم طالب ہو اُس کی بحث نہ ہونا چاہیئے بلکہ دوست کی رضا کو دیکھنا چاہیئے جیسی اُس کی رضا ہو اُسی کو گوارا کرنا چاہیئے گو طبع کو ناگواری ہو اس کو ایک مثال میں یوں سمجھئے کہ مثلاً ایک محبوب سے عاشق کو وصل حسی میسر ہو اور وہ بیٹھے ہوئے اُس سے باتیں کر رہا ہے۔ ایسی ہی حالت میں اس نے جلیب سے روپیہ نکال کر دیا کہ بازار سے فلاں شئ خرید لاؤ۔ ظاہر ہے کہ اس دس منٹ کے عرصہ میں ظاہری وصل سے یہ محروم رہے گا۔ مگر عاشق کی شان کیا ہے؟

شان یہی ہے کہ فوراً بازار چلا جائے اور محبوب کے ظاہری فراق کو ظاہری وصل پر ترجیح دے یعنی جو بُعد اس کا تجویز کیا ہوا ہے اُس کو اختیار کرے گو طبعاً ناگوار ہو۔ اپنی تجویز کو ترجیح نہ دے کیونکہ حقیقی وصل رضائے محبوب ہے اور یہ فراق محض ظاہری ہے حقیقی فراق نہیں۔

اب دونوں کلام میں تعارض نہ رہا۔ غرض مقصود رضا ہے ہر حال میں راضی رہنا چاہیئے گو وہ حال طبعاً ناگوار ہو۔ سالکین کو ایسی جہالتیں بہت پیش آتی ہیں مثلاً دل چسپی کے ساتھ ذکر کرتا تھا پھر اُس سے دل چسپی جاتی رہی ذوق وشوق کم ہو گیا۔ پس خیال کرتا ہے کہ میں مردود ہو گیا بڑا غمگین ہوتا ہے۔ بعض کو قبض کی حالت ایسی پیش آتی ہے کہ خودکشی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں سو اس کا کچھ خیال نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ جو حالت بھی پیش آوے اُس پر راضی رہنا چاہیئے اپنی رائے کو دخل ہی نہ دے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو دروے بسط بیں ٭ تازہ باش وچیں میفگن بر جبیں
چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو ٭ آں صلاح تست آیس دل مشو

اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش ٭ بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

غرض کچھ بھی حال ہو۔ عاشق کا مذہب یہ ہونا چاہیئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ٭ ور بکشی فدائے تو ٭ جاں شدہ مبتلائے تو ٭ ہر چہ کنی رضائے تو

اور یہ مذہب ہونا چاہیئے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من ٭ دل فدائے یار دل رنجانِ من

کسی حالت میں بھی گھبرائے ناگوار نہ ہو اور جو شخص اسکے خلاف لذات کا طالب ہے وہ حق تعالےٰ کا طالب نہیں کیونکہ لذت عین حق تو نہیں ہے بس عاشق صادق

وہ ہے جو حق کا طالب ہو نہ احوال کا نہ مواجید کا کیونکہ یہ باتیں نہ موعود ہیں نہ لازم ہیں کبھی ہوتی ہیں کبھی نہیں ہوتیں۔ اسلئے ان کی طرف التفات ہی نہ کرنا چاہیئے۔ توجہ صرف اُس چیز کی طرف کرو جو بوجہ موعود ہونے کے مرتب ہوتی ہے وہ کیا ہے توجہ حق الی العبد۔

چنانچہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ اسی کی نسبت فرماتے تھے کہ ہمارا مقصود تو ذکر سے یہ ہے فاذکرونی اذکرکم حق تعالےٰ فرماتے ہیں تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ یہ ایسا ثمرہ ہے جس میں بوجہ وعدہ کے کبھی تخلف ہی نہیں ہوتا یعنی ہم اللہ تعالیٰ کو اسلیے یاد کیا کریں کہ وہ ہمیں یاد کرینگے اس کے سوا حیات دنیا میں کسی اور ثمرہ کے ہم طالب نہ ہوں باقی اصل ثمرہ یعنی رضا و دخول جنت وہ تو آخرت میں ہو ہی گا۔ بس اور کیا چاہیئے ایسا شخص جس کا یہ مطلوب ہو کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ یہ ہے حقیقت مقصود سلوک کی مگر ہم اس میں بھی بدوں اتباع ہویٰ کے ہوئے نہ رہے۔

بھلا بتلائیے جس طریق کا مبنیٰ خلوص ہو جب اس میں بھی نفس کا اتباع ہو رہا ہے جیسا ابھی اوپر بیان ہوا کہ مخترع ثمرات کو مقصود بنا رکھا ہے تو دیکھئے! ہماری حالت کہاں سے کہاں پہنچی ہے پس اسی کی شکایت ہے اس آیت میں ومن اضلُّ ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی مّن اللہ۔

اقسامِ ہویٰ

ہر چند کہ ہویٰ لغۃً خواہش محمود و مذموم دونوں کو عام ہے مگر اکثر ہویٰ کا اطلاق ہوائے مذموم ہی پر ہوتا ہے اس صورت میں بغیر ھدًی من اللہ قید واقعی ہوگی اور کبھی ہویٰ کا اطلاق ہوائے محمود پر بھی آتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ بعض عورتیں آپ سے کہتی تھیں کہ ہم نے اپنے نفس کو آپ کے لیے ہبہ کیا یعنی اپنے کو بلا مہر کے آپکے نکاح میں دیتی ہیں

کیونکہ آپ کا نکاح بلا مہر بھی صحیح ہو جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ان عورتوں کو ایکبار بے حیا کہہ دیا۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی

وامرأۃ مومنۃ إن وھبت نفسھا للنبی الیٰ قولہ ترجی من تشاء منھن وتؤوی الیک من تشاء۔

اس پر حضرت عائشہؓ نے آپ سے عرض کیا ما اری ربک الا یسارع فی ھواک۔ یہاں بھی لفظ ھَوَا آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش محمودہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ ھَوَا کا اطلاق ہوائے محمود پر بھی ہوتا ہے اس صورت میں بغیر ھدی من اللہ قید احترازی ہوگی۔ فیصلہ یہ ہوگا کہ ہویٰ دو قسم کی ہے ایک وہ جو تابع ہدیٰ کے ہو اور ایک وہ جو تابع ہدیٰ کے نہ ہو پس جو ہویٰ تابع ہدیٰ کے ہے وہ ہویٰ اہل اللہ کی ہے اُن کا نفس مطمئنہ ہوتا ہے جس کا تعلق رضا حق سے ہو چکا ہے یہ وہ بات ہے جو بہلولؒ کی حکایت میں ہے کسی بزرگ سے انہوں نے پوچھا کہ کس حال میں ہو ان بزرگ نے فرمایا اُس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو جس کی خواہش کے خلاف دنیا میں کچھ بھی نہ ہوتا ہو کہا یہ کیسے؟ فرمایا یہ ایسے کہ میں نے اپنی خواہش کو حق تعالیٰ کی خواہش میں فنا کر دیا ہے۔ اب کوئی واقعہ میری خواہش کے خلاف ہوتا ہی نہیں پھر مجھے راحت ہی راحت ہے رنج کیوں ہو۔

واقعی جس نے اپنی خواہش کو فنا کر دیا ہو۔ خدا تعالیٰ کی خواہش ہیں جو حاصل ہے فانی فی الحق ہونے کا۔ وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے اور اس صورت میں جو چیز خدا کی خواہش اور ارادہ کے موافق ہوگی وہ اس کی خواہش کے موافق بھی ہوگی۔ پس دنیا میں تمام حوادث اور تمام واقعات اسکی مرضی کے موافق ہی ہوں گی۔ پھر اسکو رنج کیوں ہوگا۔ اس کا نفس مطمئنہ ہوگا اور وہ کس پر مطمئن ہوگا تعلق بہ

محبوب پر مطمئن ہوگا جیسا ارشاد ہے

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

اسی واسطے وہ کسی حالت اور کسی چیز سے دلگیر نہیں ہوگا کیونکہ کوئی چیز اُس کے خلاف ہی نہیں ہوتی۔ مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ وہ دعا نہیں کرتا وہ دُعا ضرور کرتا ہے کیونکہ وہ دعا خود حق تعالیٰ کی خواہش کے موافق ہے۔

دعا پر ایک اشکال

اس دلیل سے یہاں ایک اشکال جو بظاہر واقع ہوتا تھا۔ رفع ہوگیا اور اسی اشکال کی وجہ سے بعض اہل حال دعا کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اشکال کی تقریر یہ ہے کہ جس بات کے لیے دعا کی جاتی ہے دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ خدائے تعالےٰ کی خواہش و ارادہ کے موافق ہے یا مخالف ہے۔ اگر موافق ہے تو اس کا آپ ہی ظہور ہو جاویگا دُعا کی کیا حاجت ہے اگر مخالف ہے تو ایسی بات کی دعا کرنا گستاخی ہے۔

جواب یہ ہے کہ جس بات کا خلاف ارادہ حق ہونا متیقن نہ ہو بلکہ محتمل بین الامرین ہو۔ اسکے لیے دعا کرنا نصوص میں مامور بہ ہے اور مامور بہ کا بجالانا خود حق تعالیٰ کی خواہش کے موافق ہے پس دعا کرنا خلاف خواہش حق نہ ہوا ہاں جس امر کا خلاف خواہش حق ہونا اس کے لئے متیقن ہو اُس کے لیے دعا کرنا ممنوع ہے اور خلاف خواہش ہونے کے علم کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی امر حرام و ممنوع کے لیے دعا کی جائے جس کا خلاف خواہش حق ہونا نصوص سے معلوم ہے دوسرے یہ کہ وہ مطلوب حرام اور ممنوع تو نہیں مگر اس کا خلاف خواہش حق ہونا... دلیل صحیح سے معلوم ہو چکا ہے جیسے کوئی اپنی نبوت کی دعا کرنے لگے۔

اب ایک سوال باقی رہا وہ یہ کہ جس امر کا خلاف منشاء حق ہونا متیقن نہیں۔ جس کے لیے دعا جائز ہے اگر اس کے لیے دُعا کی گئی اور عین دعا کی حالت میں یہ

احتمال ہے کہ قبول نہ ہو تو اس وقت دوسرا اشکال ہوگا وہ یہ کہ دعا تو طلب ہے اور طلب کے وقت ایک شق کو ترجیح دے رہا ہے اور تفویض میں دونوں شقیں مساوی تھیں تو دعا و تفویض کیسے جمع ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عارف عین دعا کی حالت میں قبول و عدم قبول دونوں پر دل سے راضی ہوتا ہے مگر طلب میں ایک کو ترجیح دینا یہ بھی رضاہی کا اتباع ہے تو اس وقت بھی درحقیقت وہ دونوں احتمال پر رضا ہی کا طالب ہے، اگر دعا قبول ہوئی تو ثواب بھی ملے گا اور مراد ظاہری بھی پوری ہوگی اور قبول نہ ہوئی تو اجر و ثواب سے خوش ہوگا اور مرادِ حق کے پورا ہونے پر اپنی مراد سے زیادہ خوش ہوگا ؎

گر مرادت را مذاقِ شکر ست ؛ بے مرادی نے مرادِ دلبر ست

پس طلب و دعا اور تفویض و رضا دونوں اس طرح جمع ہوگئی یہاں مضمون مقصود ختم ہوگیا۔ اب صرف مقصود کے متعلق دو تین مختصر جملے باقی رہ گئے ہیں وہ معروض ہیں ایک یہ کہ یہ تو معلوم ہوگیا کہ خواہش کے فنا کرنے کی ضرورت ہے اب یہ بات معلوم کرنا رہ گئی کہ فانی ہونے کی کیا صورت ہے اسکو مولانا فرماتے ہیں ؎

با ہوا و آرزو کم باش دوست ؛ چوں یضلک عن سبیل اللّٰہ اوست

حاصل یہ ہوا کہ ہوا کی فانی ہونے کی صورت یہ ہے کہ اُس کا اتباع نہ کرے اس سے وہ مضمحل ہوجاویگا یہی اضمحلال فنا ہے پھر اس کی مقاومت آسان ہوجاوے گی اس کا کسی قدر بیان اثنار وعظ میں بھی ہوچکا ہے اس سے ہوا و آرزو کے فنا کرنے کا حاصل تو معلوم ہوگیا آگے اس کے طریقہ کا بیان ہے ؎

ایں ہوا را نشکند اندر جہاں ؛ ہیچ چیزے جز کہ سایہ ہمرہاں

یعنی خواہش نفسانی کا شکستہ کرنے والا رفیق طریق کے سوا کوئی نہیں آگے

رفیق طریق کی تعیین فرماتے ہیں ؎

نفس نتواں کشت الاظل پیر — دامنِ آں نفس کش راسخت گیر

یہ ہے وہ رفیق طریق یعنی شیخ کامل پس فانی بننے کی صورت یہ ہے کہ شیخ کامل کا دامن پکڑ لو۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی کے مرید ہی ہو جاؤ۔ اس معاملہ میں بہت لوگ بڑی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ لوگ بیعت کو ضروری یعنی شرط اور کافی یعنی علت سمجھتے ہیں کام نہیں کرتے یا بدوں بیعت کام کو نافع نہیں سمجھتے پس خوب سمجھ لو کہ شیخ کا اتباع ضروری ہے بیعت ہونا ضروری نہیں یعنی اس پر اصرار نہ کرو کہ بیعت ہی ہو کر کام کرونگا۔ بس کام کرنا چاہیئے۔ اور شیخ سے کام لینا چاہیئے۔

ارکان تربیت

اب کام کی تفصیل بھی سُن لو۔ شیخ کے تو دو کام ہیں ایک اصلاح۔ ایک ذکر کی تعلیم اور ان میں بھی اصل کام اصلاح ہی ہے ذکر اسکی اعانت و برکت کے لیئے ہے باقی اصلاح کیا چیز ہے سو وہ نفس کو پاک کرنا ہے جو مانع سے یعنی تربیت باطنی کرنا مگر اسکی اعانت کے لیے شیخ ذکر اللہ کی تعلیم کرتا ہے۔ یوں آدمی اصلاح کی خود بھی تدبیر کرسکتا ہے مگر شیخ کی تعلیم میں غیبی برکت ہوتی ہے۔ باقی نرا وظیفہ بدوں اصلاح کے مطلق کافی نہیں ہے۔ اس خیال کی بھی اصلاح ضروری ہے، بہت لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ نرا وظیفہ ہی اصلاح کے لیے کافی ہے حالانکہ اصلاح کی حقیقت ہے ہُوا کا نفس سے نکالنا اگر ہوا نفس کے اندر ہی تو فرمائیے نرا وظیفہ کیسے کافی ہو گا یہ کام تو شیخ کا تھا اور مرید کا اصل کام ہے اتباع۔ اور اتباع کی تکمیل کے لیے دوسرا کام ہے شیخ کو حالات کی اطلاع۔ بس ہیں خلاصہ اور عطر تصوف کا بتلائے دیتا ہوں۔ کہ اصل مقصود ہوٰی کو ہدٰی کے تابع کرنا ہے اور یہ جب ہوگا کہ نفس

سے ہوا نکل جائے یعنی ہوائے نفس مغلوب ہو جائے اور یہ بات شیخ کے واسطے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ پس یہ ہے خلاصہ۔

دوسرا جملہ یہ کہ اگر کسی کو شیخ کامل نہ ملے تو وہ یہ تدبیر کرے کہ مشائخ کے ملفوظات و احوال کا مطالعہ کرے اور کتابوں سے فنائے نفس کا طریقہ معلوم کر کے عمل کرے مگر شیخ کی تلاش میں برابر رہے کیونکہ کتابوں کے مطالعہ سے شیخ کے برابر نفع نہیں ہو سکتا پس جس کو شیخ میسر ہو وہ تو ایسا ہے جیسے طبیب سے علاج کرانے والا۔ اور جس کو طبیب نہ ملے وہ خود کتابوں میں تدابیر دیکھ کر ایسا علاج شروع کر دے جس میں خطرہ نہ ہو لیکن ایسا نفع تھوڑا ہی ہو گا جیسا طبیب سے رجوع کرنے والے کو ہوتا ہے۔

غرض مشائخ کا فرض منصبی نفس کی اصلاح ہے یعنی دواعی ذمیمہ کا مغلوب ہو جانا اور جیسے طب ظاہر میں امراض جسم کے مغلوب کرنے کی تدابیر ہیں اور یہی معنی ہیں صحت کے گو دواعی مرض کے یعنی اخلاط وغیرہ بدن کے اندر باقی رہتے ہیں مگر اعتدال کے سبب مضر اثر نہیں کرتے۔

اسی طرح طب باطن میں امراض نفس کے مغلوب کرنے کی ایسی تدابیر ہیں جن کے استعمال سے دواعی ذمیمہ کا اضمحلال ہو جاتا ہے بس شیخ یہی تدبیر بتلاتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتا۔ اور یہ تدابیر تم خود بھی اپنے مطالعہ سے معلوم کر سکتے تھے مگر تمہارا معلوم کرنا ویسا ہی ہو گا۔ جیسا غیر طبیب کتب سے طریق علاج معلوم کرتا ہے اور دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ اور ان مجموعی تدابیر کا حاصل یہ ہے کہ اول تو علم شریعت حاصل کرے تاکہ افعال و اخلاق کا بھلا اور برا ہونا معلوم ہو کہ یہ چیز بری ہے اور یہ اچھی ہے۔ پھر جو بری خواہش نفس کے اندر پیدا ہو اس کے مقتضا پر عمل نہ کرے اگر پھر خواہش پیدا ہو پھر ایسا ہی کرے

چند روز میں تقاضا جاتا رہے گا۔ اور یہ زوال تقاضا ہر شخص کی استعداد کے موافق مختلف طور پر ہو گا (مثلاً کسی کو تین بار اس پر عمل کرنے میں نفع ہو گا کسی کو زیادہ میں کسی کو کم میں) اگر کچھ مدت تک ایسا کیا جاوے تو مقاومت نفس آسان ہو جائیگی یہ طریقہ دونوں شقوں کے ساتھ میں نے اسلیئے بیان کر دیا کہ بعض دفعہ شیخ کامل نہیں ملتا تو اس صورت میں طالب کو کیا کرنا چاہیئے پس وہ یہ دو کام ہے ایک تحصیل علوم دوسرے ہوائے مذموم میں نفس کی مخالفت۔ مگر یہ لازم ہے کہ شیخ کی تلاش میں رہے۔ تیسرا جملہ یہ کہ یہ بھی معلوم کرنا چاہیئے کہ شیخ کامل کسے کہتے ہیں۔

علاماتِ شیخ کامل

پس سُنیئے شیخ کامل کی سات علامتیں ہیں ایک علامت ہے کہ اس کو علم دین بقدر ضرورت حاصل ہو۔ ایک[۲] یہ کہ علمائے حق سے اس کو مناسبت ہو ایک[۳] یہ کہ جتنا علم رکھتا ہو اس پر عمل کا اہتمام ہو۔ چوتھے[۴] اس کی صحبت میں یہ برکت ہو کہ روز بروز دنیا سے دل سرد ہونے لگے اور حق تعالیٰ سے محبت بڑھنے لگے۔ پانچویں[۵] دقیق علامت ہے وہ یہ کہ اہل علم و اہلِ فہم کی توجہ اس کی طرف زیادہ ہو یعنی علماء اور صلحاء کا میلان اُس کی طرف زیادہ ہو۔ اُمراء اور عوام الناس کا میلان زیادہ نہ ہو۔ چھٹے[۶] یہ کہ وہ کسی شیخ کامل کا مجاز ہو یعنی کسی مشہور بزرگ نے اسکو بیعت و تلقین وغیرہ کی اجازت دی ہو۔ ساتویں[۷] یہ کہ اُس کے اصحاب میں زیادہ کی حالت اچھی ہو۔ یعنی اُس کے ہاتھ سے لوگوں کو شفا حاصل ہوتی ہو اور طریق باطن میں شفا اسی کا نام ہے کہ اپنی حالت شریعت کے موافق ہو جائے مولانا ان ہی شرائط کا خلاصہ فرماتے ہیں ؎

کار مرداں روشنی و گرمی ست   کار دوناں حیلہ و بے شرمی ست

روشنی سے مراد معرفت ہے اور گرمی سے مراد محبت ہے یعنی شیخ کامل وہ ہے جسے معرفت بھی حاصل ہو اور محبت بھی۔ ایک مقام پر مصنوعی پیروں کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ۔۔۔ پس بہر دستے نباید داد دست

حقوقِ شیخ

اور جب شیخ کامل مل جائے تو اس کے حقوق کے متعلق فرماتے ہیں ؎

نفس نتواں کشت الا ظلِ پیر ۔۔۔ دامن آں نفس کش را سخت گیر

اسی کو شیخ فرید عطار فرماتے ہیں ؎

در ارادت باش صادق اے فرید ۔۔۔ تا بیابی گنج عرفاں را کلید

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق ۔۔۔ عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

اور شیخ کے اور بھی حقوق ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اس کا جی برا نہ کرے اسکی کوشش کرے کہ اس کا دل میلا نہ ہو یہاں تک کہ اگر وہ ادب و تعظیم سے خوش ہو تو اس کی تعظیم کرے اور جو تعظیم نہ کرنے سے خوش ہو تو تعظیم نہ کرے یہ نہ ہو کہ اپنی مرضی کے موافق عمل کرے اور شیخ کی مرضی کا اتباع نہ کرے۔ یہ حاصل ہے اتباع شیخ کا۔

خلاصہ تمام بیان کا یہ ہے کہ اتباع ہوٰی کو ترک اور اتباع ہدٰی کو لازم کرنا چاہیئے یہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور اسی سے اصلاح ہو سکتی ہے بدوں اس کے منزل مقصود تک پہنچنا سخت دشوار ہے اور یہ سمجھ لیجئے کہ بدوں کئے ہوئے کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسلیے کام کرنا اور ہمت سے کام لینا چاہیئے اس ہمت میں ہماری حالت یہ ہے کہ دنیوی امور میں تو جان لڑا دیتے ہیں اور دنیوی مقاصد کے حاصل کرنے میں عمریں ختم کر دیتے ہیں۔ مگر دین کے بارہ میں دیکھا

جاتا ہے کہ عام طور سے قصد ہی نہیں کرتے بس یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے بٹھائے دین مل جائے کچھ کرنا نہ پڑے۔ تو سمجھ لو کہ بدوں سعی کے کچھ نہیں ہوتا۔ عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے۔ اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق مرحمت فرمائیں فقط۔

اشرف علی

جمادی الاخری ۱۳۵۵ھ

نسیان النفس

اپنے عیوب نہ دیکھ کر دوسروں کے عیوب پر ملامت کرنے کے بارے میں حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے جامع مسجد تھانہ بھون میں ۵ رجب المرجب سنہ ۱۳۳۰ھ کو ۲ گھنٹے تک بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی مولوی سعید احمد صاحب مرحوم نے اسے قلم بند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونومن بہ و نتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ و علیٰ الہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قال اللہ تبارک وتعالیٰ۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

تمہید یہ ایک آیت ہے جس میں ظاہراً اہل علم کو خطاب اور ان کے ایک عمل پر ان کو عتاب کیا گیا ہے یہ آیت اسی معنی میں نہایت مشہور ہے اور اکثر لوگ اس کی یہی سمجھتے ہیں اور اس کا اثر یہ ہے کہ غیر اہل علم اپنے کو بوجہ فقدان علم اس کی بری سمجھتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس امر پر باز پرس کی گئی ہے اور جو امر اس باز پرس کی بناء ہے اس میں عوام الناس بھی

بدرجہ اولیٰ شریک ہیں۔

اس آیت میں اوّل سے آخر تک غور کرنے سے عوام اور علماء سب کے لیے اس آیت کا عام ہونا بخوبی واضح ہو جائیگا۔ اسی طرح قرآن کی دوسری وہ آیات بھی ہیں۔ جن میں سے بعض میں بظاہر اہل علم کو خطاب معلوم ہوتا ہے۔ جس کی بناء پر عوام الناس ان کے مضمون سے اپنے کو بالکل بری سمجھتے ہیں بلکہ بسا اوقات علماء کو کسی مضمون کی وجہ سے مورد عتاب دیکھ کر اپنا عالم نہ ہونا غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے جہل پر فخر کرتے ہیں۔ اور بعض میں عوام الناس کو خطاب معلوم ہوتا ہے ان سے اہلِ علم اپنے کو بری سمجھتے ہیں لیکن یہ تقسیم اسی وقت تک ہے۔ جب تک کہ سرسری اور ظاہری نظر کی جائے ورنہ غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احکام شرعیہ سب عام ہیں ہر جاہل و عالم اس کا مخاطب ہے لہٰذا نہ کسی کو ناز کا موقع ہے اور نہ اعتقاد برات کی گنجائش ہے اور چونکہ یہ آیت بھی احکام شرعیہ میں سے ایک حکم ہے اسلیے اس کا مضمون بھی سب کو عام ہے یہ مجمل تعیین ہے اس آیت کے مضمون کی۔

ظاہر مدلول آیت

اب مجھے اس آیت سے جو بیان کرنا مقصود ہے اس کو مجملاً بیان کرتا ہوں۔ اور تفصیل اسکی انشاء اللہ تعالیٰ پوری بیان میں ہو گی۔ لیکن اسکے لیے اول آیت کا ترجمہ کر دوں کہ آیت کا مدلول ظاہری معلوم ہو جائے۔ فرماتے ہیں کہ کیا تم دوسروں کو تو نیک اور بھلی باتوں کی فرمائش کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو (یعنی یہ کیا لغو حالت ہے) حالانکہ تم کتاب اللہ پڑھتے ہو (اور اس میں یہ لکھا ہے کہ عمل قول کے مخالف ہونا مذموم ہے۔ اور حکم خداوندی کے بالکل خلاف ہے)

کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ یہ مذموم ہے اور خدا کے نزدیک بُرا ہے۔ یہ حاصل ہے آیت کے مدلول ظاہری کا۔

اس آیت کے متعلق ایک شبہ تو اہل علم کو ہوا اسکو انشاء اللہ ضمناً بیان کر دیا جائیگا اور ایک شبہ عوام الناس کو ہوا وہ یہ کہ انہوں نے صرف علماء ہی کو اس آیت کو مخاطب سمجھا اور اپنے کو بری سمجھا اور سمجھا کہ صرف علماء پر ملامت ہے اور قرینہ اس شبہ کا یہ ہوا کہ عنوان ایسا اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب وہ شخص ہے جو کہ دوسرے کو امر یا نصیحت کرتا ہے اور یہ منصب صرف علماء کا ہے لہٰذا علماء ہی اس آیت کے مخاطب بھی ہوں گے یہ عوام الناس کا شبہ ہے اور اثر اس شبہ کا یہ ہوا کہ اپنے کو اس خطاب سے بالکل پاک سمجھا اور یہ بہت بڑی خرابی ہے۔

اس واسطے کہ یہ سمجھنا ایسا ہے جیسا کہ کوئی مریض جو کہ مرض مزمن میں مبتلا ہو اپنے کو اس مرض سے پاک سمجھنے لگے۔ سو ظاہر ہے کہ ایسا مریض نہایت بدقسمت ہے اور اس کا مآل نہایت بُرا ہے کیونکہ اگر یہ اپنے کو مریض سمجھتا تو اس کے معالجے اور ازالے کی فکر بھی کرتا کسی طبیب سے رائے لیتا اس کی تجویز پر عمل کرتا مضرات سے پرہیز کرتا۔ اور جب کہ وہ اپنے کو مریض ہی نہیں سمجھتا تو نہ کسی طبیب سے رجوع کرنے کو ضروری سمجھے گا نہ پرہیز کریگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ مرض میں ترقی ہوتی جائے گی اور اس سے پھر دوسرے امراض پیدا ہوں گے۔ ایک خرابی تو اپنے کو پاک سمجھنے کی یہ ہوئی۔ دوسرے جب عوام نے سمجھا کہ علماء کو اپنے عمل نہ کرنے اور دوسروں کے نصیحت کرنے پر عتاب ہوا ہے تو انہوں نے اپنے عالم نہ ہونے کو غنیمت جانا بلکہ بسا اوقات اپنے جاہل ہونے پر فخر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے تو جاہل ہی اچھے۔ حالانکہ یہ نہایت لغو فخر

ہے اس کی حقیقت انشاء اللہ آگے معلوم ہو گی۔

خلافِ عقل مستی

آج کل ہم لوگوں کی کچھ ایسی عجیب حالت ہے کہ ہم کو نہ نقائص کی خبر نہ فخر و مباہات کی اشیاء پر اطلاع ۔ جس چیز پہ جی چاہا فخر کرنے لگے ۔ جس چیز میں چاہا عیب نکال دیئے۔

چنانچہ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ وہ اپنے غریب اور مفلوک الحال ہونے پر فخر کیا کرتے ہیں اور امارت میں عیب نکالا کرتے ہیں ۔ بھلا امیر آدمی اگر فخر کرے تو ایک حد تک بجا بھی ہے کیونکہ اسکے پاس سامانِ فخر موجود ہے ۔ غریب آدمی جس کے کھانے کو ٹکڑا ، پہننے کو لنگوٹا وہ کس چیز پہ فخر کرے اور پھر لطف یہ کہ یہ فخر قولاً ہی نہیں بلکہ عمل میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے چنانچہ جب کبھی موقع تقریب وغیرہ کا ہوتا ہے تو ہم نے ان غرباء ہی کو زیادہ اینٹھتے ہوئے دیکھا ہے ان ہی کو سب سے زیادہ نخرے اور ناز سوجھتے ہیں اور اس کی یہ بھی وجہ ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے اور یہ خیال کریں گے کہ یہ شخص ہماری دعوت کا منتظر ہی بیٹھا تھا ۔ اسی طرح ان غرباء کا ایک اور مقولہ بھی مشہور ہے کہتے ہیں کہ میاں کوئی مال میں مست ہے ، کوئی کھال میں مست ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کھال میں مست ہونے کے کیا معنے ہیں ۔ لیکن خیر! انہوں نے اتنا اقرار تو کیا کہ ہم میں عقل نہیں کیونکہ اپنے کو مست کہا اور مستی عقل کے خلاف ہوتی ہے اور اگر عقل ہوتی تو ایسی حرکت ہی کیوں کرتے۔

خُبثِ باطن

حدیث میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ کو تین آدمیوں سے سخت بغض ہے ایک وہ شخص کہ بادشاہ ہو کر جھوٹ بولے

کیونکہ جھوٹ بولنے کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ جو بات سچ بولنے میں حاصل نہ ہوسکے اس کو اس ذریعہ سے حاصل کیا جائے اور یہ ضرورت اس شخص کو پیش آ سکتی ہے جس کے مزاحم کوئی ایسی قوت موجود ہو جو کہ اس کے اور مقصود کے درمیان حائل ہو جائے اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کو کوئی ایسا مزاحم پیش نہیں آیا لہٰذا اس کا جھوٹ بولنا خبث باطن کی کھلی دلیل ہے دوسرے وہ شخص کہ بڈھا ہو اور پھر زنا کرے کیونکہ زنا اوّل تو حرام ہے دوسرے بڈھے آدمی میں کوئی ایسا جوش بھی نہیں جس کی بناء پر کسی مرتبے میں اس کو معذور رکھا جا سکے اس لیے اس کا یہ فعل بھی اس کے خبثِ باطن کی دلیل ہے۔ تیسرے وہ شخص جو کہ غریب ہو اور تکبر کرے۔

گویا حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے شخص تیرے پاس کیا چیز ہے؟ کہ جس پر تو تکبر کرتا ہے تو ایسے ہی جاہل کا فخر بھی بہت ہی بُرا ہے۔ بالخصوص جبکہ جہل پر فخر ہو یعنی جاہل آدمی کا دوسری اشیاء پر فخر کرنا بھی زیبا نہیں لیکن صفتِ جہل پر فخر کرنا بہت ہی نازیبا ہے کیونکہ علم انسان کے لیے حیات اور جہل موت۔

دولت کا فخر

اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ اکثر امراء جو روپیہ پیسے پر فخر کرتے ہیں یہ بھی حقیقت ناشناسی کے سبب سے ہے کیونکہ جب ان میں علم نہیں تو گویا فخر کی کوئی بات نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ؎

الناس من جهة التمثال اکفاء　　ابوهم آدم والامُّ حواء

ما الفخر الا لاهل العلم انهم　　علی الهدی لمن استهدی ادلاء

دنیا پر فخر کرنے والوں کی نادانی بیان کرتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ حسب نسب کوئی فخر کی چیز نہیں کیونکہ تمام لوگ ایک آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں

اور اسی کے حکم میں ہے مال پر فخر کرنا کیونکہ آگے جو علت مذکور ہے مشترک ہے آگے کہتے ہیں کہ البتہ فخر اگر کریں تو علماء کر سکتے ہیں کیونکہ وہ خود راہِ راست پر ہیں۔ اور دوسروں کے لیئے دلیل راہ بنتے ہیں اور مال کو تو اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس کا نہ ہونا موجب فخر ہو سکتا ہے کیونکہ مال کی حالت سانپ کی سی ہے کہ اس کا ظاہر نہایت دل کش، دلفریب چکنا چمک دار لیکن اس کے باطن میں مہلک زہر بھرا ہے۔

اسی طرح مال اگرچہ ظاہر میں آسائش و راحت آرام کا سبب ہے لیکن اس کا باطن تمام خرابیوں اور مصیبتوں کی جڑ ہے تو مال پر فخر کرنا ایسا ہے جیسا کہ کوئی اس پر فخر کرنے لگے کہ میرے تمام جسم کو سانپ لپٹے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اس پر فخر کرے تو ظاہر ہے کہ سب عقلاء اس کو احمق بنائیں گے اسی طرح مال پر فخر کرنے والے کو بھی احمق سمجھنا چاہیئے۔

دولت کی بے وفائی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں

رضینا قسمۃ الجبار فینا لنا علم و للاعداء مال

فان المال یفنیٰ عن قریب وان العلم باقٍ لا یزالُ

یعنی مال تو فنا ہو جائے گا۔ اور علم ہمیشہ باقی رہے گا۔

صاحبو! مال وہ چیز ہے کہ اکثر تو حالتِ صحت ہی میں جاتا رہتا ہے ورنہ مرض الموت میں تو اس کا جاتا رہنا بالکل ہی یقینی ہے کیونکہ شریعت مطہرہ کا قانون ہے کہ مرض الموت میں دو تہائی مال سے مالک کا حق جاتا رہتا ہے اور وارثین کا حق اس کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرض الموت میں وصیت کرے یا اپنا مال کسی کو ہبہ کرنا چاہے تو وہ ایک ثلث میں جاری ہوتا

ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے پاس تین ہزار روپیہ ہو اور وہ ان تین ہزار کی وصیت کرے یا دو ہزار کی وصیت کرے تو یہ صرف ایک ہزار میں جاری ہوگی۔ بقیہ دو ہزار ورثا کو دیا جائے گا اور یہ ایک تہائی بھی اس کے آنسو پونچھنے کے لیے اس کو دیدیئے ورنہ وارثین کا حق کل مال کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اگر وصیت نہ کرے تو یہ ثلث بھی وارثوں ہی کو مل جاتا ہے پس معلوم ہوا کہ مال جس کو ہم اپنا سمجھ رہے ہیں۔ واقع میں ہمارا نہیں ہے۔ بلکہ بسا اوقات ایسوں کو پہنچ جاتا ہے کہ جن کو دینا گوارا بھی نہیں ہوتا۔ فیف اس تہائی پر بھی جو کچھ اختیار رہتا ہے وہ مرنے کے قبل تک رہتا ہے اور مرنے کے بعد تو کچھ بھی اختیار نہیں رہتا۔ یعنی اگر کوئی کفن بھی نہ دے تو یہ کچھ نہیں کر سکتا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ مال بہت جلد جُدا ہونے والا ہے حتیٰ کہ قبر تک بھی ساتھ نہیں دیتا۔ کیونکہ قبر میں صرف ایک کفن جاتا ہے مگر کفن سے مردے کو کیا فائدہ غرض نہ قبر میں گیا نہ حشر میں گیا۔ اس لیئے کہ وہاں یہ حالت ہوگی۔ کہ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ۔ یعنی قیامت کے دن خدا تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم ہمارے پاس بالکل تنہا آئے ہو کہ کوئی چیز بھی تمہارے ساتھ نہیں بالکل ایسے جیسا ہم نے تم کو اول مرتبہ پیدا کیا تھا۔ یعنی یکہ و تنہا۔ ہاں اگر زندگی میں کچھ فی سبیل اللہ دے دیا ہے تو وہ جائے گا۔ لیکن اسکا جانا کچھ مال ہونے پر موقوف نہیں۔ کیونکہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے خود مال تو جاتا نہیں بلکہ اس کا ثواب جاتا ہے جو کہ حشر میں کام آئے گا۔ اور ثواب کا حصول مال پر موقوف نہیں بلکہ اس کا مدار نیت پر ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص لاکھوں روپیہ فی سبیل اللہ خرچ کرے اور نیت درست نہ ہو تو اسکو کچھ بھی ثواب نہیں ملے گا۔

اور اگر ایک پیسہ بھی پاس نہ ہو اور یہ نیت ہو کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو مال

دیں تو ہم خوب نیک کاموں میں صرف کریں تو ثواب کا مل رل جائے گا۔

دولتِ علم برخلاف علم کے کہ جس کے ساتھ ہو وہ دنیا بھر سے مستغنی ہے اس کو نہ رفیق کی ضرورت نہ مونس کی ضرورت۔ وہ ہر وقت خوش اور مطمئن ہے بلکہ اس کی خوشی اور اطمینان کی یہ حالت ہے کہ کسی بادشاہ کو بھی وہ خوشی اور اطمینان حاصل نہیں بادشاہ کو سب سے اول اپنے مصاحبوں ہی سے خطرہ ہوتا ہے کہ یہ مجھے زہر نہ دے دیں مار نہ ڈالیں۔ ایسے متعدد واقعات ہیں کہ خود بادشاہ کے حرم سرا نے اسکو زہر دیا اور عالم کے اطمینان کی یہ حالت ہے کہ تن تنہا جنگل میں ہے مگر محفوظ بادشاہ سے زیادہ اطمینان میں ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ علم کے ثمرات اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ ہاں جن لوگوں کو علم نہیں ہے ان کو تعجب ہو تو تعجب نہیں۔

حقیقتِ علم مگر علم سے مراد یہ نہیں کہ قَالَ دراصل قُولُ بود جانتا ہو بلکہ علم ایک نور ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں

وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ۔

اور اس نور کے ہوتے ہوئے قلب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

موحد چہ برپائی ریزی زرش	چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس	ہمین ست بنیاد توحید و بس

اگر چاروں طرف سے اس کو تلواروں میں گھیر لیا جائے تب بھی اس کے دل پر ہراس نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی سفر میں تھے دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرمانے کے لیے اُترے۔ اتفاق سے صحابہ

کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بھی کوئی اسوقت قریب نہ تھا آپ نے اپنی تلوار درخت میں لٹکا دی اور درخت کے نیچے سو گئے اسی وقت آپ کے ایک دشمن کو خبر ہوئی کہ حضور اسوقت تن تنہا فلاں درخت کے نیچے سو رہے ہیں اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً وہاں آیا آکر دیکھا تو واقعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تن تنہا سو رہے تھے اور تلوار درخت میں لٹک رہی تھی اس نے اول دبے پاؤں آکر تلوار پر قبضہ کیا اس کے بعد اس کو نہایت آہستگی سے نیام سے نکالا اور آپ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا جب بالکل تیار ہو گیا تو آپ کو بیدار کیا اور پوچھا مَنْ یَعْصِمُکَ مِنِّیْ اسوقت آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے آپ نے اس کی یہ ہیئت دیکھ کر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں فرمائی اور اس کے سوال کے جواب میں نہایت اطمینان سے فرمایا اللہ۔ یعنی مجھے اللہ بچائے گا۔ بھلا کوئی ایسا کر تو دکھلا دے بدوں خدا کے تعلق کے کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ تو علم اس کا نام ہے ورنہ نرے الفاظ تو شیطان بھی خوب جانتا ہے — اس ارشاد کا اثر یہ ہوا کہ وہ لرزنے لگا اور تلوار چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ آپ نے فوراً لپک کر تلوار اٹھالی۔ اور فرمایا کہ اب تجھ کو مجھ سے کون بچائے گا وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس حالت کو دیکھ کر نہایت گھبرایا اور کہنے لگا کہ مجھے آپ ہی بچائیں گے۔ آخر آپ نے اس پر کرم فرمایا اور اس کی گستاخی کو معاف فرما کر اس کو چھوڑ دیا۔ تو یہ ہے علم اور اس کا اثر جس کو کہتے ہیں کہ ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش | چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس | ہمین ست بنیاد توحید و بس

کمال معرفت

اور راز اس کا یہ ہے کہ علم کامل سے معرفت کامل ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ عَسٰۤی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ اس لیے گھبراتا نہیں اور سمجھتا ہے کہ یہ میرے لیے علاج اور کفارہ

سیئات ہو رہا ہے نیز اس میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اپنے نہیں ان کو اختیار ہے کہ جس حالت کو ہمارے لیے مناسب سمجھیں۔ اس میں ہمیں رکھیں چنانچہ اسی کو مصیبت کے موقع پر فرماتے ہیں۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں نے اب اس آیت کو موت ہی کے موقع کے لئے خاص کر لیا ہے۔ ایک بڑھیا کا واقعہ ہے کہ

اس کا بچہ اکثر مصیبت کے موقع پر اناللہ پڑھ دیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بڑھیا کہنے لگی کہ بچے خیر مانگ کس کو مارنے کا ارادہ ہے۔ اسی طرح سورۃ یٰسین کہ اس کو مصیبت کے آسان کرنے کے لیے پڑھا جاتا ہے لیکن اب عام طور سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سورۃ یاسین صرف نزع کے وقت پڑھنی چاہیے چنانچہ آج دیکھ لیجیے کہ اگر کوئی شخص کسی مریض کی عیادت کو جائے اور اس کی تکلیف دیکھ کر سورۃ یٰسین پڑھنے لگے تو اس پر کیسی ملامت اور لعنت ہوتی ہے حالانکہ نزع کے وقت بھی سورۃ یاسین کو اسی واسطے پڑھا جاتا ہے

کہ اسکی برکت سے مشکل آسان ہو۔ اگر حیات ہے تو اچھا ہو جائے اور اگر موت آگئی ہے تو اس کی برکت سے آسانی سے خاتمہ ہو جائے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ شب کے وقت گھر میں چراغ گل ہو گیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون ۝ حضرت عائشہؓ فرمانے لگیں کہ حضورؐ! یہ بھی کوئی مصیبت ہے یعنی حضرت عائشہؓ کو یہ معلوم تھا کہ اناللہ مصیبت کے وقت پڑھا جاتا ہے لیکن ان کو اس واقعہ کے مصیبت ہونے میں تامل تھا۔ کیونکہ ظاہراً یہ واقعہ ایک معمولی بات تھی حضورؐ نے فرمایا کہ جو بات

مومن کو ناگوار ہو وہ مصیبت ہے اور چراغ کے گل ہونے سے جبکہ قصد نہ ہو ناگواری ہوتی ہے لہٰذا یہ بھی مصیبت ہوئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہُوا ہوگا کہ خدا نے اپنے بندوں کو ثواب عطا فرمانے کے لیے معمولی معمولی طریقے رکھے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ؏

رحمتِ حق بہانہ می جوید

اور اس سے بڑھ کر لیجئے حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی چیز جیب میں رکھ کر بھول جائے اور ادھر اُدھر اس کو تلاش کرے تو اس تلاش کرنے میں جو پریشانی اس کو ہوگی خدا تعالےٰ اس پر بھی ثواب عطا فرمائیں گے اور کفارہ سیئات فرمائیں گے۔

بالکل ایسی حالت ہے کہ جیسے ہمارا چہیتا بچہ ہو کہ اس کے چلنے پھرنے اُٹھنے بیٹھنے —————— حتیٰ کہ گرنے پڑنے پر بھی ہم کو پیار آتا ہے اسی طرح خدا تعالےٰ بھی ہم کو ہر ہر فعل پر ثواب عطا فرماتے ہیں حالانکہ معصیۃ وعناداً تو انا للہ جو سکھلایا گیا ہے اس لیے کہ اس کے ذریعے سے تخفیفِ حزن ہو کیونکہ جب اسکو پڑھے گا تو اس مضمون کی یاد تازہ ہوگی کہ ہم خدا کی ملک ہیں وہ ہمارے مالک ہیں اور مالک کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنے مملوک میں جو چاہے تصرف کرے لہٰذا خدا تعالیٰ کو بھی اختیار ہے کہ ہم میں جو چاہیں تصرف کریں اور اس کا مخفف حزن ہونا ظاہر ہے۔ دوسرے اس خیال کے تازہ ہونے سے خدا تعالیٰ سے محبت بڑھتی ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اسکی بدولت سخت سے سخت مصیبت بھی ہلکی ہو جاتی ہے ؏

از محبت تلخہا شیریں شود

دیکھئے جن لوگوں کو امردوں یا بازاری عورتوں سے تعلق ہو جاتا ہے وہ ان کے

پیچھے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر وہ جوتیاں بھی مارے تو ان میں لطف آتا ہے اور فخر کرتا ہے۔

مشہور ہے کہ ایک شخص بیوی پر توجہ نہ کرتا تھا اور کسی بازاری عورت سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ بیوی کو یہ خیال ہوا کہ شاید وہ بازاری عورت مجھ سے زیادہ حسین ہو لیکن تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ بالکل کالی بھجنگ ہے سخت تعجب ہوا اور اب وہ اس فکر میں لگی کہ آخر اس میلان کا سبب کیا ہے۔ چھان بین سے معلوم ہوا کہ جب یہ شخص اس کے پاس جاتا ہے تو دور ہی سے دیکھ کر اسکو برا بھلا کہنا شروع کرتی ہے اور خوب جوتیوں سے خبر لیتی ہے۔ کہنے لگی کہ کیا مشکل کام ہے آج سے میں بھی یہی وتیرہ اختیار کروں گی چنانچہ جب شوہر آیا تو اسکی دروازے ہی سے اس کی خبر لینی شروع کی اور خوب جوتیوں سے پیٹا کہنے لگا کہ بس اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آج تک تجھ میں یہی کسر تھی سو اب وہ پوری ہو گئی۔

اس حکایت سے معلوم ہوا کہ محبت میں اگر محبوب کی طرف سے کوئی مصیبت بھی آئے تو وہ موجبِ فرح ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ یہ محبت مجازی کیا ہوتی ہے اس محبت کی حقیقت یہ ہے کہ ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

البتہ خدا تعالیٰ سے جو محبت ہو وہ قابل اعتبار ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

عشق با مردہ نباشد پائدار — عشق را باحیّ و باقیوم دار

تاثیرِ محبت

تیسرے اس معرفت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کو ہم سے محبت ہے۔ اور کوئی محب محبوب کو تکلیف نہیں دیا کرتا لہٰذا ہم پر جو ظاہراً تکلیف آئی ہے یہ ایسی ہی ہے جیسے کہ ماں باپ کسی بچے کے دنبل میں جرنے اس کو بے حد تکلیف دے رکھی ہو یا آئندہ تکلیف

پہنچانے کا اندیشہ ہو نشتر لگواتے ہیں کہ وہ ظاہراً تو تکلیف ہوتی ہے لیکن واقع میں کامل راحت کا سامان ہوتا ہے۔ اس تکلیف کی وہ حالت ہوتی ہے کہ سے

طفل می لرزد ز نیش احتجام　　　مادرِ مشفق ازاں غم شاد کام

کہ بچہ تو ڈرتا ہے لرزتا ہے اور ماں خوش ہو رہی ہے حتیٰ کہ نشتر لگانے والے کو انعام دیتے ہیں۔ سو اگر کوئی اجنبی تعجب کرنے لگے اور کہے کہ یہ انعام کس بات کا دیا ہے اس شخص نے تو تکلیف پہنچائی ہے اس کو تو سزا دینی چاہیئے تو ماں باپ کہیں گے کہ احمق! یہ تکلیف نہیں ہے یہ عین راحت ہے جس کی بدولت لڑکے کی زندگی کی امید ہو گئی۔ ورنہ یہ دنبل بڑھتا اور اس کا زہریلا مادہ تمام جسم میں سرایت کر جاتا اور لڑکا ہلاک ہو جاتا۔

تو جب ماں باپ کا نشتر لگوانا اور اس کی تکلیف دینا بوجہ راحت ہونے کے ناگوار نہیں ہے تو خدا تعالیٰ کو تو ماں باپ سے بدرجہا زیادہ محبت اپنے بندوں سے ہے پھر اگر وہ فقر و فاقہ ڈال دیں یا کسی اور مصیبت میں گرفتار کر دیں تو اسکو نشتر کے قائم مقام کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ تو علم سے یہ فائدے ہیں جو کہ مال سے نہیں ہو سکتے اور یہ فائدے تو دنیا میں ہوتے ہیں اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو اور یہ علم کی بدولت ہوتا ہے۔ جاہل آدمی کا خاتمہ اکثر خراب ہوتا ہے لیکن جاہل سے　مراد وہ ہے کہ نہ تو خود پڑھے اور نہ اہلِ علم سے ملے نہ کسی سے پوچھے تو ایسے شخص کے ایمان کا بھروسہ نہیں کیونکہ جب یہ شخص مرتا ہے تو شیطان اس کو یہ سمجھاتا ہے کہ تو اس وقت اپنی سب پیاری چیزوں سے چھوٹ رہا ہے اور خدا تعالیٰ تم کو ان چیزوں سے چھڑا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے بغض ہو جاتا ہے اور کفر پر خاتمہ ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے اگر علم ہو تو اس قسم کے اندیشے نہیں رہتے لیکن عالم سے

خاص وہی مراد نہیں جو عربی ہی پڑھا ہو۔ بلکہ یا پڑھا ہو یا علماء کی صحبت میں بیٹھ کر علم حاصل کر لیا ہو یا علماء سے پوچھ پوچھ کر قدر ضروری معلوم کر لیا ہو۔ غرض علم ایسی نعمت ہے۔

فوائدِ علم

مگر آجکل دنیا کو ایسا مقصود بنا رکھا ہے کہ بہت لوگ علماء کو ترقی کا مانع سمجھتے ہیں اور ان کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور نمازیں بھی ان کی اکثر کسی دباؤ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اور اگر دباؤ کی وجہ سے نہ بھی ہوں تب بھی چونکہ دل میں رچی ہوئی نہیں ہوتی اس لیئے وہ کچھ بھی مفید نہیں ہوتی۔ ان کے پڑھنے کی بالکل وہ حالت ہوتی ہے۔ جیسے کہ کسی نے ایک طوطے کو الم ذٰلک سے قل اعوذ تک یاد کرا دیا تھا کہ وہ بے تکلّف اس کو پڑھتا چلا جاتا تھا۔ لیکن اگر اس پر بلی گرتی تو کیا اس وقت بھی اس کو کوئی سورۃ یاد رہ سکتی تھی کبھی نہیں اس لیے کہ اس کے دل میں کچھ بھی نہ تھا۔

کسی ظریف نے ایک طوطے کے مرنے کی تاریخ لکھی ہے اگرچہ اس نے محض تمسخر کی بناء پر لکھی ہے لیکن بات نہایت گہری اور کام کی ہے سنہ ۱۲۳۰ھ میں کسی طوطے کا حادثہ ہوا تھا۔ اس وقت یہ تاریخ لکھی گئی ہے۔ لکھا ہے ؎

میاں مٹھو جو ذاکر حق تھے	رات دن ذکر حق رٹا کرتے
گربۂ موت نے جو آ دابا	مضطرب ہو گئے اور گھبرا گئے
چونچ میں لے کے پانی کی کلھیا	کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے ٹے

ٹ کے عدد ت کے برابر ہیں تو تین ٹ کے عدد ۱۲ سو ہوئے اور تین ی کے عدد ۳۰ کل ۱۲۳۰ ہوئے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ چونکہ طوطے کے محض زبان پہ ذکر حق تھا اور دل میں اس کا کچھ اثر نہ تھا۔ اس لیے اس مصیبت کے وقت کچھ بھی یاد نہ آیا۔ اور ٹاں ٹاں کر کے خاتمہ ہو گیا۔

یادرکھو اگر محبتِ دین کی دل میں نہیں ہے تو یہ سب لفافہ ہے کہ اوپر سے نہایت مکلف اور خوش نُما لیکن اندر سے بالکل سادہ مشہور ہے کہ ایک میراثی کسی کے پاس لفافہ لے کر آیا دیکھا کہ اوپر سے بالکل سادہ ہے سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ حضور نہایت جلدی میں خط دیا ہے لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ مکتوب الیہ کو خیال ہوا کہ اندر مضمون ہوگا کھول کر دیکھا تو خط بھی بالکل سادہ۔ پوچھا کہ بھائی اس کا کیا سبب، کہنے لگا حضور میں عرض کر چکا ہوں کہ بہت ہی جلدی میں خط دیا ہے لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ ہم لوگوں میں اکثر کی تو بعینہٖ یہی حالت ہے کہ اندر باہر دونوں جانب سے محض کورے۔ اور جو لوگ کچھ ہیں بھی تو محض ظاہر ہی مکلف ہے اندر خاک بھی نہیں۔ حالانکہ ضرورت اسکی ہے کہ چاہے لفافہ باہر سے زیادہ مکلف نہ ہو لیکن اندر مضمون سے پُر ہو۔

اسی طرح ہم اگر بہت سی نفلیں نہ پڑھیں بہت ذکر و شغل نہ کریں صوفیہ کی صورت نہ بنائیں تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن دل محبت الٰہی سے بھرا ہوا ہونا چاہیئے اور علم حقیقی یہی ہے جس سے دولتِ محبت دل میں ہو۔ اسی علم کو حضرت علیؓ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ ؎

رضینا قسمۃ الجبار فینا لنا علمٌ وللجہالِ مالٌ

نعمتِ علم

تو فخر کی چیز اگر ہو سکتی ہے تو یہ علم ہو سکتا ہے نہ کہ جہل مگر آج وہ حالت ہے کہ جہل پر بھی فخر کیا جاتا ہے کوئی ان سے پوچھے کہ بھائی تم کس طرح اچھے اور قابل فخر ہو گئے۔ بلکہ عالم اگر بدعمل بھی ہے تو وہ تم سے بدرجہا اچھا ہے کیونکہ وہ مریض ہے لیکن اسکے ساتھ ہی اسکو نسخہ بھی معلوم ہے۔ جب ذرا توجہ کریگا علاج کر لے گا۔ اور تم سڑ یا

مرض ہو لیکن نہ مرض کی خبر نہ نسخہ پر اطلاع ۔ غرض کسی حال میں ۔ جہل کوئی فخر کی چیز نہیں مگر بعضے جہال اس بناء پر فخر کرتے ہیں کہ اہل علم کے متعلق وعیدوں سے بری ہیں ۔ حالانکہ اول تو اہل علم کے متعلق جو وعیدیں ہیں ان میں علم سے خاص اصطلاحی مولویت ہی نہیں بلکہ مطلقاً جاننا مراد ہے ۔ سو ایسا علم تھوڑا بہت ہر شخص کو ہوتا ہے ۔ دوسرے اگر علم نہ بھی ہو تب بھی الزام سے بری نہیں ہو سکتے کیونکہ علم نہ ہونے کا الزام اس سے بھی بڑھ کر ہے ۔ کیونکہ علم عمل کا موقوف علیہ ہے اور موقوف علیہ زیادہ مہتم بالشان اور باعتبار اہتمام کے زیادہ افضل ہوا کرتا ہے ۔

جہالت پر ناز

اب میں اس کو بیان کرتا ہوں کہ آیت کے خطاب سے جہلا کیوں پاک نہیں ہو سکتے اور اس کے سمجھنے کے لئے الزام کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ جس کو میں اس آیت سے استنباط قیاس و ظن نہیں ہے بلکہ دلالۃ النص سے ثابت ہوتا ہے جو کہ قیاس قطعی ہے ۔

حاصل اس الزام کا جو کہ آیت میں مقصود ہے اور جو کہ عالم جاہل سب میں پایا جاتا ہے اور جو کہ نہایت زہریلا مرض ہے ۔ یہ ہے کہ ہم اپنے عیوب کو نہیں دیکھتے بلکہ دوسرے کے عیبوں کو دیکھا کرتے ہیں ۔ ہم شب و روز دوسروں کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ ان کے عیب نکالتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا کیا عیوب موجود ہیں اور یہ عیوب دوسروں کے عیوب سے بڑھ کر ہیں یا نہیں ۔ کیونکہ امر کرنا لوگوں کو نیک کام کا موقوف اس پر ہے کہ دوسروں کی کوتاہیوں پر نظر ہو پھر اسکے ساتھ ... نسیان نفس کو ملا کر دیکھا جائے تو حاصل یہ نکلے گا کہ تم دوسروں کے عیوب کو تو دیکھتے ہو اور اپنے عیوب کو نہیں دیکھتے ۔ یہ مرض ایسا رچا ہے کہ اکثر مواقع پر اس کا زبان سے بھی اظہار ہوتا ہے ۔ چنانچہ جب کبھی امراض وبائیہ پھیلتے ہیں تو اکثر کو تو اس

کا احساس بھی نہیں کہ ان مصائب میں معاصی کا کچھ دخل ہے بلکہ اس کو ہوا کے فساد کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کا تو ذہن بھی یہاں تک نہیں پہنچتا کہ گناہوں کو بھی اس میں کوئی دخل ہے حالانکہ یہ ان کی سخت غلطی ہے ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ آخر ہوا میں فساد کیوں آیا اگر کہا جائے کہ شدت گرمی یا سردی کے سبب ایسا ہوا تو میں کہوں گا کہ گرمی یا سردی میں اس قدر شدت کیوں ہوئی لیکن یہ خطاب جس کا انتہا آگے خدا کی مشیت پر ہوگا۔ مسلمانوں ہی سے ہے ملحدین سے نہیں اگرچہ ہمارے پاس جواب ان کے اعتراضات کے موجود ہیں الحمد للہ کا شکر ہے کہ ہم ان کے جواب دینے سے بھی عاجز نہیں مگر یہ اس کا موقع نہیں ہے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ٭ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

غرض مسلمان عوام الناس جس چیز کو بھی سبب بتلائیں گے۔ ہم اسی کی بابت پوچھیں گے کہ آخر یہ کیوں ہوا کسی حد پر پہنچکر ان کو یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ خدا کے حکم سے ہوا اس وقت کہیں گے کہ اس کا کیا سبب کہ خدا تعالے نے اس وقت یہ حکم کیوں فرمایا جس سے یہ مصیبت پیدا ہوگئی اور پھر خود ہی قرآن سے ہم جواب میں کہیں گے کہ سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تم سے گناہوں کے سبب ناراض ہوئے اور مصیبت بھیجی۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ

یعنی تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے کرتوتوں کی بدولت پہنچتی ہے اور بہت سی باتوں میں درگذر بھی فرماتے ہیں۔

اور اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص کو پھانسی دیدی جائے اور اسکی موت کا سبب پوچھا جائے تو ظاہر بیں ہر شخص یہی کہے گا کہ پھانسی کی رسّی گلے میں

اٹک گئی اس سے مر گیا مگر ایک عقلمند اس پر بس نہ کریگا۔ بلکہ وہ پوچھے گا کہ رتی گلے میں کیوں لٹکی اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ ایک شخص نے لٹکا دی تو وہ پوچھے گا کہ اس نے کیوں لٹکائی اس پر کہا جائیگا کہ حاکم نے اس کو حکم کیا تھا تو علت اخیر حاکم کا حکم نکلا۔ لیکن ابھی یہ سوال باقی ہے کہ حاکم نے ایسا حکم کیوں دیا اس کے جواب میں کہا جائیگا کہ اس شخص نے کسی کو قتل کیا تھا یا ڈکیتی کا مرتکب ہوا تھا اس جواب کے بعد پھانسی پر لٹکنے کا اصلی سبب کھل جاتا ہے تو ایسے ہی وبا رخدا کے حکم سے آئی لیکن خدا تعالیٰ کا حکم ہمارے جرائم کے سبب سے ہوا۔ اسی کو فرماتے ہیں

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

جزاء الاعمال میرا ایک رسالہ ہے اس میں اس بحث کو مبسوط لکھا گیا ہے اور بحمد اللہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ہم کو جو کچھ ابتلاء ہوتا ہے ہمارے اعمال کے سبب ہوتا ہے تو عوام الناس کا مبلغ پر تو محض اسباب طبعیہ ہیں لیکن جو قدرے فہیم اور دیندار ہیں وہ اگر ان سب امراض کو خدا تعالیٰ کے حکم سے مانتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ گناہوں کے سبب سے یہ حکم ہوا لیکن ہمیشہ دوسروں کے گناہوں کو شمار کرتے ہیں۔ اوپر اس کا ذکر تھا کہ دوسروں کے عیوب پر ہم لوگوں کی نظر ہوتی ہے۔

زہر بلا مرض اکثر لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ لوگوں کو زنا اور قمار میں مبتلا دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ اسی سبب سے تو قحط ٹوٹ رہا ہے مگر کبھی کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ انکی اپنے اعمال کو اس کا سبب بتلایا ہو حالانکہ زیادہ ضرورت اس کی ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ سے لوگوں نے قحط کی شکایت کی فرمایا کہ قحط کے

دور ہونے کے سوائے اس کے اور کوئی ترکیب نہیں ہے کہ مجھ کو شہر سے نکال دو۔ کیونکہ میرے گناہوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اور یہی نہیں کہ محض زبان سے کہنے پر بس کیا ہو۔ بلکہ آپ اس شہر کو چھوڑ کر چلے بھی گئے۔ ایک بزرگ کہتے تھے کہ جب ریل میں بیٹھتا ہوں تو خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میرے گناہوں کے سبب یہ سب لوگ ہلاک نہ ہو جائیں۔ یہی امراض ہیں جن کا علاج بزرگوں نے کیا ہے کہتے ہیں ؎

یکے آنکہ بر غیر بد بیں مباش ❊ دوم آنکہ بر خویش خود بیں مباش

یہاں رات دن ہمارا سبق ہے کہ ہم ایسے ہم ویسے اور دوسرا ایسا اور ایسا۔

امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ اے عزیز! تیری ایسی مثال ہے کہ تیرے بدن پر سانپ بچھو لپٹ رہے ہیں اور ایک دوسرے شخص کے بدن پر ایک مکھی بیٹھی ہے تو اسکو مکھی بیٹھنے پر ملامت کر رہا ہے لیکن اپنے سانپ اور بچھو کی خبر نہیں لیتا جو کوئی دم میں تجھ کو فنا کئے ڈالتے ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو اپنی آنکھ میں کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا۔ اور دوسرے کی آنکھ کے تنکے کا تذکرہ کر رہے ہیں حالانکہ اول تو یہ دونوں مستقل عیب ہیں کیونکہ اپنے عیبوں کا نہ دیکھنا یہ بھی گناہ اور دوسرے کے عیوب کو بے ضرورت دیکھنا یہ بھی گناہ اور بے ضرورت کے معنے یہ ہیں کہ اس میں کوئی ضرورت شرعی نہ ہو اور ایسے افعال جو شرعاً ضروری اور مفید نہ ہوں عبث اور لایعنی کہلاتے ہیں۔ حدیث میں ان کے ترک کا امر ہے اور بزرگوں نے اس کا بڑا اہتمام فرمایا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کسی شخص کے مکان پر گئے اور دروازے پر جا کر آواز دی گھر میں سے جواب آیا کہ وہ نہیں ہیں انہوں نے پوچھا کہ کہاں گئے جواب آیا کہ معلوم نہیں۔ لکھا ہے کہ اپنے اس سوال پر کہ کہاں گئے ہیں تیس برس

تک روتے رہے کہ میں نے ایک لایعنی سوال کیوں کیا۔ مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ دیوبند کے والد مولانا فرید الدین صاحبؒ کی نسبت سنا ہے کہ وہ بہت ہی کم بولتے تھے اور بلا کسی شدید ضرورت کے نگاہ کبھی اوپر نہ اٹھاتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر ان سے کوئی بات پوچھتا تو زبان سے جواب دیتے لیکن منہ نہ اٹھاتے تھے صرف اس لیے کہ بلا ضرورت کیوں نگاہ کو صرف کیا جائے نیز قرآن حکیم میں حکم بھی ہے قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ دوسری جگہ ارشاد ہے اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا یعنی غَاضِّيْنَ اَبْصَارَهُمْ۔

سمتِ امن

اہل لطائف نے لکھا ہے کہ شیطان نے بنی آدم کو بہکانے کی چار سمتیں بیان کی ہیں۔ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ ... اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ۔

اور دو سمتوں کو بیان نہیں کیا یعنی فوق اور تحت اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سمتیں محفوظ ہیں لیکن اوپر سے مراد دہلی کے چاندنی چوک کا کوٹھا نہیں ہے بلکہ آسمان مراد ہے لیکن ہر وقت اوپر دیکھنا بہت دشوار تھا اسلئے سب سے اسلم سمت تحت ہے باقی چار سمتیں قدام۔ خلف۔ یمین۔ شمال۔ ان کی یہ حالت ہے کہ ان کی طرف دیکھنے میں اکثر انسان فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی سبب سے بعض اکابر نے یہاں تک کیا ہے کہ شہر کو چھوڑ کر جنگل میں بود و باش اختیار کر لی۔ شیخ سعدیؒ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے ؎

بزرگے دیدم اندر کوہسارے	نشستہ از جہاں در کنج غارے
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی	کہ بارے بندے از دل برکشائی
بگفت آنجا پریرویاں بلغزند	چو گِل بسیار شد پیلاں بلغزند

اسی حالت کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎
زاہد نداشت تاب جمالِ پریرخاں کنجے گرفت و ترسِ خدا را بہانہ ساخت

بہرحال ایسا ہوتا ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ ان چاروں سمتوں کی جانب دیکھنا بہت کم کر دیا جائے اور اوپر کے دیکھنے میں گرنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ پس تجربہ عقل نقل سب سے معلوم ہو گیا کہ حفاظت اور امن کی سمت سمتِ تحت ہے۔

لایعنی سے پرہیز

اور جب بزرگوں نے لایعنی امور سے اس قدر پرہیز کیا ہے اور حدیث نے بھی من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ کا حکم کیا ہے اسلئے تفتیش عیوب کے گناہ ہونے میں یہ قید لگائی ہے کہ بے ضرورت ہو اور دوسروں کی عیب جوئی اگر گناہ بھی نہ ہوتی تو لایعنی تو ضرور تھی اور اس سے بچنا بھی ضروری ہے تو جب کہ وہ گناہ بھی ہے تو اس سے بچنا بدرجہ اولیٰ ضروری ہے مثلاً اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ جناب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملے میں آپ کی کیا تحقیق ہے کوئی اس عقلمند سے پوچھے کہ تجھ کو حضرت معاویہ کے معاملہ کی کیا پڑی تو اپنا معاملہ درست کر۔

مولانا محمد نعیم صاحب لکھنوی فرنگی محلی کے پاس ایک رنگریز آیا کہنے لگا کہ حضرت معاویہؓ کے معاملہ میں آپ کی کیا تحقیق ہے مولانا نے فرمایا کہ میاں تم جا کر کپڑے رنگو جب تمہارے پاس حضرت معاویہؓ کا مقدمہ آئیگا تو لینے سے انکار کر دینا اور کہہ دینا کہ میں نے اس کی تحقیق کی تھی مگر مجھے کسی نے بتلائی نہیں۔ ایک اور صاحب ایک مولوی صاحب کے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کی بابت دریافت کرتے ہوئے آئے کہ وہ ایماندار تھے یا نہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ تم کو نماز کے فرائض معلوم ہیں یا نہیں کہنے لگا کہ نہیں۔ مولوی صاحب نے

کہا کہ غضب کی بات ہے کہ نماز جس کا سوال سب سے اوّل قیامت میں ہوگا۔ اسکی وہ فرائض جن سے دن میں پانچ مرتبہ کام پڑتا ہے اور جن کے معلوم نہ ہونے سے احتمال ہے کہ وہ فوت ہوجائیں تو نماز ہی نہ ہو ان کی تم کو خبر نہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا ایمان جس کی بابت یقیناً ہم سے نہ قیامت میں سوال ہوگا نہ دنیا کا کوئی کام اس علم پر موقوف۔ اسکی تحقیق کی جاتی ہے۔

حدودِ تفتیش

صاحبو! اگر کوئی بُرا ہے تو تم کو کیا غرض اور اچھا ہے تو تم کو کیا مطلب؟ تمہیں اپنی اچھائی برائی کی فکر ہونی چاہیئے۔ باقی ہر شخص کی خبر رکھنا یا اس کا خیال ہونا یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے یا اسکی بندے کا کام ہے جس کے سپرد خدا تعالےٰ نے اصلاح خلق کا کام کردیا ہو کہ اس شخص کو بھی تفتیش حالات کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر علم حالات اصلاح ممکن نہیں ہے اور اسی وجہ سے میں نے بلاضرورت کی قید لگا دی تھی اسلئے کہ مثلاً حاکم وقت جب تک تفتیش حالات نہ کرے گا مجرموں کو سزا نہ دے سکے گا مگر اس کو بھی ایسے امور میں اجازت ہے کہ جن میں تفتیش نہ کرنے سے فساد کا احتمال ہو اور جو امور ایسے نہیں ہیں ان میں حاکم کو بھی تجسس کی اجازت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر میں سے گانے کی آواز آئی۔ آپنے دروازہ کھلوانا چاہا مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سُن سکے آخر آپ مکان کی پُشت پر سے اندر تشریف لے گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صورت دیکھ کر وہ سب لوگ سہم گئے لیکن چونکہ جانتے تھے کہ خلاف حضرت عمرؓ کو ہرگز غصہ نہ آئے گا۔ اس لیے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المومنین!

ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا لیکن آپ نے تین گناہ کیے ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر میں چلے آئے حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْذِنُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا دوسرا یہ کہ آپ نے تجسس کیا اور قرآن میں تجسس کی ممانعت ہے لَا تَجَسَّسُوْا تیسرا یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کر لو

آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ آزادی ان حضرات میں تھی یا آج کے مدعیان آزادی میں کہ بہائم کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے کھالیا اور ہوا پرستی میں عمر گذار دی ۔

صاحبو! واللہ یہ آزادی نہیں یہ نفس کی شرارت اور اتباع ہوا - اور مطلق العنانی ہے اور یہ آزادی سانڈ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا منہ مار دیا جدھر چاہا چل دیا جو چاہا کر لیا تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں اگر اس کا جواب نعم ہے تو آج سے آپ بھی ہماری طرف سے یہی لقب لیجیے اور اگر لا میں جواب ہے تو پھر ذرا مہربانی کر کے اپنے اور سانڈ میں کچھ فرق بتلائیے اسی طرح اگر کوئی شخص اتالیق یا نگران ہو تو اس کو بھی تفتیش حالات کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر اصلاح غیر ممکن ہے - یا شوہر ہو کہ اس کو بھی بیوی کے حالات کی تفتیش کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے متعلق اس کی اصلاح ہے یا کوئی شخص مصلح قوم ہو کہ اسکو بھی مجموعی طور سے قوم کے حالات کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے ورنہ وعظ کچھ بھی نہ کر سکے گا ۔

مقصودِ تفتیش

مگر مصلح کو بھی اسی وقت تک اجازت ہے کہ تفتیش سے مقصود اصلاح ہو اور اگر تحقیر کے لیے ایسا کرے گا تو اسکو

بھی ہرگز اجازت نہ ہوگی۔ کیونکہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اس استثناء کے بعد جو لوگ رہ گئے وہ دیکھ لیں کہ عیب جوئی اور عیب گوئی سے ان کا کیا مقصود ہوتا ہے آیا یہ کہ اس شخص میں سے یہ عیب جاتا رہے یا محض بدنام کرنا۔ اگر پہلا امر مقصود ہے تو کیا وجہ کہ کبھی اس کے آثار کیوں نہیں پائے گئے کیا کبھی کسی شخص نے صاحب عیب کو خطاب کر کے نہایت شفقت کے ساتھ اس کے عیوب پر مطلع کیا ہے اور اگر نہیں کیا۔ تو کیا محض چار آدمیوں میں کسی کے عیب کا تذکرہ کر دینا اصلاح کہلائے گا ہرگز نہیں۔ ہم لوگوں کی مجالس میں رات دن تمام مخلوق کی غیبتیں شکائتیں ہوتی ہیں کیا ان سے سوائے بدنام کرنے کے اور کچھ مقصود ہوتا ہے کچھ بھی نہیں تو یہ لوگ ایک تو غیبت کے گناہ میں مبتلا ہوئے دوسرے ایک لایعنی فعل کے مرتکب ہوئے جس کی برائی اوپر بیان ہو چکی ہے۔

حضرت رابعہ بصریہ رحؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ کبھی شیطان کو بھی برا کہتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ جتنی دیر اس فضول کام میں صرف کی جائے اتنی دیر تک اگر محبوب کے ذکر میں مشغول رہیں تو کس قدر فائدہ ہوگا۔ حضرت شیخ شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوئی ❊ چو بگذشت بر عارفِ جنگ جوئے
گر ایں مدعی دوست بشناختے ❊ بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

عیب جوئی کا نقصان

دیکھو اگر کسی کا محبوب بغل میں باتیں بیٹھا کر رہا ہو۔ تو اس حالت میں ایک شخص آکر اس عاشق کو ماں کی سڑی ہوئی گالی دے تو کیا عاشق کی طبیعت اس کو گوارا کرے گی کہ محبوب کو چھوڑ کر دشمن کے انتقام لینے کے درپے ہو جائے اور اگر اس نے ایسا کیا تو کہا جائیگا کہ اس کا عشق نہایت خام اور ناتمام ہے اسی طرح

سمجھدار لوگ ایسے موقع پر سمجھ جاتے ہیں کہ شیطان جو ہمارا دشمن ہے وہ اس شخص کو بہکا کر لایا ہے کہ اس کو دوسری طرف مشغول کر کے بہکائے اسلیے وہ پرواہ بھی نہیں کرتے اور محبوب کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور جتنی اس میں کمی ہوتی ہے اسی قدر ان میں بھی کمی ہوتی ہے۔

ایک شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ بزرگوں کی شان اور ان کے حالات کس طرح مختلف ہوتے ہیں انہوں نے جواب دیا۔ فلاں مسجد میں تین بزرگ بیٹھے ہیں ان کے پاس جاؤ معلوم ہو جائے گا کہ بزرگوں کے حالات میں کیا فرق ہے چنانچہ وہ شخص گیا اور جا کر دیکھا کہ کوئی بے ادب آیا اور ان بزرگوں میں سے اول ایک کے ایک چپت رسید کیا انہوں نے اٹھ کر اتنے ہی زور سے ایک چپت اس کے بھی مار دیا اور پھر بیٹھ کر ذکر میں مشغول ہو گئے اسکے بعد وہ دوسرے بزرگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ایک چپت ان کے بھی مار دیا وہ بولے بھی نہیں اور اپنے کام میں لگے رہے۔ اس کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ایک چپت ان کے مارا انہوں نے اٹھ کر فوراً اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اسکو دبایا اور پیار کرنا شروع کیا اور کہنے لگے کہ تمہارے ہاتھ میں بہت چوٹ لگی ہوگی۔ یہاں سے یہ تماشہ دیکھ کر ان بزرگ کے پاس گیا اور تمام ماجرا بیان کیا کہنے لگے کہ بس اتنا ہی فرق ان تینوں کی حالات اور شان میں بھی ہے۔ تو دیکھیے کہ جو غیر صابر تھے وہ انتقام لیئے بغیر نہ رہ سکے وہ بھی لایعنی کے مرتکب نہیں ہوئے یعنی مارنے والے سے یہ سوال تک بھی نہیں کیا کہ تو نے ایسی حرکت کیوں کی بلکہ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا پر عمل کر کے ایک چپت خود بھی اس کو مار دیا پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک ذرا سی بات کسی کو کہہ دیجیے پھر دیکھیے کیا قیامت قائم ہوتی ہے۔ بلکہ بلاوجہ بھی لوگ سر ہو جاتے ہیں۔

میرے ایک دوست مولوی اسحٰق علی صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ چلا جا رہا تھا سامنے سے ایک شخص نظر پڑے مجھے خیال ہوا کہ یہ میرے ملنے والوں میں سے کوئی شخص ہیں اس خیال کی بنا پر میں نے نہایت تپاک سے ان کو سلام کیا۔ قریب آئے تو معلوم ہوا کہ کوئی دوسرے صاحب ہیں۔ اپنے دھوکہ کھانے پر میرے منہ سے لاحول نکل گئی۔ بس وہ شخص میرے سر ہو گیا کہ کیا تم نے مجھ کو شیطان سمجھا۔ اس لئے لاحول پڑھی۔ اب یہ کتنا ہی سمجھاتے ہیں خوشامد کرتے ہیں وہ مانتا ہی نہیں بڑی دور تک ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ آخر شاید کسی گلی میں نظر بچا کر گھس کر جلدی سے نکل گئے جب پیچھا چھٹا۔ غرض یہ حالت ہے ہم لوگوں کے دینداروں کی۔ حالانکہ پہلے لوگوں نے اس قدر احتیاط کی ہے کہ فضول باتوں سے بھی بچے ہیں۔

ایک خرابی اور مضرت عیب جوئی اور عیب گوئی میں یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ جس شخص کی برائی کی جا رہی ہے اس کو خبر نہ ہو اور خبر ہونے کے بعد بہت دشوار ہے کہ وہ تم کو برا نہ کہے اور پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے کہنے کی تم کو خبر نہ ہو اور اس تمام الٹ پھیر کا نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں عداوتیں بڑھیں۔ اور دشمنیاں قائم ہوئیں اور پھر یہ عداوتیں بعض اوقات پشت ہا پشت تک چلتی ہیں اور بنا ان کی محض ذرا سی بات کہ اس نے ہم کو یوں کہہ دیا۔ حالانکہ اگر کہہ بھی دیا تو کیا عزت میں فرق آگیا۔

اوصافِ مردانِ راہ

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے چند مرید ساتھ تھے۔ راستے میں ایک شخص نے دیکھ کر کہا کہ یہ شخص بڑا ٹھگ ہے۔ ایک مرید کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس شخص کے مارنے کو چلا۔ پیر صاحب نے روکا اور گھر لے گئے اور بہت سے لفافے

جو ان کے نام آئے ہوئے تھے اس کے سامنے ڈال دیئے۔ اُن لفافوں میں بڑے بڑے القاب و آداب لکھے ہوئے تھے۔ کسی میں قبلہ کونین، کعبہ دارین، کسی میں رحمتِ جہاں وغیرہ وغیرہ اور فرمایا کہ بھائی میں نہ تو اس قدر بُرا ہوں جتنا اس شخص نے ظاہر کیا اور نہ اس قدر اچھا ہوں جتنا ان لوگوں نے لکھا۔ پس اگر خلافِ واقع کہنے کی وجہ سے اس شخص پر غصہ آیا تو ان لوگوں پر بھی تو غصہ آنا چاہیئے اور ان کا منہ بھی تو بند کرنا چاہیئے جو کہ جنید عصر اور فرید وقت لکھتے ہیں۔

مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کو ایک شخص نے آکر بُرا بھلا کہنا شروع کیا مولانا چونکہ بڑے مرتبے کے شخص تھے طالب علموں کو سخت غصہ آیا اور اس کے مارنے کو اُٹھے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی سب باتیں تو جھوٹ نہیں کہتا کچھ تو سچ بھی ہے تم اسی کو دیکھو۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کو ایک شخص نے بُرا کہا تو آپ نے اس کو ہدیہ بھیجا اور امام صاحبؒ کی نسبت لکھا ہے کہ آپ کسی کی غیبت نہ کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی کی غیبت کروں تو اپنی ماں کی غیبت زیادہ مصلحت ہے تاکہ میری نیکیاں میری ماں ہی کے پاس رہیں غیروں کے پاس تو نہ جائیں۔

حضرت امام سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہؒ بڑے عقلمند ہیں ہم لوگوں کی نیکیاں تو وہ لے لیتے ہیں (یعنی چونکہ ہم ان کی بابت کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں) اور وہ اپنی نیکیاں کسی کو نہیں دیتے (یعنی چونکہ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتے)

صاحبو! غور کرو کہ ایک یہ اسلاف ہیں جن کے وہ حالات ہیں ایک ہم خلاف ہیں کہ جن کے یہ حالات ہیں خوب کہا ہے ؎

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا | دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام | کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

نا اتفاقی کا بڑا سبب

آج کل بڑے زور سے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم لوگوں میں اتفاق رہے اسکے لیے تقریریں ہوتی ہیں۔ اخباروں میں تحریری مضامین بھیجے جاتے ہیں جلسے کئے جاتے ہیں لیکن جو نا اتفاقی کی جڑ ہے یعنی زبان۔ اس کے کاٹنے کی آج تک کسی کو فکر نہیں۔

صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ نا اتفاقی کا بڑا سبب ہم لوگوں کی زبان ہے جس کو لگام ہی نہیں جو چاہا کہدیا جس کو چاہا کہہ دیا۔ یہ ظالم اس قدر چلتی ہے کہ جس کی حد نہیں اور پھر غضب یہ کہ بے حیا کبھی تھکتی بھی نہیں دوسرے اعضاء مثلاً سر، آنکھ، کان، ہاتھ، پیر جب ان سے ضرورت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے تو تھک جاتے ہیں لیکن زبان کسی وقت بھی تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اسلیے حدیث میں آیا ہے کہ جب صبح ہوتی ہے تو تمام اعضأ زبان سے خوشامد کر کے کہتے ہیں کہ تو ٹھیک رہنا اگر تو درست رہی تو ہم بھی درست رہیں گے اور اگر تو بگڑی تو ہم سب بھی بگڑ جائیں گے۔

تقدس ظاہری

غرض! عیب گوئی اور عیب جوئی کا مرض ہم میں نہایت عام ہے اور جن کو خدا تعالےٰ نے چار پیسے دیئے ہیں۔ وہ خصوصیت کے ساتھ اس میں مبتلا ہیں کیونکہ معاش کی طرف سے فراغت ہو جانے کی وجہ سے کوئی کام تو رہا نہیں اور جو اصلی کام تھا یعنی ذکر اللہ اسکو کرتے نہیں اسلیے دن رات کے چوبیس گھنٹے پورے ہونے کی اسکے سوا کوئی ترکیب نہیں کہ چند ایسے ہی ایسوں کا مجمع ہوا اور اس میں دنیا بھر کے خرافات ہانکے جائیں بلکہ بعضے دیندار بھی جن کو کچھ فراغت ہے اس میں مبتلا ہیں۔ بلکہ عوام فارغین سے زیادہ مبتلا ہیں کیونکہ وہ لوگ تو بسا

اوقات شطرنج گنجفہ نرد وغیرہ میں مشغول ہو کر اسکی چھوٹ بھی جاتے ہیں اور دیندار لوگ اسکو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اس لیے ان کو سوائے مجلس آرائی اور عیب گوئی کے اکثر اور کوئی شغل ہی نہیں ملتا۔ لیکن اسکے میرا یہ مقصود نہیں کہ عیب جوئی سے بچنے کے لیے شطرنج یا گنجفہ کی اجازت دیتا ہوں ہر گز نہیں۔ ان دونوں کی حالت بول و براز کی سی ہے کہ براز بول سے زیادہ خراب اور بول براز سے نیا؟ دوسرے شطرنج وغیرہ میں اکثر اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ اسکی بدولت تمام دنیا و دین کے کاروبار چھوٹ جاتے ہیں۔ میں نے اپنے استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے سُنا ہے کہ ایک شخص شطرنج کھیل رہے تھے اور ان کا لڑکا بیمار پڑا ہوا تھا۔ اثنار شغل میں کسی نے آکر اطلاع کی کہ لڑکے کی حالت بہت خراب ہے کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں اور پھر شطرنج میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں پھر کسی نے آکر کہا کہ وہ مر رہا ہے کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں اور یہ کہہ کر پھر مشغول ہو گئے اس کے بعد کسی نے آکر کہا کہ لڑکے کا انتقال ہو گیا کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں۔ یہ سوال وجواب سب کچھ ہو لیا لیکن ان کو اٹھنے کی توفیق نہ ہوئی جب شطرنج کی بازی ختم ہوئی تو آپ کی آنکھیں کھلی اور ہوش آیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا فرمائیے جس کھیل کا انجام یہ ہو اس کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے سو اجازت مقصود نہیں۔ بلکہ صرف یہ تبلانا ہے کہ عوام تو صریح گناہوں میں مشغول ہو کر غیبت سے بعض اوقات بچ بھی جاتے ہیں مگر مدعیان دیندار ی ظاہری تقدس کے پردے میں اسکے بڑھ کر گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں پس اس بنا پر ہماری وہ حالت ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حُلل	واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید	واز درونت ننگ میدارد یزید

صرف وضع کی درستگی اور ظاہر کی آراستگی کا نام آجکل دینداری رکھ لیا ہے باقی اعمال واخلاق وہ چاہے کیسے بھی ہوں اور عوام کی حالت پر ایک اعتبار سے اس سے بھی زیادہ افسوس ہے کہ ان کا ظاہر بھی درست نہیں دینداروں میں اگر ایک کمی ہے تو ان میں دو ہیں اور یاد رکھو کہ ظاہر کی درستی بھی بیکار نہیں ہے اس کا بھی باطن پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔

حضرت موسےٰؑ جب ساحرانِ فرعون کے مقابلے کے لئے تشریف لے گئے تو مقابلے کے بعد ساحر تو سب مسلمان ہو گئے تھے لیکن فرعون نہیں ہوا تھا۔ حضرت موسےٰؑ نے خدا تعالیٰ سے اس کا سبب پوچھا ارشاد ہوا کہ اے موسےٰ! ساحران فرعون اس وقت تمہارا لباس پہن کر آئے تھے ہماری رحمت نے گوارا نہ کیا کہ تمہارے ہم لباس دوزخ میں جائیں اس لیے ہم نے ان کو ایمان کی توفیق دیدی اور فرعون محروم رہا۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ ظاہر کی درستی بھی اچھی چیز ہے مگر محض اس کی درستی پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ باطن کو بھی درست و آراستہ بنانے کی فکر ہونی چاہیئے۔

ابتلاءِ مشائخ اور جو لوگ مقتدا ہیں وہ اس کی زیادہ فکر کریں کیونکہ غیر مقتدا کو تو غیبت کرنے کی نوبت کم آتی ہے اور یہ لوگ چونکہ مرجع الخلائق ہوتے ہیں اسلئے انکو غیبت سننے کی بھی بہت نوبت آتی ہے۔ سینکڑوں آدمی ان کے پاس آتے ہیں اور ہر شخص ان کے پاس یہی تحفہ لے کر آتا ہے اور یہ اس تحفہ کو قبول کرتے ہیں۔ ہاں جو عاقل ہوتے ہیں وہ ایسے لوگوں کا علاج بھی کرتے ہیں۔

حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ فلاں شخص آپکو یوں کہتا تھا حضرت نے فرمایا کہ اس نے تو پس پشت کہا لیکن تم اس سے زیادہ بے حیا

ہو کر میرے منہ پر کہتے ہو۔ حضرت میر درد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو سماع سننے سے کچھ رغبت تھی ان کی نسبت حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ سے آکر کسی نے کہا کہ حضرت میر درد سماع سنتے ہیں۔ آپنے فرمایا کہ بھائی! کوئی کانوں کا بیمار ہے کوئی آنکھوں کا بیمار ہے۔ مرزا صاحب کے اس مقولے سے اکثر جاہلوں نے یہ سمجھا کہ مرزا صاحب حسن پرست تھے حالانکہ یہ الزام بالکل غلط اور بہتان ہے۔ اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب بوجہ لطافت مزاج کے بدصورت آدمی کو دیکھ نہ سکتے تھے اور مرزا صاحب کے بچپن کے واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی مرزا صاحب کی نسبت یہ مشہور بات ہے کہ شیر خوارگی کے زمانے میں آپ کسی بدصورت عورت کی گود میں نہ جاتے تھے حالانکہ اس وقت آپکو خوب صورتی بدصورتی کا ادراک بھی نہ تھا لیکن لطافتِ روح کے باعث آپ کو بدصورت آدمی سے اُسی وقت تکلیف ہوتی تھی اور اس کا اثر بڑے ہو کر بھی تھا۔

غرض اس قسم کے حضرات ایسے لوگوں کا منہ اسی وقت بند کر دیتے ہیں اور جو لوگ احتیاط نہیں کرتے وہ ان آنے والوں کی بدولت اکثر گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیئے کہ ؎

ہر کہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمرد ✧ بیگماں عیب تو پیش دگراں خواہد برد

اس لیے میں نے کہا تھا کہ مقتدا لوگ باستثنار متناطین و متقین کے زیادہ اس آفت میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ ہے وہ مرض۔

علماء کی غلطی

اب میں اس مضمون کا مدلولِ آیت ہونا ظاہر کرتا ہوں مگر اس کے لیے چند مقدموں کی ضرورت ہے اول اُن کو سمجھ لیا جائے اس کے بعد بہ آسانی یہ سمجھ میں آجائیگا۔

اوّل مقدمہ یہ ہے کہ نیک بات بتلانا ہر وقت طاعت ہے خواہ عمل کرے

یا نہ کرے اور یہی وہ غلطی ہے جو کہ اس آیت کے غلط سمجھنے کی بدولت علماء کو ہوئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض نے وعظ و تلقین کو بالکل ہی ترک کر دیا اور جب ان سے سبب پوچھا گیا تو یہ جواب دیا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے اتامرون الناس بالبرِ وَ تنسون انفسکم وانتم تتلون الکتٰب اور اس جواب کے بعد اپنے کو بالکل بری الذمہ سمجھ لیا مگر یہ دھوکہ ہے اور سبب اس دھوکہ کا یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ اگر خود عمل نہ کرو تو دوسروں کو بھی نصیحت نہ کرو حالانکہ یہ مقدمہ بالکل غلط ہے کیونکہ امر بالمعروف طاعت ہے اور اس طاعت کی شرائط میں یہ شرط کہیں نہیں کہ اگر خود بھی عمل کرے تو طاعت ہوگی ورنہ نہیں۔ ہاں اپنا عمل نہ کرنا ایک مستقل گناہ ہے جو کہ قابل ترک ہے لیکن امر بالمعروف کے ساتھ اس کو شرطیت وغیرہ کا کچھ تعلق نہیں اور یہ کسی حدیث سے یا کسی مجتہد کے قول سے ثابت نہیں کہ اگر گناہ سے نہ بچے تو دوسری طاعت بھی طاعت نہ ہوگی۔ اور اگر اس کو مانا جائے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہونگے ان الحسنات یذھبن السّیّات کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسکی بارے میں ہے جو کہ نیکی بھی کرتا ہے لیکن گناہ میں بھی مبتلا ہے تو اگر گناہ کرنا دوسری طاعت کے طاعت نہ رہنے کا موجب ہو تو اس کفارہ سیئات کی کوئی صورت ہی نہ رہے گی اور مضمون آیت کے بالکل خلاف لازم آتا ہے البتہ اگر کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جو کہ مفوّتِ طاعت ہے تو بے شک پھر طاعت طاعت نہ رہے گی۔ اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں طاعت اپنی حالت پر رہے گی اگرچہ معصیت کرنے سے گناہ بھی ہوگا۔ ہاں اتنا اثر ضرور ہوگا کہ گناہ کی وجہ سے طاعت کی برکت کم ہو جائے گی۔

سو یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کو انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسرے وقت

مستقل طور پہ بیان کروں گا (فرمایا کہ بہتر ہو اگر مجھے اس کے متعلق یاد دلایا جائے کیونکہ بعض لوگوں کو اس مسئلے کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے گناہ کرنے میں بہت بے پروا ہی ہو گئی ہے اور یوں سمجھتے ہیں کہ گناہ کو طاعت کے عدم میں کچھ بھی علاقہ نہیں حالانکہ عدم برکت کا علاقہ ہے) مگر اس وقت یہ بیان کرنا ہے کہ گناہ کرنے سے طاعت منہدم نہ ہو جائے گی اور دلیل اس کی یہ آیت ہے کہ ان الحسنات یذھبن السیئات۔ جب اس کی بناء الگ ہوئی تو یہ سمجھنا کہ اگر وعظ کہوں گا تو گنہگار رہوں گا غلطی پر مبنی ہے۔ پس امر بالمعروف طاعت ہوا اور اس کا طاعت ہونا گناہ نہ کرنے پر موقوف نہ ہوا بلکہ آیت میں ملامت اس پہ ہے کہ تم خود کیوں عمل نہیں کرتے۔ اور وعظ کے چھوڑ دینے سے تو دوسرا جرم قائم ہو گیا یعنی نہ خود عمل کریں اور نہ باوجود معلوم ہونے کے دوسروں کو تبلائیں یہ ہے علماء کی اس غلطی کا کشف۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ ان الحسنات یذھبن السیئات۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب ایک شخص امر بالمعروف کرتا ہے جو کہ طاعت ہے اور طاعت مزیل ہوتی ہے معصیت کی تو اس کا اقتضاء یہ ہو سکتا تھا کہ کفارہ ہو جاتا نسیان نفس یعنی ترک عمل کا۔ مگر اس طاعت کے ہوتے ہوئے بھی اس کا یہ نسیان اس امر بالمعروف سے ہوا تو جہاں امر بالمعروف بھی نہ ہو نری بدعملی ہی ہو جس میں عیب جوئی بھی داخل ہے وہ تو کیونکر موجب ملامت نہ ہو گی ضرور ہو گی۔

خلاصہ یہ ہو گا کہ اے شخص جو کہ اپنی حالت کو بھول رہا ہے جبکہ تیری حالت ایک معصیت اور ایک طاعت کے مجموعہ پر بھی محل ملامت ہے تو جب طاعت ایک بھی نہ ہو بلکہ دونوں امر معصیت ہوں تو کیونکر موجب ملامت نہ ہو گی اور دو معصیتیں اس طرح ہوئیں کہ بدعملی تو اپنی حالت پر رہی جس کو تنسون۔۔

آنفسکم فرمایا ہے اور امر بالمعروف کی بجائے دوسرے کی عیب جوئی ہوگئی۔ تو اس حالت میں تو بدرجہ اتم ملامت ہونی چاہیئے۔

پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس میں ملامت کی بنا بدعملی وعیب جوئی ہے۔ علماء کو ہی خطاب نہیں بلکہ جہلاء کو بھی ہے کیونکہ اس کا ارتکاب وہ بھی کرتے ہیں بلکہ جہلاء کو زیادہ سخت خطاب ہے اور علماء کو ہلکا۔ کیونکہ ان کے پاس ایک نیکی تو ہے۔ امر بالمعروف اور جہلاء کے پاس تو ایک بھی نہیں۔ اب اس کو غور کیجئے اور جہل پر اپنے فخر کو دیکھیئے کہ اس کی بدولت تعزیرات الٰہیہ کی ایک دفعہ اور بڑھ گئی۔ مقصود اس سب سے یہ ہے کہ ہماری جو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ ہم دوسروں کی عیب جوئی کیا کرتے ہیں اس کو چھوڑ دینا چاہیئے اور اپنی فکر میں لگنا چاہیئے۔ صاحبو! اپنے جرائم کیا کچھ کم ہیں کہ ہم دوسروں کی فکر کریں۔

آدابِ اصلاح

اور یہ جو میں نے کہا تھا کہ اصلاح قوم کے لئے تفتیش حالات جائز ہے اس کے کچھ آداب بھی ہیں ان کو معلوم کر لینا ضروری ہے سو ایک ادب تو اس کا یہ ہے کہ اصلاح کسی شخص کی مجمع عام میں نہ کی جائے کیونکہ اس میں دوسرے کو شرمندگی ہوتی ہے اور اس شرمندگی کا اثر یہ ہے کہ نصیحت کرنے والے سے بغض ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس امر کو ترک کرنے کی بجائے اس میں اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سمجھتا ہے کہ میری رسوائی تو ہو ہی گئی پھر میں کیوں چھوڑوں اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ یا تو خود اس کو خلوت میں لے جا کر اس سے کہہ دے یا اگر اس سے نہ کہہ سکے تو کسی ایسے شخص سے کہہ دے جو کہ اسکی اصلاح کر سکے لیکن اس کے دشمن سے نہ کہے کیونکہ دشمن سے کہنے میں اصلاح تو ہو نہیں سکتی ہاں تذلیل ہو گی۔

دوسرا ادب یہ ہے کہ نرمی سے کہے تحقیر اور طعن کے طور پر نہ کہے تیسرا ادب

یہ ہے کہ اگر مجمع میں عام خطاب سے کہے تو ایسے پتے نہ دے کہ عام میں اسکی... رسوائی ہو مجھے یہ امر بہت پیش آتا ہے یعنی یہ فرمائش کی جاتی ہے کہ فلاں شخص سود لیتا ہے ذرا وعظ میں اس کی خبر لیجیے گا یا فلاں شخص نے حقوق دبا رکھے ہیں ذرا اسکے متعلق فرما دیجیے گا۔ لیکن میں بحمداللہ ان فرمائشوں پر کبھی عمل نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ طریق اصلاح بجائے مفید ہونے کے مُضر ہے سننے والے قرائن سے سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں کو کہا جا رہا ہے اور اسکے مجمع عام میں اس کو شرمندگی ہوتی ہے جس کا نتیجہ بُغض عداوت ہے اور اسکے سبب اپنے فعل کی اور زیادہ پیچ ہو جاتی ہے اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اگر واقعی ان لوگوں کی اصلاح کرنا منظور ہے تو اوّل ان سے میل جول پیدا کیا جائے۔ جب خوب بے تکلفی ہو جائے تو وقتاً فوقتاً نرمی سے ان کو سمجھایا جائے اور خدا تعالٰے سے ان کے لیے دعا کی جائے اور جو تدبیریں مفید ثابت ہوں انکو عمل میں لایا جائے غرض وہ برتاؤ کیا جائے جو کہ اپنی اولاد سے کیا جاتا ہے اگر ان کی شکایت کسی دوسرے سے کی جائے گی تو اپنے دوستوں سے کی جائے گی جو کہ اس کی اصلاح کر سکیں یا بزرگوں سے کی جائے گی کہ وہ اس کے لیے دعا کریں۔ علیٰ ھذا جن سے درستی کی امید ہو گی اُن سے کہا جائے گا اور جہاں یہ بات نہ ہو گی وہاں زبان پر بھی اپنی اولاد کے عیوب کو نہ لایا جائے گا۔

یہ مثال بحمداللہ ایسی عُمدہ ہے کہ اس کے پیش نظر رکھنے کے بعد اصلاح کے تمام آداب معلوم ہو جائیں گے۔ یعنی جس مسلمان کی اصلاح کرنی چاہو۔ یہ غور کر لو اگر یہ حالت تمہاری اولاد کی ہوتی تو ہم کیا برتاؤ اسکے ساتھ کرتے بس جو برتاؤ اسکے ساتھ طبیعت تجویز کرے وہی برتاؤ اس غیر کے ساتھ بھی کرو۔

آئینۂ مسلم

اور میں اس حدیث کے کہ المسلم مرآۃ المسلم یہی معنی بیان کیا کرتا ہوں۔ یعنی جس طرح آئینہ کا خاصہ ہے کہ وہ تمہارے عیوب چہرہ کو تم سے چھپاتا نہیں اور دوسروں پر ظاہر نہیں کرتا اسی طرح مسلمان کو بھی ہونا چاہیئے کہ کسی مسلمان کے عیوب کو اس سے چھپائے نہیں اور دوسروں پر ظاہر نہ کرے۔ نیز یہ کہ کسی مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ نہ رکھنا چاہیئے بلکہ.. آئینہ کی طرح بالکل صاف باطن رہنا چاہیئے کسی نے خوب کہا ہے ؎

کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن　　آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

یہ شعر اس مقام پر بہت زیادہ چسپاں تو نہیں ہے لیکن لفظ آئینہ کی مناسبت سے پڑھ دیا گیا ہے کہ آئینہ کی شان صفائی ہوتی ہے اور اوپر جو وجہ شبہ بیان کی گئی ہے وہ بھی صفائی کی فرد ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جب کسی کے عیوب پر مطلع ہو تو اسکو اطلاع کر دو اور اگر یہ کارگر نہ ہو تو خدا تعالیٰ سے دعا کرو۔ غرض دوسرے کی عیب جوئی وعیب گوئی ان مصالح سے تو جائز ہے اور اگر یہ مصالح نہ ہوں تو باستثنار ایک موقع کے بالکل حرام ہے اور وہ موقع یہ ہے کہ مظلوم شخص ظالم کی عیب گوئی کرے۔ کیونکہ مظلوم کو ظالم پر غصہ ہوتا ہے اور وہ غصہ حق ہوتا ہے۔ پس شریعت نے مظلوم کو اجازت دیدی ہے کہ وہ اپنے غصے کو نکال لے۔

سبحان اللہ! شریعت اسلام کی تعلیم بھی عجیب پاکیزہ تعلیم ہے کہ کسی ایک قابل رعایت پہلو کو بھی نہیں چھوڑا مجھے تو اسلام کی تعلیم دیکھ دیکھ کر یہ شعر یاد آیا کرتا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

دیکھئے! مظلوم چونکہ اپنے جائز غصے کو نکالتا ہے اور یہ طبعی امر ہے کہ اسکی ضبط

سے کلفت ہوتی ہے تو اس کو اجازت دیدیگئی۔ نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ جب اس مظلوم کی غیبت سے لوگوں کو ظالم کے ظلم کی حالت معلوم ہوگی تو وہ اپنے بچانے کی فکر کرلیں گے۔ بلکہ بعض بزرگوں نے ایک مستقل مصلحت یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مظلوم کو چاہیئے کہ اگر اسکو باطنی قرائن سے معلوم ہوجائے کہ میرے صبر کرنے سے ظالم پر ضرور قہر نازل ہوگا (کیونکہ بعض شخص کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہوتا ہے) تو اپنی زبان سے کچھ تھوڑا ضرور ظالم کو کہہ لیا کرے کیونکہ اس کی خاموشی سے اندیشہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا غضب دنیا ہی میں ظالم پر ٹوٹے۔ اور بعض بزرگوں کے کلام سے جو نہ کہنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے وہ اس بناء پر کہ صبر ایک نیک عمل ہے اس کے کرنے سے مظلوم کو زیادہ ثواب ملے گا۔ لیکن جنہوں نے کچھ کہنے کی اجازت دی اور اس کو افضل بتلایا انہوں نے یہ خیال کیا کہ مسلمان بندے کو دوزخ کا عذاب ہو اور خدا تعالے کے قہر سے محفوظ رہے۔

مصلحتِ اظہارِ ظلم

شاید کسی طالب علم کو شبہ ہو کہ خدا تعالے کے قہر سے محفوظ رہنے کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ وہ مظلوم معاف کردے تو سمجھنا چاہیئے کہ بعض لوگوں کا معاملہ خدا تعالے کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ معاف بھی کردیں تو خدا تعالیٰ اپنا حق کہ ان کے بندے کو ستایا تھا معاف نہیں فرماتے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ چلے جارہے تھے کہ ایک شخص نے انکو بیہودہ کہا ان بزرگ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا کہ اسکے ایک دھول مار۔ وہ ذرا متامل ہوا۔ فوراً وہ شخص زمین پر گرا اور مرگیا۔ انہوں نے اپنے مرید سے کہا کہ تم نے دیر کی اور اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ اور فرمایا کہ جب اسکے مجھے برا بھلا کہا تو میں نے دیکھا کہ قہر خداوندی اس پر نازل ہوا چاہتا ہے۔ اس لیے میں نے چاہا تھا کہ میں خود ہی

اسکو کچھ کہہ لوں تاکہ قہر خداوندی اس پر نہ پڑے لیکن تم نے دیر کی۔ آخر یہ شخص ہلاک ہوگیا۔ اور یہی راز ہے کہ جب حضور صلعم کے دہن مبارک میں کڑوی دوا ڈالی گئی اور آپکے منع فرمانے پر لوگوں نے نہیں مانا تو حضورؐ نے ہوش آجانے کے بعد فرمایا کہ جن لوگوں نے میرے منہ میں دوا ڈالی ہے ان سب کے منہ میں دوا ڈالی جائے سوائے عباسؓ کے کہ وہ شریک رائے نہ تھے تاکہ مکافات ہو جائے اور یہ لوگ قہر خداوندی میں مبتلا نہ ہوں۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ اکثر لوگوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت دیتے تھے کسی نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ لوگوں کی اکثر حرکات سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور میری تکلیف کی وجہ سے لوگ وبال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور میں نے ہرچند خدا تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ میری وجہ سے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے لیکن میری یہ دعا قبول نہیں ہوتی حافظ فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات ۔۔۔ با دردکشاں ہرکہ درافتاد برافتاد

اور ؎

ہیچ قومی را خدا رسوا نہ کرد ۔۔۔ تا دل صاحبدلی نامد بدرد

تو چونکہ بعض کے معاف کرنے سے بھی پورا معاف نہیں ہوتا اسلیے وہاں کچھ کہہ لینا ہی مصلحت ہے۔ غرض مظلوم کو اظہار ظلم کی بدوں کسی مصلحت کے بھی اجازت ہے اگر وبال کے ٹل جانے یا ہلکا ہو جانے کی نیت ہو تو وہ مستحسن ہے لیکن غیر مظلوم کو مصالحۃ سابقہ کے بغیر اجازت نہ ہوگی۔

اظہار مرض

اب میں اپنے بیان کو بقیہ آیت کا ترجمہ کر کے ختم کرتا ہوں فرماتے ہیں وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ یعنی باوجودیکہ تم کتاب اللہ کو پڑھتے ہو اور اسکے احکام تم کو معلوم ہیں۔ شاید بعض لوگ اس ترجمے

کو سُن کر خوش ہوں کہ یہ تمام خطاب تو اُن لوگوں کے لیے ہے جو کہ کتاب کو پڑھتے ہیں
ہم چونکہ پڑھے ہوئے نہیں اسلیے ہم مخاطب نہیں ہیں لیکن یہ خوشی صحیح نہیں کیونکہ
آگے یہ بھی ارشاد ہے افلا تعقلون۔ یعنی کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔ جس سے معلوم ہوا کہ
یہ مسئلہ جس طرح نقلی ہے عقلی بھی ہے یعنی عقل بھی اسکی قبح کا فتوٰے دیتی ہے
بہر حال اس آیت سے بدلالت مطابقی اس پر وعید ہوئی کہ اوروں کو سمجھاؤ اور خود
عمل نہ کرو اور بدلالت التزامی و بدلالت النص یہ ثابت ہوا کہ اوروں کی برائی کے
درپے ہونا اور اپنی برائیوں کو فراموش کرنا بُرا ہے ضرورت اسکی ہے کہ ہر وقت
اپنے گناہوں اور عیوب پر نظر ہو۔ اور اس کے معالجے کی فکر کی جائے اور جس میں اپنی
فکر کافی نہ ہو اس میں دوسرے ماہر سے رجوع کرو۔ شرم و حجاب کی وجہ سے اپنے
امراض کو معالج سے چھپایا نہ جائے کیونکہ اظہار مرض کے بغیر علاج ممکن نہیں۔

یہ بیان ختم ہوا۔ چونکہ اس مرض میں اکثر لوگ مبتلا تھے اس لیے اس کا بیان
کرنا ضروری سمجھا گیا۔ سو بحمد اللہ کافی گفتگو اس پر ہو گئی۔

اب خدا تعالےٰ سے دعا کی جائے کہ وہ ہم کو فہم صحیح اور اعمال صالحہ کی توفیق عطا
فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

اِحسانُ التّدبیر

۱۹ رجب المرجب سنہ ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں سوا دو گھنٹے تک بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحبہ وازواجہ وبارک وسلم اما بعد

فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ - وَأۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِهَا... وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۝

تمہید

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے اور دو جملوں پر مشتمل ہے اس کا شان نزول گو خاص ہے مگر مقصود اس سے ایک عام مضمون پر دلالت کرنا ہے اور اسی عام مضمون میں یہ مضمون بھی داخل ہے جس کو اس وقت میں بیان کرتا ہوں - اگرچہ اس وقت قصد ایک دوسرے مضمون کے بیان کا تھا لیکن

بقاعدہ الاہم فالاہم چونکہ اس وقت یہ مضمون زیادہ ضروری معلوم ہوا اس لئے اس کو اختیار کیا گیا ہے۔

اُمراء کی سنگدلی

یہ سب کو معلوم ہے کہ آجکل ہمارے نواح میں بارش کا کہیں پتہ نہیں ہے اور لوگوں کو قحط کا اندیشہ ہے بلکہ لوگوں کو اسی وقت سے بارش نہ ہونے کے سبب تکلیف شروع ہوگئی ہے۔ خاص کر ان لوگوں کو جن کے پاس نہ غلہ ہے نہ اس قدر وافر روپیہ ہے کہ وہ اس سے اپنی ضرورت پوری کر سکیں البتہ جن لوگوں کے گھروں میں غلہ بھرا پڑا ہے یا جو لوگ روپئے والے ہیں وہ البتہ اس تکلیف سے بچے ہوئے ہیں اور یہ تو خوشی کی بات ہے اور ان کو کسی قسم کی فکر بھی نہیں کیونکہ آثار قحط سے بچنے کا سامان ان کے پاس موجود ہے نہ اپنی فکر ہے اور یہ بھی محل شکایت نہیں اور نہ برائی اور یہ محل شکایت ہے کیونکہ یہ خاصیت جانور کی ہے چنانچہ طوفان میں ہر جاندار کو غرق کی فکر ہوتی ہے لیکن بط کو فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ پانی کتنا ہی اونچا ہو جائے میں بہر صورت اس سے اونچی ہی رہوں گی ؎

گر از نیستی دیگرے شد ہلاک — ترا ہست بط را ز طوفاں چہ باک

اسی طرح نادار ان کی حالت کا امراء کو بھی کچھ خیال نہیں امراء کی طرف سے نادار لوگ بچیں یا ہلاک ہوں اُن کے پاس تو غلہ بھرا ہے وہ بے فکر ہیں کہ ہم کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا گھر میں سے نکالیں گے اور کھائیں گے اور یہی لوگ ہیں جن کی سنگدلی بہت بڑھ جاتی ہے اور ترحّم کا پتہ بھی ان میں نہیں رہتا۔ لیکن یہ ہے یہ بہت بڑی غلطی۔

انسانیت کا امتیاز

حدیث شریف میں وارد ہے کہ بنی آدم مثل اعضا یکدیگر ہیں یعنی جو حالت ایک انسان کے اعضا

کی ہوتی ہے کہ اگر پیر میں درد ہے تو سر بھی متاثر ہے آنکھیں بھی متاثر ہیں اسی طرح بنی آدم کا حال بھی ہونا چاہیئے خاصکر مسلمانوں کا اثر ان کو ایک دوسرے کی ضرور مدد کرنا چاہیئے اور ہر شخص کو دوسرے کے غم سے غمگین ہونا چاہیئے اور اس کے ازالے کی تدابیر میں لگنا چاہیئے جس قسم کی تدبیر بھی ممکن ہو اسلیئے کہ تدابیر مختلف ہوتی ہیں کسی امر کی تدبیر یہ ہے کہ اسکے لیے دعا کی جائے کسی کی تدبیر یہ ہے کہ اسباب طبیعہ کی مباشرت کی جائے ایک کو دوسرے سے غافل ہرگز نہ رہنا چاہیئے... یہ ہے انسانیت جس کو حضورؐ نے بیان فرمایا ہے اور اس کا ترجمہ شیخ شیرازی علیہ الرحمۃ نے ان الفاظ میں کیا ہے

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند	کہ در آدمیت زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار	دگر عضوہا را نماند قرار
چو از محنتِ دیگراں بے غمی	نشاید کہ نامت نہند آدمی

شریعت مطہرہ نے مواسات کی یہاں تک رعایت کی ہے اور اس کی تعلیم دی ہے کہ ارشاد ہوتا ہے جب گوشت پکایا کرو تو اس میں شوربا زیادہ کر لیا کرو آگے فرماتے ہیں وتعاھد واجیرانکم اللہ اکبر! شریعت مطہرہ نے کس قدر رعایتیں کی ہیں اور کیسی پاکیزہ تعلیم دی ہے۔

تعلیمِ مواسات

اس حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہمدردی کی تعلیم کے ساتھ ہی ایک دوسرے بڑے دقیق امر کی کتنی رعایت فرمائی ہے۔ یعنی اس حکم کے ساتھ شوربا زیادہ کر لیا کرو اور خود ہی سب بھون کر مت کھا جایا کرو۔ ایک ایسے امر کی رعایت کی ہے کہ نبی کے سوا... دوسرے کے کلام میں اتنی دقیق رعایت ممکن نہیں اور ایسی رعایتیں نبی کے کلام میں اسلیے ہوا کرتی ہیں کہ ان حضرات کو خدا تعالے خود ادب اور علم سکھلاتے ہیں چنانچہ

ارشاد ہے۔ علمنی ربی فاحسن تعلیمی وادّبنی ربّی فاحسن تادیبی

طبع انسانی کی رعایت

اور وہ امر یہ ہے کہ انسان اگرچہ کتنا ہی بڑا ہمدرد ہو اور صفتِ ایثار اس میں کتنی ہی غالب کیوں نہ ہو۔ لیکن اس میں یہ خصلت بھی طبعاً ضرور ہوتی ہے کہ وہ ہر امر میں دوسرے کو اپنی برابر نہیں رکھتا اور اپنے مرافق خاصہ میں طبعاً دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرتا اور قرآن مجید نے بھی اس کی اجازت دی ہے اور یہ بالکل فطرت کا مقتضا ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ غالباً ہر شریعت آسمانی میں اسکی اجازت ہوگی۔ سو قرآن مجید میں ارشاد ہے ھَل لکم ما ملکت ایمانکم من شرکاء فیما رزقنٰکم فانتم فیہ سواء۔ اس آیت میں توجیہ کو بیان فرما رہے ہیں اور اس کی توضیح کے لئے ایک مثال دیتے ہیں کہ تم خدا کی مملوک کو خدا کے برابر کیسے قرار دیتے ہو حالانکہ اگر تمہارا ایک غلام ہو تو کیا تم اسکو اپنی برابر سمجھو گے یعنی حظوظ اور انتفاعات کے حاصل کرنے میں تم ان کو اپنی برابر نہیں سمجھتے۔

عدم مساوات کی اجازت

اس مثال کو ذکر کر کے اس کو رد نہ فرمانا۔ بلکہ استدلال کرنا اس عدم مساوات کی اجازت کی صاف دلیل ہے اور یہ مساوات واجب بھی نہیں ہے اور حکمت اس کے واجب نہ ہونے کی یہ ہے کہ اس پر بہت کم آدمی عمل کر سکتے علیٰ ہذا حدیث سے بھی اس کی اجازت مفہوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ اگر غلام سے اچھا کھانا پکواؤ تو بہتر تو یہ ہے کہ اس کو اپنے ساتھ کھلاؤ۔ لیکن اگر ایسا نہ کر سکو تو کم از کم اتنا تو ضرور کرو کہ ایک لقمہ بنا کر اسکے ہاتھ پر رکھ دو اور اس حدیث میں بھی علاوہ تعلیم ہمدردی کے ایک بڑی حکمت تمدنی بھی ہے کہ اسکی چوری کا

انسداد بالکل ہوگیا کیونکہ جب غلام یہ سمجھے گا کہ آقا خود مجھے دیدے گا تو چوری نہ کریگا اسی طرح جس تعلیم کو دیکھئے اس میں بڑے بڑے دقیق امور کی رعایت ہے اگرچہ اس وقت وہ امور حضورؐ کو مقصود نہ ہوں۔ چنانچہ اس مقام پر بھی گو اس انسداد کی غرض سے ایسا نہ فرمایا ہو لیکن تعلیم اتنی پاکیزہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے اس کا بھی انسداد ہو جائے گا۔

غرض اس لقمہ رکھ دینے کی حدیث میں ہمدردی کی بھی رعایت ہے اور انسان کے طبعی مقتضا کی بھی رعایت ہے کہ بہتر تو ساتھ کھلانے کو فرمایا اور ساتھ ہی اس کی بھی اجازت دیدی کہ الگ سے تھوڑا سا دیدو کیونکہ نفس میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ جب میں کماتا ہوں تو دوسرا اس میں برابر کا کیوں شریک ہو۔

اسی طرح قرآن میں اَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ فرمایا یعنے کیا تم غلاموں کو اپنی برابر… بنالوگے۔ یہ تمثیل بھی اس پر دال ہے کہ مساوات باہم نہیں ہو سکتی اسلئے کہ خدا نے اس پر انکار فرمایا۔ اور یہ قاعدہ مقررہ ہے کہ جب کسی امر کو نقل کر کے قرآن وحدیث میں اس پر انکار نہ کیا جائے تو وہ ہمارے لیے بھی شریعت ہوتا ہے جیسا اوپر بیان کیا گیا۔

مسلک ابوذر غفاریؓ

اگر کسی کو شبہ ہو کہ حدیث میں تو البسوھم مما تلبسون واطعموھم مما تطعمون۔ آیا ہے پھر عدم مساوات کی اجازت کہاں ہوئی جواب اس کا یہ ہے کہ یہ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے اور بصورت وجوب اسلیے فرمایا کہ مخاطب اسکے ایک خاص شخص تھے اور ان کی خصوصیت و تنبیہ کا مقتضا یہ ہوگا کہ اس میں تاکید ہو۔ واقعہ اسکا یہ ہوا تھا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ جو کہ نہایت جلیل القدر صوفی مشرب صحابی ہیں۔ اور ان کی شان دوسرے صحابہ کرام سے بالکل جدا ہے

ایک مرتبہ یہ ایک غلام سے لڑ رہے تھے۔ اسی اثناء میں انہوں نے اس کے نسب پر طعن کیا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جا کر شکایت کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بلایا اور یہ فرمایا کہ انک امرءٌ فیک جاھلیۃ اور فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے ان کو تمہارے قبضے میں کر دیا ہے ان کو حقیر نہ سمجھو بلکہ جو خود کھاؤ وہ کھلاؤ جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ تو اس واقعہ میں اگر تعلیم مجاہدہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصود کہا جائے تو اس کی خصوصیت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صیغے کو تاکد کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور حضرت ابوذر غفاری نے بھی اس پہ یہاں تک عمل کیا کہ ایک مرتبہ ان کے پاس دو چادرے تھے جن کے مجموعے کو عربی میں حلہ کہتے ہیں انہوں نے ایک تو خود پہنا اور ایک اپنے غلام کو دیدیا ایک شخص نے ان کو ایک چادرے میں دیکھا تو کہا اے ابوذرؓ! یہ چادرے دونوں اگر تم رکھتے تو پورا حلہ ہو جاتا اور اچھا معلوم ہوتا۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ یہ تو تم سچ کہتے ہو لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ۔ اس روز سے میں اپنے اور غلام کے کھانے کپڑے میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ یہ تو آپ کی خصوصیت کے اعتبار سے کلام تھا اور اگر عام لیا جائے اور ظاہر یہی ہے بھی تو پھر یہ امر استحباب کے لیے ہے اور دلیل استحباب کی وہی سابق حدیث ہے کہ کم سے کم ایک لقمہ ہی دیدیا کرو۔ تو تفاوت رکھنا تو جائز ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ بالکل ہی رحم نہ کیا جائے اور خبر ہی نہ لی جائے۔

اجازت تفاوت

بس اسی جواز تفاوت کی رعایت ہے کہ حضورؐ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر گوشت پکایا کرو تو شوربا زیادہ کر لیا کرو۔ یعنی اگر اپنی برابر دوسروں کو بھنا ہوا گوشت نہ کھلا سکو تو جیران کو کچھ شوربا ہی دیدیا کرو۔ بعض صالحین کا بھی عمل اسکے موافق سُنا گیا ہے۔ کہ جب ان کے

ہاں گوشت پکتا تو شوربا بڑھا کر پڑوسیوں کو بھی دیتے تھے یہ ایسا حکم ہے کہ عمل کرنے والے کو اس میں ذرا بھی گرانی نہیں ہوسکتی اور مصلح کی یہی دانائی ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر دانا کون ہوسکتا ہے۔ غرض ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ ہمدردی کی سخت ضرورت ہے۔

جانوروں سے ہمدردی

بلکہ بعض احادیث سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی ہمدردی کرنا ضروری ہے اور ان کو ستانا جائز نہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اگر سواری کو ٹھہرا کر بات کرنا ہو تو اس پر سے اتر پڑو اس پر چڑھے چڑھے زیادہ باتیں مت کرو۔ حتیٰ کہ جن جانوروں کے ذبح کرنے یا قتل کرنے کی بھی اجازت دی ہے ان کے ذبح اور قتل کے بھی قاعدے بتلا دیئے ہیں اور اس میں ظلم کی اور ترسانے کی ممانعت اور اس پر وعید فرما دی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بلی پال لی تھی اور اسکو باندھ کر رکھ چھوڑا تھا نہ خود کچھ کھلاتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ کچھ کھا کر گذر کرلے۔ حتیٰ کہ وہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب عالم برزخ کا معائنہ فرمایا تو دیکھا کہ وہ عورت دوزخ میں جل رہی ہے اور وہ بلی اس پر مسلّط ہے اور نوچ رہی ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب بلی آگ میں تھی تو سزا تو اس کو بھی ہوئی پھر اس نے بدلہ کیا لیا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو یہی ضرور نہیں کہ جو چیز آگ میں ہو وہ جلا ہی کرے اس لیے کہ آگ میں جلانے کی قوت خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کسی خاص چیز کے حق میں اس اثر کو باطل فرمادیں۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اس بلی کی صورت میں کوئی دوسری چیز اس پر مسلّط کی گئی ہو اور بلی کی صورت اسلئے بنا دی گئی ہو تاکہ اس عورت کو یاد آجائے کہ

میرے فلاں عمل کی سزا مجھ کو مل رہی ہے تو معلوم ہوا کہ جانوروں کا ستانا بھی جائز نہیں۔ البتہ جو جانور ستاتے ہوں ان کو مار ڈالنا جائز ہے لیکن ایک دم سے مار دینا چاہیئے ستا ستا کر مارنا جائز نہیں ہے۔

ذبح کے آداب

اسی طرح ذبیحہ کے لیے فرمایا کہ چھری کو تیز کر لیا کرو اور جلدی ذبح کر دیا کرو۔ جب چار رگیں کٹ جائیں تو پھر آگے تک چھری چلانا بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ چاروں رگوں کے کٹنے کے بعد فوراً تو جان نکلتی نہیں اسلیے اگر آگے بھی چھری چلائی جائے گی تو بلا ضرورت اس کو تکلیف ہوگی اور یہ حرام ہے۔

افسوس ہے کہ آجکل دوسری قومیں مسلمانوں کو بے رحم بتلاتی ہیں۔ وہ ذرا آنکھ کھول کر دیکھیں کہ مسلمانوں میں کس قدر رحم ہے اور اگر اس کا نام بھی بے رحمی ہے تو دنیا میں کوئی بھی رحیم نہیں کیونکہ تمام قومیں اپنی ضرورت میں آدمی کے قتل تک کو بھی جائز کہتی ہیں۔ چنانچہ ملکی لڑائیوں میں اور مذہبی جنگجوں میں ہزاروں آدمی تیغ کے گھاٹ اتر جاتے ہیں جو لوگ ہتیا کرتے ہیں وہ بھی بکری وغیرہ کو سانپ کو بچھو کو مار ڈالتے ہیں اور اگر کوئی کہے کہ ہم تو کسی کو بھی نہیں مارتے تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جب آپ کے گھر میں بہت سے چوہے ہو جاتے ہیں اور وہ اکھو ستاتے ہیں تو آپ ان کا کیا علاج کرتے ہیں بعضے یہ کہیں گے کہ ہم ان کو پکڑ کر دوسرے محلے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ بعضے ایسا کرتے بھی ہیں تو نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اُس محلے کے مسلمان خوب اچھی طرح جوتوں سے مار مار کر ان کا خاتمہ کریں۔ تو صاحبو! کیا کوئی عقلمند اس کو رحم کہے گا کہ جن چیزوں کو اپنا دلوتا سمجھا جاتا ہے ان کو ایسے لوگوں کے سپرد کیا جائے جن کو بے رحم سمجھا جاتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اپنی مصلحت سے دوسروں کی جان لینا جائز ہے اور یہ

ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ کی اجازت اپنی مصلحت سے بڑھ کر ہے تو خدا تعالےٰ کی اجازت سے دوسروں کی جان لینا کیوں نہ جائز ہوگا۔ اور جب جائز ہے تو مسلمانوں پر بے رحمی کا اعتراض بالکل غلط ہوا اور اگر اب بھی وہ بے رحم ہیں تو آپ اُن سے زیادہ بے رحم ہیں کہ ان کے ہاتھ سے بیرحمی کراتے ہیں۔

غرض جانور کے ذبح کو بھی بے رحمی بتلانا سخت غلطی ہے ہاں ذبح میں اس کو تکلیف دینا ستانا یہ بے رحمی ضرور ہے تو شریعت مطہرہ نے اس کی کہیں اجازت نہیں دی۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل ذبح کرنے والے اکثر اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ بعض تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ ٹھنڈا ہونے سے قبل ہی کھال بھی کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔ خیر قصائیوں کو اختیار ہے وہ جو چاہیں کریں خود بھگتیں گے۔ لیکن جو لوگ ذبح کرتے ہیں وہ تو ذبح میں کہ ان کا فعل ہے تکلیف نہ دینے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ خدا ہمارے بزرگوں کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے قصائیوں کو ذبح کی اجازت ہی نہیں دی۔ اس میں منجملہ دوسرے مصالح کے ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اکثر سخت دل ہوتے ہیں۔ پس دوسرے لوگ کچھ تو رحم کریں گے بالخصوص قربانی کے جانوروں میں تو لوگوں کو بہت ہی احتیاط کرنی چاہیئے کیونکہ وہ تو خالص اپنی مِلک ہیں قصائیوں کا اس میں کوئی اختیار نہیں پس جب تک وہ ٹھنڈے ہی نہ ہو جائیں ہرگز کھال نہ نکلنے دیں۔

رحم کا ثمرہ

تو جب شریعت میں جانوروں کو ستانے کی اجازت نہیں اور اُن پر رحم کا حکم ہے اور اس رحم پر ثواب بھی مرتب ہوتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک فاحشہ عورت چلی جا رہی تھی۔ راستہ میں اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ پیاس کے مارے سسک رہا ہے۔ اُس عورت کو بہت قلق ہوا اور اُس نے کتے کے لیے پانی تلاش کرنا شروع کیا آخر ایک کنواں ملا لیکن

اس کنویں پر نہ رسی تھی نہ ڈول تھا۔ اس عورت نے اپنا چمڑے کا موزہ اتارا اور اپنی اوڑھنی سے رسی کا کام لے کر پانی نکالا اور اس کتے کو پلایا۔ خدا تعالیٰ نے اس عمل کی بدولت اس کے عمر بھر کے گناہ بخش دیئے اور بے حساب اس کو جنت میں داخل کر دیا۔ اس حدیث کو سُن کر صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا جانوروں کو پانی پلانا بھی ثواب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر جاندار کو آرام دینے میں ثواب ہے۔ غرض جب شریعت میں جانور تک کو آرام دینے کا حکم ہے تو کیا اس میں انسان کو آرام پہنچانے کا حکم نہ ہوگا یا انسان کا کوئی حق اس شریعت میں مقرر کیا گیا ہوگا۔ افسوس ہے۔

حقیقی رحم

آج کل اکثر لوگ جانوروں پر تو رحم کرتے ہیں لیکن اپنے بھائیوں پر رحم نہیں کرتے۔ بعض کی تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان کے گھر میں چیزیں رکھی رکھی سڑ جائیں گی لیکن کبھی یہ توفیق نہ ہوگی کہ پڑوسیوں کو یا کسی دوسرے حاجت مند کو اس میں سے کچھ دیدیں اور اگر کسی کو دیں گے تو ایسے شخص کو جس کو دینے سے ان کا نام ہو یا ان کا کوئی کام نکلے تو یہ دینا واقع میں اپنے ہی کو دینا ہے باقی ترحم کے لیے بہت کم لوگ ہیں کہ وہ کسی کو کچھ دیتے ہوں اور یہ لوگ زیادہ تر وہ ہیں جو کہ خود نہایت آرام میں ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تکلیف کس چیز کا نام ہے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سات برس کے متصل قحط میں کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔ اور جب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ آج کل قحط کا زمانہ ہے لوگ بے وقت میرے پاس غلہ لینے کے لیے آتے ہیں اگر میں شکم سیر ہو کر کھاؤں گا تو مجھ کو ان کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہو سکے گا تو ممکن ہے میں کسی وقت غلہ دینے سے انکار کر دوں اور بھوکا رہوں گا تو ہر وقت یہ معلوم رہے گا کہ بھوک کی تکلیف ایسی ہوتی ہے اس کو بھی ایسی ہی تکلیف ہو رہی ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص خود آرام میں ہو اس کو دوسرے کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اور یہی سبب تھا کہ پہلے زمانہ میں تربیت کرتے وقت کچھ تکلیف بھی دیا کرتے تھے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ کسی بادشاہ کا لڑکا ایک میاں جی کے سپرد تھا وہ اسکو پڑھاتے لکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ بادشاہ جو مکتب میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ میاں جی سوار ہو کر فلاں جانب کو گئے ہیں۔ یہ سنکر بادشاہ خود بھی اسی جانب چلدیا دونوں ملے مگر اس حالت میں کہ میاں جی گھوڑے پر سوار ہیں اور شاہزادہ سائیس کی طرح گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا آرہا ہے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کو نہایت غصہ آیا لیکن اس وقت تحمل سے کام لیا اور پھر اطمینان سے میاں جی سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا کہ یہ شاہزادہ ہے خدا اسکی عمر میں برکت کرے ایک دن یہ تخت سلطنت پر متمکن ہوگا۔ ہزاروں آدمی اس کی خدمت میں ہوں گے سواری کریگا تو جلو میں بھی سینکڑوں آدمی ہوں گے۔ سو میں نے اس پر اس واسطے مشقت ڈالی کہ بادشاہی کے زمانے میں یہ دوسروں کی مشقت کا بھی اندازہ کر سکے اور لوگوں کو تحمل سے زیادہ تکلیف نہ دے۔

بادشاہ اس کو سُن کر بہت خوش ہوا اور انعام واکرام دیا تو جو لوگ آسودہ ہیں اور اتنا کھاتے ہیں کہ ان کو نمک سلیمانی کی بھی ضرورت ہو ان کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ دوسروں پر کیا گزرتی ہے ایک جماعت تو ان بے رحموں کی ہے لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں اسلئے کہ ایسے لوگ اکثر امراء ہیں اور اُمراء کی تعداد خود بہت کم ہے دوسری جماعت وہ ہے اور یہی تعداد میں زیادہ ہے کہ جن کو ابھی سے آثار قحط سے تکلیف ہونے لگی ہے اور اسکی رفع کی بھی تمنا ہے۔

رفعِ قحط کی تدبیر

اور مجھے اس وقت زیادہ تر اس جماعت کے متعلق ایک مضمون بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو بظاہر قحط کی طرف سے فکر لگی ہوئی ہے ان میں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ آیا صرف اُن کی زبانوں پر اس کا ذکر ہی ہے یا کوئی تدبیر بھی کر رہے ہیں اور اگر تدبیر کر رہے ہیں تو واقع میں بھی وہ تدبیر مفید ہے یا نہیں اور اس کو تدبیر کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔

تو مجموعی حالت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس میں دو غلطیاں کر رہے ہیں بعض تو ایسے ہیں کہ وہ کوئی تدبیر ہی نہیں کرتے۔ بلکہ جس طرح ان کی مجلس میں اور دنیا بھر کی باتوں کا تذکرہ ہوا کرتا ہے اسی طرح اس کا بھی تذکرہ ہو جاتا ہے اس کو اس کی خبر ہی نہیں ہے کہ قحط کے رفع کے لئے کوئی تدبیر بھی ہے یا نہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ وہ تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں اور تدبیر کرتے بھی ہیں لیکن وہ تدبیر صحیح نہیں ہوتی اور شاید ہزاروں میں دو چار آدمی ایسے ہوں جو سمجھ سکتے ہوں اسلئے وہ بھی بے تدبیری کرتے ہیں مجھ کو اس وقت اسی بے تدبیری کے متعلق کچھ کہنا ہے لیکن میں نے اس وقت جو آیت پڑھی ہے وہ کچھ اسی بے تدبیری کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس بے تدبیری اور ہر بے تدبیری کو شامل ہے آیت یہ ہے وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرو اُمید ہے کہ تم فلاح حاصل کرلو۔ مناسبت اس آیت کی آج کے مضمون سے انشاء اللہ ابھی ظاہر ہو جائیگی۔

اختراعی تقویٰ

شانِ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں منجملہ اور رسوم قبیحہ کے ایک رسم یہ بھی تھی کہ ایام حج

میں احرام باندھنے کے بعد گھر میں نہ جاتے تھے اور اگر بہت ہی ضرورت گھر میں جانے کی ہوتی تو گھر کی پُشت سے اندر جاتے تھے دروازے سے مکان میں جانے کو ان ایام میں حرام سمجھتے تھے۔ خدا تعالیٰ اس رسم کو مٹا رہے ہیں اور اس کا لغو ہونا ظاہر فرما کر مکان میں دروازے کے ذریعے سے داخل ہونے کا حکم فرماتے ہیں اس کے بعد دوسرے جملے میں تقوے کا حکم دیتے ہیں جس سے مقصود یہ تبلانا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اصل چیز تقوے ہے یعنی جن باتوں سے خدا تعالیٰ ناراض ہوں ان کو ترک کر دینا۔ باقی یہ مخترع رسوم۔ سو یہ کوئی چیز نہیں ہیں کیونکہ محض نفس کی مخالفت کرنے سے خدا تعالیٰ کی رضا مندی حاصل نہیں ہوتی جیسا وہ لوگ سمجھتے تھے کہ پُشت کی طرف کو جانا نفس پر شاق ہے اسلئے یہ قربت ہے۔ اور یہ ایسا مرض ہے کہ آج کل کے صوفی بھی اکثر اس میں مُبتلا ہیں یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس قدر نفس کی زیادہ مخالفت ہوگی خدا تعالیٰ زیادہ راضی ہوں گے اگرچہ وہ مخالفت نفس شریعت کے خلاف بھی ہو۔

چنانچہ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر گوشت کھانا حرام کر لیتے ہیں۔ گویا خدا تعالےٰ کے خزانے میں اُن کے اس فعل سے بڑی توقیر ہوگئی۔ اسی طرح بعض لوگ سرد پانی نہیں پیتے۔ بعضے چارپائی پر نہیں سوتے اور بعضے لوگ جن کو دولت اسلام نصیب نہیں وہ تو یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ اپنے اعضا تک سُکھلا دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے جوگی سُنے گئے ہیں کہ انہوں نے اپنا ہاتھ سکھلا دیا۔ میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ گرمی کے ایام میں چاروں طرف آگ جلا رکھی ہے اور اس کے بیچ میں خود بیٹھا ہے گویا یہیں دکھلا رہا ہے کہ میں دوزخی ہوں یہ سب جہل کی باتیں ہیں حدیث میں وارد ہے اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا عہ۔ اتنی مشقت نہ اٹھاؤ کہ پھر بالکل کام ہی سے جاتے رہو۔

عہ۔ بیشک تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور بے شبہ تیری آنکھ کا تیرے ذمہ حق ہے۔

حضرت سلمانؓ نے ان کو روکا۔ آخر مقدمہ جنابِ نبوی میں گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ سلمان سچ کہتے ہیں اور یہ ارشاد فرمایا۔ ان لنفسک علیک حقاً الخ

غرض ایام جاہلیت میں لوگ منجملہ اور تکالیف کے ایک تکلیف اپنے نفس کو یہ بھی دیتے تھے کہ خدا تعالیٰ اسکو فرماتے ہیں کہ اصل چیز تقوےٰ ہے اس کو اختیار کرو اور گھر میں پسِ پشت سے آنا کوئی ثواب کا کام نہیں ہے۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ گو لفظاً خاص ہے۔ ایک ہی امر کو، مگر معناً عام ہے۔ ایسے امور کو جو اس کی نظیر ہوں وہ معنی مشترک یہ ہیں کہ جس کام کا جو طریقہ ہے اسی طریقہ سے اس کام کو کرو بے طریقے نہ کرو۔ اور یہ مضمون عام ہے۔ لہٰذا آیت میں معنی تعمیم کے ہوگئے۔

اور جملہ ثانیہ واتقوا اللہ الخ سے بدلالت مطابقی ہی تعمیم ہو رہی ہے۔ کیونکہ اسکا حاصل یہ ہے کہ جو بات تقویٰ پر مبنی نہ ہوگی۔ گو ظاہراً وہ موجبِ قربت نظر آئے وہ موجبِ کامیابی نہ ہوگی اور تمہارا ظہورِ ابواب بیوت میں داخل ہونا تقوے پر مبنی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بھی اُس کامیابی کا سبب نہیں جو تمہارا مقصود ہے کہ رضا حق حاصل ہو ـــــ اب آیت کا مضمون ہمیشہ نظر رکھ کر اپنی حالت کو دیکھئے کہ ہم اکثر کام ایسے ہی طریقے سے کرتے ہیں جس میں کامیابی نہیں ہوتی اور مراد اس وقت دنیا کے کام نہیں کیونکہ اس کی کامیابی کے طریقہ کا تعلیم کرنا ہمارا کام نہیں ہم سے یہی غنیمت ہے کہ ہم دنیا کے کام کی اجازت دیدیتے ہیں اس وقت مجھے یہ شعر یاد آتا ہے جس میں اہل دنیا کے اس انتظار کا جو کہ علماء سے کامیابیٔ دنیا کا طریقہ بتلانے کے متعلق ان کو رہتا ہے جواب ہے کہتے ہیں ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم | چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم | الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

پس معلوم ہوا کہ کوئی خاص تکلیف اپنی طرف سے اختراع کر کے برداشت کرنا تقویٰ نہیں ہے لیکن اس سے ان لوگوں پر شبہ نہ کیا جائے جنہوں نے اپنے نفس کی اصلاح کے لیے بڑے بڑے مجاہدے کیے ہیں اسلئے کہ اول تو وہ حضرات حدِ اباحت سے تجاوز نہ کرتے تھے پھر وہ بھی اس کو بطور علاج کے کرتے تھے عبادت اور ذریعۂ قرب نہیں سمجھتے تھے ان کے مجاہدے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص گل بنفشہ پینے لگے یا کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے بلائے چند سے چھوڑ دے کہ وہ اس دوا پینے اور ترک اطعمہ کو عبادت نہیں سمجھتا بلکہ ذریعۂ حصول صحت سمجھتا ہے اور اگر کوئی اس کو ثواب سمجھ کر پینے لگے تو وہ یقیناً گنہگار ہوگا۔ اس اسلئے کہ اس نے قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ اپنی طرف سے کیا اور بدعت کے قبح کا یہی راز ہے اگر اس میں غور کیا جائے تو پھر بدعت کے منع میں تعجب نہ ہو۔ روزمرہ میں اسکی مثال دیکھئے اگر کوئی صاحب مطبع گورنمنٹ کے قانون کو طبع کر اور اخیر میں ایک دفعہ کا اضافہ کر دے اور وہ ملک و سلطنت کے لیے بھی بے حد مفید ہو تب بھی اسکو جرم سمجھا جائے گا۔ اور یہ شخص مستوجب سزا ہوگا۔

پس جب قانون دنیا میں ایک دفعہ کا اضافہ جرم ہے تو قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں کیوں جرم نہ ہوگا۔ تو اگر اس طرح سے کوئی گوشت وغیرہ کو ترک کریگا تو بلا شبہ جرم ہوگا لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے۔

بخلاف اس وقت کے جہلاء کے کہ وہ اس کو دین اور عبادت اور ذریعۂ قرب سمجھ کر کرتے ہیں۔ بہرحال نفس کو راحت پہنچانا اور اسکے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے اسلئے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر دی ہے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ صحابی کا واقعہ ہے کہ وہ رات کو بہت جاگتے تھے۔

یعنی ہم کو خدا تعالیٰ کی باتوں کے سوا کچھ یاد نہیں رہا۔ اور ہم دنیا کی باتیں کچھ نہیں جانتے اور اگر اب تک جانتے تھے تو اب بھول گئے۔ غرض اس وقت گفتگو دین کے کاموں کے متعلق ہے کہ ان میں بھی وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہونے کے سبب اخروی کامیابی کا سبب نہ ہو مثلاً یہی جو اوپر مذکور ہے کہ اپنے نفس کو خوب تکلیف دینا سبب قربت کا سمجھا جائے۔

حکایات جاہل فقراء

اس پر مجھے ایک جاہل فقیر کی حکایت یاد آئی وہ یہ ہے کہ ایک عالم کے صاحبزادے گھر سے خفا ہو کر چلے گئے ایک مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں پہاڑ پر ایک فقیر رہتا ہے ان کو چونکہ دین سے مناسبت خاندانی تھی اس لیے ان کو اس فقیر سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ایک شخص ہے جس نے ایک آنکھ پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ناک کا ایک سوراخ نجاست بھری بتی سے بند کر رکھا ہے انہوں نے اس حرکت کا سبب پوچھا تو اس فقیر نے کہا کہ ناک میں گوہ کی بتی تو اس لیے دی ہے کہ یہاں پھولوں کے درخت بہت ہیں ہر وقت خوشبو سے دماغ معطر رہتا ہے اور اس سے نفس پھولتا ہے تو میں نے نفس کا علاج کرنے کے لیے ایک طرف ناک میں نجاست کی بتی دے رکھی ہے تاکہ اس کی تکلیف سے نفس محظوظ نہ ہونے پائے اور آنکھ پر پٹی اس واسطے باندھ رکھی ہے کہ کام تو ایک آنکھ سے بھی چل جاتا ہے پھر بلا ضرورت دوسری آنکھ کو کیوں خرچ کروں یہ سن کر اس مسافر نے کہا کہ فقیر صاحب میں خود تو عالم نہیں ہوں لیکن عالموں کی صحبت میں رہا ہوں ان سے جو کچھ سنا ہے اس کی بنا پر کہتا ہوں کہ نہ تو آپ کا وضو ہوتا ہے اور نہ نماز ہوتی ہے کیونکہ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہے وہ جگہ ہمیشہ خشک رہتی ہوگی اور یہ مانع وضو ہے لہٰذا آج تک کی سب نمازیں آپ کی برباد ہوئیں چونکہ وہ فقیر باعتبار

نیت کے طالب حق تھا۔ صرف جہل سے مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کو سنکر بہت رویا اور توبہ کی۔ واقعی جہل بھی ہے بری چیز۔

ہمارے تھانہ بھون کا واقعہ ہے کہ یہاں ایک فقیر رہتا تھا بالکل جاہل اور محلے کے اکثر لوگ اسکے معتقد تھے حتیٰ کہ ہمارے نانا صاحب بھی۔ چونکہ عملیات فقراء سے ان کو خاص تعلق تھا وہ بھی معتقد تھے۔ محلّے بھر میں صرف ایک شخص ایسا تھا کہ وہ اس فقیر کا معتقد نہیں تھا اور یہی کہتا تھا کہ جاہل آدمی کی کیا فقیری اس حرکت پر تمام اہل محلہ ان کو ملامت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس شخص کو یہ شرارت سوجھی کہ اخیر شب میں تہجد کے وقت کسی ذریعے سے اُس فقیر کے مکان کی چھت پر جا بیٹھا اور جب وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے گیا تو نہایت دھیمی اور سُریلی آواز میں اس کا نام لے کر پکارا اسنے اپنا نام سُنکر پوچھا کون پکارتا ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں اخی جبرئیل۔ جبریل کا نام سنکر وہ نہایت غور سے متوجہ ہوا [الحائک اذا صلی یومین انتظر الوحی] اور کہا کیا ارشاد ہے؟ اسنے جواب دیا کہ مجھے خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ تجھے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اب تو بہت بوڑھا ہو گیا ہم کو تیری کبڑی کمر دیکھ کر شرم آتی ہے اسلیے اب ہم نے تجھ سے نماز کو معاف کر دیا یہ کہہ کر آپ وہاں سے چلے آئے۔

اس فقیر نے جو اخی جبریل کی زبان سے پروانہ معافی سُنا پھر گیا تھا وضو کا لوٹا رکھ اور سو گئے۔ اب تہجد بھی غائب صبح بھی ظہر بھی۔ معتقدین نے جو دیکھا کہ بڑے میاں کئی وقت سے مسجد میں نہیں آئے تو بعضوں کو فکر ہوئی ادھر اُدھر تذکرہ شروع ہوا آخر گھر پر پہنچے تو دیکھا کہ اندر سے بہتیری آوازیں دیں تو جواب ندارد۔ آخر بڑی مشکل سے دروازہ کھولا۔ بڑے میاں سے نماز میں نہ آنے کا سبب پوچھا تو اول تو مارے نخوت کے آپنے کچھ جواب ہی نہیں دیا لیکن جب لوگوں

عہ اشارۃ الی انہ کان حائکا ۱۲ منہ

نے بہت اصرار کیا تو آپ نے کہا کہ میرے پاس ابھی جبریل آئے تھے وہ فرما گئے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تجھے نماز معاف کردی۔ یہ سنکر وہ شخص جو غیر معتقد تھا اور جس نے یہ حرکت کی تھی بہت ہنسا لوگوں کو اس کے ہنسنے سے شبہ ہوا کہ اسی نے یہ حرکت کی ہے پوچھا تو اس نے کہا کہ دیکھ لیجئے آپ ان کو فقیر اور بزرگ تبلاتے ہیں۔ حقیقت میں جاہل کی فقیری کیا اور جب وہ فقیر نہیں ہو سکتا تو پیر اور مقتدار تو بدرجۂ اولےٰ نہیں ہو سکتا

ایک اور جاہل فقیر یہیں تھانہ بھون میں تھے ایک مرتبہ انہوں نے تفسیر فرمائی تھی وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ اے نفس یہی تیری سجا د سزا)

صاحبو! سب جہل کے کرشمے ہیں اور یہ نامعقول پیٹ اس قسم کی کرتوتیں کراتا ہے زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی تمیز ہی نہیں رہی کہ یہ واقع میں فقیر ہے یا مکار ہے۔ اور بعض بعض مقامات کی تو یہ حالت ہے کہ وہاں فساق فجار تک کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک مشہور شہر کی نسبت ایک ثقہ سے سُنا ہے کہ ایک ایسے ہی نامعقول پیر کے پاس ان کا مرید بیٹھا ہے اور اس کی بیوی بھی بیٹھی ہے اور حضرت پیر صاحب اس کا منہ چوم رہے ہیں اور مرید صاحب اس پر خوش ہیں اور بیوی سے ہنس ہنس کر فرماتے ہیں کہ اب تمہارا منہ بڑے رتبہ کا ہو گیا۔ اب ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اس میں تصرف کریں۔ میرے ایک خاندانی بزرگ اس شہر کی نسبت کہتے تھے کہ وہاں کے فقیر تو دوزخی اور امیر جنتی۔ کیونکہ اُمراء تو فقراء سے ان کو...... اہل اللہ سمجھ کر تعلق رکھتے ہیں اور فُقراء ان سے دنیا حاصل کرنے کیلئے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیروں کو بھی جنتی کہنا مشکل ہے جو شخص اتنا جاہل ہو کہ اس کو فاسق اور صالح میں تمیز نہ ہو سکے وہ کیا جنتی ہونے کے کام کریگا۔

خرافاتِ جہل

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ پیر کے فعلوں سے کیا کام۔ اس کی تعلیم سے کام تو میں کہتا ہوں کہ شیطان کے مرید کیوں

نہیں ہو جاتے اسلئے کہ اس سے بڑا عالم اور واقف تو کوئی فقیر نہ ہوگا یہ تو عالموں سے بھی بڑا عالم ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ عالموں کو بھی علوم میں بہکا لیتا ہے اور کسی دوسرے کو کسی خاص امر میں وہی بہکا سکتا ہے جو اس سے زیادہ اس امر میں مہارت رکھتا ہو۔ غرض! جاہل کی پیری کچھ بھی نہیں ہے ؎

سرانجام جاہل جہنم بود ۔۔۔ کہ جاہل نکو عاقبت کم بود

چنانچہ وہ پہاڑ کا رہنے والا اگرچہ فقیر تھا لیکن بوجہ جاہل ہونے کے اس نے یہ خرافات کی کہ آنکھ پر پٹی باندھ لی کہ نفس کو شاق ہوگا اور اسی کو اطاعت سمجھا۔

صاحبو! اگر نفس پر مشقت ہی ڈالنا ذریعۂ قرب ہوتا تو لَا تَقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ عـہ نہ فرمایا جاتا کیونکہ یہ تو بہت بڑی تکلیف ہے اس سے بہت زیادہ قرب ہونا چاہیے تھا۔ غرض قرب ہوتا ہے صرف دین کا کام اس طریقے کے ساتھ کرنے سے اور اس میں بھی بہت سی بے تدبیریاں کرتے ہیں۔

مثلاً آجکل رمضان شریف آرہے ہیں اس میں اکثر لوگ قرآن تراویح میں بھی سنائیں گے لیکن اس قدر تیزی سے پڑھیں گے کہ سوائے یَعْلَمُوْنَ اور تَعْلَمُوْنَ کے کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے گا تو تراویح ذریعۂ قرب ہے لیکن اس کو ایسی بے تدبیری سے ادا کیا گیا کہ وہ ذریعہ بُعد ہو گیا اور پھر غضب یہ کہ اپنی ان حرکات پر تنبہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہم نے اتنا زیادہ دین کا کام کیا خدا تعالیٰ ایسوں ہی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۞ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا عـہ اور یہ سب دنیا ہی ہے۔ دوسری بار ارشاد ہے اَفَرَءَيْتَ عـہ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ط

عـہ اپنی جانوں کو مت قتل کرو ۱۲ احمد حسن عفی عنہ۔ عـہ تو کہہ ہم بتائیں تم کو کن کن کے بہت اکارت جنکی دوڑ بہک رہی ہے۔ دنیا کی زندگی میں اور وہ سمجھتے ہیں کہ خوب بناتے ہیں کام۔ عـہ بھلا دیکھ تو جس نے پوجنا

نیک نیتی کا گناہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں انما الاعمالُ بالنیات آیا ہے اور ہماری نیت درست ہوتی ہے جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا محمل عام نہیں ہے بلکہ اسکا محمل صرف طاعت ومباحات ہیں نہ کہ گناہ پس گناہ میں نیت نیک کرنے سے عمل کا کچھ ثواب نہیں ملتا۔ بلکہ وہاں تو یہ نیت اور بھی زیادہ موجب وبال ہے کیونکہ معصیت کو ذریعہ قرب کا اعتقاد کیا۔ اسی طرح مثلاً اب شب برات آ رہی ہے اس میں حلوا پکانے کو دین سمجھتے ہیں اور اس کی عام رسم ہے۔ اور اگر کوئی مولوی منع کرتا ہے تو اس کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور غضب یہ ہے کہ بے چارے مولویوں پر افترا پردازی کی جاتی ہے کہ یہ لوگ حلوے کو منع کرتے ہیں۔

صاحبو! میں صاف کہتا ہوں کہ خود حلوے کو کوئی منع نہیں کرتا صرف اسلئے منع کیا جاتا ہے کہ اس دن پکانے کو ثواب سمجھتے ہو جس کی کوئی اصل نہیں۔ حدیث شریف سے اس کا صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس رات کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبرستان میں تشریف لے گئے اور آپ نے مُردوں کے لیے دعا فرمائی۔ اس سے ممکن ہے کہ کسی نے یہ سمجھ کر کہ اس شب میں اموات کو نفع پہنچانا تو ثواب ہو ہی گیا۔ نفع کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کھانے کے ذریعے سے ثواب پہنچا دیا جائے تو یہاں تک تو قیاس کی گنجائش ہے اسکے بعد تو وہ طوفان بے تمیزی برپا ہوا ہے کہ الامان الحفیظ۔ کہیں حلوے کی تخصیص ہے اور کہیں مسور کی دال کی بھی قید ہے۔ خدا جانے ان دونوں میں کیا مناسبت ہے البتہ اتنی مناسبت تو سمجھ میں آتی ہے۔ دونوں کے متعلق ایک ایک مثل قریب المعنی مشہور ہے چنانچہ کہتے ہیں حلوا خوردن را روئے باید۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ منہ اور مسور کی دال اس دوسری مثل کی اصل ایک دوست نے عجیب بتلائی کہ یہ منہ اور منصور کی دار۔

یعنی منصور کے منہ سے جو انا الحق نکلا جس کی وجہ سے وہ دار پر چڑھائے گئے ہر منہ اس کلمہ کے لائق نہیں لیکن مشہور وہی ہے۔

اور شہروں میں تو غضب یہ کرتے ہیں کہ ہر چیزیں رہن رکھ کر اور سودی قرض لیکر یہ رسمیں پوری کرتے ہیں۔ چنانچہ میں جس زمانے میں کانپور میں تھا ایک ماما ہمارے ہاں رہتی تھی۔ ماما کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ شب برات جو آئی تو اس نے اپنے برتن رہن رکھے اور کچھ سودی قرضہ لیا اس کے بعد اس نے ایک جگہ کو خوب اچھی طرح لیپا اور حلوا پکایا اور ایک اور طرّہ یہ بھی ہے کہ اکثر لوگ فاتحہ کے لیے بہت سے پتوں میں علیحدہ علیحدہ رکھ کر مُردوں کو ثواب بخشتے ہیں اور غالباً علیحدہ علیحدہ پتوں میں رکھنے کی رسم پیرزادوں نے اس لیے نکالی ہے تاکہ پیر جی صاحب کو بہت سا ملے کیونکہ پیر جی کا حصہ ہر فاتحہ کے لحاظ سے زیادہ ہوتا ہے اور اسی لیے زیادہ تر مولویوں پر خفا بھی پیر جی لوگ ہوتے ہیں۔

انسدادِ بدعات

اسی وجہ سے میں بطور لطیفہ کے اس کے متعلق اپنے ناصح دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم کو چاہیئے کہ عوام الناس کو ان چیزوں سے دفعتہً منع نہ کریں کہ وہ بگڑتے ہیں۔ بلکہ ان سے یوں کہو کہ تم پیر جی کو حصہ دیکر ان سے ثواب بخشواتے ہو یہ ثواب نہیں پہنچتا اسلیئے کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا ہے اُجرت لے کر پڑھا ہے اور اُجرت لینے کے بعد ثواب ملتا نہیں تو جب پیر جی کو خود ہی ثواب نہیں ملا تو تمہارے مردوں کو ثواب کیسے مل جائیگا اسلیئے تم پیر جیوں سے پڑھوا تو لیا کرو لیکن ان کو کچھ دیا مت کرو۔ اور اسی طرح پیر جیوں سے بھی یہ کہا جائے کہ تم فاتحہ خوانی بھی کرو نیاز بھی۔ لیکن اس پر نہ حصہ لیا کرو نہ کوئی اُجرت لیا کرو۔ جب پیر جیوں پہ محنت تو پڑی پوری اور ملا نہیں ایک پیسہ بھی۔ تو دیکھ لینا انشاءاللہ تعالےٰ خود یہ پیر جی ہی بہت جلد ہی اس کو حرام کہنے لگیں گے اور بدعت کا فتویٰ

لگادیں گے کیونکہ ان کے نزدیک اس کام سے زیادہ بدعت کیا ہوگا جس کو دن
میں دس دس دفعہ کرنا پڑے اور ایک پیسہ بھی نہ ملے۔ ادعیاء سنیت کا منشا تو صرف
یہ تھا کہ کچھ وصول ہو جاتا تھا اور وصول ہونے ہی کے لیے زیادہ تر ان لوگوں نے
اپنی ہوشیاری سے ایصالِ ثواب کے ایسے طریقے ایجاد کئے ہیں جن کو سوائے ان کے
دوسرا عامی آدمی جان ہی نہیں سکتا کہ اول قُلْ هُوَاللّٰه ہو پھر تَبَارَكَ الَّذِی ہو پھر
یہ ہو اور پھر وہ ہو اور بعض سورتوں پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور بعض پر نہیں
یہ ایسی بات ہے کہ اس کو مولوی بھی نہیں جانتے تو چونکہ یہ طریقہ وہی لوگ جانتے
ہیں اسلئے مجبوراً سب عوام ان کے محتاج ہو کر انہیں کے پاس جاتے ہیں اور اس طرح
سے ان کو ملتا ہے۔ اور پھر غضب یہ کہ لوگ اس میں اور بھی بڑی بڑی چالاکیاں کرتے ہیں۔

ایک سب انسپکٹر مجھ سے کہتے تھے کہ میں کسی تھانہ میں تھا کہ میرے پاس
ایک شخص یہ رپٹ لکھوانے آیا کہ کوئی آدمی میری فاتحہ چرا کر لے گیا۔ میں سخت پریشان
ہوا کہ فاتحہ چرانے کے کیا معنے۔ اس شخص سے پوچھا تو اس نے کہا کہ موقع پر چلیئے
آخر موقع پر جاکر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک ٹکی میں پیر جی ایک سال کے لیئے فاتحہ
پڑھ کر بند کر جاتے ہیں اور کہہ جاتے ہیں کہ جب ضرورت ہو اس میں سے تھوڑی سی
جھاڑ لینا۔ فی ٹکی ۶ے / ان کا مقرر ہے اتفاق سے کسی شخص کے پاس روپیہ تھا نہیں
اور اس کو فاتحہ کی ضرورت ہوئی تو اس نے اس شخص کی ٹکی چرالی۔ اس سے بڑھ کر ایک
حکایت حضرت مولانا گنگوہیؒ سناتے تھے کہ کسی مسجد میں ایک ملا رہتا تھا سب
اسی سے فاتحہ وغیرہ دلاتے تھے ایک مرتبہ ایک بڑھیا کھانا لے کر آئی اتفاق سے ملاجی
اس وقت مسجد میں موجود نہ تھے۔ ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا وہ یہ سمجھ کر کہ مقصود تو ثواب ہے
چلو مسافر ہی کو دیدو اس کو کھانا دیکر چلی مسجد کے دروازے سے نکلی ہی تھی کہ ملاجی
مل گئے پوچھا کہ بڑھیا کیسے آئی تھیں اس نے سب واقعہ کہدیا۔ آپ فوراً مسجد میں آئے

اور ایک لاٹھی لے کر تمام مسجد کے فرش کو خوب پیٹنا اور غل مچانا شروع کیا۔ اور پیٹتے پیٹتے تھوڑی دیر میں دھم سے مسجد کے فرش پر گر گئے۔ لوگوں نے جو غل شور سنا تو سب آ کر جمع ہو گئے پوچھا کہ ملاجی کیا ہوا کہنے لگے کہ بھائیو! میں تو مدت سے یہاں رہتا ہوں سب مُردوں سے واقف ہوں انہی کو ثواب بخش دیتا تھا یہ نیا آدمی ہے خدا جانے اسنے کس کس کو ثواب بخش دیا یہاں کے سب مُردے مجھے آ کر لپٹ گئے۔ میں نے ان کو بہت کچھ بھگایا لیکن میں تنہا تھا کہاں تک لڑتا آخر تھک کر گر گیا اگر دو چار دفعہ ایسا ہوا تو میں تو مر ہی جاؤں گا۔ اسلیے اور کہیں جاتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ ملاجی آپ کہیں نہ جائیے ہم آپ ہی کو ہر چیز دیا کریں گے تو جب بناان رسوم کی یہ اغراض ہیں تو جب فاتحہ کی عوض ان کو کچھ نہ ملے گا تو الگ الگ پتہ پر فاتحہ پڑھنا ان کو خود ہی مشکل معلوم ہو گا۔ اور اس طرح بہت جلد اس کا انسداد ہو جائیگا

بدعات کے زائد علی الدین ہونے کی علامت

اور یہ بھی ایک علامت ہے ان رسوم کے زائد علی الدین ہونے کی۔ کیونکہ اصل چیز منجانب اللہ ہر حالت میں محفوظ رہتی ہے چنانچہ جس زمانے میں طاعون کی کثرت ہوئی ہے تو تیجہ دسواں وغیرہ سب چھوٹ گئے صرف وہی چیزیں باقی رہ گئیں تھیں جو شرعاً ضروری تھیں۔ بعض لوگوں سے جو میں نے کہا کہ اب وہ رسوم کیوں نہیں ہوتیں تو کہنے لگے کہ صاحب! کس کس کی رسمیں کریں یہاں تو روز تیجہ ہی رہتا ہے میں نے کہا دیکھو اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ امور محض زائد ہیں ورنہ اس کثرت موت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مُردے کو بغیر کفن دیئے اور بلا نماز پڑھے دفن کر دیا ہو اور تیجہ دسواں بہت لوگوں کا نہیں ہوا۔

غرض یہ کہ دین کے کاموں میں بھی عجیب عجیب طریقے ایجاد کئے ہیں جن سے مقصود دین میں کامیابی یعنی رضاء حق بمراحل بعید ہے ——— چنانچہ منجملہ ان کے

ایک یہ موقع بھی ہے کہ آجکل قحط کے آثار معلوم ہوتے ہیں سو اسکے متعلق بعضے تو تدبیر ہی نہیں کرتے بلکہ شغل کے طور پر محض تذکرے ہی کو کافی سمجھتے ہیں حالانکہ نرا تاسف کچھ بھی مفید نہیں ہے

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اور اگر یہ سمجھ کر کہ اس کا سبب معاصی ہیں اور معاصی کا کفارہ طاعات سے ہوتا ہے پس کوئی طاعت اختیار کرنا چاہیے تاکہ اسکے مقصود ہیں کہ رفع سخطِ حق و دفع بلا ہے کامیابی ہو یہ سمجھ کر اس مقصود کی تدبیر کی تو اس کی تعیین میں غلطی کی۔ یعنی یہ کیا کہ بہت سا اناج اکٹھا کر لیا اور تنور میں روٹیاں پکوا کر تقسیم کر دیا۔ گویا اسکے میکائیل علیہ السلام کے محکمے کو خرید لیں گے اور کبھی اسکے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو دو جواب ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دیکھئے ایک نیک کام سے روکتے ہیں۔

صاحبو! اگر کوئی شخص ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھنے لگے تو اس کو کیوں منع کیا جاتا ہے آخر پانچویں رکعت بھی تو نماز ہی ہے اسی طرح اگر کوئی طبیب پانچ ماشہ گل بنفشہ تجویز کرے تو دس ماشہ استعمال کرنے سے کیوں رکتے ہو زائدہ ماشہ بھی تو گل بنفشہ ہی ہے اسکی بھی تو وہی خواص ہیں۔ صرف اسی لیے منع کیا جاتا ہے کہ یہ تحدید طبی سے زائد ہے اور تحدید سے آگے بڑھنا ممنوع ہے۔ پس تحدیدات شریعت کی آپ کے نزدیک اتنی وقعت بھی نہیں ہے۔ جب پانچویں رکعت کا پڑھنے والا اس لیے بدعتی ہے کہ وہ حدِ مقرر سے آگے بڑھ گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر نیک کام کرنے کی علی الاطلاق اجازت نہیں ہے بلکہ اس شرط سے اجازت ہے کہ حدود کے اندر ہو اور اگر تم کو حدود کی اطلاع نہیں ہے تو تم کو اس کہنے کا کیا مجاز ہے۔ کہ یہ نیک کام ہے اور یہ بدعت یہ حق علماء کا ہے یا انبیاء علیہم السلام کا تھا۔ کم علم یا بے علم لوگ علماء کے سامنے مسائل شریعت میں ایسے ہی ہیں جیسے کسی وکیل کے سامنے ایک دیہاتی آدمی۔ جس طرح

ایک دیہاتی کسی وکیل کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کر لینے میں کیا حرج ہے اسی طرح آپ کو بھی یہ حق نہیں۔ اور جس طرح وہ ہر کام میں وکیل سے مشورہ کرنے کا محتاج ہے۔ اسی طرح آپ بھی ہر مذہبی کام میں علماء سے مشورہ کرنے کے محتاج ہیں پس طریقہ اس کا یہ ہے کہ جو کام کرو اول علماء سے مسئلہ پوچھ لو۔ اور اگر کوئی عالم شفیق بھی ہوں تو اُن سے وجہ بھی پوچھ لو اور اگر وجہ نہ بتلائیں تو سعادت مندی یہ ہے کہ اس کو اپنے فہم سے باہر سمجھ کر خاموش رہو اور اگر بیان کر دیں تو ان کا احسان سمجھو اور بعض لوگ اس میں بھی چلتا ہوا ایک دوسرا جواب دیا کرتے ہیں وہ یہ کہ کیوں صاحب! یہ آج تک ہوتا چلا آیا ہے کیا یہ کرنے والے سب بے وقوف ہی تھے۔ صاحبو! یہ سب عامیانہ باتیں ہیں۔

مفاسدِ تقسیمِ اناج

اب اپنی اس رسم کی حقیقت ابتداء سے سمجھئے۔ سب سے پہلے اناج وصول کرنا شروع کیا جاتا ہے یعنی دو آدمی اٹھے اور گھر گھر جا کر انہوں نے کہنا شروع کیا اور لوگوں نے جمع کر دیا۔ سو دیکھنا یہ ہے کہ یہ اناج لوگوں نے خوشی سے جمع کیا ہے یا محض ان کے لحاظ اور دباؤ سے کہ جب یہ مانگنے آئے ہیں تو ان کو خالی کیا جانے دیں جنہیں لوگوں کی حالت میں کچھ بھی غور کیا ہوگا۔ یا کم از کم اپنی حالت میں غور کیا ہوگا کہ ہم نے خوشی سے دیا ہے یا محض لحاظ سے یا اگر نفس اناج تو خوشی سے دیا ہے تو یہ مقدارِ خاص پانچ سیر یا دس سیر خوشی سے دی ہے یا لحاظ سے تو خوب اندازہ کر لیگا کہ اکثر محض آنے والے کے لحاظ سے یا محلے میں بدنامی کے خیال سے دیا جاتا ہے یعنی چونکہ یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر نہ دیں گے تو تمام محلے والے ہم کو کنجوس فقیر کہیں گے اور یہ مانگنے والے بدنام کرتے پھریں گے۔ اس لئے مجبوری ہی دیدیا جاتا ہے اور اس کی نسبت حدیث شریف میں مصرح ہے الا لا یحل مال امرء الا بطیب نفس منہ یعنی

کسی کا مال بدون اسکی خوش دلی کے لینا جائز نہیں ہے۔ اور اگر ایک دو مثالیں ایسی بتلا بھی دو کہ فلاں شخص نے خوشی سے دیا تو زیادہ سے زیادہ چار من میں چار سیر حلال نکلے گا۔ باقی سب حرام اور حلال و حرام کا مجموعہ جب کہ حرام غالب ہو جیسا کہ غالب یہی ہے حرام ہوتا ہے اور اگر اب بھی سمجھ میں نہیں آتا تو یہ کیجئے کہ جس محلے سے اب تک وصول نہیں کیا ہو اس میں ایک اعلان عام کر دو کہ اس کام کے لئے اناج جمع کیا جا رہا ہے اور اعلان کر کے ایک کوٹھی کسی موقع پر رکھ دو اور اس میں قفل لگا دو اور کہہ دو کہ چار دن کے بعد جس قدر اناج اس میں جمع ہو جائے گا اس کو یکجا کر تقسیم کیا جائے گا۔ پھر پانچویں دن اس کوٹھی کو کھول کر دیکھو انشاءاللہ ایک چوتھائی اناج اس میں نہ ہوگا۔

اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ طیب خاطر سے کتنے لوگ دیتے ہیں اور مسلمانوں کے پاس رکھا بھی کیا ہے کہ وہ خوشی سے اتنا دے سکیں۔ ان بے چاروں کو خود تو کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ دوسروں کو کہاں سے دیں گے تو سب سے اول تو یہ لغو حرکت کی جاتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ اگر پانی برسنے والا بھی ہو تو نہ برسے کیونکہ ایک تو گناہ دوسرے حق العبد۔ دوسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ جن لوگوں نے خوشی سے بھی دیا ہے انہوں نے اپنا مال دیا ہے یا دوسرے کا۔ اور اگر دوسرے کا مال دیا ہے تو اس کی اجازت سے دیا ہے یا بلا اجازت۔ کیونکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ میاں کا مال بغیر اجازت بیوی نے دیدیا۔ اور شوہر سن کر مجبوری خاموش رہا۔ اور بعض جگہ کراہت کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔

چنانچہ کانپور میں ایک مرتبہ مدرسہ میں جلسہ ہوا ایک صاحب کے گھر سے بعض حقہ باز مہمانوں کے لئے حقہ منگایا گیا۔ بیوی نے شوہر کا مراد آبادی حقہ بھیجدیا شوہر کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے بیوی کو خوب پیٹا۔ اور اگر اب بھی سمجھ

یہ نہیں آیا تو انتظار کیجئے تھوڑے دنوں میں خدا تعالےٰ خود سمجھا دیں گے یعنی بعد موت کہ سب حقائق منکشف ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اناج کے پلینے کا وقت آتا ہے اس میں وہ گڑبڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پلینے والی نہیں ملتی تو رؤسا سے کام لیا جاتا ہے اور ان کے ذریعے سے چماریوں کو بیگار میں پکڑ کر اُن سے پسوایا جاتا ہے۔ اور اگر ان کو پسائی دی جاتی ہے تو بہت ہی کم۔ اور اگر پوری ہی دی تب بھی تو کسی سے کام لینا بلا رضامندی حرام ہے اس کے بعد اسے پکانے کا وقت آتا ہے۔ پکوانے کے منتظم اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں کہ ان کو خدا کا خوف نہ حلال وحرام کی پرواہ ــــ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اندھا بانٹے شیرینی اپنے اپنوں کو دے یا جس کو جی چاہا دیا جس سے چاہا انکار کر دیا۔ اکثر بھنگی چمار۔ چماریاں اس کھانے کے مستحق سمجھی جاتی ہیں اور چیلیں گوشت کی حقدار سمجھی جاتی ہیں۔ اور ویسے مریض کے لیے صدقہ دینے میں بھی چیلوں کے کھلانے کی رسم ہے اور شہروں میں ہم نے صدقے کے متعلق بعض خاص رسوم دیکھی ہیں یعنی وہاں اکثر لوگ مسلّم ماش اور تیل اور پیسے تقسیم کرتے ہیں اور اکثر بھنگیوں کو دیتے ہیں۔

اس کی وجہ غور کرنے سے یہ سمجھ میں آئی کہ عوام الناس بلا کو کالی سمجھتے ہیں اس لیئے کالی کالی چیزیں چھانٹ کر دیتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے بلا دفع ہو گی۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کھانوں کا حقدار بھنگیوں اور چماروں کو سمجھا گیا ہے کیونکہ وہ لوگ بھی اکثر کالے ہوتے ہیں۔ گویا جب وہ کھائیں گے تو ساری بلا ان کے پیٹ میں چلی جائے گی۔ مگر وہ ایسے بلا نوش ہیں کہ ان کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

علیٰ ہٰذا اکثر ایسے لوگ بھی اس کھانے کو لے جاتے ہیں جو خود بھی خوشحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے محلہ میں ایک مرتبہ کھانا پکا تھا ایک بڑے میاں کو

میں نے دیکھا کہ کھانا لئے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا کہنے لگے کہ یہ کھانا ذرا مزے دار ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ جناب آپ کو لینا جائز نہیں تب ان کی سمجھ میں آیا۔ اور ان بے عنوانیوں کے سبب میں تو ایسے کھانے کو کسی کے لیے بھی پسند نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ ہمارے مدرسے کے طالب علموں کی بھی دعوت کی گئی تھی لیکن میں نے اس کو منظور نہیں کیا کیونکہ یہ جائز نہیں ہے۔

چندہ میں بے عنوانی

غرض! آج کل چندوں کے جمع کرنے میں اس قدر بے عنوانیاں ہوتی ہیں جس سے اکثر چندے ناجائز ہو جاتے ہیں۔ اکثر مدارس کے چندوں میں بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا۔ اور پھر اپنی اس حرکت پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہم نے خوب خوب کوشش کی۔ کوشش یہ کہ خوب چمٹ کر وصول کیا اور بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے دین کے کاموں میں کوشش کر کے خدا کے مقرب ہو گئے۔

صاحبو! خدا تعالےٰ نے کب کہا تھا کہ تم لوگوں کو چمٹ کر اور پریشان کر کے وصول کرنا اور ہمارے حکموں کو چھوڑ دینا۔ بعض لوگ اس کے جواب میں کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ہم نے اپنے لیے تو نہیں کیا۔ خدا کے کام کے لیے کیا ہے۔ صاحبو! یہ عُذر گناہ بدتر از گناہ ہے اگر اپنے لیے کرتے تو خیر کچھ تو ملتا دنیا ہی سہی۔ اور اب تو سوائے گناہ کے کچھ بھی نہ ملا اور یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے جو محض دین کا کام سمجھ کر کرتے ہیں اور جو لوگ اپنے نفس کی کسی غرض کے حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ پس ازالہ قحط کی یہ تدابیر نہیں ہیں۔

ازالہ قحط کی تدابیر

تدبیر اس کی اور ہے اور وہ ایک ضروری امر معلوم کرنے پر موقوف ہے وہ یہ ہے کہ ہر مصیبت کا ازالہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب اس مصیبت کا سبب دریافت ہو جائے پھر اس سبب کو

دُور کر دیا جائے۔ لہٰذا اس موقع پر بھی اوّل بارش نہ ہونے اور ہونے کے اسباب دریافت کیے جائیں اور پھر ان کو زائل یا حاصل کریں۔ سو بارش نہ ہونے کا سبب غیر تام تو معصیت ہے اور سبب تام مشیّت۔ اور بارش ہونے کا سبب غیر تام طاعت ہے اور سبب تام مشیّت۔ یعنی طاعت کو بارش ہونے میں اور گناہ کو بارش نہ ہونے میں دخل ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

عہ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ ۝

یہ اگرچہ خاص قوم کو خطاب ہے اور ان ہی سے یہ وعدہ بھی تھا۔ اور یہ اس لیے کہدیا کہ اگر استغفار کے بعد بھی بارش نہ ہو تو خدا کے کلام کو غلط نہ سمجھو لیکن تاہم۔ استغفار کا دخل تو اس میں معلوم ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے

عہ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

یہاں بھی ایک خاص قوم کی نسبت ارشاد ہے کہ اگر وہ ایمان لے آتے تو اُن کے لیے ایسا ہی ہوتا۔ عام وعدہ قطعی نہیں ہے لیکن ایمان اور تقوے کا اس فتح برکات میں دخل تو ضرور ثابت ہوا اور تیسری جگہ ارشاد ہے

عہ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ۝

عہ تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے بے شک وہ ہے بخشنے والا چھوڑ دے آسمان کی تم پر دھاریں اور بڑھتی دے تم کو مال اور بیٹوں سے۔ ۱۲۔

عہ اور اگر وہ یقین لاتے اور بچ چلتے تو ہم کھول دیتے اُن پر خوبیاں آسمان اور زمین سے ۱۲

عہ اور اگر وہ قائم رکھیں توریت اور انجیل کو اور جو اترا ان کو اُن کے رب کیطرف سے تو کھائیں اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے۔ ۱۲

یہ آیت بھی اسی قبیل کی ہے اور جو آیتیں ایسی ہیں کہ ان میں وعدہ عام معلوم ہوتا ہو۔ وہاں بھی دوسری آیات کے انضمام سے تقیید بالمشیت ہوگی۔ چنانچہ فرماتے ہیں فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ تو جہاں وہ بھی ہے وہ مقید بالمشیت ہے۔ نیز اس آیت اخیرہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ طاعت سبب غیر تام ہے چنانچہ فَيَكْشِفُ کو اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ پر مرتب فرمایا ہے۔

اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ مشیت سبب تام ہے تو تدبیر بارش ہونے کی یہ ہوئی کہ موانع کو مرتفع کیا جائے اور بواعث کو پیدا کیا جائے۔ یعنی دونوں پہلوؤں پر نظر کر کے ایک دستور العمل مقرر کریں اور وہ یہ کہ گناہ کو بالکل ترک کر دیں اور طاعت کو پوری طرح اختیار کریں یہ تو سبب غیر تام کا رفع اور اس کے ساتھ تشبث ہوا۔ رہا دوسرا سبب یعنی خدا تعالیٰ کا چاہنا کہ بارش نہ ہو سو اسکی وہ تدبیر کرو جس کو خدا تعالےٰ چاہیں اور یہ بات اگر چہ ہمارے قبضہ میں نہیں ہے لیکن ہم کو اس کا طریقہ بتلایا گیا ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے درخواست کی جائے کہ آپ مشیت کو متعلق فرما دیجئے اور یہ ضرور نہیں کہ اس عنوان سے درخواست ہو۔ بلکہ یہ دعا کرنا کہ اے اللہ بارش عطا فرما اس کا حاصل وہی درخواست مشیت ہے کیونکہ مشیت موقوف علیہ ہے اور موقوف کی دعا موقوف علیہ کی دعا ہے۔

تو حاصل ساری تدبیر اور دستور العمل کا تین عمل ہوئے ایک تو گناہ نہ کرنا اس میں ہم لوگ بہت زیادہ مبتلا ہیں۔ اور پھر ظلم یہ ہے کہ طرح طرح کے گناہ ہم سے سرزد ہوتے ہیں اور اس پر طرہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو بالکل پاک صاف سمجھتے ہیں حالانکہ ہمارے سلف کی یہ حالت تھی کہ باوجود بالکل پاک ہونے کے بھی وہ اپنے کو گنہگار سمجھتے تھے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ مدین میں قحط پڑا لوگ ان

کے پاس دعا کرنے کے لیے آئے تو آپ نے فرمایا کہ امساک باراں گناہوں کے سبب ہوتا ہے اور سب سے زیادہ گنہگار شہر میں میں ہوں۔ لہٰذا مجھے شہر سے نکال دو تو بارش ہو جائے گی اور یہی نہیں کہ محض زبانی کہہ دیا ہو۔ بلکہ آپ اس شہر سے چلے بھی گئے ہم لوگ شب و روز گناہوں میں مبتلا ہیں لیکن ہم کو کبھی وہم بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے اعمال کی شامت ہے۔

حضرت سیدنا شاہ عبدالقادر جیلانیؒ جن کی شان یہ تھی کہ قدمی علیٰ رقاب کل اولیاء اللہ ان کا مقولہ ہے ان کی وہ حالت تھی جو شیخ نے گلستان میں نقل کی ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے۔

من نگویم کہ طاعتم بپذیر ❊ قلم عفو بر گناہم کش

یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ میری طاعت کو قبول فرما لیجئے اس لیے کہ میرے پاس طاعت ہی کہاں ہے۔ صرف یہ التجا ہے کہ میرے گناہوں کو بخش دیجئے اور آپ کے اس قول میں قدمی علیٰ رقاب کل اولیاء اللہ اگرچہ اختلاف ہے کہ تمام اولیاء اللہ مراد ہیں یا اس زمانہ کے اولیاء اللہ۔ لیکن دوسری شق میں بھی کچھ کم فضیلت ثابت نہیں ہوتی تو جب یہ حضرات اپنے کو ایسا کہیں تو ہم کو کیا حق ہے کہ ہم اپنے کو جنیدؒ وقت سمجھیں۔ اور اگر جنیدؒ ہی سمجھیں تب بھی اپنے کو گنہگار سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ جنیدؒ تو اپنے کو بہت بڑا گنہگار سمجھتے تھے۔ مگر ہمارا تقویٰ کچھ ایسا لوہے جڑا ہے کہ فسق و فجور سے بھی نہیں جاتا کچھ بھی کریں مگر پھر بزرگ کے بزرگ ہمارے تقوے کی وہ حالت ہے

عہ قال العارف السہروردی انہ قال فی حالۃ السکر وقال بعض العلماء انہ قالہ بالالہام من اللہ عزوجل والاقرب الی سیرتہؓ ھو الاول واللہ اعلم لکن من ثبت فضلہ علیہ فھو مستثنیٰ من ذلک والکشف ظنی فافہم۔ ۱۲ احمد حسن سنبھلی عفی عنہ

کہ جیسے بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ وہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہ تھا۔

بی بی تمیزہ کا ایک قصہ مثنوی میں لکھا ہے کہ یہ ایک عورت فاحشہ تھی کسی بزرگ نے اس کو نصیحت کی اور نماز پڑھنے کی تاکید کی اور وضو بھی کرا دیا اسنے نماز شروع کر دی۔ ایک مدت کے بعد جوان بزرگ کا وہاں کو گذر ہوا تو بی بی تمیزہ بھی ملیں انہوں نے پوچھا کہ بی نماز بھی پڑھا کرتی ہو۔ کہنے لگی جی ہاں پڑھتی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بھی کرتی ہو کہنے لگی کہ آپنے اس روز کرا نہیں دیا تھا۔ صاحب مثنوی نے اس قصے کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ہم لوگوں کا تقوٰی بالکل ایسا ہی ہے جیسے بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ نہ وہ زنا سے ٹوٹتا ہے نہ اور کسی فعل سے۔ اسی طرح ہم لوگ اپنے ایسے معتقد ہیں کہ کوئی عیب ہی نہیں نظر آتا۔ البتہ دوسرے پر طعن کرنے میں خوب پختہ ہیں۔

کیوں صاحبو! کیا ہم کو گناہوں کے معاف کرانیکی ضرورت نہیں ہے جو اس کو چھوڑ کر دوسروں کے پیچھے پڑ گئے کیا ہم آنکھ کان ہاتھ پیر کے گناہوں میں مبتلا نہیں ہیں کیا ہمارے ذمہ حقوق العباد نہیں ہیں۔ کیا ہم میں بہت لوگوں نے دوسروں کی زمین نہیں دبا رکھی۔ کیا بہت سے لوگ زمین کی موروثیت کے مدعی ہم میں نہیں ہیں۔ باوجود اس کے پھر ہم میں بعضے لوگ بارش نہ ہونے پر یا کسی دوسری بلا آنے پر تعجب کیا کرتے ہیں۔ اور کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم کس گناہ میں پکڑے گئے۔

صاحبو! آپ کو تو اس پر تعجب ہونا چاہیئے کہ ہم کو جو دو وقت روٹی مل جاتی ہے یہ کونسی طاعت سے ملتی ہے اس واسطے کہ باغیوں کو تو روٹی نہیں ملا کرتی غرض تدبیر تو یہ ہے کہ یہ سارے گناہ چھوڑ دو۔ اور دوسری تدبیر یہ ہے کہ طاعت کو اختیار کرو۔ جن لوگوں کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہے وہ زکوٰۃ دیں جن پر حج

فرض ہے وہ حج کریں اور پختہ قصد کرلیں کہ انشاء اللہ علیہ سے اگلے دن ضرور حج کو چلے جائیں گے بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ سالہا سال سے ان کا ارادہ حج کا ہے لیکن آج تک پورا نہیں ہوا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بہانہ ان کو لگا رہتا ہے۔ کسی نے ایسے لوگوں کے لیے کہا ہے کہ ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

اور تیسری تدبیر یہ ہے کہ دعا کریں لیکن دعا کے یہ معنی نہیں کہ جماعت میں سے کسی ایک نے پکار دیا کہ بارش کے لیے دعا کیجئے اور دوسرے نے کہدیا کہ اے اللہ! بارانِ رحمت نازل کیجئے حالانکہ نہ دل میں درد ہے نہ قلب کی توجہ ہے

دُعا کا طریقہ

بلکہ دعا اس طرح کرو کہ پوری طرح دل ادھر متوجہ ہو اور دل میں درد بھرا ہوا ہو اور درد اگر اختیار میں نہیں ہے تو توجہ کرنا تو اختیار میں ہے اور کم سے کم اس قدر توجہ تو ہو جس قدر حکام سے التجا کرتے وقت ہوا کرتی ہے۔ صاحبو! جو دعا توجہ سے کی جاتی ہے وہ اکثر قبول ہوتی ہے اور اکثر محض احتیاطاً کہا ورنہ اصل یہ ہے کہ ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد ۔۔۔ اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

طبیب کے ہونے میں شک نہیں مگر درد ہی نہ ہو تو کیا کریں اور دعا کرنے کے تین طریقے ہیں ایک تو یہ کہ ہر نماز کے بعد دعا کیا کرے۔ دوسرے یہ کہ سب مل کر کسی جنگل میں جمع ہوں اور وہاں جا کر خدا تعالیٰ سے دعا کریں ان میں سے جو آسان معلوم ہو اس کو کرلیں۔ پس یہ تدبیر یہ ہے۔ نہ وہ جو کہ لوگوں نے اختراع کی ہے۔ خدا تعالیٰ کا یہ کلام ان سب تدابیر مذکورہ کو شامل ہے اور مولانا نے اسی کو منظم بھی کیا ہے۔ ؎

اطلبوا الارزاق من اسبابھا　　　وادخلوا الابیات من ابوابھا

جس کام کو کرو اس کے دروازے سے کرو اور دروازہ ہر کام کا وہی ہے جو اس کا اصلی طریقہ ہے یہ تو حاصل تھا وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا کا۔ آگے خدا تعالےٰ نے ایک قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا ہے اگرچہ یہ جملہ بھی قاعدہ کلیہ تھا۔ مگر وہ مقاصد پر مطابقتاً دلالت نہ کرتا تھا اور یہ مطابقتاً دلالت کرتا ہے فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کام کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ ہم خلاف شرع تو نہیں کرتے یعنی دین کا جو کام کرو اس کا تو طریقہ کامیابی بھی دیکھ لو اور دنیا کا جو کام کرو اس میں صرف اتنا دیکھ لو کہ یہ جائز ہے یا نہیں۔ چونکہ یہ مضمون حالت موجودہ پر نظر کر کے نہایت ضروری تھا۔ اسلئے اس کو اس حالت کے ساتھ بالتخصیص بیان کر دیا گیا۔ باقی ہے یہ ایسا امر کہ اسکو ہر وقت ہر کام میں پیش نظر رکھنا چاہیے البتہ طاعت میں علاوہ طاعت عامہ مذکورہ سابقہ کے خصوصیت کے ساتھ رفع قحط کے لئے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کچھ صدقہ دیدیا جائے کیونکہ صدقے کو خدا تعالیٰ کے غصے کے دور کرنے میں بہت دخل ہے اور اس صدقے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں وقت اپنے گھر میں سے ایک ایک روٹی غریبوں کو دے دو یا جس قدر توفیق ہو۔ یہ آسان بھی ہے اور ہمیشہ جاری بھی رہ سکتا ہے۔ یا جو لوگ صاحب وسعت ہیں وہ ایک ایک خوراک دونوں وقت مقرر کر دیں اس میں غلہ بھی خرچ ہو جائے گا۔ اور کسی کو خبر بھی نہ ہو گی۔

حدیث شریف میں اخفائے صدقہ کی یہاں تک تاکید آئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ اس طرح صدقہ کرو کہ داہنا ہاتھ دے تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو لوگ کہتے ہیں کہ مولوی نیک کاموں سے منع کرتے ہیں۔ صاحبو! منع نہیں کرتے بلکہ تمہاری چیزوں کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں اور تم کو ان کے صرف کرنے

کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ اس طرح کرو تاکہ ٹھکانے لگے۔

اب خدا تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم کو توفیق عمل دے۔ اور ہمارے گناہوں کو بخش دے اور بارانِ رحمت نازل فرمائے۔

اٰمین یا ربّ العٰلمین

برحمتک یا ارحم الرّاحمین۔

بحرمۃ سیّد الابرار

صلّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلّم۔

اِتعاظ بالغیر

یعنی "دوسروں کے احوال سے سبق حاصل کرنا" کے بارے میں حکیم الامت حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قصبہ جلال آباد میں گیارہ (۱۱) ربیع الاول سنہ ۱۳۳۰ھ کو دو گھنٹہ تک بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو (۱۰۰) تھی۔

مولانا سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمدًا عبدہٗ ورسولہ اَمّا بَعۡدُ فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اَلسَّعِیۡدُ مَنۡ وُّعِظَ بِغَیۡرِہٖ

تمہید یہ ایک جملہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد کیا ہوا اس میں ہمارے ایک عام مرض کے علاج پر تنبیہ ہے اس واسطے اس جملہ کو اختیار کیا ہے۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ مختصر ہے اور جامع اور اس وقت طبیعت کی حالت اضمحلال اسی کو مقتضی ہے کہ مختصر مضمون تجویز کیا جائے لیکن یہ مضمون باوجود اختصار کے ہے جامع ہماری حالت پر اس سے گفتگو ہو سکتی ہے اب سمجھیے کہ مرض دو قسم کے ہیں ایک وہ مرض کہ جس پر اطلاع نہ ہو ایک وہ کہ اطلاع ہو اور پرواہ نہ ہو۔ اور ایسا مریض زیادہ قابل رحم ہے سو ہم میں بعض امراض بوجہ بے علمی کے ہیں اور بعض بوجہ قلت تدبر کے کیونکہ بعض تو ہم میں بے علم ہیں۔ سو ان کی تو زیادہ شکایت نہیں ہے۔ لیکن بعض وہ ہیں کہ ذی علم ہیں اور باوجود اس کے ان میں قلت تدبر ہے یعنی اپنی حالت کو سوچتے نہیں۔ دنیا کا کام جس طرح سوچ سمجھ کر کرتے ہیں یہ ہے کہ دین کے کاموں میں اتنا اہتمام نہیں بلکہ جس میں جتنا دین ہے وہ عادت کی وجہ سے ہے اگرچہ یہ خوشی کی بات ہے کہ دین کی عادت ہوتی لیکن شکایت یہ ہے کہ اس سے اتنا التفات کیوں نہیں۔

ہے یعنی کہ بقیہ میں بھی تدبّر سے کام لیتے۔ دیکھئے دنیا میں کبھی قناعت نہیں کرتے بلکہ اُسکی ترقی اور زیادتی میں مشورہ کرتے ہیں۔ تدبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ کامیابی بھی نہ ہو کیونکہ دنیا میں کامیابی اکثر کم ہوتی ہے۔ ورنہ اگر سب کامیاب ہوا کرتے تو آج ساری دنیا بادشاہ ہوتی۔ تو دنیاوی مساعی میں باوجود کامیابی کم ہونے کے پھر بھی کوشش کی جاتی ہے اور خدا کی مصلحت ہے کہ کسی کی تدبیر کارگر کر دیتے ہیں اور کسی کو ناکام۔ آج جن لوگوں کی تدبیر مساعد ہو گئی ہے۔ وہ تدابیر ہی کو مؤثر سمجھتے ہیں۔

صاحبو! ذرا اُن سے پوچھو کہ جن کو تمام عمر ناکامی ہی رہی تو صرف تدبیر نہ مؤثر ہے اور نہ یہ تدبیر محض بیکار ہے مگر آخرت کے لیے ناکامی کبھی نہیں ہوتی۔ پس تعجب ہے کہ جس میں اکثر ناکامی ہو اس میں تو سعی و اہتمام کیا جائے اور جس میں کبھی ناکامی نہ ہو اُس میں کبھی التفات نہ کیا جائے۔ حالانکہ جس قدر سعی دُنیا کے لیے کیجاتی ہے اُس سے نصف بھی آخرت کے لیے کریں تو ناکام نہ رہیں۔ غرض بعض میں خرابی قلّت تدبّر کی وجہ سے ہے بہرحال یہ مرض ہم میں ضرور ہے۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی مرض ہم میں ہے۔ بلکہ منجملہ اور بہت سے امراض کے یہ مرض بھی ہے اور یہ مرض قریب عالم گیر ہے۔ مگر پھر بھی اسکے معالجے کی طرف التفات نہیں ہے تو اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ ہماری حالت یعنی عدم تدبّر وہ ہے جس کا متقابل اس حدیث میں مذکور ہے یعنی تدبّر تو چونکہ یہ مضمون اُس مرض کی ضد ہے اس لیئے اس سے اُس کا علاج ہو جائیگا۔

سو فرماتے ہیں کہ سعید وہ ہے کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تدبّر ہی میں داخل ہے اور عجب نہیں کہ ایسا مضمون بہت دفعہ سُنا ہو۔ چنانچہ عام محاورہ میں کہتے ہیں کہ تازی پٹے اور ترکی کانپے۔ اس مَثَل کا خلاصہ یہی ہے کہ السعید من وعظ بغیرہ

کہ سعادت مند وہ ہے کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر اُس کو عبرت حاصل ہو پس یہ مضمون تسلیم شدہ ہونے کے سبب مستقل تسلیم کرانے کی ضرورت نہیں

شریعت و طبیعت کا توافق

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہم کو کوئی مضمون ایسا نہیں سکھلایا گیا کہ وہ ہم سے اجنبی ہو۔ بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ شریعت کی ہر تعلیم طبیعت کے اتنی مناسب ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ہزاروں مشقتیں پڑ جائیں۔ تو شریعت کی ہر تعلیم طبیعت کے مناسب ہے اور اُس کی مُضاد تعلیم کے منافی ہے مگر اس کے دریافت کے لیے بصیرت کی ضرورت ہے۔ ہمارا نفس چونکہ بصیر نہیں ہے۔ اس لیے شریعت کی تعلیم سے بھاگتا ہے جیسے مریض بدپرہیزی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور سفید ادویہ و اغذیہ سے بھاگتا ہے۔

چنانچہ استسقاء کے اندر سارے سمندر کی خواہش ہوتی ہے اور جو تندرست ہوتا ہے وہ اعتدال سے پیتا ہے۔ اور اگر مریض کو طبیب روکے گا تو وہ یوں سمجھے گا کہ یہ تعلیم طبیعت کے خلاف ہے۔ حالانکہ اُس کی طبیعت ہی حدِ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہے۔ ورنہ ایک گھونٹ زیادہ پینے سے بھی طبیعت پر گرانی ہوتی ہے ——— علیٰ ہٰذا۔ کھانے میں ایک شخص کو ہم نے دیکھا ہے کہ کھا رہے ہیں اور نکل رہا ہے مگر کھائے جاتے ہیں اور نکلتا جاتا ہے اسی طرح برابر سلسلہ رہتا تھا تو کیا طبیعت سلیم ہے؟ ہرگز نہیں۔ میں تو دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر طبیعت سلیم ہو تو کشش شریعت ہی کی طرف ہوگی۔ اور اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو امتحان کر لیجئے کہ جب کبھی شریعت کے خلاف کیجئے گا ضرور ضرر ہوگا۔ جیسے زیادہ کھانے سے ضرر ہوتا ہے اور عاجل ضرر یہ ہے کہ فوراً طبیعت گرفتہ ہو کے منقبض ہو گے۔ مخالفت شریعت کا اول تو تقاضا پیدا ہوتا ہے مگر بعد فراغ اُس عمل کے گرانی ہوگی۔ اگر کہیے کہ ہم کو تو

کچھ بھی گرانی نہیں ہوتی۔ تو سمجھئے کہ یہ ظلمت بڑھ جانے سے ہے۔ یہ دیکھئے کہ اوّل اوّل جب یہ گناہ کیا تھا۔ اُس وقت کیا حالت ہوئی تھی۔

مثلاً ایک شخص نے اول ہی اول رشوت لی تو اُس وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا ہے اور اپنی نظر میں بھی بالکل وقعت جاتی رہی تھی۔ اسی طرح اوّل زنا کرنے سے خود اپنے اوپر شرم آئی تھی۔ اور خود اپنی نظر میں ذلیل ہوا تھا۔ علیٰ ہٰذا دوسرے گناہوں کی بھی یہی حالت ہے اس سے معلوم ہُوا کہ ہر گناہ طبیعت کے خلاف ہے اور شریعت طبیعت کے موافق ہے البتہ بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ اُن کا اثر فوراً ہی ہر شخص کو محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ بعد مرنے کے معلوم ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ حضورؐ نے وہی باتیں بتلائی ہیں جو طبیعت کے موافق ہیں تو یہ تعلیم بھی طبیعت کے موافق ہے۔

دیکھو! اگر چور کو سزا ہو تو دوسرے کے لیے راحت اس میں ہے کہ چوری چھوڑ دے۔ اور کلفت اس میں ہے کہ دیکھے اور برابر کئے جائے اور جب یہ حالت رہے گی تو مثل مشہور ہے کہ سو دن چور کے ایک دن ساہوکار کا۔ کبھی نہ کبھی یہ بھی ماخوذ ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں ایک چور پکڑا ہوا آیا۔ آپ نے قطع ید کا حکم دیا اُس نے کہا امیر المومنینؓ! میں نے پہلی ہی مرتبہ ایسا کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تو غلط کہتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی یہ عادت نہیں ہے وہ کبھی اول گناہ پر نہیں پکڑتے آخر تحقیق جو کیا گیا تو معلوم ہُوا کہ وہ بڑا عیّار ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

حکم حق باتو مواساتے کند — چونکہ از حد بگذری رُسوا کند

اول اوّل تو مواساۃ کرتا ہے لیکن جب کوئی حد ہی سے نکل جائے تو وہ رُسوا بھی کر دیتے ہیں۔ تو یہ تعلیم کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر نصیحت پکڑے بالکل مصلحت اور طبیعت کے موافق ہے اس سے تو فراغت ہوئی۔

حقیقتِ عبرت

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں یہ مرض ہے یا نہیں تو اگر ذرا بھی اپنی حالت کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہو کہ بہت شدت سے ہم میں یہ مرض ہے۔ اور ہر ہر امر میں ہماری یہ حالت ہے۔ مگر میں اس وقت ایک خاص امر کو بیان کرتا ہوں۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ جابجا اس وقت طاعون ہے۔

نیز اخباروں میں بھی ضرور پڑھا ہوگا۔ کیونکہ آپ لوگوں نے اخباروں کو تو ایک مشغلہ بنا لیا ہے ——— میں نے ایک مرتبہ اخبار کے متعلق ایک مضمون لکھ دیا تھا جس میں اُسکے حکم کی تفصیل تھی۔ مگر اخبار والوں نے اُس مضمون کو بلا دیکھے ہی وہ شور وغل مچایا کہ خدا کی پناہ! میں نے کہا کہ اس وقت تک تو میں نے اخبار بینی کے متعلق تشدد نہیں کیا تھا۔ مگر اب تو میرے پاس ایک دلیل بھی مقتضی تشدد کی ہے کہ اخبار تہمت بھی لگاتے ہیں۔

واقعی اخباروں کی یہی حالت ہے کہ اکثر باتیں بے تحقیق محض تخمین سے لکھ دیتے ہیں — نوجوان اسی لئے اس کو خریدتے ہیں۔ صاحبو! ایک تاریخ کا شعبہ ہے۔ تاریخ بہت مفید چیز ہے خدا تعالےٰ فرماتے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ

کہ اُمم سابقہ کے قصے اس واسطے نقل کئے جاتے ہیں کہ لوگ عبرت پکڑیں۔ عبرت کا خلاصہ یہی ہے کہ کسی امر مشترک کی وجہ سے اپنے کو ان پر قیاس کریں کہ فلاں شخص نے ایسا کیا تھا۔ اُس کو یہ نتیجہ ملا تو ہم کو بھی یہی نتیجہ ملے گا۔ یہ حقیقت ہے عبرت کی اس کی وجہ سے علم تاریخ مفید ہوا۔ پس اخبار سے بھی اگر یہی سبق حاصل کریں تو وہ مفید ہے ورنہ غیر مفید ——— اب دیکھ لیجئے کہ کون شخص یہ سبق حاصل کرتا ہے۔ اکثر لوگ مسلمانوں کی مصیبت کو سُنتے ہیں۔ مگر کانوں پر جُوں بھی

نہیں رہ گئی ۔ میں پوچھتا ہوں کہ دوسری جگہ کے مسلمانوں کو جیسا کہ طاعون منتشر
کی حد کا تخالف سے آدمی ایسے ہیں کہ ان کے دل پر ایسا اثر نہیں ہوتا جیسا اپنی بستی
کے اندر مرض طاعون ہونے سے ہوتا ہے ۔

تو کز محنت دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

جب دوسروں کی تکلیف کو نہ سمجھا اور دل نہ دکھا تو ہم آدمی نہیں اب ہم نے
بازار کو جس غرض کے لیے تجویز کیا ہے اس کا خلاصہ مگر ایک تو اشتہار دیکھنا ہے
کہ دوسرے کا گھر جلے اور ہم بیٹھ کر ہاتھ تاپیں تو کہاں انصاف ہے ۔ دیکھئے تو یہ ہوتا
کہ ہم نے مسلمانوں کی مصیبت کو مشغلہ بنا رکھا ہے اور تسلی حاصل کرتے تو تسلی
حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ ہے سوچ بہت کر کے لوگوں کے دل میں آتا ہے ۔

کوتاہ دستی

اسے تسلی حاصل کرتے ہیں کہ دوسری جگہ کے
لوگوں سے خطاب نہیں بلکہ اس سے طاعون میں مبتلا
ہوتے ۔ مگر اس سے زیادہ حیرت اور بھی ہے کہ ان کی ابھی پہچان کو ہوا لگی نہیں لگی
اور جس کی نسبت سزا آ چکے ہیں ۔

چند خوانی حکمت یونانیاں — حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

کہاں یونانیوں کی حکمت کہاں تک پڑھو گے ۔ اب کچھ ایمانیوں کی حکمت بھی پڑھو
صاحبو! مطلب واقعی ایک یونانی ایک ایمانی ۔ یونانی سے مراد حکمت کی
ہے اس پر تو آپ کی نظر جاتی ہے مگر حکمت ایمانیاں پر نظر نہیں جاتی ۔ اس کو بھی
دیکھو ، آج کل تشخیص کر لی کہ ہوا صاف نہ ہونے سے طاعون ہوا ۔ مگر یہ بھی تو دیکھئے
کہ ہوا کے صاف نہ ہونے کی کیا علت ہے ؟ آپ نے طاعون کی علت کو تو دیکھا مگر علت العلت
کو نہ دیکھا ۔ ہم اطباء کی تکذیب نہیں کرتے ۔ مگر اہل دنیا کی نظر وہیں تک رہ جاتی ہے
اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص قلم سے لکھ رہا ہے جو شخص چیونٹی نے دیکھا ایک

نے تو کہا کہ یہ نقوش خود بخود ہو رہے ہیں۔ دوسری جو اس سے وسیع النظر تھی اُس نے کہا کہ نہیں بلکہ قلم چل رہا ہے۔ تیسری اس سے بھی وسیع النظر تھی اُس نے کہا کہ قلم خود نہیں چل رہا۔ بلکہ وہ انگلیوں میں ہے۔ انگلیاں اُس کو چلا رہی ہیں۔

چوتھی جوان سب میں محقق تھی اُس نے کہا کہ انگلیاں خود بخود نہیں چل رہیں بلکہ ایک قوتِ ارادیہ اُن کو چلا رہی ہے —— اب بتلایئے کہ اُن میں محقق کون ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے قوتِ ارادیہ کا پتہ چلا لیا وہ محقق ہے باقی سب کوتاہ نظر ہیں ایک بزرگ کہتے ہیں کہ

قال الجدار للوتد لم تشقنی - قال الوتد انظر الی من یدقنی

غرض یہ ہے کہ علت کو بھی تو دیکھو دوسری مثال لیجئے کسی شخص کو پھانسی ہوئی کسی نے پوچھا کہ کیونکر ہوئی۔ ایک نے کہا کہ جیڑے سے گلا گھونٹ دیا گیا۔ دوسرے نے کہا کہ احمق سبب یہ ہے کہ حاکم نے حکم دیا تھا۔ تیسرے نے کہا کہ حاکم نے حکم اس لئے دیا کہ اُس نے ڈکیتی کی تھی تو اصل محقق یہ تیسرا شخص ہے کہ حکم حاکم کو اور مجرم کے عمل کو بھی دیکھا یہی فرق ہے عقلائے ظاہر اور عقلائے حقیقت میں۔ تو یہ بھی صحیح ہے کہ موت جیڑے سے ہوئی اور طاعون سمیت سے ہوا۔

اسبابِ مصیبت

مگر یہ بھی تو دیکھو کہ ہوا میں سمیت کیوں پیدا ہوئی۔ سو اسکی وجہ یہ ہے کہ حاکم حقیقی نے اُس میں سمیت پیدا کر دی۔ اور اُس کے پیدا کرنے کا سبب مخلوق کے گناہ ہوئے تو محض چوہوں کے مارنے پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ جرائم کی وجہ سے طاعون ہوا تھا۔ اُن کو بھی چھوڑنا چاہیئے اور ایک طاعون کیا سب مصیبتیں ہمارے جرائم اور اعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ

اور یہاں سے یہ معلوم بھی ہوگیا ہوگا کہ اہلِ شریعت پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ہر امر میں گناہوں کو سبب بناتے ہیں۔ اسباب کے مُنکر ہیں۔ سو یہ اعتراض غلط ہے وہ اسباب سے بے خبر نہیں۔ مگر اسبابِ بد کے ساتھ اسباب اسباب کو بھی دیکھتے ہیں۔ اور اس لیے کہتے ہیں کہ جو مصیبت آتی ہے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے ہَوا، آگ، پانی سب خداوند کریم کے حکم کے تابع ہیں اُن کو جب حکم ہوتا ہے جیسا حکم ہوتا ہے کرتے ہیں ؎

خاک و آب و بادہ و آتش بندہ اند　　　با من و تو مردہ با حق زندہ اند

یہ ہمارے سامنے مردہ ہیں ورنہ سب زندہ اور تابع حکم ہیں۔ ایک کافر بادشاہ نے بہت سے مسلمانوں کو آگ میں ڈال دیا تھا کیونکہ وہ لوگ بُت کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے تھے۔ آخر ایک عورت کو لایا گیا۔ اور اُس سے بھی سجدہ کرنے کو کہا گیا تو اُس نے بھی انکار کیا۔ اُس کی گود میں ایک بچہ تھا بادشاہ نے حکم دیا کہ اُس کی گود سے بچہ لے کر آگ میں پھینک دیا جائے چنانچہ پھینک دیا گیا۔ قریب تھا کہ وہ عورت سجدہ کرے کہ لڑکے نے آواز دی ؎

خواست تا او سجدہ آرد پیشِ بُت　　　بانگ بر زد طفل کانّی لَم اَمُت
اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم　　　گرچہ در ظاہر میانِ آتشم

اُس کے بعد اوروں سے خطاب کرنا شروع کیا کہ یہاں آ ؤ یہاں آ ؤ بہت بڑا عجیب باغ ہے پھر تو یہ حالت ہوئی کہ لوگ بے قرار ہو کر اُس میں کودنے لگے سپاہی روکتے تھے مگر لوگ برابر آگ میں کودتے جاتے تھے۔ جب بادشاہ نے یہ حالت دیکھی تو آگ کو خطاب کر کے کہا کہ اے آگ تو کیا تو آگ نہیں رہی یا تجھ میں جلانے کی قوت سلب ہوگئی۔ آگ نے جواب دیا ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم اندر آ تا تو بہ بینی تابشم

یعنی تو اندر آ تو معلوم ہو کہ میں آگ ہوں یا نہیں۔ باقی ان کو کیونکر جلاؤں چھری کاٹتی ہے مگر چلانے سے ؎

طبع من دیگر نگشت و عنصرم تیغ حقم ہم بدستوری برم

اسی طرح آب و ہوا خدا کے حکم سے ممّی ہو جاتی ہیں اور وہ ہلاک کر دیتی ہیں حضرت مولانا نظامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

نبارد ہوا تا نگوئی ببار زمین نا ورد تا نگوئی ببار

کہ جب تک حکم نہ ہو زمین ایک دانہ بھی نہیں نکال سکتی۔ تو سبب اصلی جرائم و معاصی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر چہ بر تو آید از ظلمات و غم آں ز بیباکی و گستاخی ست ہم

غم چو بینی زود استغفار کن غم با خالق آمد کار کن

تعلیمِ نبوی کی برکت

کہ جب غم دیکھو فوراً توبہ کر لو۔ دیکھئے کیا عجیب تعلیم ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں کہ تم اگر حکام کی طرف سے کوئی ناگوار بات دیکھو تو ان کو برا مت کہو۔ اس کی وجہ فرماتے ہیں [قربان ہو جائیے حضورؐ کی تعلیم پر کہ فضول باتوں سے کیسا روک دیا ہے] کہ حکام کے قلوب میرے اختیار میں ہیں اگر راحت چاہتے ہو تو میری اطاعت کرو اور مجھ سے معاملہ درست رکھو۔ میں حکام کے دل نرم کر دوں گا۔

ایک مرتبہ کانپور میں طاعون ہوا۔ لوگوں نے چاہا کہ ایک جلسہ کریں اور حاکم ضلع سے درخواست کریں کہ جدید قوانین طاعون کے متعلق اٹھا دیئے جائیں۔ سو مجھ کو بھی اس جلسے میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انکار کر دیا۔ جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا کہ اچھا میں دیوانِ حافظ میں بطور فال کے دیکھتا ہوں یہ دیکھنا اس وجہ

نہ تھا کہ میں فال کو مؤثر سمجھتا تھا۔ مگر دیوان حافظ میں اکثر صحیح مذاق کے موافق باتیں نکل آتی ہیں۔ اسی لئے میں نے اُس کو دیکھا تو اُس میں یہ شعر نکلا ؎

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش — رموز و مصلحتِ ملک خسرواں دانند

کہ تم کون ہو خواہ مخواہ گڑ بڑ کرنے والے۔ میں نے اُن سے کہا کہ بھائی اب تم بھی نہ بولو بس خدا کے سپرد کردو اور اللہ اللہ کیا کرو۔ اور بعد عصر لاحول کی تسبیح پڑھنے لگو۔ اور اتفاق سے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہفتہ دو ہفتہ کے اندر ہی سب پریشانی رفع ہو جائے گی ——— چنانچہ ایسا ہی کیا حاکم ضلع نے از خود رپورٹ کی کہ ان قوانین سے لوگوں کو تکلیف ہے ان کو اُٹھا لیا جائے چنانچہ سب موقوف ہو گئے۔ لوگ بہت خوش ہوتے ہوئے آئے اور کہنے لگے صاحب سب کام ٹھیک ہو گیا۔ میں نے کہا کیا حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بتلائی ہوئی تدبیر نہ چلے گی۔

سببِ طاعون

صاحبو! اگر ہم عمل کریں تو دنیا کی راحت بھی شریعت ہی کی تعلیم میں ہے۔ تو حضورؐ نے فضول باتوں سے یہاں تک روکا کہ حکام کو بھی بُرا نہ کہو۔ غرض سب مصیبتوں کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو ناراض کر رکھا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس قوم میں زنا زیادہ ہو گا اُس میں طاعون ہو گا۔ اور اس طاعون کا دوسرا سبب بھی ہے اگرچہ بعضے باتیں ظاہر کرنے کی نہیں ہوتیں مگر اس لئے ظاہر کئے دیتا ہوں کہ شاید اس کو سُن کر لوگ اپنی حالت درست کر لیں۔ تین چار سال ہوئے کہ جب تھانہ بھون اور اس کے گرد و نواح میں طاعون ہوا تھا۔ تو قبل طاعون ایک روز میں اخیر شب میں بیٹھا ہوا تھا کہ قلب پر یہ آیت وارد ہوئی۔

إِنَّا مُنزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ

میں نے اس کو وعظ میں بیان کیا لیکن اپنی طرف منسوب نہیں کیا کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوا مگر لوگوں نے توجہ نہ کی۔ اور طاعون پھیلا۔ تو غرض ایک سبب وہ گناہ بھی نکلا جو قوم لوط میں تھا

اس وقت لوگوں میں یہ مرض بہت شدت سے پھیل رہا ہے۔ کوئی خاص اصلی ہی گناہ میں مبتلا ہے۔

نظر بازی

اور کوئی اگلے مقدمات میں یعنی اجنبی لڑکے یا اجنبی عورت پر نظر کرنا حدیث میں ہے اللسان یزنی وزناہ النطق والقلب یتمنی ویشتھی۔ اس میں ہاتھ لگانا بری نگاہ سے دیکھنا سب داخل ہوگئے۔ یہاں تک کہ جی خوش کرنے کے لیے کسی حسین لڑکے یا لڑکی سے باتیں کرنا یہ بھی زنا و لواطت میں داخل ہے اور قلب کا زنا سوچنا ہے جس سے لذت حاصل ہو ——— جیسے زنا میں تفصیل ہے ایسے ہی لواطت میں بھی۔

اس بلا میں اکثر لوگ مبتلا ہیں اور یہ نہایت ہی افسوس اور رنج کی بات ہے۔ باوجودیکہ عورت کی طرف طبعًا میلان ہوتا ہے مگر لوگ پھر بھی لڑکوں کی طرف مائل ہیں اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہے کہ عورت سے ملنے میں بدنامی ہوجاتی ہے دوسرے عورت ملتی بھی مشکل سے ہے اور لڑکے سے ملنے میں زیادہ بدنامی کا بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔ اور ملتے بھی ہیں آسانی سے۔ بالخصوص دیکھنا اور تصور کرنا تو اس لئے بھی سہل ہے کہ اس کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی اور یہ سب بدکاری ہے۔ اور نہایت افسوس ہے کہ یہ مرض تاک جھانک کا اکثر پرہیزگاروں میں بھی ہے اور ان کو دھوکہ اس سے ہوجاتا ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی طبائع میں اکثر شہوت کی خلش نہیں پاتے اور اس سے سمجھتے ہیں کہ ہماری نظر شہوانی نہیں لیکن بہت جلد شہوت ظاہر ہوجاتی ہے اسلئے ابتدا ہی سے احتیاط واجب ہے ——— صاحبو! امام ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر تو آج کل کوئی متقدس نہیں ہوگا مگر دیکھئے کہ امام محمدؒ کو امام صاحب نے اوّل دفعہ تو دیکھا لیکن جب معلوم ہوا کہ اُن کے داڑھی نہیں آئی تو یہ حکم کر دیا کہ جب تک داڑھی نہ نکل آئے پُشت کی طرف بیٹھا کرو۔ دونوں طرف متقی مگر احتیاط اتنی بڑی۔ بعد مدت دراز ایک مرتبہ اتفاقًا امام صاحب

کی نظر پڑ گئی تو تعجب سے پوچھا کہ کیا تمہارے داڑھی نکل آئی ہے؟ تو جب امام ابوحنیفہؒ نے اس قدر احتیاط کی ہے تو آج کون ہے کہ وہ اپنے اوپر اطمینان کرے۔ تو اس آیت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ لوگوں کے اس عمل سے اُن پر عذاب نازل ہونے کو ہے ہیں نے روکا مگر کون سنتا ہے جب اس لغو کام کی عادت پڑ جاتی ہے تو کم ہمتوں سے بڑی مشکل سے چھوٹتا ہے۔

عزمِ توبہ

ہاں اگر ہمت کی جائے اور پختہ قصد کرے تو چھوٹ بھی جاتا ہے کیونکہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں ایک حد تک مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے غریب آدمی کا رشوت لینا اگر نہ لے تو بظاہر اُس کے کام اٹکتے ہیں اور اس میں تو کوئی ایسی مجبوری نہیں کہ کوئی کام اُس پر اٹکا ہو پس اس میں تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ تھوڑی سی تکلیف نفس کو ہوگی تو اس کا چھوڑ دینا ہمت والے کے لیے بہت آسان ہے ہمت والوں نے تو خدا کی راہ میں جانیں تک دیدی ہیں۔ بہت سے ایسے باہمتوں کے واقعے سُنے گئے انہوں نے تمام عمر کی افیون کی عادت چھوڑ دی۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اور بیعت کی درخواست کی۔ مولانا نے اُس کو بیعت کر لیا اور تمام گناہوں سے یعنی کفر و شرک وغیرہ سے توبہ کرا دی۔ جب مولاناؒ بیعت کرا چکے تو کہنے لگا مولوی جی! تم نے افیم (افیون) سے توبہ کرائی نہیں۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر تھی کہ تو افیون بھی کھاتا ہے اچھا جس قدر افیون تو روزانہ کھاتا ہو اُس کی گولی بنا کر میرے ہاتھ پر رکھ دے چنانچہ اُس نے گولی بنا کر مولاناؒ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ مولاناؒ نے اُس کو دیکھا۔ اور اس میں سے تھوڑا سا حصہ لے کر اُس سے کہا کہ اس قدر کھا لیا کر کہ مقصود یہ تھا کہ بتدریج چھڑا دیجائیگی۔ مگر جب قلب میں محبتِ خدا آتی ہے تو افیون کیا سلطنت بھی چھوٹ جاتی ہے اُس نے کہا کہ مولوی جی اب کیا کھاؤں گا

اور یہ کہہ کر افیون کی ڈبیہ جیب سے نکالی اور بہت دور پھینک دی۔ گھر پہنچکر افیون کا تقاضا ہوا۔ مگر اُنس نہیں کھائی۔ آخر دست لگے۔ مولاناؒ کے پاس کہلا کر بھیجا کہ مجھے دست لگ رہے ہیں۔ مگر میں توبہ کو نہیں توڑوں گا۔ چند روز میں دست بند ہو گئے جب بالکل تندرست ہو گیا تو مولاناؒ کے پاس آکر سلام کیا مولاناؒ نے پوچھا کہ بھائی کون ہو کہنے لگا جی میں ہوں افیم والا۔ اور دو روپے نکال کر مولاناؒ کو دیئے اور کہا کہ مولوی جی یہ افیم کے روپے ہیں۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ بھائی افیون کے روپے کیسے کہنے لگا میں دو روپے مہینے کی افیم کھاتا تھا جب میں نے چھوڑ دی تو نفس بہت خوش ہوا کہ دو روپے ماہوار بچے میں نے نفس سے کہا کہ میں یہ دو روپے تجھے ہرگز نہ دوں گا۔ میں اپنے پیر کو دوں گا۔

دیکھئے اس شخص نے دین کو کتنا خالص کیا کہ وہ دو روپے بھی اپنے پاس نہیں رکھے خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ ہمت وہ چیز ہے کہ وہ سب کچھ کرا دیتی ہے تو اگر ہمت کی جائے تو نگاہ بد کا چھوڑنا کیا مشکل ہے۔

فسادِ گندم

مگر افسوس ہے کہ لوگ تو اس کو ایسا خفیف جانتے ہیں کہ گویا حلال ہی سمجھتے ہیں حالانکہ حلال سمجھنا معصیت کا قریب بکفر ہے اور ایک بیباک شاعر نے تو اس کو ایک مثال میں بیان کیا ہے کہ ؎

نگاہِ پاک لازم ہے بشر کو روئے جاناں پر خطا کیا ہو گئی گر رکھ دیا قرآں کو قرآں پر

اس میں ایک تو یہ کھلا دھوکہ ہے نگاہ ناپاک کو پاک سمجھا۔ دوسرے اگر پاک بھی مان لیا جائے تو خوب سمجھ لو کہ شیطان اول اول تو اچھی نیت سے دکھلاتا ہے چند روز کے بعد جب محبت جاگزیں ہوتی ہے تو پھر نگاہ کو ناپاک کر دیتا ہے تو ضروری امر یہ ہے کہ علاقہ ہی نہ کرو۔ اور علاقہ ہوتا ہے نظر سے لہٰذا نظر ہی نہ کرو۔ غالباً حدیث میں ہے یا کسی بزرگ کا قول ہے النظر سهم من سهام ابلیس کہ اس کا زخم بھی نہیں ہوتا

اور سودا قلب تک اُترتا چلا جاتا ہے کسی شاعر کا شعر ہے ے

درونِ سینہ من زخم بے نشان زدہ — بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہ

یہ نظر ایسی چیز ہے کہ اس کا اثر پیدا ہونے کے بعد بھی مدت تک یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کو تعلق ہوگیا۔ بلکہ جب کبھی محبوب جُدا ہوتا ہے اُس وقت قلب میں ایک سوزش سی پیدا ہوتی ہے اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ تعلق ہوگیا اور جس قدر یہ سوزش بڑھتی ہے خدا کی محبت کم ہوجاتی ہے۔ اور اس کی خدا تعالےٰ کو بہت غیرت آتی ہے اور کیوں نہ آئیگی جبکہ محبوبانِ دنیا کو غیرت آتی ہے۔ مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص ایک عورت کے پیچھے چلا اُس نے پوچھا کہ تو میرے پیچھے کیوں آتا ہے کہنے لگا کہ میں تجھ پر عاشق ہوگیا ہوں۔ اُس نے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے میری بہن چلی آرہی ہے وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے۔ ہوسناک تو تھا ہی فوراً پیچھے لوٹا جب یہ لوٹنے لگا تو اُس نے ایک دھول اس کے رسید کیا اور ے

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی — در بیانِ دعوائے خود صادقی

★

پس چرا بر غیر افگندی نظر — ایں بود دعوائے عشق اے بے ہنر

کہ مردود اگر تو عاشق تھا تو غیروں پر کیوں نگاہ کی محبت تو وہ چیز ہے کہ ے

ہمہ شہر پُرز خوباں منم و خیال ماہے — چکنم کہ چشم بدبیں نکند بکس نگاہے

تمام دنیا بھی اگر حسینوں سے بھر جائے تو یہ محبوب کو چھوڑ کر اُدھر متوجہ نہ ہو۔——

حضرت مولانا گنگوہیؒ فرمانے لگے کہ اگر ایک مجلس میں حضرت جنیدؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ دونوں ہوں تو ہم حضرت جنیدؒ کی طرف التفات بھی نہ کریں۔ البتہ حضرت حاجی صاحب اُن کو دیکھیں سو محبت تو ایسی چیز ہے۔ یہ کیسی محبت کہ دعوے

خدا کی محبت کا ۔ اور لڑکوں سے تعلق معلوم ہوا کہ ؎

این نہ عشق ست آنکہ در مردم بود　　　این فسادِ خوردنِ گندم بود

اگر چار دن کھانے کو نہ ملے تو سب بھول جائیں تو یہ نفس کی شرارت ہے اور یہی وجہ ہے کہ عشق اُنہی کو ہوتا ہے جن کو خوب فرصت اور فراغ ہے ۔ ورنہ جو لوگ کسی کام میں مشغول ہیں اُن کو کبھی ایسی لغویات کی نہیں سوجھتی جیسے کاشتکار ۔ اس واسطے اس کا علاج بھی یہی ہے کہ اپنے کو کسی کام میں لگا دو جس میں کھپ جاؤ اگر دین کا کام نہ ہو تو دنیا ہی کا کسی جائز کام کرو طبیبوں نے بھی لکھا ہے ۔ اس مرض کے متعلق کہ یہ مرض للبطالین افسوس ہے کہ خدا تعالےٰ نے فراغت اس لیے دی تھی کہ دین کا کام کریں مگر زیادہ تر ایسے ہی لوگ محروم رہتے خوب کہا ہے ؎

خوشا روزگارے کہ دارد کسے　　　کہ بازارِ حرصش نہ باشد بسے

بقدرِ ضرورت یسارے بود　　　کند کارے ار مرد کارے بود

کہ بڑا خوش قسمت وہ ہے کہ اس کو حرص نہ ہو اور ضرورت کے موافق کھانے کو ہو لیکن افسوس ہے کہ ہم قدر نہیں کرتے اور اس بیکاری میں اپنے پیچھے یہ علتیں لگا لیتے ہیں ۔ اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ میں نے بعض درویشوں کو دیکھا ہے کہ اُنکے پاس ایک ایک لڑکا پلا ہوا ہے اور کہتے ہیں کہ ان کے حُسن میں خدا کا حُسن جلوہ گر ہے حضرت شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ بقراط نے ایک شخص کو ناچتے ہوئے دیکھا پوچھا اسکو کیا ہوا معلوم ہوا کسی اَمرد حسین کو دیکھ کر اس لئے بے خود ہو گیا کہ اُس میں جلوۂ حق نظر آیا کہنے لگا یہ کیا بات ہے کہ اس کو امرد میں تو جلوۂ حق نظر آیا میرے اندر کبھی نظر نہ آیا یہ تو بقراط کا قول ہے اس کا جواب ہے اعتبار نہ کرو لیکن شیخ کے مقولہ کا اعتبار کرو ۔ گے وہ اس کے اہل سمجھتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل　　　کہ در خوبرویانِ چین و چگل

اور فرماتے ہیں ؎

نداوند صاجدلاں دل بہ پوست   اگر ابلہے داد بے مغز اوست

ایک بزرگ تھے پنجاب میں۔ اُن کی بابت ایک دوست بیان کرتے تھے کہ اُن کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی حسین مکان دیکھتے تو وجد کرنے لگتے تھے اور یہ حالت تھی کہ اُن کے سامنے کوئی کواڑ نہ کھول سکتا تھا۔ اُس کی۔ آواز سے وجد کرنے لگتے تھے ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند   بہ آوازِ دولاب مستی کنند

اور یہ حالت تھی کہ ان کو پنکھا نہ جھل سکتے تھے۔ اُس کی آواز سے وجد ہو جاتا تھا تو ایسا شخص اگر کسی حسین آدمی کو بھی دیکھ کر وجد کرنے لگے تو یہ اُس کی ایک حالت ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو محض فسق وفجور ہے اور یہ ایسا مرض ہے کہ مُدعیانِ تصوّف میں بہت زمانے سے چلا آتا ہے۔ مولانا رومؒ جو ساتویں صدی میں ہیں۔ ایسوں ہی کے حق میں فرماتے ہیں ؎

صوفیِ ماندہ بنزد ایں لسام   الخیاطۃ واللواطۃ والسلام

کہ بس اس کا نام تصوّف رہ گیا ہے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ یہ بہت پُرانا مرض ہے اور سب سے اول لوط علیہ السلام کی قوم میں یہ مرض پیدا ہوا تھا۔ اور شیطان نے اُن لوگوں کی راہ ماری۔

حدیث میں ہے کہ قوم لوطؑ پر عذاب نازل ہُوا کہ پانچ بستیوں کو حضرت جبریل علیہ السلام نے بازو پر اُٹھایا۔ اور آسمان تک لیجا کر گرا دیا۔ گویا یہ دکھلا دیا کہ چونکہ تمہاری مت اُلٹی ہوگئی تھی۔ اس لئے سزا بھی تمہارے لئے اُلٹنے کی تجویز کی گئی

غرض اوّل تو نفس اس فعل ہی کی اس وقت کثرت ہے دوسرے اس کی وسعتِ مفہوم سے نظر وغیرہ سب اسی حکم میں ہے معلوم ہوگیا ہوگا کہ شاید ہی کوئی

اسکی بیجا ہوا ہو۔ اِلّا ماشاء اللہ

امامتِ امرد

اسی طرح اجنبی عورت یا امرد مشتہی سے گانا سننا یہ بھی ایک قسم کی بدکاری ہے حتیٰ کہ کسی لڑکے کی آواز سننے میں نفس کی شرکت ہو تو اُس سے قرآن سننا بھی جائز نہیں۔

اکثر لوگ لڑکوں کو نعت کی غزلیں یاد کرا دیتے ہیں یہ بھی جائز نہیں ہے فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر بے ریش لڑکا مرغوب طبع ہو تو اُس کی امامت بھی مکروہ ہے۔ اور نابالغ کے پیچھے تو نماز ہی نہیں ہوتی تو جب امام بنا کر کھڑا کرنا جائز نہیں حالانکہ قرآن مجید ہی پڑھے گا۔ مگر فقہاء نے بلاضرورت اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ دوسرے یہ بھی وجہ ہے کہ لڑکوں کا اعتبار ہی کیا عجب نہیں کہ وہ بے وضو ہی پڑھا دیں۔

چنانچہ ایک لڑکا کہتا تھا کہ میں نے بے وضو نماز پڑھائی اور لیجئے دو لڑکے نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اُن میں ایک امام تھا۔ ایک مقتدی ایک نے دوسرے کے پیر میں گدگدی اُٹھائی خوب کہا ہے الصبی صبی ولو کان ولیا خیر یہ جملہ معترضہ تھا

خلاصہ یہ ہے کہ امرد صبیح کی امامت کو فقہاء نے ناجائز کہا ہے۔ جوان یا میانہ عمر عورت کو مسجد میں آنے سے منع کیا ہے۔ البتہ بوڑھی کے لئے بجز امام صاحب کے اوروں نے اجازت دی ہے کہ اُس میں فتنہ نہیں ہے مگر یہ اُس زمانہ میں ہوگا آج تو ایسی گندی طبیعتیں ہو گئی ہیں کہ مطلقاً ناجائز کہا جائے گا۔ اگرچہ بڑھیا ہی ہو۔

ایک بادشاہ کی حکایت سُنی ہے کہ اُس کے سامنے ایک بیوہ عورت نکلی جو کہ بے انتہا بدصورت اور نفرت کی ہیئت و لباس رکھتی تھی۔ اور اس کو حمل تھا۔ اُس نے وزیر سے کہا کہ تحقیق کرو یہ حمل کس کا ہے اس کی طرف کس کو رغبت ہوئی ہوگی۔ وزیر تحقیق کرتے کرتے پریشان ہو گیا عتاب شاہی بڑھنے لگا۔ ایک روز اس پریشانی سے کسی سڑک پر گذر رہا تھا

کہ دیکھتا ہے ایک شخص نہایت تکلف کا لباس پہنے ہوئے ایک گندہ پرنالے کے نیچے جس میں... پیشاب وغیرہ گرتا تھا۔ایک دوات لئے ہوئے کھڑا اُس میں پانی ڈال رہا ہے سخت حیرت ہوئی اور اُس کو گرفتار کر لیا۔تحقیق سے معلوم ہوا ان ہی صاحب کا اس عورت کو حمل تھا۔لہذا اس زمانے میں اُس تفصیل کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ سب ہی کو روکنا چاہیئے۔

امارد کی شعر خوانی

غرض فقہاء نے جب محلِ شہوت میں قرآن سُننا... گوارا نہیں کیا تو غزلیات پڑھانے کی اجازت کب ہوسکتی ہے افسوس ہے کہ شریعت سے بے پروائی کی وجہ سے اب ان امور کا ذرا خیال نہیں کیا جاتا اکثر واعظین عورتوں کے مجمع میں خوش الحانی سے اشعار پڑھتے ہیں۔ یہ بالکل ہی مصلحتِ دین کے خلاف ہے۔ بحمد اللہ عورتوں کے مجمع میں اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہوں حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ سفر میں ایک غلام ساربان کو عورتوں کے سامنے اشعار پڑھنے سے روک دیا اور فرمایا تھا کہ رویدك یا انجشة لا تکسر القوارير۔ تو جب اُس زمانے میں کہ سب پر تقویٰ ہی غالب تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی اجازت نہیں دی تو آج کس کو اجازت ہوسکتی ہے۔ بالخصوص جبکہ خود عورتیں یا لڑکے ہی پڑھنے والے ہوں۔

حاصل یہ ہے کہ اس معصیت کو طاعون میں خاص دخل ہے اور اس کی وجہ سے زیادہ تر طاعون ہوتا ہے اگرچہ مطلق ناراضی ہر گناہ سے ہوتی ہے یہ صدور معاصی اصل علت ہے۔ طاعون کی تو جہاں طاعون آیا ہو۔سمجھ لیجئے کہ اس علت کی وجہ سے آیا۔ اب دوسری جگہ کے طاعون کی خبر سنکر اور اس علت کو معلوم کر کے یہ دیکھئے کہ اس میں ہم بھی مُبتلا ہیں یا نہیں۔ اگر مبتلا ہیں تو اس کو چھوڑنا چاہیئے یہ معنی ہیں السعید من وعظ بغیرہ کے چونکہ اس وقت مختصر ہی بیان کرنا تھا۔ اس لئے اس خاص مضمون کو بیان کیا۔ اب میں قطع نظر طاعون و اسباب طاعون کے اس مضمون کی عام تعلیم کرتا

ہوں کہ جو مصیبت آئے اُس کو کسی گناہ کا ثمرہ سمجھا کرو۔ اور جب کسی کو مصیبت میں دیکھو تو اس سے عبرت حاصل کیا کرو۔

اتعاظ بالغیر

اسی طرح جب کوئی مرجائے تو سوچو کہ ہمارے لئے بھی یہ دن آنے والا ہے مگر اس وقت کچھ ایسی غفلت پڑی ہے کہ مردے کو دیکھ کر بھی ذرا تغیر ہماری حالت میں نہیں ہوتا۔ میں خود اپنی حالت بیان کرتا ہوں کہ اوّل اوّل زمانے میں مردے کو دیکھ کر ایک عبرت سی ہوتی تھی مگر اب تو مساوات سی ہوگئی ہے۔ حالانکہ اس بارہ میں شریعت نے ہم کو یہاں تک تعلیم کیا ہے کہ قرآن میں حکم ہے کہ جب گھوڑے پر سوار ہو تو یہ آیت پڑھو

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝

کہ خدا کا فضل ہے کہ اُس نے ہمارے لئے اس کو مسخر کر دیا۔ ورنہ اگر بگڑ جاتا تو ہم کیا کر لیتے۔ یہ تو خاص رکوب کے سامنے ہوا آگے فرماتے ہیں وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ اس کو بظاہر پہلے مضمون سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر اہل لطائف نے سمجھا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ اس جانور پر سوار ہونے سے دوسری سواری کو بھی یاد کرو اور سمجھ لو کہ تم کو کسی تختہ پر اور چارپائی پر بھی سوار ہونا ہے پس جس میں تم کو رکھ کر چار آدمی لے جائیں گے اصل سواری وہی ہے جس پر سوار کر کے تم کو خدا کے یہاں پہنچا دیں گے تو جب جانور پر سواری لیتے وقت اسکی یاد کرنے کا حکم ہے تو مردے کو دیکھ کر تو یاد کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا۔ اس وقت بھی یاد نہ کرنا سخت قساوت ہے اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ قبر پر بیٹھے ہیں اور مقدمے کی باتوں میں مشغول ہیں۔

اسی طرح اگر مصیبت میں کسی کو گرفتار دیکھتے ہیں اُس کو اُسی شخص تک محدود سمجھتے ہیں حالانکہ سمجھنا چاہئے کہ اس پر یہ مصیبت کیوں مسلط ہوئی۔ ظاہر ہے کہ گناہوں کی وجہ سے تو ہم کو

بھی گناہوں سے بچنا چاہیئے اسی لئے حدیث میں ہے کہ جب کسی کو مبتلائے مصیبت دیکھو تو کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا۔ اس میں بھی تذکیر ہے احتمال ابتلاء کی اور اسی میں تنبیہ اجمالی ہے۔ اسباب ابتلاء کی کہ معصیت ہے اسی پر یہ شکر سکھلایا کہ احتمال تھا کہ اسی معصیت کے سبب شاید ہم بھی مبتلا نہ ہو جائیں لیکن یہ دعا آہستہ پڑھے کہ مصیبت زدہ کی دل شکنی نہ ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِاَخِیْكَ بعض دوسرے کے مصائب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن کو ڈرنا چاہیئے کیونکہ مقتضی تو ہم میں بھی موجود ہیں۔

مصیبت زدہ پر طعن

بعض لوگ وہ ہیں کہ دوسرے کی مصیبت پر افسوس تو کرتے ہیں لیکن طعن کے طور پر اس کی بابت اُسی حدیث میں ہے فَیَرْحَمُهُ اللّٰهُ وَیَبْتَلِیْكَ یعنی منسومت شاید بجائے اُس کے تم مبتلا ہو جاؤ اسی کو کہتے ہیں ؎

نخواہندہ بر در دیگراں — بشکرانہ خواہندہ از در مراں۔

یعنی اگر اور کچھ نہیں تو سائل کو اسی شکر میں دیدو کہ تم مانگنے نہیں گئے تو یہ شکر اسی احتمال پر تو ہے کہ شاید ہم ہی اپنی معاصی کے سبب اس حالت کو پہنچ جاتے۔

اس کے مناسب ایک حکایت تاریخ میں عجیب لکھی ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کے پاس بیٹھا کھا رہا تھا اُس وقت ایک فقیر مانگنے آیا اُس نے فقیر کو جھڑک دیا۔ اتفاق سے کچھ ایسا انقلاب آیا کہ یہ شخص بالکل تباہ و پریشان ہو گیا۔ حتی کہ بیوی کا نان و نفقہ جب نہ چل سکا تو اُس کو بھی طلاق دیدی اور اُس نے کسی اور دولت مند سے نکاح کر لیا۔ اتفاق سے اُس دولت مند کے دروازے پر کوئی شخص سوال کرنے آیا اُس شخص نے بیوی کو کہا کہ اُس کو بھیک دے آؤ۔ جو دروازے پر گئی تو وہاں سے روتی ہوئی لوٹی

شوہر نے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ سائل میرا پہلا شوہر ہے اور اُسی تذکرے میں وہ قصہ سائل کے جھڑک دینے کا بھی بیان کیا ـــــــ اس شوہر ثانی نے کہا کہ وہ سائل جو جھڑکا گیا تھا میں ہوں۔ خدا تعالےٰ نے مجھ کو مال بھی دیا اور اس کی بیوی بھی دیدی۔

تو خدا تعالیٰ کی بڑی قدرت ہے عبرت حاصل کرو۔ اور عبرت میں یہ بھی داخل ہے کہ جس کو کسی مصیبت میں مبتلا دیکھو ڈرو۔ بزرگوں نے ہر جگہ یہ بات یاد دلائی ہے مگر ہم بے فکر ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو اُس کے اسباب سے بری سمجھتے ہیں کہ ہم کو مثلاً طاعون کیسے آئے گا۔ ہم تو تعویذ یا فنائل رکھتے ہیں۔

صاحبو! جس وقت کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو فنائل وغیرہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کے حکم کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں ؎

اوست سلطاں ہر چہ خواہد آں کند　　　　عالمے را در دمے ویراں کند

ـــــ کیا انتہا ہے قدرت کا۔

فرماتے ہیں۔ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ـــــ کہ اے عیسائیو! بتلاؤ کہ کس کو قدرت ہے کہ وہ خدا کے مقابلے میں آسکے اگر ان سب کو ہلاک کر دیں تو دیکھئے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو بھی کس طرح تحت قدرت فرمایا ہے۔ جب یہ ہے تو فقیر درویش جن کے تعویذوں پر ناز ہے وہ تو کیا چیز ہیں۔ اسی لئے ناز کرنا بھروسہ کرنا سب بیجا ہے

البتہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ خدا کو راضی رکھو اور احکام پر عمل کرو۔ خصوص بہت جلد نمازیں شروع کر دو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نماز پڑھنے سے کوئی مرے گا نہیں مریگا تو ضرور۔ مگر اطاعت میں فائدہ یہ ہوگا کہ میں اس ایک شبہ کو دور کرنا چاہتا ہوں کہ اصلی سبب تو نزول بلا کے گنہگار لوگ ہوتے ہیں ـــــــ

جب حدیث میں یہاں تک ہے کہ ظالم کو سُرخاب تک

کوستا ہے کہ اس کے سبب قحط پڑتا ہے جس سے جانوروں کو بھی تکلیف پہونچتی ہے مگر باوجود اس کے آتی ہے مصیبت سب پر تو اس صورت میں بظاہر اطاعت بیکار معلوم ہوتی ہے۔ یہ ہے شبہ مگر جواب یہ ہے کہ اطاعت بیکار نہیں بلکہ اُس سے فائدہ یہ ہوتا ہے) کہ مطیع اُس مصیبت سے پریشان نہیں ہوگا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ کہ اگر ماں کی گود میں ہو تو اس کو کسی واقعہ سے پریشانی نہیں ہوتی خدا تعالیٰ ہمارے مربی ہیں اُن کا جس قدر قرب ہوگا اُسی قدر زیادہ اطمینان ہوگا خواہ کچھ ہی ہوا کرے جیسے ماں کے پاس بچہ اسی قرب کے حافظ عن التشویش ہونے پر ایک حکایت یاد آئی۔ افلاطون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا تھا کہ جب آسمان کمان ہے اور حوادث تیر اور خدا کمان انداز ہو تو آدمی کہاں جاکر بچے حضرت موسےٰؑ نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جاکر کھڑا ہو کہنے لگا کہ بے شک آپ نبی ہیں۔ یہ علوم حضرات انبیاء ہی کا حصہ ہے تو خدا تعالیٰ کا قرب جب ہوگا مصیبت نہیں آسکتی یعنی حقیقتِ مصیبت نہ آئے گی۔ گو صورتِ مصیبت آئے وہ باطن میں بالکل مسرور رہوگا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میری توبہ کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ ایامِ قحط میں میں نے ایک غلام کو دیکھا کہ نہایت ہی خوش ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ تو قحط اور تو ایسا خوش ہے کہنے لگا کہ میں فلاں شخص کا غلام ہوں میرا کھانا کپڑا اُس کے ذمہ ہے اور اسکے پاس ایک گاؤں ہے اُس سے آمدنی آجاتی ہے وہ اُس میں سے مجھے دونوں وقت کھانے کو دیتا ہے اسلئے میں بالکل بے فکر ہوں یہ سُنکر اس کے دل پر ایک چوٹ لگی کہ تیرے مالک کے پاس تو زمین و آسمان کے خزائن ہیں اور پھر تو اس قدر فکر مند ہے۔

برکات اطاعت

تو واقعی جب خدا سے قرب بڑھ جاتا ہے بے فکری ہو جاتی ہے۔ دیکھئے معمولی غنی کے قرب کے سبب کیسی بے پرواہی ہو جاتی ہے تو غنی حقیقی کے تعلق میں تو یہ حالت بدرجہ اولےٰ ہوتی

چاہیئے ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد زکس ۔۔۔ ہمین ست بنیاد توحید و بس

ایک بزرگ ہیں صحابی یا تابعی انہوں نے لوگوں کو دیکھا کہ بھاگ رہے ہیں پوچھا کیوں بھاگ رہے ہو۔ لوگوں نے کہا کہ طاعون سے بھاگ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا

یا طاعون خذنی الیک

آخر اُن کا انتقال طاعون میں ہو گیا جب قرب ہوتا ہے تو یہی حالت ہوتی ہے کہ دوست کی بلا کی آرزو کرنے لگتا ہے اسی کو عراقی کہتے ہیں ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی دوست کیا تھوڑے ہیں پھر بے قدر دشمن کو طاعون کیوں عنایت کیا جائے۔ یہ تو اطاعت والوں کا حال ہوتا ہے اور نافرمانی میں ہر حال میں پریشانی ہوتی ہے حیات میں بھی اور مرنے کے وقت بھی مطیعین کی ایک حکایت یاد آئی۔ تھانہ بھون ہی میں ایک طالب علم کا انتقال ہوا۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی چونکہ کئی طالب علم طاعون میں مر چکے تھے ان کا ارادہ وطن جانے کا تھا اس میں یہ مبتلائے طاعون ہو گئے دوسرے طالب علموں کو خیال ہوا کہ یہ تو گھر جانے والے تھے اب انکو سخت پریشانی ہو گی

؏ ہذہ اللاقو یا آء علی المصائب والبلواء کما ذکر فضل طلب الشہادۃ فی الحدیث ولکن لا یجوز للضعفاء ولھم ان یطلبوا عافیۃ الدنیا والاخرۃ.. والشہادۃ بالطاعون کالشہادۃ باعلاء کلمۃ اللہ راسا براس لا فرق بینھما ھذا کلہ جاء فی الحدیث کما فصلہ فی ۔

فتح الباری شرح البخاری

احمد حسن سنبھلی عفی عنہ

چنانچہ ان کی تسلی کے لیے کہا کہ تم اچھے ہو جاؤ گے کہنے لگے کہ یوں مت کہو اب تو یہ دعا کرو کہ خدا بخیریت اپنے پاس بلالیں۔ اب تو اللہ میاں سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ایمان پر خاتمہ کی تمنا ہے۔

ایک میرے دوست تھے مولوی احمد علی وہ گورکھپور میں مدرس تھے اُن کی بیوی وہاں ہی مبتلائے طاعون ہوئی یہ اسکی علاج کے واسطے قنوج اس کے میکے میں لائے وہ اچھی ہوگئی اور یہ خود مبتلائے طاعون ہو گئے ایک روز اسی حالت میں لیٹے ہوئے تھے اچانک اُٹھ کر پائنتی کی طرف بیٹھ گئے اور کسی کو خطاب کر کے سرہانے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر یہ کہا کہ چلنے کے لئے حاضر ہوں مگر وقت نہیں آیا بارہ بجے کا وعدہ ہے اس وقت چلوں گا۔ لوگوں نے ہذیان سمجھا مگر ٹھیک بارہ بجے روح نکلی۔

حضرت! واللہ یہ سب اطاعت کی برکت ہے۔ اطاعت کرنے والے کے پاس کبھی پریشانی نہیں آتی پس ایک تو اطاعت میں یہ فائدہ ہے دوسرے یہ کہ طاعون اُن کے لیے رحمت ہے اور رحمت ہی کے یہ آثار ہیں پس اطاعت کرنے والے کو گو طاعون ہی کیوں نہ ہو مگر یہ دولتیں کیا تھوڑی ہیں جن سے عاصی محروم ہے۔ غرض اطاعت سے اوّل تو بلیّات نہ آئیں گی اور اگر کسی مصلحت سے آ بھی گئیں تو پریشانی سے بچیں گے یہ جواب ہو گیا شُبہ کا۔

خلاصۂ وعظ

اب میں اصل مقصود کا خلاصہ پھر اعادہ کرتا ہوں کہ میرا یہ مطلب ہے من وعظ بغیرہٖ سے کہ دوسرے کی مصیبت دیکھ کر اس گناہ سے بچو کہ جس کی وجہ سے اس پر مصیبت آئی بس اب ختم کرتا ہوں اور خدا تعالٰی سے دعا کرتا ہوں کہ وہ عمل کی توفیق دے۔ آمین۔

تمت

چھٹا وعظ

ملقّب

بہ

الغضب

۲۵ صفر المظفر ۱۳۳۲ھ جامع مسجد تھانہ بھون
میں اڑھائی گھنٹہ تعدیل غضب کے بارے میں
یہ بیان ہُوا - دورانِ وعظ حضرت اقدس تشریف
فرما رہے ۔ سامعین کی تخمینی تعداد یک صد تھی
حضرت مولانا محمد عبد اللہ صاحب گنگوہی مرحوم نے یہ وعظ
قلم بند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ و نتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ وصلی اللہ علیہ و علی الہ و اصحابہ بارک وسلم اما بعد۔ فقد روی البخاری ان رجلاً قال للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اوصنی قال لا تغضب فردد ذٰلک مراراً قال لا تغضب ٥

تمہید یہ ایک حدیث ہے جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا خاص مضمون ہے۔ چونکہ طبع آج ذرا کسل مند ہے۔ اسلیے مختصر مضمون اختیار کیا ہے مگر انشاء اللہ نافع بہت ہے اس لیے کہ جس طرح بسیط مضمون بوجہ بسط کے نافع ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض مختصر مضمون بوجہ انضباط کے نافع۔ بلکہ بعض اوقات انفع ہوجاتا ہے اور وہ فی نفسہٖ کوئی نیا مضمون نہیں ہے۔ مگر بعض مضامین اُس کے متعلق جدید ہوں گے جس موضوع

پر آج کا بیان ہے وہ حدیث کے پڑھنے ہی سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ غضب کے متعلق ہے اور اجمال کے درجہ میں اُس کی مذمت سب جانتے ہیں۔ اور شاید اس وجہ سے بعض کا خیال ہو کر دل چسپ ہوگا۔ لیکن اس کے بعض شعب ایسے ہوں گے کہ بہت لوگ اُسکے واقف نہیں ہیں۔ میں اول اس کا ترجمہ کیے دیتا ہوں۔

فراستِ نبویؐ

حاصل یہ ہے کہ اس حدیث میں ایک قصہ ہے وہ یہ کہ ایک شخص نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ کو کچھ نصیحت کی بات فرمایئے۔ چونکہ حضورؐ حکیم ہیں اور حکیم ہر ایک کو اُسکے مرض کے موافق دارُو بتلاتا ہے بہت لوگوں نے مثل اس شخص کے حضورؐ سے ایسی درخواست کی ہے اور حضورؐ نے ہر ایک شخص کو جدا جواب دیا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کسی طبیب کے پاس چند آدمی آویں اور کہیں کہ حکیم جی ہم کو ایک مفید نسخہ لکھ دیجئے وہ طبیب ایسا حاذق اور صاحب فراستِ صحیحہ ہے کہ چہرہ کے رنگ اور اعضاء کی حرکات سے ایک نظر میں اُس نے ہر ایک کا مرض پہچان لیا وہ خوب جان گیا کہ یہ شخص اس مرض میں مُبتلا ہے اُس کو یہ روگ ہے ایسے طبیب کے سامنے مرض کے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

حقیقتِ کشف

باقی جس کی یہ شان نہ ہو اُس کے سامنے مرض بیان کرنا ضروری ہے۔ لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ بزرگوں کے یہاں جاتے ہیں اور اپنا حال کچھ بیان نہیں کرتے اُن کا اعتقاد یہ ہے کہ اہل اللہ کو کشف ہوتا ہے حضرت خود روشن ضمیر ہیں خود معلوم کرلیں گے۔

یاد رکھو! اول تو کشف ہونا ہر بزرگ کو ضروری نہیں۔ انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نبی ہیں اور بڑے صاحبِ کشف

ہیں۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر سے بھائیوں کو قمیص دیا ہے کہ اسکو باپ کی آنکھوں پہ ڈال دو اور اُدھر وہ کُرتہ لے کر چلے اور درمیان میں سینکڑوں مراحل۔ اسلئے کہ کہاں شہر کنعان یعقوب علیہ السلام کا مسکن اور کہاں مصر۔ بہت دُور دراز کی مسافت درمیان میں ہے لیکن آپ فرماتے ہیں اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝ یعنی بے شک میں یوسف کی بُو پاتا ہوں اگر تم مجھ کو بہکا ہوا نہ کہو۔ قَالُوْا تَاللّٰہِ اِنَّکَ لَفِیْ ضَلٰلِکَ الْقَدِیْمِ ۝ بیٹوں نے کہا قسم ہے خدا کی کہ آپ بے شک اپنی پُرانی غلطی میں ہیں فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ ... اَلْقٰہُ عَلٰی وَجْہِہٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی جب خوش خبری دینے والا آیا کُرتہ کو یعقوب علیہ السلام کے چہرہ پہ ڈال دیا تو وہ بینا ہو گئے اور فرمایا۔ میں نے تم کو کہا نہ تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔

اللہ اکبر! اتنا بڑا کشف۔ اور باوجود اسکے یوسف علیہ السلام نے مصر میں سالہا سال سلطنت کی اور صاحب سلطنت کے واقعات اور اس کے حالات سے دُور دُور تک واقفیت ہوتی ہے اور یوسف علیہ السلام یوسف ہی کے نام سے مصر میں مشہور تھے۔ یہ بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ نام بدل لیا ہو گا۔ چنانچہ عزیز مصر نے زلیخا کے قصہ میں یوسف علیہ السلام کو اس طرح خطاب کیا یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ ھٰذَا اور دوسری جگہ ارشاد ہے یُوْسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا۔ ان آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یوسف کے ہی نام سے مشہور تھے اور یہ بھی نہ تھا کہ آمد و رفت ایک ملک سے دوسرے ملک میں نہ ہوتی ہو برابر قافلے آتے جاتے تھے چنانچہ ارشاد ہے وَجَآءَتْ سَیَّارَۃٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَھُمْ الخ خصوص قحط کے زمانہ میں تو قوافل کی آمد و شد بہت ہی تھی۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص کنعان سے مصر میں قحط کے

زمانہ میں قافلے آتے جاتے تھے۔ چنانچہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر غلہ لینے کے لیے پہنچے اور چوری کے قصہ میں وہاں ایک بھائی روک لئے گئے تو بقیہ بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام سے آکر عرض کیا۔ واسئل القریۃ التی کُنَّا فیھا والعیر التی اقبلنا فیھا وانا لصدقون۔ یعنی آپ پوچھ لیجئے اُن بستی والوں سے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں اور بے شک ہم سچے ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کنعان سے مصر کو برابر آمدورفت تھی۔ پس جس حالت میں کہ اس قدر ذرائع علم کے یعقوب علیہ السلام کے پاس موجود تھے اس پر بھی یعقوب علیہ السلام کو پتہ نہ لگا اور یہی فرمایا۔ یَا بَنِیَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ یُوسُفَ وَاَخِیْهِ وَلَا تَایْئَسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ تبلایئے وہ کشف کہاں گیا۔ اس قدرت کا نام خدائی ہے۔

غیبی راہنمائی

اور اس مقام پر ایک اور کام کی بات سمجھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ بُرا ارادہ کیا تو اُس قصہ میں حق تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ یعنی بے شک زلیخا نے ارادہ کرلیا یوسفؑ کے ساتھ اور یوسفؑ بھی ارادہ کر لیتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے برھان ربہٖ کی تفسیر میں مفسرین اور اہل سیر نے لکھا ہے رَاٰی صُوْرَةَ یَعْقُوْبَ علیہ السّلام یعنی یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کا چہرہ نظر آیا۔ اور شرما گئے۔

تو اس قصہ سے ایک مسئلہ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دشواری کے وقت بعض لوگ جو اپنے شیخ کی صورت دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے

اس وقت ہماری دستگیری کی اور اُن کو ہماری اس مصیبت کا علم ہوگیا یہ اعتقاد صحیح نہیں بسا شیخ کو خبر تک بھی نہیں ہوتی۔ جیسے اس قصہ میں یعقوب علیہ السلام کو اطلاع تک نہ ہوئی۔ ورنہ اس قدر پریشان نہ ہوتے۔ بلکہ اس شخص کی تسلی اور رہبری کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتہ کو کسی ایسے مقبول بندہ کی صورت میں متمثل کر کے دکھاتے ہیں جس کے ساتھ اس شخص کو اُنس اور اعتقاد ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک مشکل میں مُبتلا تھا۔ سر کی طرف سے حضرت حاجی صاحبؒ کی آواز آئی کہ اس کام اس طرح کر لو اس کے بعد فرمانے لگے کہ میں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ آواز حضرت حاجی صاحبؒ کی نہیں ہے حضرت کو تو خبر بھی نہیں۔ ایسے ہی یوسف علیہ السلام کو خود یعقوب علیہ السلام نظر نہیں آئے۔ ورنہ اگر یعقوبؑ ہوتے تو پھر اُن کی بے خبری اور پریشانی کے کیا معنی۔ حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کیا کہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا اور راستہ بھول گیا۔ آپ نے مجھ کو رہبری فرمائی سید صاحب نے قسم کھا کر فرمایا کہ میں نہیں تھا۔ مجھ کو تو خبر بھی نہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ میری صورت میں کسی کو بھیجکر تم کو راہ دکھلا دیا ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں   مصلحت را تہمتے برآہوئے چین بستہ اند

کام کوئی کرتا ہے نام کسی کا ہو جاتا ہے اگر آجکل کے کوئی دکاندار پیر ہوتے تو سُنکر اور زیادہ خوش ہوتے اور پھُولے نہ سماتے اور اس قصہ کو اپنی کرامت شمار کرتے اور سچے پیروں کے ہاں یہ حالت ہے کہ جو سچی اور واقعی کرامتیں اور تصرفات ہیں اُن کی طرف بھی التفات نہیں فرماتے۔ بلکہ روک دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحبؒ کے یہاں مہمان بہت سے آگئے کھانا کم تھا حضرت نے اپنا رومال بھیجدیا کہ کھانے پر اس کو ڈھانک دو۔ کھانے میں ایسی

برکت ہوئی کہ سب نے کھالیا۔ اور کھانا بچ رہا۔

حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خبر ہوئی تو حضرت سے آکر عرض کیا کہ حضرت آپ کا رومال سلامت چاہیئے اب تو قحط کیوں پڑے گا۔ حضرت شرمندہ ہو گئے اور فرمایا کہ واقعی خطا ہوئی۔ توبہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہوگا۔ حقیقت میں اس قسم کے تصرفات کمالِ عبدیت کے ضرور من وجہ خلاف ہیں اسلئے کہ تصرف میں توجہ الی الغیر کرنا ہوتا ہے اور نیز من وجہ اپنے اوپر بھی نظر ہوتی ہے ــــ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالےٰ کسی کے ہاتھ پر کوئی کرامت بلا اُس کے اختیار اور توجہ کے پیدا فرمادیں۔ لیکن یہ حضرات پھر بھی اس کو مقصود نہیں جانتے بلکہ کرامت میں تو یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ مَن لَہُ الکرامت کو اطلاع ہو۔

چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ کا ایک اور قصہ اسی قبیل کا یاد آیا کہ ایک بڈھی تھا نقاع اُس کا نام تھا حضرت کے محبین میں سے تھا۔ لڑائی میں اُس کی ران میں گولی لگ گئی رات کو اُسنے دیکھا کہ حضرت حاجی صاحبؒ تشریف لائے اور ران میں سے گولی نکال دی۔ صبح کو دیکھا تو واقعی گولی نکلی ہوئی تھی۔ حضرت سے اُسنے سارا قصہ حاضر ہو کر کہا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نہ تھا اور قسم کھا کر فرمایا کہ مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہے اگر کوئی اور ہوتا تو سنکر کبھی انکار نہ کرتا بہت خوش ہوتا کہ اچھا ہے کہ ایک معتقد اور بڑھا۔ اور حضرت معتقدین سے گھبرایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی واقعہ میں یہ فرمایا تھا کہ واللہ تمہارے معتقد ہونے نے مجھ کو پریشان کردیا۔

جو لوگ سچے ہیں اُن کی یہی شان ہوتی ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ کوئی ہمارا معتقد ہو۔ اور بعض امور بطور کرامت حضرت کے یہاں ایسے بھی ہوئے ہیں کہ حضرت کو اطلاع ہوئی ہے لیکن اُن کو ٹال دیا ــــ بہرحال یعقوب علیہ السلام کے قصے سے ثابت ہوگیا کہ کشف ضروری نہیں ہے اور دیکھئے یوسف علیہ السلام کنعان کے کنوئیں

میں رہے لیکن یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی۔ جب بیٹوں نے کہا اکلہ الذئب تو اجمالاً یہ معلوم ہوا کہ یہ جھوٹے ہیں بھیڑیے نے نہیں کھایا۔ لیکن مفصلاً یہ معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں۔ چنانچہ فرمایا قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ۔ بس جب انبیاء کو اطلاع ہونا ہر امر کی ضروری نہیں تو پیروں پہ بھروسہ کرنا کہ ان کو ہمارے حال کی اطلاع ہے۔ نہایت جہل اور شائبہ شرک کا ہے۔

اظہارِ طلب

بعضے جہلاء ایسے ملے ہیں کہ جب اُن سے پوچھا گیا کہ کیسے آئے کیا کام ہے تو فرماتے ہیں کہ حضرت آپ کو سب خبر ہے میں نے کہا کہ جب سب خبر تھی تو آپ کو یہاں تکلیف فرمانے کی کیا ضرورت تھی وہیں بیٹھے بیٹھے تار بھیج دیا ہوتا۔ نہایت جہل کی بات ہے اوّل تو خبر نہیں اور اگر خبر ہو بھی تو ہر وقت ہونا ضروری نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو اُن کو تو اطلاع ہر حال میں کرنا چاہیئے۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ کو سب کچھ خبر ہے لیکن پھر یہ حکم فرمایا ہے کہ مانگو۔ حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ بعض لوگ میرے پاس آتے ہیں اور کہتے کچھ نہیں اور دل میں یہ لے کر بیٹھتے ہیں کہ اگر یہ بزرگ ہوں گے خود ہی معلوم کرلیں گے۔ میاں میں نے دعوے کب کیا ہے بزرگی کا۔ کیرانہ کے ایک حافظ صاحب تھے حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں آئے اور دل میں یہ سوچنے لگے کہ معلوم نہیں کہ حافظ ضامن صاحبؒ کا مرتبہ بڑا ہے یا حاجی صاحبؒ کا۔ حضرت نے فرمایا یہ بے ادبی ہے ایسے امور میں پڑنا اور یہ پڑھا

پیشِ اہل دل نگہدار بد دل تا نباشید از گماں بد خجل

بہرحال طلب اور عرضِ حال ضروری ہے۔ پھر اگر وہ حضرات اجمال کو کافی سمجھیں تو اسی پر اکتفا کرو۔ اور اگر تفصیل چاہیں تو تفصیل سے بیان کرو۔ اپنی رائے کو

مطلقاً دخل نہ دو۔ اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ ہر بات میں اپنی رائے ضرور شامل کر دیتے ہیں۔ ایسے امور میں اگر رائے زنی کریں جس میں اُن کو دخل ہے تو مضائقہ نہیں ہے۔ اور جس بات میں بالکل دخل نہ ہو اور گئے ہوں۔ دوسرے کے پاس اس کو واقف سمجھ کر اور مدعی اعتقاد بن کر وہاں تو رائے زنی سے خاموش رہنا چاہیئے لیکن بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو اعتقاد ہی نہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ اپنے نفس کے ہی معتقد ہیں۔ اُن کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کسی گرُو کے پاس گیا تھا کہ گرُو جی مجھ کو چیلہ بنالو۔ کہا بھائی چیلہ ہونا بہت مشکل ہے تو آپ کیا کہتے ہیں کہ چیلہ نہیں بناتے تو گرُو ہی بنالو۔ اُن کا پیر وہ ہے جو اُن کا تابع ہو۔ مرید بننے نہیں جاتے بلکہ پیر بن کر جاتے ہیں۔

حکمتِ دُعا

دیکھو! اللہ تعالےٰ سے زیادہ کوئی جاننے والا نہیں ہے لیکن باوجود اس کے ارشاد ہے من لم یسئل اللہ یغضب علیہ یعنی جو کوئی اللہ تعالےٰ سے نہ مانگے اللہ تعالیٰ اُس پر غصہ ہوتے ہیں اور اس مانگنے میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ اسکو ایک مثال سے سمجھو۔ عید کے روز بچوں کو انعام دیا کرتے ہیں اور بچے ناز سے لڑ جھگڑ کر رو دھو کر مانگتے ہیں۔ ماں باپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم اُن کو دیں گے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اُن کو ضرورت ہے لیکن پھر بھی مانگنے پر دیتے ہیں۔ اور للچا للچا کر اُن کو دیتے ہیں اسلیئے کہ بچوں کا اس طرح مانگنا اور لگا لپٹنا اُن کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پس جب ادنیٰ تعلق میں یہ بات ہے تو خدا تعالےٰ کو تو اپنے بندوں کے ساتھ ماں باپ سے بدرجہا زیادہ محبت ہے اسلیئے اُن کو اپنے بندوں کا مانگنا اور گڑگڑانا اور رونا پسند آتا ہے۔ بلکہ جن بندوں کے ساتھ زیادہ محبت ہے ان کو بعض اوقات اُن کا مطلوب دیر میں دیتے ہیں اور جن کے ساتھ تعلق نہیں ہے اُن کو جلدی دیدیتے ہیں تاکہ جلدی دفع ہوجائیں۔

جیسے کوئی سائل تمہارے دروازہ پر آتا ہے اور اسکی آواز یا صورت تم کو اچھی معلوم ہوئی تو اسکو دینے میں توقف کرتے ہو کہ اچھا ہے تھوڑی دیر اس کی آواز سُنیں یا اُس کو دیکھیں اگر اُسکی کراہت ہو تو جلدی سے دیدیتے ہیں کہ جلدی ٹل جائے جن کو یہ راز معلوم ہوگیا ہے وہ خود چاہنے لگے ہیں کہ ہم کو دیر میں ملے تو اچھا ہے موسٰی علیہ السلام سے جب سوال ہوا وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ یعنی کیا ہے تیرے داہنے ہاتھ میں اے موسٰے ۔ تو اُس کا جواب تو اس قدر تھا عَصَايَ ۔ یعنی میری لاٹھی ہے ۔ لیکن موسٰے علیہ السلام نے اس پر اقتصار نہیں فرمایا بلکہ اُس پر ایک طویل مضمون بڑھایا ۔ چنانچہ فرمایا هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي یعنی یہ میری لاٹھی ہے میں اس پر سہارا کر لیتا ہوں اور اپنی بکریوں پر اسکے پتے جھاڑتا ہوں اور چاہتے تھے کہ کچھ فوائد اس کے مفصلاً بیان کریں لیکن کچھ ہیبت اور کچھ فرط ونشاط کے سبب اور کچھ جب یاد نہ آیا تو یہ فرمایا وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ یعنی میرے لیے اس میں اور بھی مقاصد ہیں اور اس میں گنجائش اس کی رکھی ہے کہ کسی اور وقت پر عرض کرسکوں کہ وہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ اُس میں اور بھی فوائد ہیں وہ فوائد یہ ہیں ۔

دیکھئے ! اللہ تعالیٰ کو ان سب اور کی خبر تھی ۔ اور نیز سوال بھی صرف یہی تھا کہ کیا شے ہے اُسکی فوائد سے سوال نہ تھا لیکن کلام کو اسلئے طول دیدیا کہ پھر ایسا وقت کہاں ملے گا کہ اللہ میاں سے باتیں کرنا نصیب ہوں اچھا ہے جتنا وقت بھی میسر ہو تو جو اہل دل ہیں اُن کی غرض تو دعا سے اپنے مولٰے حقیقی سے مناجات ہوتی ہے اسلئے وہ دیر میں ملنے سے اُکتاتے تو کیا اور خوش ہوتے ہیں ؎

از دعا نبود مرادِ عاشقاں   جز سخن گفتن باں شیریں دہاں

حقیقت میں محبت ایسی شے ہے کہ اُسکی احکام اور آثار عقل جزوی کے احکام سے بالکل جُدا ہیں ـــــ یہی محبت تو وہ شے ہے جس کے ساتھ نوع انسان کی خصوصیت ہے اور یہی محبّت تو سبب حمل امانت ہے جس کی نسبت ارشاد ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ یعنی بے شک ہم نے پیش کیا امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر سب نے اُسکے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے اُس سے اور اُٹھا لیا کہ اُسکو انسان نے اس کی وجہ عارف شیرازی[1] نے ایک شعر کے اندر ایک لفظ سے بیان کی ہے کہتے ہیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید ـــــ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

لفظ دیوانہ سے اس امانت کے برداشت کرنیکی لِم کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان میں محبت اور عشق کا مادہ رکھا ہے اور سوائے اُس کے اور مخلوقات میں یہ مادہ اس درجہ کا نہیں ہے۔ یہ امر دوسرا ہے کہ ہر شے کو اپنے خالق کے ساتھ تعلق ہے لیکن وہ تعلق دوسری قسم کا ہے پس چونکہ زمین و آسمان و جبال میں ایسا مادہ محبت کا نہ تھا۔ اس لیے جب اُن پر امانت الٰہی پیش کی گئی تو بوجہ عدم محبت کے اس خطاب میں ان کو لذت نہ آئی اور اپنی نا اہلیت کا اظہار کیا۔ اور حضرت انسان میں چونکہ دیوانگی اور عشق رکھا تھا اس لیے

---

[1] ظاہر بیں اور جدید الخیال حضرات یہ خیال نہ فرمائیں کہ یہ کلام محض مجاز اور دہول ہے اگر عقلی اور اصطلاحی پیرایہ میں ایک بحث کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو حجۃ اللہ البالغہ میں اس بحث کو دیکھ لیں ۱۲

اس نے آگے بڑھ کر فوراً عرض کیا کہ حضرت اس ہار کو میں لیتا ہوں مجھے دیدیجیے یہ سمجھا کہ اور کچھ نہیں تو اس بہانہ سے بات ہی کرنے کا موقع ملا کریگا۔ بقول کسی شاعر کے ؎

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

بہرحال جب حق تعالےٰ کے ساتھ محبت ہے تو دیر میں ملنے سے پریشان نہ ہونا چاہیئے بلکہ خوش ہو کہ اچھا ہے اس بہانہ ہی اُس سے باتیں کرنا نصیب ہو جاتا ہے جیسے ایک طبیب پر کوئی عاشق ہو گیا تھا اور علاج اُسی طبیب کا تھا تو وہ مریض دعا کیا کرتا رہا کہ اے اللہ! میں بیمار رہوں تاکہ حکیم صاحب میرے پاس آتے رہیں اور حکیم صاحب کوشش کرتے رہتے کہ اچھا ہو جائے۔

پس دیکھیئے اپنی بیماری کو چاہنا صریح خلاف عقل ہے تو جب محبت مجازی میں خلاف عقل امور پیش آجاتے ہیں تو محبت حقیقی کی دیوانگی تو شئے ہی دوسری ہے شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودی ز آب و گل — رباید ہمی صبر و آرام دل
بصد قش چناں سر نہی بر قدم — کہ بینی جہاں با وجودش عدم
چو عشقے کہ بنیاد او بر ہواست — چنیں فتنہ انگیز و فرماں رواست
عجب داری از سالکان طریق — کہ باشند در بحر معنی غریق

؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود — گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

مجنوں کی یہ حالت تھی کہ بیت اللہ شریف کو لے گئے اور کہا کہ اے مجنوں بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر دعا کر اَللّٰھُمَّ اَزِلْ عَنِّیْ حُبَّ لَیْلٰی یعنی اے اللہ! مجھ سے لیلیٰ کی محبت زائل کر دے تو مجنوں اس وقت کہتا ہے اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ حُبَّ لَیْلٰی اور یہ کہتا ہے

اِلٰهِیْ تُبْتُ مِنْ کُلِّ الْمَعَاصِیْ وَلٰکِنْ حُبُّ لَیْلٰی لَا اَتُوْبُ

یعنی اے اللہ! میں تمام معاصی سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا ہوں جب کہ مجنوں کی ایک مخلوق کی محبت میں یہ حالت تھی تو حق تعالیٰ کی محبت میں اگر کسی کی یہ حالت ہو جائے تو کیا تعجب ہے۔

الحاصل: محبت کا خاصہ ہے کہ مسئول میں دیر ہونے سے بھی نہیں گھبراتا اور خصوص جب کہ واقع میں بھی اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں، اور یہ بات نہیں ہے کہ اُن کے دینے میں (معاذ اللہ) کمی ہے وہ تو ایسے دینے والے ہیں کہ اگر تم نہ مانگو جب بھی دیتے ہیں بلکہ اگر پانچوں نمازوں کے بعد یہ دعا کرو کہ اے اللہ ہم کو روٹی نہ دے یا اے اللہ! روٹی جو ہم نے کھائی ہے ہضم نہ ہو۔ تو اس پر دیں گے اور واللہ! ہرگز روٹی اسکی منقطع نہ ہو گی۔ جب روکنے کی دعا پر بھی دینے سے نہیں رُکتے تو مانگنے پر تو کیوں نہ دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی عطا مانگنے پر موقوف نہیں۔ اور مانگنے کا مقصود اعطاء نہیں ہے عطا تو ہر حال ہے مانگنا اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ بندہ کا افتقار اور انکسار اور عجز کا اظہار ہو۔ ایک بزرگ کو کسی نے دیکھا کہ رو رہے ہیں پوچھا گیا کہ آپ کیوں روتے ہیں فرمایا بھوک لگ رہی ہے لوگوں نے کہا کہ بچے رویا کرتے ہیں فرمایا تم تو دیوانہ ہو۔ خدا تعالیٰ کے سامنے ہم سب بچوں سے بھی کم ہیں جب وہ خود ہم کو رُلا دیں تو ہم کیوں نہ روویں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

جب وہ خود ہی درخواست کریں کہ رؤو تو پھر صبر کیسا! بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اللہ تعالیٰ کے شیون کے نگراں رہتے ہیں۔ جس طرح اور جس طرف رضا پاتے ہیں اسی طرف ہو لیتے ہیں۔ —— حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیمار

ہوئے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے فرمایا طبیعت اچھی نہیں اُس شخص نے کہا کہ آپ بیماری کو ظاہر کرتے ہیں فرمایا کہ کیا میں اپنے اللہ کے سامنے پہلوانی ظاہر کروں۔

دیکھئے بظاہر تو اپنی اس قسم کے حالت ظاہر کرنا صبر اور استقلال کے خلاف ہے لیکن چونکہ مقصود اپنا عجز اور انکسار ظاہر کرنا ہے اس لیے محمود ہے۔

کاملین کی پہچان

اسی واسطے کاملین کے حالات عوام بلکہ مبتدیان اور متوسطان سلوک بھی نہیں سمجھ سکتے۔ آجکل تو کامل اسکو سمجھتے ہیں کہ جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو اور بیمار ہو تو دوا نہ کرتا ہو ـــــ حضرت جنیدؒ سے کسی نے پوچھا تھا ما النہایۃ قال العود الی البدایۃ یعنی نہایت سلوک کیا ہے؟ فرمایا کہ نہایت یہ ہے کہ سالک بدایۃ کی طرف رجوع کرے یعنی اُس کے حالات اور عوام مومنین کی حالت میں کوئی فرق نہ رہے۔

پس جس کی یہ حالت ہو اور عوام سے اس کو اور کوئی امتیاز نہ رہے تو بھلا اس کو کون پہچان سکتا ہے۔ اسی واسطے انبیاء کی حالت عوام کے ساتھ ایسی مخلوط ہوتی ہے کہ کوئی اُن کو پہچان نہیں سکتا۔ اسی واسطے بزرگوں نے کہا ہے کہ ولی کا پہچاننا آسان ہے اور نبی کی معرفت مشکل ہے۔ اسی واسطے تو کفار نے کہا تھا کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ط یعنی یہ رسول کیسا ہے کہ جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

بعضے اولیاء اللہ ایسے ہوئے ہیں کہ برسوں ایک دانہ نہیں چکھا عوام ایسے ہی لوگوں کو کامل سمجھتے ہیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کون ہوگا آپ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازار بھی تشریف لے جاتے تھے۔ اور گھر کا کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے۔ اور بعض اولیاء اللہ کی یہ حالت ہوئی ہے کہ جہاں پانچوں وقت جانا ضروری ہے یعنی مسجد میں وہاں کی بھی اُن کو خبر نہیں تھی ـــــ حضرت شیخ احمد

عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حالت تھی کہ غلبۂ استغراق کی وجہ سے یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ راستہ کس طرف کو ہے ایک خادم آگے حق حق کہتا چلتا تھا اس کی آواز پر آپ مسجد کو تشریف لیجایا کرتے تھے ـــــ اور راز اس میں یہ ہے کہ انبیاء کا ظرف نہایت وسیع ہوتا ہے ایک ہی وقت میں اُن کو توجہ الی الخلق توجہ الی الخالق سے مانع نہیں ہوتی تھی۔ ایک حالت میں ان کو علیٰ وجہ الکمال.. دونوں طرف نظر ہوتی تھی اور جس کو انبیاء کے ساتھ جس قدر تشابہ ہوگا اُسی قدر وہ کامل ہوگا اور چونکہ یہ حالت عوام کی حالت کے ساتھ بظاہر ملی جلی ہوتی ہے۔

ولایت و تصرف کا فرق

اسی واسطے عام لوگ محققین کو درویش نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کو اتنا کہتے ہیں کہ صالح اور متقی ہیں باقی درویشی تو چیز ہی دوسری ہے درویشی اس کو کہتے ہیں کہ ہو حق بہت کرے اور کسی کو ایک نظر میں گرادے کسی کو پچھاڑ دے کسی پر چھو کر دیا اچھا ہو گیا۔ حالاں کہ گرا دینا اور پچھاڑ دینا تو پہلوان بھی کر سکتا ہے۔ درویشی اور بزرگی میں اس کو کیا دخل ہے۔ یہ تصرف کہلاتا ہے اور تصرفات واللہ! کمال نہیں ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ خدا کا بندہ بن جائے ولایت شعبہ نبوۃ کا ہے پس ولی جتنا نبی کے مشابہ ہوگا اتنا ہی زیادہ کامل ہوگا۔

نبوت کی مثال ایسی ہے جیسے حوض ہو اور ولایت جیسے نل تو اگر نل میں اُسی رنگ کا پانی ہے جیسے کہ حوض میں خالص ہے تو وہ پانی عمدہ ہے اور اگر نل میں آکر نل کے رنگ سے اس کا رنگ بدل گیا تو ظاہر نظر میں وہ پانی اگرچہ حسین معلوم ہو مثلاً نل میں سرخ مصالحہ تھا اور وہ پانی سرخ ہو کر زیادہ خوشنما معلوم ہونے لگا لیکن خلوص اور پانی کا کمال اس میں نہیں رہا۔ اسی طرح متوسطین سلوک کے اندر جو

تصرفات اور حالات عجیب غریب مشاہدہ کئے جاتے ہیں یہ خالص رنگ نبوت نہیں ہیں۔ ہاں محمود ہونے میں ان کے شبہ نہیں۔ لیکن کمال مقصود نہیں ہیں جیسے اُن پانی مل کے لون سے متلون ہوگیا تھا ـــــ اسی طرح یہاں بھی یہ حالات اُن کی کیفیات نفسانیہ کی آمیزش سے ظاہر ہوتے ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ بعینہ یہی حالات ان جوگیوں کو بھی پیش آجاتے ہیں جو غیر مسلم ہیں اور کچھ ریاضت وغیرہ .. کرتے ہیں اور جس روز ان متوسلین کو تمکین میسر ہوتی ہے اس وقت ان حالات سے بالکل خالی اور کورے ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اولیاء کاملین اکثر مخفی ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض مرتبہ خود ان کو بھی اپنا حال معلوم نہیں ہوتا۔ حدیث الہامی میں ہے اولیائے تحت قبائی لایعرفہم سوائی ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزیست ۔۔۔ کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

علاماتِ ولایت

ہاں جو لوگ مبصر ہیں وہ علامات سے پہچانتے ہیں اور علامت ولایت کی دو ہیں اوّل اتباع شریعت کا کامل طور سے رکھتا ہو اور اتباع شریعت میں کمال یہ ہے کہ شریعت اُس کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو۔ جیسے خلاف طبیعت کرنے سے اس کو تکلیف اور اَلم ہوتا ہے اُسی طرح شریعت کے خلاف کرنے سے ہوتا ہو۔ دوسرے یہ کہ اُس کے پاس بیٹھنے سے دل حق تعالیٰ کی طرف منجذب ہوتا ہو۔

حدیث میں بھی یہ علامت آئی ہے چنانچہ ارشاد ہے واذا رأوا ذکر اللہ یعنی جب وہ دیکھے جاویں تو اللہ تعالیٰ یاد آوے۔ پس یہ دو علامتیں جس کے اندر ہوں وہ شخص کامل اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا جانشین ہے اور اگر یہ نہیں ہیں تو چاہے ہوا پر اُڑے یا پانی پر چلے کوئی چیز نہیں ہے خواجہ عبداللہ انصاری کا مقولہ ہے "بر ہوا پری مگسے باشی ۔ برآب روی خسے باشی دل

بدست آر اگر کسے باشی ۔ بڑی شے دل ہے اس کو قابو میں کرنا چاہیئے اور دل سے مراد اپنا دل ہے دوسرے کا دل نہیں ہے اور یہی توجیہ ان اشعار میں بھی محتمل ہے ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر ست — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

کعبہ بنگاہِ خلیلِ آذر ست — دل گذر گاہِ جلیلِ اکبر ست

ہوا پر اُڑے تو کیا ہوا بس کبوتر بن گئے اور اگر پانی پر چلے تو تنکا ہو گئے بڑی شے آدمی بننا ہے سب چیز آسان ہے آدمی بننا مشکل ہے ؎

زاہد شدی و شیخ شدی و دانشمند — ایں جملہ شدی ولیکن انساں نہ شدی

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد سے نکل رہے تھے اور ایک خلقت نکل نکل جا رہی تھی فرمایا الحمد للہ ! یہ سب جنت کی بھرتی ہے لیکن آدمی ان میں ایک ہی دو ہے کبوتر ہونے پر یاد آیا کہ آجکل لوگوں کو جانوروں کی مشابہت بہت پسند آنے لگی ۔ کوئی اپنا لقب طوطیٔ ہند رکھتا ہے کوئی بلبلِ ہند لینے کو لکھتا ہے اگر یہی ترقی ہے تو شاید تھوڑے دنوں میں خچرِ ہند اور خرِ ہند بنیں گے یا زاغِ ہند بن جاویں گے ۔ اس واسطے کہ کوا بہت زور سے بولتا ہے ۔ صاحبو! لقب کیا چیز ہے کوئی چیز نہیں کام کرنا چاہیئے ۔ بڑی چیز کام ہے ؎

کار کن کار بگذار از گفتار — کاندریں راہ کار دارد کار

بڑی شے یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی اطاعت پوری پوری ہو بہر حال اہل کمال کی یہ علامتیں ہیں اور چونکہ یہ دونوں علامتیں نہایت لطیف ہیں اسلئے عوام الناس اہل کمال کو پہچان نہیں سکتے ۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گفتہ اینک ما بشر ایشاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

ایں ندانستند ایشاں از عمے | درمیاں فرقے بود بے منتہا

آجکل بعض درویشوں کی مدح کی جاتی ہے کہ انہوں نے غلہ کھانا چھوڑ دیا ہے شاباش! وہ روٹی کھاتے اور جو کام کرنے کا ہے وہ کرتے۔ صاحبو! روٹی کھانا پانی پینا چھوڑ دینا کمال نہیں ہے اور نہ تسبیح پھرانا کوئی کمال مقصود ہے بڑی شئے تو عبدیت اور افتقار ہے کہ جس سے نفس کے گلے پر چھری چلتی ہے اور اُن چیزوں سے تو نفس اور پھولتا ہے اسلئے کہ اس میں ایک امتیاز کی شان ہے۔

غرض دعا افتقار اور عبدیت کے اظہار کے لیے ہے پس جب اللہ تعالیٰ باوجود عالم الغیب ہونے کے طلب کو دیکھتے ہیں تو پیر تو کیوں طلب کو نہ دیکھے گا۔ اس لیے بزرگوں کے یہاں جاکر صم بکم بن جانا اور ان کے کشف کے بھروسہ پر اپنا مافی الضمیر بیان نہ کرنا سخت غلطی ہے۔

خودسپردگی

اور بعضے کچھ کہتے ہیں تو وہ اپنی رائے اس میں شامل کر دیتے ہیں مثلاً بعضے درخواست کیا کرتے ہیں کہ حضرت ہم کو پاس انفاس بتلا دیجئے ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مریض کسی طبیب سے کہے کہ مجھ کو گل بنفشہ بتلا دیجئے خواہ گل بنفشہ اُن کو مضر ہی ہو۔ سو وہ طبیب غصہ ہو کر کہے گا کہ جناب آپ خود ہی اپنے لیے نسخہ تجویز کر سکتے تھے تو آپنے یہاں آنے کی کیوں تکلیف فرمائی۔

یاد رکھو! جب کسی کے پاس جاؤ اپنے کو اس کے سپرد کر کے اپنی رائے فنا کر دو جو کچھ وہ حکم کرے اس کے موافق کرو مُردہ بدست زندہ بن جاؤ۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو | ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو
صبر کن در کار خضرؔ اے بے نفاق | تا نگوید خضر رو ھذا فراق

ہاں اپنا حال ضرور عرض کر دو اس کے بعد جو کچھ وہ حکم دیں وہ کرو اور جہاں معلوم ہو کہ ان کو ہمارے حال کی اطلاع ہے یا کوئی فائدہ کلیہ حاصل کرنا ہے تو وہاں چاہیے

حال بھی نہ کہو۔ جیسے ان صحابی نے کیا کہ آکر یہ عرض کیا اَوْصِنِیْ اور تعین نہیں کی کہ فلاں بات بتلا دیجئے اور اپنا حال اسلئے نہیں کہا کہ یا تو جانتے تھے کہ ہمارا حال حضورؐ کو معلوم ہے یا ایک وصیت کلیہ کے طالب تھے ورنہ ضرور عرض کرتے چنانچہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا ہے کہ یا رسول اللہ مجھ کو وسوسے آتے ہیں وہاں قرائن سے ان کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر ذکر کئے حضورؐ کو اطلاع نہ ہوگی۔ اور جو اکثر آمد و رفت رکھتے ہیں اور ملتے جلتے ہیں ان کی حالت اکثر معلوم رہتی ہے۔ اسلیے حضور کو معلوم ہو گیا تھا کہ اُن کے اندر غصہ کا مرض ہے اس لیے فرمایا لَا تَغْضَبْ یعنی تم غصہ نہ کیا کرو۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اور کچھ فرمائیے اس کے جواب میں بھی آپنے یہی فرمایا تین مرتبہ اسی طرح سوال و جواب ہوا اور تکرار اسی کو اس لیے فرمایا کہ ان کو یہ جتلانا منظور تھا کہ زیادہ مہتم بالشان اور قابلِ فکر تمہارے اندر یہی مرض ہے۔ اسلیے چند بار فرمانے سے تاکید زیادہ ہوگئی۔

اطاعتِ صحابہ

تکرار جواب کی یہ وجہ تو وہ ہے جو شُرّاحِ حدیث نے بیان فرمائی ہے یعنی تاکید مگر میری سمجھ میں اسکی وجہ اور آتی ہے اور تاکید پر محمول کرنا اسلیے مرجوح معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضور کے اس قدر جاں نثار تھے کہ اشاروں پر جان دیتے تھے وہاں اسکی ضرورت کب تھی کہ کسی بات کو دوبار کہا جائے ——— احادیث سے سیکڑوں واقعات ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ جن سے صحابہ کی بے حد اطاعت اور محبت حضورؐ کے ساتھ مترشح ہوتی ہے۔ عام حدیبیہ میں جب حضورؐ مکہ معظمہ تشریف لائے اور کفار نے بیت اللہ شریف سے آپ کو روک دیا۔ اور کفار نے بڑے بڑے عقلاء اور رؤساء کو صلح کے لیے بھیجا۔ جب وہ لوگ واپس ہو کر مکہ معظمہ آئے تو اُن میں سے بعض نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ ان سے مت لڑو۔ ہم نے بڑے

بڑے ملوک کی مجلس دیکھی ہے ایسی محبت اور ادب کسی بادشاہ کے خدم حشم میں نہیں دیکھا جس قدر کہ اصحاب محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں دیکھا لا یحدون النظر الیہ یعنی نظر بھر آپ کی طرف نہیں دیکھتے دُزدیدہ نظر سے دیکھتے ہیں کسی شخص نے کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے حضور کا حلیہ شریف پوچھا انہوں نے فرمایا کہ میاں بیان تو وہ کرے جس نے حضور کو نظر بھر کر دیکھا ہو اور یہاں تو یہ کیفیت رہی کہ ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

بعض خشک مغز اہل ظاہر اس شعر کو مجنوں غیر عاقل کا کلام جانتے ہوں گے لیکن ہم ان کو جواب دیتے ہیں کہ تم کو اس کا ذوق نہیں ہے جو شخص عنین ہو وہ کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہے ع

تو مشو منکر کہ حق بس قادر ست

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شعر کے مضمون کو کر کے دکھلا دیا۔ الحاصل وہ رئیس مکہ کے لوگوں کو کہتا ہے کہ اصحاب محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی یہ حالت ہے کہ ذرا ان کے منہ سے کوئی بات نکلتی ہے تو اس کی بجا آوری کے لیے چاروں طرف سے سب دوڑ پڑتے ہیں اور جس وقت وہ تھوکتے ہیں تو آب دہن زمین پر نہیں گرتا سب ہاتھوں میں لے کر منہ کو اور آنکھوں کو مل لیتے ہیں اور اگر کسی کو نہیں ملتا تو وہ ان لینے والوں کے ہاتھوں کو مس کر کے ایسا ہی کرتے ہیں پس سے اُن کی وہ حالت ہے ؎

مرا از زلف تو بوئے پسند است ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست

اور وہ رئیس کہتا ہے کہ جب آپ وضو کرتے ہیں تو جو پانی اعضاء وضو سے چھوٹتا ہے اس پر اس قدر لڑائی ہوتی ہے کہ قریب ہے کہ آپس میں تلوار چلنے لگے سبحان اللہ! یہ کیا اچھی لڑائی ہے ایسی لڑائی جنت میں بھی ہوگی۔ ارشاد ہے

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ۔ اگر جنت میں یہ لڑائی نہ ہوتی تو وہاں کچھ مزہ نہ تھا اس کو اہل محبت سمجھ سکتے ہیں۔ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا یہ کیفیت تھی صحابہ کی محبت کی۔

ادب و تکلّف کا فرق

لیکن محبت تھی متکلّف نہ تھا چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن پھر چھوڑ دیا لما کنا نعرف من کراھۃ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی قیام اس وجہ سے ترک کر دیا کہ ہم نے جانا کہ آپ کو یہ ناگوار ہے آجکل لوگوں میں تکلّف بہت آگیا ہے اور اس کا نام ادب رکھا ہے صحابہؓ سے زیادہ کون ادب والا ہوگا۔ مگر یہ تکلّفات ان میں نہ تھے اور لطف بھی اسی میں ہے بلکہ بعض جگہ بے تکلفی اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے کہ صورۃً بے ادبی اور گستاخی معلوم ہوتی ہے۔ مگر محبوب کو اگر مطلوب ہے تو وہ بھی محبوب ہے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا قصہ ہے کہ ان کا بچپن تھا اور ان کی مسجد میں ایک موذن تھے جو ظاہر میں خستہ اور شکستہ حال تھے لیکن باطنی دولت سے مالا مال تھے۔ مرزا صاحب جب مسجد میں آتے تو از راہ بچپن ان موذن صاحب کے ہمیشہ ایک دھول رسید کیا کرتے وہ بزرگ اپنی نظر بصیرت سے سمجھتے تھے کہ یہ بچہ ہونہار ہے کسی وقت کچھ ہوگا اسلئے کچھ نہ بولتے بلکہ خوش ہوا کرتے۔ جب مرزا صاحب کی آنکھیں کھلیں اور ان کو دیکھا کہ یہ بزرگ ہیں تو یہ عمل چھوڑ دیا اور معذرت کرنے لگے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ مرزا اگر اپنی پونجی کی خیر منانی ہے تو وہ ہی دھول دھپّے کا شغل رہے ورنہ سب چھین لوں گا۔ مجبوراً مرزا صاحب ہمیشہ ایک دھول لگاتے۔

پس بڑی شے راحتِ قلب ہے ادب وہ ہے جس میں دل کو راحت ہو

— بعض مرتبہ تعظیم سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

میرے پاس ایک شخص آئے آکر جت سے کھڑے ہیں بیٹھتے نہیں میں نے کہا کہ تم بیٹھتے کیوں نہیں کہنے لگے کہ بلا اجازت کس طرح بیٹھ جاؤں میں نے کہا کہ اچھا دو ہفتہ تک اجازت نہیں کھڑے رہو۔ فوراً بیٹھ گئے۔ پھر میں نے پوچھا کہ کب جاؤ گے کس قدر ٹھہرو گے۔ کہنے لگے کہ جب حکم ہوگا میں نے کہا کہ اچھا دو برس تک ٹھہرو گے۔ کہنے لگے کہ گھر کا کام ہے اس قدر تو نہیں ٹھہر سکتا میں نے کہا بندۂ خدا۔ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ اتنا ٹھیروں گا۔ اس تکلف سے کیا فائدہ اور اگر واقع میں تفویض محض کی نیت تھی تو پھر بدلی کیوں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ باتیں نہ تھیں بالکل بے تکلف سب کے ساتھ ہنستے بولتے تھے آجکل بزرگی کے معنی یہ ہیں کہ منہ پھلا کر بیٹھ جاؤ نہ کسی سے بولو نہ ہنسو ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے مزاج میں مزاح تھا جہاں بیٹھتے تھے لوگوں کو ہنسایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کرتہ اتارے بیٹھے لوگوں کو ہنسا رہے تھے۔ حضورؐ نے ان کی کوکھ میں انگلی چبھو دی انہوں نے کہا کہ میں تو بدلہ لونگا۔ اُردو کے وفات نامہ میں جو عکاشہ کا قصہ لکھا ہے وہ اسی کا بگاڑا ہوا ہے یہ وفات نامہ اور بعض دیگر رسائل جیسے معجزۂ درخت۔ سائیں نامہ۔ نور نامہ آجکل عورتوں کے نصاب میں داخل ہیں جس میں اکثر موضوع ہیں ایسا ہی معجزۂ آل نبی ہے ایک اور نظم ہے جس کو بعض واعظ پڑھتے ہیں اس میں بند کا مصرع یہ ہے "میری بارکیوں دیرا تنی کری" اس کا مضمون بڑا مہمل اور بیہودہ ہے مثلاً اس میں ایک مضمون یہ ہے کہ داؤد کو پیغمبری دی اور سلیمانؑ کو بادشاہی دی میری بارکیوں دیراتنی کری۔ گاؤں کے لوگ اس نظم کو بڑے شوق سے سنتے ہیں یہ سب کتابیں جہلات ہیں ان کو چھوڑنا چاہیئے بجائے ان کے محققین علماء کی تصانیف

دیکھنا چاہیئے۔ غرض اُن صحابی نے کہا کہ میں تو بدلا لونگا۔ آپ نے فرمایا لے لو۔ اُنہوں نے کہا کہ میرے بدن پر تو کُرتہ نہ تھا۔ اور آپ کے بدن پر کرتہ ہے آپ نے کُرتہ مبارک اُٹھالیا وہ لپٹ گئے اور بدن مبارک پر بوسہ دینے لگے۔ اور عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ میرا تو یہ مقصود تھا۔ دیکھئے! کہ اُن کے اس کہنے سے کہ میں بدلا لوں گا حضورؐ نے ذرا بُرا نہیں مانا بلکہ بدلا دینے کے لیے تیار تھے اس کا نام ہے بے تکلفی۔ آج کل پیرو مرید میں تکلف ہے ادب اور محبت اور بے تکلفی نہیں ہے۔

مریدین پیروں کے سامنے بولتے نہیں۔ ہنستے نہیں بے اجازت بیٹھتے نہیں۔ یہ کیا ادب ہے۔ اچھا خاصہ جیل خانہ ہے اور جب تک تکلف رہتا ہے دل نہیں ملتا۔ اور جب تک دل نہیں ملتا تو نفع نہیں ہوتا۔

بہرحال صحابہ کی محبت کی یہ کیفیت تھی۔ پس اس اطاعت اور محبت کے ہوتے کیسے احتمال ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کو کسی بات کی تاکید کرنے کی نوبت آوے اور صحابہ کی یہ کیفیت تھی کہ اُن کو اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تھا کہ حضورؐ فلاں بات سے ناراض ہیں خواہ کیسی ہی عزیز ہو وہ فوراً اسکو چھوڑ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر مدینہ طیبہ کے کسی محلہ میں تشریف لے گئے راستہ میں ایک گنبد دار مکان دیکھا پوچھا کہ کس کا ہے کسی نے کہا کہ فلاں شخص کا ہے آپ سُنکر کچھ نہیں بولے جب وہ شخص آئے اور انہوں نے السلام علیکم کہا تو حضورؐ نے منہ پھیر لیا انہوں نے دوسری طرف سے آکر سلام کیا اُدھر سے بھی منہ پھیر لیا۔ حضورؐ کا یہ رُخ دیکھتے ہی ان کی گویا جان نکل گئی۔ اسلئے کہ وہ تو ہمیشہ نظر شفقت و رحمت کے دیکھنے والے تھے ؎

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں ۔۔۔ جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم

حاضرین سے آہستہ سے پوچھنے لگے کہ کس بات سے حضورؐ ناخوش ہیں لوگوں نے کہا کہ یقینی بات تو کوئی معلوم نہیں اتنی بات البتہ معلوم ہے کہ حضورؐ کا گذر تمہارے مکان کی طرف ہوا صرف پوچھا تھا کہ یہ کس کا مکان ہے اس کے بعد کچھ نہیں فرمایا۔ دیکھئے حالانکہ کسی دلیل سے پورا یقین نہیں ہوا کہ وجہ ناراضی کیا ہے مگر محض احتمال پر جاتے ہی تمام مکان کو خدا جانے کس قدر لاگت کا ہوگا فوراً مسمار کرا دیا اور کچھ تحقیق نہیں کیا اُن حضرات کا تو اس پر عمل تھا ؎

بہر چہ از دوست وا مانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں ‌ ‌ ‌ بہر چہ از یار دُور اُفتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

اور ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت ‌ ‌ ‌ زر و خاک یکساں نماید برت

اور پھر کمال پر کمال یہ ہے کہ آکر جتلایا نہیں اطلاع نہیں کی نہ حضورؐ سے نہ اور کسی سے۔ اسلیے کہ جانتے تھے کہ ہم نے جو کچھ کیا حضورؐ پر کون سا احسان ہے اپنا ہی نفع ہے حکیم جی سے کون جتلایا کرتا ہے کہ ہم نے تمہارے کہنے سے فلاں چیز کھانا چھوڑ دی ہے اگر کہے گا کہ تو حکیم جی کہیں گے کہ میاں مجھ پر کیا احسان جتلاتے ہو۔

اتفاق سے ایک مرتبہ پھر حضورؐ کا گذر ہوا تو دیکھا کہ وہ مکان نہیں ہے فرمایا کہ وہ مکان کہاں گیا صحابہؓ نے تمام قصہ عرض کیا کہ انہوں نے حضورؐ کی ناراضی کے احتمال پر اس کو منہدم کر دیا فرمایا کہ ہاں یہ تعمیر ضرورت سے زائد وبال ہے۔

تکرارِ احکام کی عجیب حکمت

بتلائیے جب ان کی اطاعت کا یہ حال تھا تو ایسی جماعت پر کیسے گمان ہو سکتا ہے کہ اُن کو کسی امر کی نسبت تاکیداً کہنے کی ضرورت ہوتی ہو۔ پس اگر کوئی اور حکمت اس تکرار میں ہو سکے تو تاکیداً کہنے سے وہ بہتر ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ اخلاقِ رذیلہ کی تہذیب ضروری ہے لیکن یہ بات تجربہ کی ہے کہ اگر ایک دم

سے تمام اخلاق رذیلہ کے معالجہ کی طرف مشغول ہوگا تو اس شخص پر چند کام جمع ہو جاویں گے ـــــ مثلاً ایک شخص ہے اس کے اندر چند عیب ہیں کبر۔ حسد۔ غضب۔ حب مال وغیرہ تو اگر سب کی طرف ایکدم سے متوجہ ہوگا تو ایک کی بھی پوری اصلاح نہ ہوگی۔ جیسے کانپور میں ایک طبیب تھے کسی کو مسہل لکھ کر دیا کسی کو منضج کسی کو کچھ اور لکھ کر۔ آپ کہیں چل دیئے وہاں علاج لوگوں کا شروع کر دیا ابھی وہ اچھے نہ ہونے پائے تھے کہ وہاں سے پھر کانپور آ پہنچے اب سب پڑے رو رہے تھے۔ ان طبیب صاحب کی نسبت ایک شخص نے خوب لطیفہ کہا کہ بھائی یہ حکیم جی ہر دل عزیز ہیں پھر ہر دلعزیز کا قصہ بیان کیا کہ ایک شخص ہر دلعزیز کسی کا جی برا نہ کرتے تھے ان کا گذر کسی ندی پر ہوا اس کے کنارے پر ایک شخص معذور اور دوسرے کنارہ پر دوسرا شخص معذور بیٹھا تھا اور دونوں پار ہونا چاہتے تھے۔ ہر دلعزیز نے پاس والے کو کندھے پر سوار کیا اور چلا بیچ میں پہنچکر چاہا کہ اتنا ہی دوسرے کو سوار کر کے پہنچاؤں اُسے پٹک اس کو لایا بیچ میں پہنچکر اس پہلے کو ڈوبتا دیکھا اسے پٹک اُسے پکڑنے لگا وہ ڈوب چکا تھا۔ اب اس دوسرے کو سنبھالنے آیا یہ بھی فنا ہو چکا تھا یہ حکایت تو ہنسی کی ہے لیکن بمقتضائے ؎

نگوید از سر بازیچہ حرفے کزو پندے نگیرد صاحب ہوش

اس سے ایک کام کی بات یہ نکلتی ہے کہ اصلاح اخلاق کے متعلق تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دفعۃً سب کی تعدیل کے درپے ہوگا تو ایک کی اصلاح بھی نہ ہوگی۔ البتہ جن افعال کو یہ اخلاق مقتضی ہیں اُنکو ایک دم سے ہی روکنا چاہیئے باقی تقاضائے قلب ان کی تعدیل ایکدم سے کرنے کا اہتمام نہ کرے اگر ایسا کریگا

مثلاً غضب کا معالجہ کیا کبر بڑھ گیا۔ پھر اس طرف متوجہ ہوا تو حسد نے سر اٹھایا اس کو زیر کیا تو حب جاہ نے سر ابھارا۔ ساری عمر اسی چکر میں گذر جائے گی اور تعدیل ایک کی نہ ہو گی۔

طریقہ یہ ہے کہ کسی ایسے خلق کو لے جس کا اس کے اندر غلبہ ہے اسکی تعدیل کرے۔ انشاءاللہ سب کی اصلاح ہو جاویگی۔ پس میں دعوے سے تو نہیں کہتا لیکن سمجھ میں آتا ہے کہ اس حدیث شریف میں اسی طرف اشارہ ہے کہ حضور صلعم کے مکرر لاتغضب فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اول اس کی اصلاح کر لو اس کے بعد آگے پوچھنا۔ واللہ اعلم باسرار حبیبہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

لیکن اگر یہ حدیث اس پر مبنی نہ بھی ہو تو بھی فی نفسہٖ یہ مضمون صحیح ہے بہرحال یہ تو حدیث کی شرح ہوئی اور اس سے یہ صاف معلوم ہو گیا ہو گا کہ غصہ مذموم ہے اور چونکہ یہ دلالت بالکل صاف ہے اس لیے اس وقت اس کا بیان کرنا مجھ کو زیادہ مقصود بھی نہیں تھا۔

تحقیق اخلاق

مجھ کو زیادہ بیان کرنا ایک اور امر کا ہے جو ذرا غامض ہے اور جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کے متعلق یہ تشخیص کہ میرے اندر کون سا خلق ہے اور کون سا نہیں ہے اس میں بہت غلطیاں ہوتی ہیں اور یہ غلطیاں اس قدر غامض ہیں کہ ہر شخص انکو سمجھ نہیں سکتا۔ اخلاق ہی کی تحقیق کے لیے شیوخ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اخلاق کی حقیقت ایسی سمجھتا ہے جیسے طبیب حاذق مرض کی حقیقت جانتا ہے شیخ کے بلا مشورہ علاج کرنا ایسا ہے جیسے کسی محموم نے کلیات قانون میں دیکھا کہ بخار کبھی صفرا کے غلبے سے کبھی سوداء کے کبھی بلغم کی آمیزش سے کبھی دموی ہوتا ہے طبیب سے تو رجوع کیا نہیں۔ چاروں اقسام کے بخار کے نسخے جو لکھے تھے ایک قسم کا

ایک نسخہ روزانہ پینا شروع کر دیا کہ جس قسم کا ہو گا جاتا رہے گا اُس کا حشر الآن کما کان ہو گا۔ اور طبیب حاذق سے اگر رجوع کیا تو وہ نبض دیکھ کر فوراً معلوم کر لے گا کہ اسکو فلاں قسم کا بخار ہے اور اُس کی یہ علت ہے اور فلاں شے اس کی مزیل ہے۔

اسی طرح شیخ کامل پہچان لے گا کہ مثلاً اس کو کبر کا مرض ہے یا غضب کا ہے اور اسکی علت بھی معلوم کر لے گا۔ اسکے علاوہ اور بھی ان اخلاق کے اندر اشتباہات ہو جاتے ہیں سب سے زیادہ سخت غلطی یہ ہوتی ہے کہ اخلاقِ ذمیمہ کے اندر اس شخص کو کچھ منافع نظر آتے ہیں جو محبّ دنیا ہیں ان کو تو منافع طبعیہ معلوم ہوتے ہیں چونکہ وہ اُن کو مرغوب ہیں اسلئے اُن کو نہیں چھوڑتے اور جو ذرا درویشی کے رنگ میں ہیں شیطان اُن کو منافع دینیہ عقلیہ اُن اخلاق کے مقتضا پر عمل کرنے میں تبلاتا ہے مثلاً یہ کہ گناہ کا یہ خاصہ ہے کہ گناہ کر کے آدمی اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے اور اپنی نظروں میں آدمی خوار اور ذلیل ہو جائے یہ عین مطلوب ہے تو شیطان کہتا ہے کہ گناہ سے دیکھو یہ منفعت ہے۔ اور تائید میں بعضے بزرگوں کے افعال بھی پیش کرتا ہے حالانکہ اُن بزرگوں نے خلاف شرع کام کوئی نہیں کیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے گئے لوگوں نے بڑی تعظیم کی۔ نفس کو اچھا معلوم ہوا۔ اس کا علاج کیا چلا کر بول اُٹھے انی انا اللہ لا الٰہ الا انا۔ اس وقت شریعت کا لوگوں کو بہت پاس تھا یہ کلمہ سُن کر سب غیر معتقد ہو کر بھاگ گئے صرف وہ لوگ رہ گئے جن کو حضرت کے ساتھ خاص تعلق تھا۔ جب سب چلے گئے۔ بعض اصحاب نے پوچھا کہ حضرت آپنے یہ کیا کہا فرمایا میں نے کیا کہا سورۂ طٰہٰ پڑھ رہا تھا اُس میں

اس آیت کو میں نے پکار کر پڑھ دیا۔ بتلاؤ اس میں کیا گناہ ہوا ـــــ ایک اور شخص تھے دہلی میں وہ یہ کہہ رہے تھے "نہ تو میرا خدا نہ میں تیرا بندہ پھر میں تیرا کہنا کیوں مانوں" اور لوگ چاروں طرف سے ان پر یورش کر رہے تھے کوئی بددین کہتا تھا۔ کوئی کافر کہتا تھا کوئی مجنوں کا خطاب دیتا تھا۔ کوئی ان کو تکلیف پہنچانے کے درپے تھا۔ ایک شخص سمجھدار آئے اور انہوں نے سب کو منع کیا اور ان سے آکر پوچھا کہ شاہ صاحب تم یہ بات کس کو کہہ رہے ہو انہوں نے یہ سن کر کہا کہ الحمدللہ دلّی میں ایک شخص تو ایسا نکلا کہ جس کو عقل ہے بات یہ ہے کہ میرا نفس کئی روز سے کھیر کی فرمائش کر رہا ہے میں اس کو کہتا ہوں کہ تو میرا خدا نہیں میں تیرا بندہ نہیں پھر میں تیرا کہنا کیوں مانوں۔ انہوں نے فرمایا کہ شاہ صاحب خدا کے لیے ہمارے حال پر رحم کرو کیوں کہ ہم لوگوں کو گنہگار کرتے ہو۔ آہستہ آہستہ کہہ لو تو بعض بزرگوں نے اپنے بدنام ہونے کے لیے اس قسم کے کام کئے ہیں اور آج کل اگر بدنام ہونے کی مصلحت کی ضرورت ہو تو اس کی اچھی تدبیر یہ ہے کہ خوب شریعت پر عمل کرو کیونکہ آج کل تو یہ حالت ہے کہ جس قدر کوئی شریعت کے زیادہ خلاف ہو اس کو درویش سمجھتے ہیں۔ اس زمانہ میں تو شریعت پر عمل کرنے ہی سے آدمی چھپ جاتا ہے۔ شریعت پر عمل کرو آج ہی درویشی سے خارج کر دیئے جاؤ گے۔ غرض لوگوں نے بزرگوں کے ان افعال کو خلاف شرع کام کرنے کے لیے آڑ بنالیا ہے۔

احوالِ صادقہ کی علامت

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعضوں نے بعض گناہوں کو سبب قرب سمجھ رکھا ہے چنانچہ بعضے حسن پرستی اور نظر بازی کو باعث قرب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو حق تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور بعض نے اشعار کو اپنا متمسک بنا رکھا ہے جیسے یہ شعر ہے

؎ حسن خویش از روئے خوباں آشکارہ کردہ ۔ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

ان لوگوں نے یہ اشعار تو یاد کر لیے لیکن حقیقت کو نہیں سمجھا ان کی وہی مثل ہے ع
حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاءُ - کیا خوبوں کا انحصار امردوں اور عورتوں ہی میں ہے۔ طفل یک ماہہ اور تمام زمین و آسمان وما فیہا خوبانی کا مدلول نہیں ہو سکتا۔ قدرت کا مشاہدہ ان کو بس بے ریش لڑکوں ہی میں ہوتا ہے۔ یہ سب شہوۃ پرستی ہے

شیخ شیرازی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ بقراط حکیم چلا جا رہا تھا۔ ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا حال متغیر ہو رہا ہے پسینہ آ رہا ہے پوچھا کہ اسکو کیا ہو گیا کسی نے کہا کہ کسی حسین کو دیکھ کر اس کو وجد آ گیا ہے۔ بقراط نے کہا کہ کسی بچہ کو دیکھ کر اس کی یہ حالت نہ ہوئی۔ اگر دل میں کچھ شورش عشق ہے تو اسکو تو ہر شے کو دیکھ کر تغیر ہو گا۔ چنانچہ شیخ شیرازیؒ کہتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل　　　　که در خوبرویان چین و چگل

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ یعنی کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں۔ پس خوباں جمع خوب کی ہے جس کا موصوف بوجہ تعمیم کے حذف کر دیا گیا۔ ہر شے خوب کو شامل ہے خواہ رُوئے خوب ہو یا حیوان خوب ہو۔ ہر جانور اور ہر پتہ اس قدر بے شمار حکمتوں کو مشتمل ہے کہ جس کا انتہا نہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ لکھا ہے اس میں انہوں نے بہت سی مخلوقات کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔ اور شیخ نے قانون میں ہر عضو کی تشریح میں اس کی رگوں اور پٹھوں اور موڑ کو ایسا بیان کیا ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے یہ سب چیزیں خوباں میں داخل ہیں۔ شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند　　　　بر آواز دولاب مستی کنند

پنجاب میں ایک بزرگ گذرے ہیں ان کو کوئی شخص زور سے پنکھا نہیں جھل سکتا تھا

اسکی جو آواز سن سن نکلتی تھی اسکی ان کو وجد آجاتا تھا۔ پس امتحان یہ ہے کہ اگر ہر اچھی شے کے دیکھنے سے تغیر ہو جاتا ہو تب تو واقعی حال صادق ہے ورنہ ہے

این نہ عشق است آن کہ در مردم بود ۔ این فساد از خوردنِ گندم بود

روٹیاں کھانے کو ملتی ہیں سب اُسی کی مستی ہے اگر کئی روز روٹی نہ ملے اور پھر پوچھا جاوے کہ تمہارا کسی شے کو جی چاہتا ہے کسی حسین کو یا روٹی کو۔ یہی عاشق صاحب یہ کہیں گے کہ میاں ایسی تیسی میں جائے حسین لا روٹی لاؤ۔ بھوک کی ایسی مصیبت ہے کہ جب پیش آتی ہے کچھ نہیں سوجھتا۔ قحط میں بعض لوگ اولاد کو بھون کر کھا گئے ہیں۔ سچا وہ ہے جس کے اندر ہر حال میں خواہ سرا ہو یا ضرار شورش ہو۔

احوالِ بزرگان سے دھوکہ

بعض لوگ بعضے بزرگوں کی حکایت سے استدلال کرتے ہیں۔ میں اس کی حقیقت بھی بیان کئے دیتا ہوں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت مشہور ہے کہ حُسن پرست تھے لیکن حقیقت اسکی یہ ہے کہ حضرت مرزا صاحبؒ ابتداء سے نفیس شے کو پسند فرماتے تھے اللہ تعالٰی نے طبیعت ہی پاک اور نازک پیدا فرمائی تھی۔ چنانچہ بچپن ہی میں بدشکل آدمی سے گھبراتے تھے اور حسین آدمی کی گود میں چلے جاتے تھے۔ ان ہی کے زمانہ میں حضرت خواجہ میر دردؔ بھی تھے وہ سماع سنتے تھے مرزا صاحب سے کسی نے کہا کہ خواجہ صاحب سماع سنتے ہیں فرمایا بھائی کسی کو کانوں کا مرض ہے کسی کو آنکھوں کا اللہ اکبر! ان حضرات میں کیسی تواضع تھی۔ مرزا صاحبؒ میں اس درجہ لطافت تھی کہ جامع مسجد پالکی میں بیٹھ کر تشریف لے جایا کرتے تھے اور پالکی کے پٹ بند کرا دیتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ دہلی کے بازار کی دکانیں بے قاعدہ بنی ہوئی ہیں ان کو دیکھ کر میری طبیعت گھبراتی ہے۔

ایک عالم مرزا صاحب سے بیعت ہونے کے لئے تشریف لائے اُن کی ڈاڑھی بہت بڑی اور گنجان تھی ۔ مرزا صاحب نے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا کہ پہلے آدمیوں کی سی شکل بنا کر آؤ پھر وہ موافق سنّت کے بقدر ایک مشت کے درست کر کے گئے تب خوش ہوئے ——— ایک شخص گاؤں کے رہنے والے مرزا صاحبؒ کی خدمت میں آیا کرتے تھے کھانا بہت کھایا کرتے تھے مرزا صاحب سے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت کوئی خدمت میرے لائق ہو تو فرمائیے ۔ فرمایا کہ آپ سال بھر میں دو مرتبہ تشریف لاتے ہیں تو مجھ کو تمہارے زیادہ کھانے کی وجہ سے دو ہی مرتبہ مسہل لینے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مہربانی فرما کر ایک مرتبہ آیا کیجئے تاکہ ایک ہی دفعہ یہ مصیبت برداشت کرنی پڑے اتنی لطافت تھی کہ زیادہ کھانے کے تصوّر سے مزاج اعتدال پر نہ رہتا تھا ۔ پس مرزا صاحبؒ اس طرح کے حُسن پرست تھے ۔ الحاصل بزرگوں کے قصّوں سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے اُن حضرات کے حُسن پرستی کے قصّے بس اس قبیل کے ۔

عشق حقیقی کی تاثیر

اور وجہ اس دھوکہ کی یہ ہوتی ہے کہ اس تعلق مجازی کا خاصہ ہے کہ اس سے ایک قسم کی یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اور اُس یکسوئی سے ذکر و عبادت میں مزہ آتا ہے ۔ اس لیے یہ شخص سمجھتا ہے کہ عشق مجازی سبب قرب کا ہے اور یہ مزہ اور ذوق عبادت کا ہے حالانکہ وہ اثر یکسوئی کا ہے اور وہ یکسوئی مع اللہ نہیں ہوتی ۔ بلکہ مع المحبوب ہوتی ہے اور یہ اسکو اپنی غلطی سے جمعیت اور اطمینان عبادت کا سمجھتا ہے ۔

ایک بزرگ تھے وہ بڑھاپے میں زار و زار روتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ میں مدت تک اس جہل میں مبتلا رہا کہ سمجھتا تھا کہ مجھ کو نماز میں لذت آتی ہے ۔ اب معلوم ہوا کہ وہ نماز کا مزہ نہ تھا کہ بحر اب وہ مزہ نہیں ہے تو اگر نماز کی لذت ہوتی تو اب اور

بڑھتی۔ معلوم ہوا کہ وہ مزہ جوانی اور حرارتِ غریزیہ کا تھا چونکہ بڑھاپے میں حرارت کمزور ہو جاتی ہے اس لیے وہ ذوق بھی جاتا رہا۔ اور اگر عشق حقیقی قلب میں ہوتا تو بڑھاپے میں اسکو زیادہ ترقی ہوتی ؎

خود قوی تر می شود خمرِ کہن   خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ہر چند پیر خستہ و بس ناتواں شدم   ہر گہ نظر برخ تو کردم جواں شدم

پس شوق اور لذت اور کیفیات پر مغرور نہ ہونا چاہیئے یہ کوئی مقصود چیز نہیں ہاں محمود ضرور ہیں حال کے صادق ہونے میں ان کیفیات کو کوئی دخل نہیں اسکی صرف دو علامتیں ہیں اول تو یہ کہ اس کے ساتھ شریعت پر عمل ہو۔ دوسرے یہ کہ شیخ سے محبت ہو۔ اگر یہ دو دولتیں موجود ہیں تو کسی کیفیت کے ہونے نہ ہونے کی فکر نہ کرے اور اگر یہ نہیں ہیں تو ہزار کیفیتیں ہوں کوئی قابل اعتبار نہیں پس کیفیات کا طالب ہوا گا ہے شہوت کے اندر دھوکہ ہو جانے کا سبب ہو جاتا ہے جیسا ابھی مذکور ہوا۔

مذمت غضب

اسی طرح اور اخلاق ذمیمہ میں بھی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ شیطان ان میں بہت سے منافع سوجھاتا ہے مثلاً اسی غضب کو لیجئے کہ اس میں بھی بہت التباس واقع ہوتا ہے۔ حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ غصہ قبیح ہے اور قبیح ہونا اس وقت معلوم ہوتا ہے جب اس پر کوئی واقعہ مرتب ہوتا ہے لیکن پھر بھی جو یہ نہیں چھوٹتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس میں شیطان تین قسم کی مصلحتیں سجھاتا ہے کبھی عقلی کبھی شرعی کبھی طبعی۔ طبعی تو یہ ہے کہ اس میں لطف اور لذت بہت آتی ہے گو بعد میں نادم ہونا پڑتا ہے لیکن عین وقت میں لذت آتی ہے۔ اور اس مصلحت کا جواب تو ظاہر ہے کہ اس

لذت کے بعد فوراً ندامت ہوتی ہے کبھی کسی کو یاد نہ ہوگا کہ غصہ آیا ہو اور ندامت نہ ہوئی ہو تو یہ طبعی مصلحت ہے اور عقلی مصلحت پابندان طبیعت کو یہ نظر آتی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنے ماتحتوں پر غصہ نہ کریں تو لوگ ہم کو کھا جائیں جیسے حکایت ہے کہ ایک سانپ ایک بزرگ کا مرید ہوگیا تھا اُن بزرگ نے کسی کو ستانے سے توبہ کرائی۔ بعد ایک مدت کے جو اُس پر ان بزرگ کا گذر ہوا دیکھا تو اُس کا بہت شکستہ حال ہے کچا کھچا پڑا ہوا ہے پوچھا کیا حال ہے عرض کیا جب سے حضرت سے بیعت ہوا ہوں اور توبہ میری مشہور ہوگئی ہے تمام جانوروں نے مجھ پر یورش کر رکھی ہے سب مجھ کو نوچتے ہیں ان بزرگ نے فرمایا کہ میں نے تجھ کو کاٹنے سے منع کیا تھا پھنکارنے سے تو منع نہیں کیا پھنکار لیا کر۔ تو بعضوں کو واقعی اس کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حد سے تجاوز مذموم ہے اور شرعی مصلحت یہ خیال میں آجاتی ہے کہ شیطان یہ تعلیم کرتا ہے کہ دوسروں کی اصلاح اُسی وقت ہوگی جبکہ سختی اور غصہ سے کام لیا جائے اس وجہ سے اسکو ترک نہیں کرتا۔

مراتب غضب

اس وقت میں زیادہ اسی نوع کو بیان کرنا چاہتا ہوں پس جاننا چاہئے کہ غصہ اور اسی طرح ہر خلق کے اندر تین مرتبے ہیں۔ اول تو غصہ کا پیدا ہونا یعنی ہیجان نفس۔ دوسرے یہ ہے کہ اُس کے مقتضے پر جوش میں آکر کوئی کارروائی کرنا مثلاً غصہ آیا اور جوش آیا کہ زبان سے فلاں بات سخت اسکو کہوں اور ہاتھ سے ماروں۔ پس جس قدر ہیجان اور جوش کا مقتضیٰ تھا سب افعال اُسکی کر لیے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ ہیجان تو ہوا لیکن نفس اس شخص کو بے قابو نہیں کرتا اور نہ جوش کو جاری کرتا ہے اور مطلقاً کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ جب جوش ختم

ہو گیا اس وقت غور کر کے کارروائی کرتا ہے۔ اب تینوں مرتبوں میں غور کرنا چاہیئے کہ کس میں مصلحت ہے اسلئے کہ غصہ کے اندر عقلی اور شرعی حکمتیں ضرور ہیں ان کا انکار کسی طرح نہیں کیا جا سکتا اور وہ مصالح واجب التحصیل ہیں اور موقوف علیہ اُن کا غصہ ہے اور بحکم مقدمۃ الواجب واجب۔ بعض افراد کے اعتبار سے غصہ واجب ہوا اور بعض کے اعتبار سے منہی عنہ بھی ہے جو لوگ محققین نہیں ہیں وہ ایسے مقامات پر پہنچکر تنگ ہوتے ہیں اور گھبراتے ہیں حتیٰ کہ بعض نے گھبرا کر یہ کہہ دیا ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اس شعر کا قائل ممکن ہے کہ کوئی درویش صاحبِ حال ہو لیکن یہ شعر بالکل غلط ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا اور ارشاد ہے یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ اور ارشاد ہے مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ پس شریعت میں کوئی تنگی اور گھبراہٹ اور بے چینی نہیں ہے جس کو شریعت "تنگ نظر آوے خود اُس کے اندر تنگی ہے یرقان کے مریض کو سب چیز زرد معلوم ہوا کرتی ہے اور صفراوی کو شیریں شے تلخ معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ ابھی معلوم ہو گا کہ شریعت میں کس قدر وسعت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غور کرنا چاہیئے کہ تین مرتبے جو غضب کے بیان کئے گئے ہیں ان میں سے وہ مصلحتیں کس درجہ میں حاصل ہوں گی کہ وہ مرتبہ مامور بہ اور ماذون فیہ ہو اور کس مرتبہ میں حاصل نہ ہوں گی کہ وہ منہی عنہ اور قبیح ہو۔ اول مرتبہ تھا جوش کا آنا یہ تو منہی عنہ نہیں ہے شریعت کا حکم یہ نہیں کہ ہم بالکل ٹھنڈے بن جائیں بعضوں نے اپنے نفس کو اس قدر مارا کہ بالکل ہی اُس غریب کو مار ڈالا۔

دیکھو! اگر شریعت میں اس قدر بے حسی مطلوب ہوتی تو کلمۃ اللہ جو شرق سے غرب تک بواسطہ اعلاء کے پھیل گیا۔ یہ کیسے ہوتا۔ یہ غصہ ہی کی بدولت ہُوا۔ اسی طرح شہوۃ کا قطع کرنا اگر مقصود ہوتا تو توالد اور تناسل کیسے ہوتا اور نیز مجاہدہ کے اندر جو اجر رکھا گیا ہے وہ کیسے حاصل ہوتا۔ تقوے کی دولت کہاں سے نصیب ہوتی۔ مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است — کہ از و حمام تقوے روشن است

یعنی دنیا کی شہوت کی مثال بھٹی کی سی ہے کہ اُس سے تقوے کا حمام روشن ہے گو شہوت بمنزلہ اُپلوں اور ایندھن کے ہے اور پانی جو اس سے گرم ہو رہا ہے وہ بمنزلہ تقوے کے ہے۔ عجیب مثال ہے سخت غلطی ہے اُس شخص کی جو غصہ کو بالکل دور کرنا چاہے کہ وہ بالکل ہی ملیا میٹ ہوجائے اگر یہ مطلوب ہوتا تو یوں نہ فرماتے وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور یہ ارشاد نہ ہوتا وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ اور لَا تغضب صیغہ نہی کا ارشاد نہ ہوتا اس لیے کہ محو ہوجانے کے وقت مادہ ہی غضب کا نہ رہتا تو اسکی نہی ہی کی ضرورت نہ رہتی پس جوش اور غصہ کا آنا منہی عنہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ امور غیر اختیاریہ میں سے ہے اور امر و نہی امور اختیاریہ کیطرف متوجہ ہوتے ہیں اور امور غیر اختیاریہ نہ محمود ہیں نہ مذموم۔ ہاں اس اعتبار سے اُن کو محمود کہا جاسکتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی قضا سے پیش آتے ہیں جیسے حافظ شیرازی اسی مضمون کی نسبت کہتے ہیں ؎

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست — بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

بہرحال یہ درجہ تو منہی عنہ نہیں ہے اب دو درجے باقی رہ گئے ایک تو جوش کے موافق کارروائی کرنا دوسرے جوش کو دبا کر عقل اور شرع کی اقتضاء کے موافق عمل

کرنا۔ سو تجربہ یہ ہوا ہے کہ جوش کے موافق کارروائی کرنے میں مصالح عقلیہ بالکل نہیں ہیں اور مفاسد بہت ہیں طبعی مصلحت یعنی لذت آنا یہ بے شک ہے۔ لیکن وہ ایسی ناک کے رستہ نکلتی ہے کہ آدمی اس پر بے حد نادم ہوتا ہے مثلاً جوش آیا اور اس کو روکا نہیں اور کسی کو برا کہدیا وہ مخالف ہو گیا یا کسی کی آنکھ پھوڑ دی یا ہاتھ توڑ دیا تو اس کا انجام دنیا و آخرۃ دونوں کے اعتبار سے برا ہے۔ شرعی مصلحت بھی جوش کے مقتضا پر عمل کرنے میں کچھ نہیں ہے اس لیے ارشاد یہ ہے یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا۔ یعنی سہولت کرو سختی نہ کرو۔ خوشخبری دو نفرت مت دلاؤ اور اتنے جوش پر عمل کرنے سے یقیناً نفرت ہوتی ہے اگر کوئی کہے کہ ہیبت کی سخت ضرورت ہے یہ عقلی مصلحت ہے ہم کہتے ہیں کہ ہیبت اس طرح سے نہیں ہوتی۔ ہیبت تو محبت سے ہوتی ہے تنفر سے تو ایسا خوف ہوتا ہے جیسے درندہ سے ہوتا ہے۔ ہیبت نہیں ہوتی ہیبت محبت کے ساتھ ہوتی ہے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیکھو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کس قدر محبت تھی اور ہیبت بھی بہت تھی۔ معشوق کی محبت بھی ہوتی ہے۔ اور ہیبت بھی اس قدر ہوتی ہے کہ اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا۔

پس ہیبت کی ضرورت ہے نفرت کی ضرورت نہیں اگر نفرت مطلوب ہوتی تو یہ کیوں ارشاد ہوتا فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ غرض اس مرتبہ میں نہ طبعی مصلحت ہے نہ شرعی نہ عقلی۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ جوش کو کم کر کے عقل کے موافق کارروائی کرنا لیکن اس مرتبہ میں اثر غصہ کا رہنا چاہیے یہ نہ ہو کہ بالکل نہ رہے ورنہ غضب کے اندر جو مصالح ہیں وہ مرتب

نہ ہوں گے لیکن اثر کی مختلف قسمیں ہیں۔

مثلاً گرمی کا اثر روٹی میں بھی ہوتا ہے اور توے میں بھی۔ مگر روٹی کو تو منہ میں رکھ لیتے ہیں اور توے کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ پس اتنی حرارت رکھو جتنی روٹی میں ہوتی ہے یعنی ناراضی تو ظاہر ہو اور غصہ کا ظہور نہ ہو لہجہ کے اندر ملامت کا رنگ ہو اور اتنا نہ چلائے کہ رعد و برق بن جائے **غرض:** یہ تیسرا مرتبہ ایسا ہے کہ اس میں طبعی اور عقلی اور شرعی سب مصالح کی رعایت ہے اور طبعی مصلحت کی رعایت اسلئے ذکر کی گئی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس مصلحت کی رعایت فرمائی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے کہ کسی مسلمان کو اجازت نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی مسلمان سے کلام نہ کرے ـــــــ دیکھئے! اس حکم میں کس قدر رعایت ہے ہم گنہگاروں کی حضورؐ نے دیکھا کہ میری امت میں غصیارے بھی ہوں گے اور آپس میں لڑیں بھڑیں گے بھی اور ایک دوسرے سے رُوٹھیں گے بھی۔ پس اگر یہ حکم ہوتا کہ بالکل رنج نہ رکھو تو طبیعت کے بہت ہی خلاف تھا بعضوں سے عمل نہ ہو سکتا اس لیے آپ نے غصہ کی اتنی رعایت فرما دی کہ اگر کوئی کسی سے روٹھ جائے تو خیر! ابھی کچھ نہ کہو ایک دن، دو دن تک اجازت ہے کہ اپنی ناگواری کے مقتضا پر عمل کرے۔ ہاں تین دن سے زائد اجازت نہیں۔ اب چاہیے کہ راضی ہو جاویں طبیعت کی اتنی رعایت کافی ہے۔ اب زیادہ اُس پر عمل کرنا اُس کو مصالح پر غالب کر دینا ہے اور سخت مذموم ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ اگر کوئی سال بھر تک اپنے بھائی سے نہ بولا تو ایسا ہے جیسے اُس نے اُس کو قتل کر دیا۔

غرض یہ مرتبہ طبعی مصلحت سے بھی خالی نہیں ہے اور عقلی اور شرعی مصلحتیں

تو ظاہر ہیں کہ اسی مرتبے کے حاصل ہوں گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ تین مرتبہ ہوائے نفس کا جوش آنا یہ تو نہ ماموربہ نہ منہی عنہ۔ دوسرے جوش کے موافق کارروائی کرنا یہ منہی عنہ ہے۔ تیسرے جوش کو روک کر اور کسی قدر باقی رکھ کر اور اس پر غالب ہو کر عقل کے موافق عمل کرنا یہ درجہ ماذون فیہ ہے اب حدیث میں جو لا تغضب فرمایا ہے اس کے معنی سمجھ میں آ گئے ہوں گے کہ غضب سے پہلا اور تیسرا مرتبہ مراد نہیں بلکہ دوسرا مرتبہ مراد ہے یعنی جوش کے موافق کارروائی نہ کرو یہ تو حدیث کے معنی دلائل عقلیہ سے طے ہوئے۔

اب نصوص سے لیجئے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اس سے معلوم ہوا کہ لا تغضب سے پہلا مرتبہ مراد نہیں اس لیے وہ غیر اختیاری ہے دوسرے مرتبہ کی نسبت حضورؐ کا ارشاد ہے لا یقضین قاضٍ وھو غضبان۔ یعنی کوئی قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے تیسرے مرتبہ کی اجازت ہے چنانچہ ارشاد ہے وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ــــــ بہرحال ان نصوص اور دلائل عقلیہ سے محقق ہو گیا کہ اوّل مرتبہ نہ ماموربہ نہ منہی عنہ اور دوسرا درجہ منہی عنہ، اور تیسرا درجہ کہیں ماذون فیہ اور کہیں واجب۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ اعلاء کلمۃ اللہ میں تو بغیر جوش کے کام نہیں چلتا جواب یہ ہے کہ حدود کی رعایت وہاں بھی ہے جوش کے ہر مقتضا پر عمل کرنا وہاں بھی جائز نہیں مثلاً جوش آیا کہ کسی کو قتل کریں اور اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تو حکم یہ ہے کہ جوش کو روک لو اور ہاتھ روک لو۔ پس جوش پر عمل کرنا وہاں ہی تک جائز ہے کہ حدود کے اندر ہو۔ اب بفضلہ تعالیٰ

تمام نصوص مجتمع اور تمام اشتباہات رفع ہو گئے۔ مَیں نے اس مضمون کو قصداً اس لیے بیان کیا ہے کہ میں خود بھی اس غصہ کے مرض میں مُبتلا تھا بیان کرنے سے اپنی غلطی کا اعتراف بھی ہے اور اس اعتراف کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر سے وہ عیب جاتا رہتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر غصہ آوے تو روکو اور آدمیت سے مت نکلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ پہلوان کون ہے پھر خود ہی فرمایا الذی یملک نفسہ عند الغضب۔ یعنی پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے ؎

نہ مرد است آں بہ نزدیک خردمند — کہ با پیلِ دماں بیکار جوید۔
بلے مرد آنکس است از روئے تحقیق — کہ چوں خشم آیدش باطل نگوید

پس جو غصہ کو بالکل زائل کر دیتے ہیں وہ نہایت تفریط میں ہیں اور جو جوش پر عمل کرتے ہیں وہ افراط میں ہیں اور جو روک کر خفیف اثر سے عقل کے ساتھ کام لیتے ہیں انہوں نے غصہ کے منافع اور مصالح سے کام لیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اعتدال کی توفیق عطا فرماویں۔ اللّٰھم آمین۔

تمت بالخیر

غوائل الغضب

یہ وعظ جمادی الثانی سنہ ۱۳۲۱ھ تھانہ بھون برمکان مولانا
محمد عبداللہ مرحوم بیٹھ کر ارشاد فرمایا جس کو مولینا
محمد مصطفیٰ صاحب مرحوم نے قلم بند فرمایا
سامعین کی تعداد عورتوں کے علاوہ تقریباً پچاس ۵۰ تھی

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

★

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونومن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریك لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولٰینا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ وسلم امّا بعد

چونکہ مستورات کا مجمع ہے اسواسطے ایسی دو ضروری باتوں کا بیان کیا جاتا ہے جس میں مستورات علی العموم مبتلا ہیں۔ وہ دو مرض ہیں غیبت اور غصہ

غیبت کی اصل

اور غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں میں بھی اصل ایک ہی ہے اور دوسرا اسکی فرع۔ اور وہ اصل غصہ ہے۔ غیبت جب کبھی ہوتی ہے تو کسی ایسی بات کے بعد ہوتی ہے جو خلاف طبع ہو۔ جب وہ بات ناگوار ہوتی ہے تو اُس کا ذکر زبان پر آجاتا ہے اگر غصہ نہ آئے یا آدمی بجز اُس ناگواریٔ خاطر کو ضبط کرلے تو شکایت کیوں زبان پر

پر آئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ شکایت و غیبت غصہ ہی کا نتیجہ ہے۔ اب غصہ کی نسبت سُنیئے۔ روایت ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا پہلوان کس کو کہتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ پہلوان وہ ہے جو کشتی لڑے فرمایا نہیں۔ بڑا پہلوان وہ ہے جو اپنے نفس پر غصہ کے وقت قابو میں رکھے غصہ میں جوش پیدا ہونا امر طبعی ہے اس میں ملامت نہیں مگر انسان کو خدائے تعالےٰ نے اختیار بھی دیا ہے اُس کو روکنا چاہیئے۔ غصہ آنا انسانیت کے خلاف نہیں لیکن اس وقت اُس اختیار کو صرف نہ کرنا جو حق تعالےٰ نے ایسے ہی وقت کے واسطے دیا ہے انسانیت کے خلاف ہے۔

درستی اخلاق

غصہ کو بھی حق تعالیٰ نے بہت ہی مصلحتوں سے انسان کی سرشت میں داخل کیا ہے اُس سے بہت سے کام نکلتے ہیں لیکن اختیار کو بھی ساتھ سرشت میں رکھ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ جس جگہ غصہ کا کام ہو وہاں کام لے اور جو جگہ غصہ کے کام کی نہیں وہاں کام نہ لے یعنی انسان کامل وہ ہے کہ غصہ سے مغلوب نہ ہو۔ اسی کو فرمایا ہے کہ بڑا پہلوان یہ ہے۔ ——— اور ایک روایت میں ہے قوی وہ شخص ہے جو غصہ کا مالک ہو۔ اس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کی بھی اصلاح فرمائی ہے اور نفس کی بھی۔ زبان کی اصلاح جب ہی ہو سکتی ہے کہ نفس کی اصلاح ہو چکی ہو۔ جس شخص کو نفس پر قدرت حاصل ہے اس کی زبان ضرور محفوظ ہوگی تو غصہ کا مالک ہونا نفس کا مالک ہونا بھی ہے اور زبان کا بھی۔

تمام شریعت کا ماحصل اصلاح ہی ہے جس سے آجکل ہم لوگوں کو محض غفلت ہے اول تو مطلق تنبہ ہی نہیں۔ اور اگر کسی کو دین کا شوق بھی ہوا اور کچھ تنبہ بھی ہوا تو بس اتنا کہ مسئلہ مسائل کی کتابیں پڑھ لیں گو عمل نہ ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ

عنہم کی حالت یہ نہ تھی وہ جتنا علم حاصل کرتے تھے اُس سے زیادہ عمل کا خیال رکھتے تھے۔ اور ہم لوگوں میں سے اگر کوئی عمل بھی کرتا ہے تو بڑی دوڑ یہ ہے اور تقویٰ کی انتہا بس یہی ہے کہ نماز پڑھ لی اور روزہ رکھ لیا۔ اور اگر بڑے صاحب کمال بنے تو فرضوں کے علاوہ نفلیں بھی ادا کرنے لگے۔ اور ایسی بہت سی باتیں جو نماز روزہ ہی کی طرح ضروری ہیں بلکہ بعض وجوہ سے اُن سے زیادہ قابل اہتمام کے ہیں اُن کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اور وہ درستیٔ اخلاق ہے۔ یہاں تک نوبت ہوگئی ہے کہ اگر کسی کو اخلاق کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کنز الدقائق ہم نے پڑھی اور قدوری بھی پڑھی ہے اس میں تو یہ کہیں نہیں لکھا۔

سلف کا کمال

خوب یاد رکھئے گا کہ کنز الدقائق اور قدوری پر علم ختم نہیں وہ بھی دین کی کتابیں ہیں اور جو ان دونوں کی اصل اور ماخذ ہے یعنی کتاب و سنت ان میں سب کچھ موجود ہے مگر رواج کچھ ایسا غلط پڑا ہے کہ دین کو منحصر فی الصوم والصلوٰۃ مان لیا گیا ہے۔ حدیثوں میں آپ سب کچھ پڑھتے ہیں۔ مگر عادت کے موافق سوائے چند مسائل روزہ نماز کے اور کسی بات بات پر نظر نہیں پڑتی۔ دیکھئے میں کتاب ہی کی روایت سناتا ہوں جو آپ نے خدا جانے کتنی دفعہ پڑھی ہوگی۔ روایت کیا ہے ابو وائل نے کہ ہم عروہ بن محمد کے یہاں کسی ضرورت سے گئے تھے۔ عروہ کو کسی بات پر غصہ آیا۔ غصہ کا آنا امر طبعی تھا جس میں ہم بھی ان کے مماثل ہیں۔ بلکہ اُن سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن اُن لوگوں کی حالت دیکھئے اور پھر اپنی حالت سے مقابلہ کیجئے۔ غصہ ہم کو بھی آتا ہے مگر بہائم کی طرح ہمیں کچھ یاد نہیں آتا کہ یہ مرض ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ عوام کو چھوڑ کر میں اُن لوگوں کی حالت بیان کرتا ہوں جو سب کچھ پڑھے ہوئے اور جانے ہوئے ہیں اور لوگ ان کو متقی سمجھتے ہیں اور اُن کا خود بھی گمان اپنی طرف اچھا ہے اور ایسے

امراض کا علاج دوسروں کو پڑھاتے اور سکھاتے اور بتاتے ہیں لیکن اپنے آپ کبھی وقت پر نہیں سوجھتا۔ اُن کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے طب پڑھی اور دوائیں ضرورت سے بھی زیادہ جمع کرلیں۔ کوئی دوا ایسی نہیں چھوٹی جو اُس کے پاس نہ ہو مگر اتنی کسر ہے کہ استاد سے مطب نہیں کیا جب کوئی مرض پیش آتا ہے تو اُس کے لیے نسخہ ترکیب دینا ان کو نہیں آتا۔ اگر غور سے آپ دیکھیں تو اُس شخص میں اور ایک عام آدمی میں جس کو علم طب نہیں آتا۔ اور نہ دوائیں اُس کے پاس ہیں کچھ فرق نہیں۔ بلکہ اُس شخص کی حالت زیادہ افسوس کے قابل ہے کہ اس نے بہت سا وقت صرف کیا اپنے مکان کو دواؤں کے رکھنے میں گھیر دیا بہت سی رقم دوا میں لگادی اور نتیجہ وہی جو اُس عامی کو حاصل ہے کام کی چیز تو مطب ہے گو علم تھوڑا ہو دوائیں بھی زیادہ نہ ہوں لیکن وقت پہ اُن کا استعمال آتا ہو تو مرض کا علاج ہوسکتا ہے۔ اور غرض اصلی حاصل ہوسکتی ہے آج کل کے متقیوں کی حالت یہی ہے کہ دوسروں کو بتانے میں خوب چاق چوبند ہیں اور جب اپنے آپ کو کوئی بات پیش آتی ہے تو کچھ علاج انکو نہیں سُوجھتا ——— یہ صحابہ رضی اللہ عنہم وسلف میں کمال تھا۔ اسی سے ہماری اور اُن کی حالت کا فرق معلوم ہوتا ہے وقت پر علاج کرنے میں کبھی نہیں چوکتے تھے۔

غصہ کا اہل علاج

غرض عروہ کو غصہ آیا لیکن ابو وائل کہتے ہیں کہ اُنہوں نے فوراً پانی منگا کر وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور کہا کہ میرے باپ نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ان الغضب من الشیطان ان الشیطان خلق من النار یعنی غصہ شیطان کا اثر ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے دیکھئے غصہ کے وقت حرارت ہی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں چہرہ کیسا سُرخ ہو جاتا ہے

ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں یہ سب نار کے ہی فعل ہیں۔ چنانچہ شیطان سے کسی نے پوچھا کہ انسان کے جسم میں تو کہاں رہتا ہے جس وقت انسان خوش ہوتا ہے تو دل میں ہوتا ہوں اور جب غصہ ہوتا ہے تو سر کے اوپر ہوتا ہوں۔

سبحان اللہ طبیب ماہر جاہل سے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا **الغضب من الشیطٰن والشیطٰن من النّار** تو اس کا علاج بھی وہ تعلیم فرمایا جو اس کا پورا مقابل ہے یعنی یہ تعلیم فرمایا کہ غصہ کے وقت وضو کرو صرف اعضاء کا دھونا نہیں بتایا۔ اس واسطے کہ صرف نار نہیں بلکہ شیطان کا اثر ہے جو نار سے مخلوق ہے نار کا مقابل پانی اور شیطان کی شیطنت اور کفر کے مقابل عبادت عبادت تکبر کی ضد ہے اور شیطان کی تمام شیطنت کا خلاصہ کبر ہے تو وہ فعل علاج کے لیے تجویز فرمایا جو نار کا بھی مقابل ہے اور کبر کا بھی مقابل ہے یعنی عبادت ہے اور وہ فعل وضو ہے۔ صرف اعضاء کے دھونے سے حرارت بے شک کم ہو جاتی مگر عبادت شامل ہونے سے جو تاثیر پانی کی بڑھ گئی وہ سوائے اس طریقے کے اور کسی طرح حاصل نہ ہوتی۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ وضو عبادت ہے۔ اگر عبادت مقصودہ بھی۔ نہ ہو تو لازم عبادت تو ہے ہی ـــــ اور لازم شے میں بھی کچھ نہ کچھ اثر ملزوم کا ہوتا ہی ہے۔ اسکی مثال یہ ہے کہ بنفشہ اور نیلوفر اور خطمی اور ملٹھی وغیرہ بھی چند دوائیں ہیں جو طبیبوں کے نسخوں میں اکثر لکھی جاتی ہے۔ مگر انہی دواؤں سے آپ علاج نہیں کر سکتے طبیب کی پھر ضرورت ہے اور طبیب کیا کرتا ہے کہ انہی دواؤں کو ایک خاص ہیئت پہ جمع کر دیتا ہے اس ترکیب کو علاج میں بڑا دخل ہے تو آپ کو اگر مرض کا علاج کرانا ہو تو دواؤں کو اسی ترکیب سے استعمال کریں اپنی رائے کو دخل نہ دیجئے ورنہ نقصان ہو گا۔ ہم کو ہمارے طبیب روحانی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایسے موقعوں کے لیے وضو سکھایا ہے یہ کام ہاتھ پیر دھونے سے نہیں نکل سکتا جو باقاعدہ مرکب نسخہ سے نکلے تو وضو کو بالخاصہ غصہ کے دُور کرنے میں دخل ہے۔

وُضو سے قُربِ الٰہی

اتنی بات قیاس سے بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب وضو عبادت ہے اور عبادت کہتے ہیں تقرب الی اللہ کو جب انسان کو حق تعالیٰ سے قرب ہوگا تو ظاہر ہے کہ شیطان سے بُعد ہوگا بلکہ شیطان خود وہاں ٹھہر نہ سکے گا اور اُس کو دور ہونا پڑے گا سہ

دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست

آدمی جب عبادت کرتا ہے تو جتنا یہ حق تعالیٰ کی طرف چلتا ہے اُس سے زیادہ حق تعالےٰ اُس کی طرف کرم فرماتے ہیں حدیث قدسی ہے من تقرب الیّ شبرًا تقربت الیہ ذراعًا ومن تقرب الیّ ذراعا تقربت الیہ باعاو من اتانی یمشی اتیتہ ھرولۃ۔ یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں جو شخص میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو کوئی میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں۔ اور کوئی میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اسکی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ آپ وضو سے ذرا تقرب کریں گے تو حق تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا مینہ برس پڑے گا پھر جہاں حق تعالیٰ وہاں کیسا شیطان اور جہاں رحمت کی بارش وہاں کیسی آگ سہ

دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست

خدا تو خدا شیطان فرشتوں کے سامنے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ دیکھیے بدر کے قصہ میں فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ شیطان کفار کے ساتھ تھا بلکہ جنگ میں شیطان ہی بڑھاوے دیکر کفار کو مقابلہ میں لایا تھا لیکن جب دونوں طرف سے صف بندی ہوئی اور شیطان کی نظر اُن فرشتوں پر پڑی جو مسلمانوں

کی تائید کے واسطے بھیجے گئے تھے تو نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ الٹے پیروں بھاگا کا خدا تعالیٰ کا جلال اور عظمت تو بڑی چیز ہے فرشتوں کے سامنے بھی ٹھیرنے کی تاب نہ لاسکا یہاں کوئی طالب علمانہ اشکال یہ نہ کرے کہ شیطان کو کیا خوف پڑا۔ فرشتے اُس کا کیا کرتے۔ اُسے خدا تعالیٰ نے قیامت تک کی مہلت دی ہے۔ پھر فرشتے اُسے مار تھوڑا ہی ڈالتے۔ جواب اُس کا یہ ہے کہ خوف عقلی کے دفعہ کرنے کے لیے یہ دلیل کافی ہے لیکن خوف طبعی اسکی نہیں جاسکتا چاہے کتنی ہی دلیلیں قائم ہوں اسکی مثال یہ ہے کہ جب آدمی زمین پر چلتا ہے تو ایک ہاتھ بھر چوڑا راستہ اُس کے چلنے کے لیے بہت کافی ہے بلکہ اُسکی کم میں بھی چل سکتا ہے لیکن اگر ایک دیوار بہت اونچی بنائی جاوے کہ وہ ہاتھ بھر سے بھی بہت زیادہ چوڑی ہو اور اُس پر کوئی چلنا چاہے تو دلیل عقلی اور تجربہ اور مشاہدہ سب ہی کچھ موجود ہے کہ اُس پر چلنے میں کوئی خوف نہیں اور گرنے کی کچھ وجہ نہیں مگر خوف طبعی غالب آجائے گا۔ اور دیوار پر چلا نہ جائے گا۔ یہاں ایک مسئلہ اور زبان پر آگیا وہ طالب علموں کے خاص کر کام کا ہے اور میری تقریر سے کچھ زیادہ بے جوڑ بھی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ اس بدر کے قصہ سے معلوم ہوا کہ شیطان صاحب کشف ہے کفار نے بلکہ بہت سے صحابہ نے بھی فرشتوں کو نہیں دیکھا اور شیطان نے دیکھ لیا یہی کشف کہلاتا ہے اور باوجود اس کے سب جانتے ہیں کہ شیطان ملعون ہے اسکی نتیجہ یہ نکلا کہ کشف بلا اتباع شریعت شیطانی چیز ہے اور ذرا بھی فضیلت کی چیز نہیں۔

دولتِ محبّت

صلحاء کی بڑی کرامت تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت میں مستغرق رہیں انہیں کشف و کرامت کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ کی محبت وہ دولت ہے کہ تمام دنیا کی نعمتیں اُس کے

سامنے پہنچ ہیں جس کو یہ حاصل ہو اُسکو عالم کی مغیبات کی سیر کی طرف التفات ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ ایسے پہنچے ہوئے ہیں کہ اِدھر آنکھ اٹھائی بمبئی کی سیر کرلی اُدھر آنکھ اُٹھائی کلکتہ کی سیر کرلی۔ میں کہتا ہوں یہ تو شعبدہ بازی ہے جس کی نظر حق تعالیٰ کی طرف ہو وہ کیا بمبئی دیکھے گا اور کیا کلکتہ اُن کا تو یہ قول ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

حق تعالیٰ کی محبت وہ عزیز چیز ہے کہ جس دل میں ہو وہ دل اپنے ہی کانوں کو اور اپنی ہی آنکھوں کو آشنا کرنا پسند نہیں کرتا کشف و کرامت تو بہت طریق سے حاصل ہو سکتی ہے مگر یہ دولت کشف و کرامت سے بھی حاصل نہیں ہوتی خیر یہ مضمون تو بطور جملہ معترضہ کے تھا۔ بیان یہ ہو رہا تھا کہ وضو سے خدا تعالیٰ کا قرب ہو جاتا ہے اور خدا کے قرب سے شیطان ٹھہر نہیں سکتا جبکہ فرشتوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ حاصل یہ کہ وضو کو غصہ کے فرو کرنے میں بڑا دخل ہے اور شیطان جو باعث ہے غصہ کا وہ وضو سے بھاگتا ہے یہ ایک بہت مجرب علاج ہے مگر اُسی وقت کہ جب ہمیں غصہ کے وقت یاد بھی رہے کہ اس کا علاج وضو ہے لیکن ہم تو غصہ میں بالکل مغلوب ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی یاد بھی دلائے تو ہمیں سُنائی نہیں دیتا۔

اہلِ عرب کا ایمان

اور بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ وضو کرنے سے بھی غصہ فرو نہیں ہوتا اسکی وجہ صرف ضعفِ ایمان ہے ورنہ ہم نے عرب میں بدویوں کو دیکھا ہے حالانکہ وہ بالکل جاہل لوگ ہیں نہ خود علم ہے نہ علماء کی صحبت اُن کو نصیب ہے مگر اللہ اکبر حق تعالیٰ نے کیسا ایمان اُن لوگوں کے دلوں میں رکھا ہے کہ وہ بدوی

میں لڑائی ہو جاوے اور تلوار چلنے کی نوبت آجائے اور دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں اس حال میں کوئی تیسرا شخص کہہ دے یا شیخ اَصلِّ عَلَی النَّبِیّ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بس لڑائی رہے نہ جھگڑا۔ اور ان کا غصہ اور حرارت ایک دم فنا ہو جاتی ہے اس کے مقابلہ میں یہاں دیکھئے کسی کے سامنے غصہ کی حالت میں کہتے ہیں کہ میاں! اللہ میاں کا نام لے مگر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ دونوں بدو اس لفظ کو سُن کر ممکن نہیں کہ سوائے درود شریف کے اور کوئی جواب دیں اور جہاں درود شریف انہوں نے پڑھا اور ان کا جوش کافور ہوا۔

اس قصہ کے سننے کے بعد ہمارا منہ ہے کہ عرب کو کچھ بھی کہہ سکیں ان کے رگ و ریشہ میں اللہ و رسول کی محبت پلائی ہوئی ہے ذرا سا نام لیا۔ اسی کی طرف ان کا دل کھچ گیا۔ غصہ اور موجب غصہ سب فراموش ہو گیا (ذرا سا کہنا صرف لفظ کے چھوٹے ہونے کے اعتبار سے ہے ورنہ اور کون سا نام بڑا ہوگا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خدا کے نام کے بعد ہے) کمال ایمان کے یہ آثار ہوتے ہیں ہم لوگوں میں ایمان کا نام ہی نام ہے اسی واسطے غصہ کی حالت میں خود تو سوچنا کیسا کسی کے یاد دلانے سے بھی یاد نہیں آتا۔

مہربان طبیب

اور اگر کسی طرح خیال آ بھی جاوے تو بعض جگہ وضو سے بھی غصہ فرو نہیں ہوتا۔ یہ میں نے اس واسطے بیان کر دیا کہ اگر کسی کو اتفاق ہو کہ وضو سے بھی غصہ نہ جاوے تو یہ نہ سمجھے کہ علاج غیر مجرب ہے۔ بلکہ اپنا فسادِ طبیعت سمجھے جیسا کہ گلاب اور کیوڑے سے گنواروں کی بے ہوشی کا علاج نہیں ہوتا۔ نہ اس وجہ سے کہ ان میں خاصیت ازالہ بے ہوشی کی نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ان کی طبیعت گندی طبیعت ہے پاکیزہ علاج کو قبول نہیں کرتی۔ گندہ علاج چاہتی ہے انگوٹھی کا تیل اور پیاز اور لہسن سونگھایا

جائے۔ غرض ہم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کا یہ علاج سکھایا کہ وضو کرلیں اور اسی پر بس نہیں کیا۔ ایک اور علاج بھی سکھایا ہے اور یہ صرف حضورؐ کی شفقت سے ہے ورنہ کچھ ضرور نہ تھا کہ متعدد علاج سکھائیں اس کی مثال بالکل اُس مہربان طبیب کی سی ہے جس کا دل بیمار کو دیکھ کر دکھتا ہو اور ایک علاج بتلائے اور پھر اس وجہ سے کہ شاید اُس سے نہ ہوسکے دوسرا اور تیسرا متعدد علاج بتا دیئے کہ کسی طرح اسکی جان بچ جاوے۔

غصہ کا دوسرا علاج

فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا غضب احدکم فلیجلس یعنی جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اگر کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر اس سے نہ جائے تو لیٹ جائے۔ یقین کامل ہے کہ اس سے آگے کسی تدبیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس میں اہلِ لطائف نے ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ غصہ کے فرو کرنے میں لیٹنے اور بیٹھنے کو کیا دخل ہے وہ یہ ہے کہ جب آدمی کھڑا ہوتا ہے تو زمین سے اُس کے جسم کو بُعد ہوتا ہے اور بیٹھنے میں بہ نسبت زمین سے قُرب ہو جاتا ہے۔ اور لیٹنے میں اس سے بھی زیادہ زمین سے مِل جاتا ہے اور زمین کی طبیعت میں حق تعالیٰ نے انکسار رکھا ہے وہ انکسار آدمی پر بھی اثر کر جاتا ہے اور انکسار تکبر اور غضب کی ضد ہے۔ تو گویا یہ علاج بالضد ہوا اور یہی اصل الاصول علاج کا ہے اور فطری طور پر بھی یہ علاج واقعی علاج ہے تجربہ سے دیکھا جاتا ہے کہ غصہ میں بے اختیار یہ جی چاہتا ہے کہ ایسی ہیئت بنائے کہ مارنا کوٹنا پکڑنا وغیرہ آسان ہو جائے مثلاً اگر لیٹے ہوئے آدمی کو غصہ آئے تو بے اختیار اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ غصہ ہو تو کھڑا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لیٹا ہوا آدمی دوسرے کو مارنا پیٹنا ایسا نہیں کرسکتا جیسا کہ بیٹھا ہوا یا کھڑا ہوا

ہوا کر سکتا ہے تو غصہ کا مقتضائے طبعی یہی ہوا کہ آدمی لیٹا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو کھڑا ہو جائے تو بیٹھنے کو غصہ کی اصلی ہیئت سے کچھ بُعد ہے اور لیٹنے کو بہت زیادہ بُعد ہے تو یہ تعلیم عین فطری تعلیم ہوئی کہ اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ اور بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ۔

غصہ کا تیسرا علاج

اور ایک علاج تیسرا اور ہے۔ سُبحان اللہ! شارع علیہ السلام نے اخلاق کی کس قدر اصلاح فرمائی ہے ہر ہر مرض کے متعدد علاج بتا دیئے ہیں۔ اور جیسا کہ اس سے شفقت ثابت ہوتی ہے ایسی ہی یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اخلاق کی درستی اعمال ظاہر سے بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ متعدد تدبیریں اُسی کام کے لیے کی جاتی ہیں جس کی ضرورت زیادہ ہو۔ جس مکان میں معمولی اسباب ہوتا ہے اُس میں ایک تالا ڈال دیا کرتے ہیں اور جس میں کچھ قیمتی اسباب ہوتا ہے اُس میں خوب مضبوط تالا بلکہ متعدد تالے ڈالتے ہیں اور جس میں خزانہ ہوتا ہے اس میں کئی کئی قسم کے تالے ڈالتے ہیں اور مزید اعتبار کے لیے پہرا بھی رکھتے ہیں وجہ اسکی یہی ہے کہ خزانہ کی حفاظت اور اسباب سے زیادہ ضروری ہے اور خزانہ دوسرے تمام سامان سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ شارع علیہ السلام نے جن امراض کی کئی کئی تدبیریں بتائی ہیں وہ امراض ایسے نہیں ہیں جن کو سرسری نظر سے دیکھا جاوے بلکہ وہ امراض سخت امراض ہیں اور اُن سے بچنے کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے جب تو ایک تدبیر پر اکتفا نہیں کیا گیا۔

مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی بڑی توجہ اگر ہوئی تو صرف اعمال ظاہری کی طرف اور یہی بڑی معراج ہے کہ پانچ وقت نماز پڑھ لیا کریں اور رمضان میں روزے رکھ لیا کریں۔ نماز روزہ واقعی رُکنِ ایمان ہیں لیکن یہ بھی بلاشک و شبہ

سمجھ لیجئے کہ درستیٔ اخلاق من وجہ ان سے بھی زیادہ ضروری اجزاء ہیں کیونکہ اخلاق اعمال کے لیے بمنزلہ اصول کے ہیں فروع کے لیے درخت میں سے دو چار شاخوں کا بھی کٹ جانا اتنا اثر نہیں رکھتا جتنا کہ جڑ کے ایک ریشہ کا کٹ جانا رکھتا ہے۔

خیر! وہ علاج ثالث یہ ہے جس کو روایت کیا ہے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا دو شخصوں میں جھگڑا ہوا یہ دونوں صحابی تھے بشریت سے کوئی خالی نہیں۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دونوں کو غصہ آگیا ظاہراً سوٴ ادبی ضرور ہے مگر حق تعالےٰ کو ہمارے لیے ایک تعلیم پہنچانی تھی کہ وہ بلا اس غصہ کے نہ ہوتی دونوں کو غصہ آیا۔ اور خوب جھگڑا ہوا۔ دونوں میں کوئی خاموش نہ ہوتا تھا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انی اعلم کلمۃ لو قالہا لذھب عنہ مایجد یعنی میں ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر غصہ والا کو پڑھ لے تو ابھی غصہ جاتا رہے اور وہ کلمہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ ہے۔

غصہ کی طلاق

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ ایسے وقت میں فرمایا کہ جب دونوں بے قابو تھے معلوم ہوا کہ غصہ میں بے بس ہو جانا عذر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انسان مکلف ہے کہ اپنے قابو میں رہے اور اس کا علاج کرے بعض جاہل تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ غصہ میں طلاق دیدیتے ہیں اور اُس کو طلاق نہیں سمجھتے کہتے ہیں کہ ہم نے تو غصہ میں کہہ دیا تھا۔

صاحبو! یہ مسئلہ خوب کان کھول کر سُن لیجئے کہ غصہ تو غصہ طلاق ہنسی سے بھی ہو جاتی ہے اس میں نص موجود ہے ثلث جدھن جد وھزلھن جد۔ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اُن میں ہنسی اور بے ہنسی سب کا ایک حکم ہے

اُن میں سے ایک طلاق بھی ہے کوئی ہنسی میں بلا ارادہ اپنی عورت سے کہہ دے کہ میں نے طلاق دی تو طلاق ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ یا دو دفعہ دی تو رجعی ہوتی ہے یعنی اُس کی عدت کے اندر رجوع کرنا ممکن ہے جبکہ وہ مدخول بہا ہو۔ رجوع کرنے سے نکاح بدستور رہے گا۔ اور اگر تین دفعہ کہدیا تو مغلظ طلاق ہو گئی۔ اب کوئی صورت اس نکاح کے لوٹنے کی نہیں رہی۔ گھر گھر ستی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہی حکم ہنسی کا ہے اور یہی حکم غصہ کا۔

بی بلیں بھی اس حکم کو اچھی طرح سُن لیں یہ بھی عام مرض ہے کہ عورتوں میں مزاج شناسی بہت کم ہے بسا اوقات مرد ناخوش ہوتا ہے اور بیویاں اس کو جواب دیئے جاتی ہیں بات کو دباتی نہیں بلکہ بڑھائے جاتی ہیں حتیٰ کہ اس وقت وہ غصہ میں طلاق دے بیٹھتا ہے۔

ایسے واقعات بہت ہوئے ہیں کہ بعد میں دونوں پچھتائے اور صرف ان کے گھر کو نہیں بلکہ دو خاندانوں کو آگ لگ گئی۔ اور بعض عورتیں تو ایسی بے ہودہ ہوتی ہیں کہ کھڑے بیٹھے مرد سے کہتی ہیں کہ طلاق دیدے بس اور کیا کریگا۔ عورتیں اور مرد سب یاد رکھیں کہ طلاق کا لفظ ہی زبان پر نہ آنے دیں ہنسی میں ہو یا غصہ میں۔ یہ لفظ ایسا کام دیتا ہے جیسے بھری ہوئی بندوق کے گھوڑے کی کیل دبادی کہ ہنسی میں دباؤ جب گولی لگ جائے گی اور غصہ میں دباؤ جب گولی لگ جائیگی غصہ میں بے قابو ہو جانے کو شریعت یا کوئی قانون عذر قرار نہیں دیتا۔ اپنے غصہ کو قابو میں رکھئے اور وہ تدبیریں پہلے سے معلوم کر لیجئے جو اس وقت شارع علیہ السلام نے یہ تعلیمیں عبث نہیں دیں آپ ہی کے کام کی چیزیں سکھائی ہیں۔

ابوالہوسی آجکل لوگوں کو ریاضت اور مجاہدہ کا بہت شوق ہے مگر انہیں نہیں معلوم کہ مجاہدہ کسے کہتے ہیں مجاہدہ صرف یہ نہیں ہے کہ آنکھ ناک

کو معطل کر کے خلوت میں بیٹھ جائے بلکہ مجاہدہ کی حقیقت ہے مخالفتِ نفس۔ نفس کی ہر وقت نگرانی رکھنا چاہیئے جس بات میں نفس کو لذت حاصل ہو اُسکو ایک دم نہ کر ڈالے۔ بلکہ یہ سوچے کہ اسکو شریعت نے جائز رکھا ہے یا نہیں اگر جائز رکھا ہو تو خیر ورنہ اُس سے بتکلف رُکے اور ہمت سے کام لے اس میں ابتداءً کچھ تنگی دقتیں ضرور پیش آئیں گی۔ مگر اہل ہمت کا کام یہی ہے کہ اثنار راہ کے عوائق سے نہ ڈریں اور مقصود پر نظر کئے ہوئے چلے جائیں ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

یہی کلفتیں ہیں جن کی نسبت حق تعالیٰ کا وعدہ ہے فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اور وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۞ انتہاءً سہولت ہو جاتی ہے مگر ابتداءً وقت سے خالی نہیں انہیں دقتوں سے بچنے کے لیے کم ہمت لوگوں نے مجاہدہ میں دو تصرف کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو منحصر مان لیا خلوت گزینی میں۔ دوسرے یہ کہ اُس کو اپنے ذمہ میں نہیں رکھا کسی بزرگ سے ہاتھ جا ملایا اور اپنا سارا بوجھ اُن پہ لاد دیا۔ باقی جو بات کرنے کی ہے اُس کا ذکر بھی نہیں۔ بزرگوں سے فرمائش کی جاتی ہے کہ ایسی توجہ دیجئے کہ ہماری نماز قضا نہ ہوا کرے مگر خود ہمت نہیں کرتے۔ پیر صاحب کے بھروسہ بیٹھے ہیں۔ بعض کو تو یہ سُنا کہ نماز بالقصد قضا کرتے ہیں اور پیر صاحب سے جا کر کہتے ہیں کہ اگر آپ میں کچھ تصرف ہو تو پڑھوا لیجے۔

تعجب ہے کہ جب مریض ہوتے ہیں تو اس انتظار میں نہیں رہتے کہ طبیب خود آکر نسخہ لکھے اور دوا پلا دے اور اُس سے یہ نہیں کہتے کہ تم میں کچھ زور ہے تو ہمارا علاج کر لیجئے وہاں جا کر تو خود طبیب کے سو نخرے اٹھاتے ہیں اور اگر نخروں کے بعد بھی وہ نسخہ لکھ دیں تو اُن کے ممنون ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مرض جسمانی سے ہر اس ہے

اور امراض روحانی سے ہراس نہیں - یہ صرف ٹالنے کی باتیں ہیں کہ پیر صاحب کے اوپر سارا بوجھ رکھا جاتا ہے اگر اُن کی توجہ ایسی کافی ہوتی تو وہ نماز ہی کیوں پڑھواتے بدوں نماز ہی آپ کو جنت میں بھیجدیتے - حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے "دو لوگ آتے ہیں اور کہتے ہیں کچھ سینہ میں سے عنایت کیجئے کیا سینہ کوئی جھولی ہے؟ کہ ہاتھ ڈالیں اور نکال کر دیدیا کریں"

ایک شخص نے بمبئی میں حضرت سے درخواست کی کہ دعا کر دیجئے کہ مجھے بھی حج نصیب ہو [وہ شخص متمول تھا مگر جانے میں سستی کرتا تھا] فرمایا ہاں ایک شرط سے کہ جس روز جہاز کے چلنے کا دن ہو مجھے اپنے اوپر پورا اختیار دیدو، اُسنے پوچھا کہ اسسے کیا ہوگا - فرمایا جس روز جہاز جانے لگے گا تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز پر بٹھادوں گا جو میں کہوں وہ کرو اور دعا بھی کرونگا حج ہو جائے گا - ہر کام کے لیے کچھ قواعد مقرر ہیں کہ ان قواعد پر چلنے سے وہ کام ہوا کرتا ہے - حق تعالیٰ کی قدرت دوسری چیز ہے - عادت یہ ہے کہ اُن قواعد کے ذریعہ سے کام ہوتا ہے وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا خود قرآن مجید میں موجود ہے گھر میں داخل ہونا ہر طرف سے ممکن ہے - مگر اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ متعارف راستہ سے گھر میں آؤ - اسی سے علماء کہتے ہیں کہ ہر کام کو اسکے صحیح طریق سے کرنا چاہیے اور یہ صرف بوالہوسی ہے کہ اُس کے ذریعہ کو اختیار نہ کیا جائے اور کام ہو جانے کی تمنا کی جائے خود ذرا سا بھی نفس پر بار نہ ڈالو اور پیر صاحب کے مجبور سے بیٹھے رہو کہ وہی نماز پڑھوادیں اور وہی تمام امراض کو دور کردیں یہ اُن کے حوصلے ہیں جو مرد کہلاتے ہیں

تعویذ کا غلط مَصرف

اور عورتوں کی حالت جو کہ جاہل اور دین سے ناواقف ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا جو عورتیں دیندار کہلاتی ہیں اور کچھ علم والی بھی سمجھی جاتی ہیں اُن کی فرمائش مشائخ سے یہ ہوتی ہے

کر دیجیے تو غیبت ہم سے نہیں چھوٹتی اور غصہ ہمارے قابو میں نہیں آتا کوئی وظیفہ بتا دیجیے جس سے یہ دونوں باتیں چھوٹ جائیں اور اُس طریق سے چھوڑنا نہیں چاہتیں جو اُس کے لیے مقرر ہے جس کی تعلیم حدیث میں آچکی ہو۔ کوئی بی بی کہتی ہے کہ ہم کو نیک بخت بنانے کے لیے ایک تعویذ دیدیجیے میں کہتا ہوں کہ جب تعویذ میں یہ اثر ہے کہ اُس سے ہر کام ہو سکتا ہے۔ تو بس علماء کی اور کتابوں کی کیا ضرورت ہے بلکہ دُنیا میں کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں۔ ایک تعویذ لکھوالو جس سے پیٹ بھر جایا کرے اور ایک ایسا لکھوالو جس سے بال بچے ہو جایا کریں۔ اور ایک وہی جس سے نیک بخت بن جاؤ بس علماء کو اور کتابوں کو بالائے طاق رکھو اور دنیا کے سارے دھندے چھوڑ دو۔ سب کام تعویذوں سے ہو جایا کریں گے۔ میں کہتا ہوں۔ حاشا وکلا تعویذ میں اگر اثر ہے تو صرف اتنا کہ جسمانی بیماری جاتی رہے۔ درد سر۔ بخار وغیرہ کو نفع ہو جائے جیسے اور علاج ہیں ویسے ہی یہ بھی ایک علاج ہے۔ رہے احکام شرعیہ تو اُن کا تو مکلف ہی حق تعالیٰ نے اس واسطے کیا ہے کہ اپنے اختیار سے کر کے دکھاؤ کسی دوا یا تعویذ سے اعمال شرعی نہیں ہوتے اپنے ارادہ اور ہمت سے ہوتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ تعویذ لکھنے والوں نے ہی خرابی ڈالی ہے اپنے کھانے کمانے کی وجہ سے کسی حاجت والے کو جواب دینا جانتے ہی نہیں۔ سر میں درد ہو تعویذ لکھ دیں کسی کو معاش کی تنگی ہو اُس کے لیے تعویذ لکھ دیں۔ کسی کا بیٹا کھو گیا ہو اس کے واسطے تعویذ لکھ دیں کسی کو دور کا حال معلوم کرنا ہو تو اُس کو تعویذ لکھ دیں۔ تعویذ کیا کہ ایک غیب کی کنجی ہے اور یہ کام چل پڑتا ہے اس واسطے کہ بیس کاموں کے لیے تعویذ لکھا اور دس اُن میں سے اور اسباب سے ہو ہی جاتے ہیں اس سے لوگوں کو خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ واقعی ان کے تعویذ میں بڑا اثر ہے۔ حالانکہ وہ کام ہونے والے تھے ہی یہاں تک کہ بعض تعویذ لکھنے والوں کو دیکھا

کہ کاغذ میں کچھ لکھتے بھی نہیں آنکھ بچا کر سادہ کاغذ موڑا اور دیدیا اور جو کام ہونے والا ہے وہ اس صورت میں بھی ہو ہی جاتا ہے۔ ان تعویذ لکھنے والوں نے لوگوں کو اس کا عادی بنا دیا ہے خیر وجہ جو کچھ بھی ہو۔ عورتوں کی بڑی ہمت فی زمانہ یہی ہے کہ کوئی تعویذ حاصل کرلیں یا کوئی وظیفہ پڑھ لیں۔ وظیفہ پڑھنے میں عورتیں بہت پکی ہیں اور مردوں کو ہمت بھی بس اتنی ہے کہ اپنے سارے کام پیر صاحب کے حوالہ کردیں ان کی توجہ و دعا سے ہی چاہتے ہیں کہ سب کچھ ہو جائے۔

تاثیرِ دُعا

دعا بے شک بڑی چیز ہے لیکن یاد رکھو امور اختیاریہ میں۔ تاثیر دعا کی اتنی ہی ہے کہ وہ اسباب جو دُعا سے پہلے ہوں ان میں برکت ہوتی ہے اور ان اسباب کے جو کچھ مفاسد ہوں اُن سے آدمی محفوظ رہتا ہے دُعا کا خاصہ ہے کہ اگر اسباب ضعیف بھی ہوں تو اُن کو قوی کر دیتی ہے تو اُس کا طریقہ یہی ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ تدبیر بھی کرو اور خالی تدبیر پر اسلئے اکتفا مت کرو کہ اُس پر انسان کو اعتماد ہو جاتا ہے۔

مفسدۂ تدبیر

چنانچہ غور کرکے دیکھو جتنے تدبیر کرنیوالے انکو اپنی تدبیر پر بڑا اعتماد ہوتا ہے اور اسی اعتماد سے حق تعالےٰ سے بُعد پیدا ہوتا ہے ـــــــــــــــ اور یہ تدبیر کا بڑا مفسدہ ہے اس واسطے کسی بزرگ کی دعا کو اپنے کاروبار میں شامل رکھو اُن کی دعا سے وہ اسباب موجب ثمرہ ہوں گے اور اُس کے مفسدہ سے بچے رہو گے۔ اس کو خوب سمجھ لو یہ وہ کام میں نے بتایا جو اہل دُنیا کو اہل اللہ سے لینا چاہیئے اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اہل اللہ اسی کام کے لیے موضوع ہیں اور تم کو اس کے سوا اُن سے کچھ کام نہ لینا چاہیئے اصل کام جو اُن سے لینا ہے وہ اور ہی ہے جو مقصودِ حق تعالےٰ نے اُن کے سپرد کیا ہے اور وہ تہذیب اور تکمیلِ نفس

ہے یہ اُن سے ضرور حاصل کرو اگر اس کے ساتھ دنیا میں بھی اسی طرح مدد لو گے جو میں نے بتایا تو کچھ حرج نہیں لیکن صرف دنیا ہی کا کام اُن سے لینا گو وہ اسی طرح ہو جس طرح کہ میں نے بتایا وہ بھی ایسا ہے جیسے کہ ایک شخص اشرفیاں تقسیم کر رہا ہو اور تم اُس سے ایک کوڑی مانگو۔ جب وہ اشرفیاں بانٹ رہا ہے تو کوڑی کا دینا اس کے نزدیک کوئی بات نہیں بلکہ اور سہل ہے لیکن تمہاری حالت قابل افسوس ہوگی کہ اشرفی کی قدر نہ کی۔ اور کوڑی کا حوصلہ کیا اہل اللہ سے قرب الی اللہ حاصل کرو وظیفہ اور تعویذ کو منتہائے ہمت نہ قرار دو نہ پیر سے ہاتھ ملا کر بے فکر ہو کر بیٹھ جاؤ ہاتھ ملانے سے یہ غرض رکھو کہ وہ تم کو وصول الی اللہ کے طریقے بتائیں اور مہمات امور دینیہ میں تمہارے مددگار رہیں۔ یہ اُن کا کام ہے اور اُن طریقوں پر عمل کرنا تمہارا کام ہے جیسا کہ کسی سر رشتہ میں نوکری کرنے کیلئے وسائل کو تلاش کیا جاتا ہے جس سے غرض یہ نہیں ہوتی کہ بلا محنت تنخواہ مل جایا کرے۔ بلکہ صرف وسائل کا یہ اثر مانا جاتا ہے کہ نوکری مل جاوے پھر کام کرنا اور تنخواہ لینی اپنا کام ہے۔ پیر صاحب سے بیعت کرو تاکہ تم کو حق تعالیٰ کے دربار میں رسائی ہو جاوے اور کام مل جائے پھر کام کرو اور ترقی کرتے چلے جاؤ۔ وہاں پیر صاحب ہر وقت آپ کی امداد اتنی کریں گے کہ سر رشتہ میں کوئی نہیں کر سکتا رہا یہ کہ اُن سے ہاتھ ملا کر آپ تکلیفات شرعی سے فارغ ہو جائیں سو یہ غلطی ہے اور نفس کا مغالطہ ہے جس سے وہ کام سے روک دینا چاہتا ہے محنت کرو۔ نہ اپنا کام دوسرے پر ٹالو نہ بے قاعدہ محنت کرو۔ صرف آنکھ کان کو معطل کرنے کا نام مجاہدہ نہ رکھو۔ مجاہدہ یہ ہے کہ ہر وقت اپنے حالات میں غور کرتے رہو جو بات اہل اللہ سے سُنی ہو اس پر عملدرآمد رکھو اور وقت پر اُس سے کام لو صرف سننے یا پڑھنے پر کفایت نہ کرو جب کوئی طب کی کتاب پڑھتا ہے تو اس سے حاصل یہی نکلنا چاہیے کہ جب مرض پیش آئے علاج کر سکے اور اگر علاج نہ کر سکا تو خواندہ ناخواندہ برابر ہے

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہی حالت تھی کہ جتنا سنتے تھے اس کے کاربند ہوتے تھے اور اپنے امراض کا علاج وقت پر ضرور کرتے تھے۔ گویا طب سے کام لینے والے یہی لوگ تھے اور جاننے کو ہم بھی سب کچھ جانتے ہیں وہ علوم اب تک باقی ہیں ہاں عاملوں کی کمی ہے۔

علماء کا احسان

غرض غصہ کے علاج اسی واسطے بتائے گئے ہیں کہ عین غصہ کی حالت میں کام دیں۔ ان کو یاد رکھیے اور غصہ کے وقت ان کو استعمال کیجیے۔ غصہ سے مغلوب ہو جانا عذر نہیں ہے۔ دیکھو حضور صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو غصہ کی حالت میں علاج کی تعلیم فرمائی۔ یہ تین علاج حدیث میں آئے ہیں۔ علمائے امت نے غصہ کے چند علاج اور بھی لکھے ہیں اسکو یہ سمجھنا چاہیے کہ علماء کی ایجاد ہے اور دین میں کچھ کمی تھی جس کو انہوں نے پورا کیا بلکہ اس کو دین کے ساتھ تفصیل اور اجمال یا متن اور شرح کی نسبت ہے شارح فن کا موجد نہیں ہوتا۔ ہاں موضح ہوتا ہے۔ دین میں ترمیم اور ایجاد کا کسی کو منصب نہیں اور توضیح کے واسطے حق تعالیٰ نے علماء کو پیدا ہی کیا ہے۔ ہم لوگوں کی آسانی کے واسطے قواعد شرع سے وہ باتیں مستنبط کر کے لکھ دیں کہ ہماری نظر ان تک نہ پہنچتی یا پہنچتی تو بہت محنت کے بعد یہ علماء کا ہمارے اوپر احسان ہے کہ ہم کو بہت سے کام سے سبکدوش کر دیا اور لکھ کر نسخہ ہمارے ہاتھ میں دے دیا کتاب میں تلاش کرنے کی زحمت سے بھی بچا دیا۔ اس امت کے علماء نے خدا کے فضل سے دین کی خدمت ایسی کی ہے کہ نظیر ملنا مشکل ہے اسکی مثال ایسی ہے کہ ماہر طبیب ایک مرض کے متعدد نسخے لکھ سکتا ہے حالانکہ کتاب میں ایک ہی نسخہ لکھا ہے وہ نسخے اسکی ایجاد نہیں ہوتے۔ بلکہ ان اصول کلیہ سے مستنبط ہوتے ہیں جو طب میں موجود ہیں وجہ یہ ہے کہ جزئی علاج ہر زمانہ میں بدلتے رہتے ہیں۔ اور کلیات وہی ہیں جو مدت

سے چلے آتے ہیں۔ یہاں سے ان تدبیروں کے بدعت ہونے کا شبہ جاتا رہا۔

فائدہ: بدعت کے متعلق جو حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد۔ اس میں لفظ مالیس منہ بتا رہا ہے کہ اس وہ ایجادیں مراد ہیں جو اصول دین کے خلاف ہوں اور جو ایجادیں اصول دین کی مؤید ہوں وہ دین میں داخل ہیں اس وقت بدعت کی تحقیق بیان کرنا مجھے مقصود نہیں صرف اشارۃً کچھ بیان کر دیا ہے ذرا غور کرنے سے اس کے تمام باتیں نکل سکتی ہیں۔

غصّہ کے دیگر علاج

غرض ایک علاج غصہ کا علماء نے یہ کہا ہے کہ اس جگہ سے علیحدہ ہو جائے ظاہر ہے کہ جب دوسری جگہ چلا جائے گا تو نہ وہ شخص موجود ہوگا جس پر غصہ آیا نہ وہ اسباب وہاں موجود ہوں گے جو باعث غصہ کے ہوئے تھے۔ غصہ آپ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور ایک علاج یہ ہے کہ جسکو غصہ زیادہ آتا ہو ایک کاغذ پر یہ لفظ لکھ کر کسی ایسے موقعہ پر لگا دے کہ اس پر ضرور نظر پڑتی ہو وہ لفظ یہ ہے "خدا تعالیٰ کو تجھ پر اس سے زیادہ قدرت ہے کہ جتنی تجھ کو اس پر ہے" غصہ جبھی آتا ہے کہ جب دوسرے کو اپنے سامنے کمزور پاتا ہے اور جب دوسرا زبردست ہوتا ہے تو غصہ نہیں آتا۔ بلکہ اگر تیسرا بھی ایک زبردست موجود ہو اس کے سامنے بھی تو غصہ نہیں آتا۔ کہیں ایک ہاتھی مست ہوگیا تھا اور لوگوں کو مارنا شروع کیا بہت تدبیریں کیں مگر قابو میں نہ آیا۔ یہاں تک کہ مالک نے اجازت دیدی کہ گولی سے مار دیا جائے ایک پرانے فیل بان نے یہ تدبیر بتائی کہ ایک شیر ببر کا کٹ گھرا اس کے سامنے لاکر رکھ دو۔ بس شیر کا لانا تھا کہ وہ مستی اور شور سب جاتا رہا اور ہاتھی چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ ہاتھی کی بھی جان بچ گئی اور مالک کا بھی نقصان نہ ہوا۔ اسی طرح جب

اس عبارت کو دیکھ کر ایک قادر قوی کا استحضار ہوگا۔ یعنی حق تعالیٰ کی عظمت اور جبروت ذہن میں گذرے گی۔ بس پھر غصہ کا نام کہاں۔ اور ایک علاج یہ ہے کہ گو غصہ اپنے سے کم مرتبہ والے پر آیا ہے مگر انسان سوچے کہ اسکی کیا دلیل ہے کہ میں بڑا ہوں اور یہ چھوٹا ہے۔ اس وقت میں زبردست ہوں لیکن ممکن ہے ابھی ذرا دیر میں یہ شخص زبردست ہو جائے اور میں زیر دست ہو جاؤں ایسے واقعات دنیا میں دن رات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ہماری صرف کوتاہ نظری اور غفلت ہے کہ یاد نہیں رکھتے اور اگر مان بھی لیا جاوے کہ وہ شخص زبردست نہیں ہو سکتا تو دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ یہ سوچنا چاہیئے کہ ممکن ہے کہ آخرت میں مجھ سے بہتر ہو اور بلکہ دنیا ہی میں خدا تعالیٰ کے نزدیک مقرب ہو اور حق تعالیٰ کے اولیاء میں سے ہو کسی کی نیکی اور بدی پیشانی پر لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے اولیاء میں سے ہے تو اسکی نسبت حق تعالیٰ کا یہ اعلان ہے کہ میرے اولیاء کو جو کوئی ستاتا ہے تو میں اُس کو اُس نظر سے دیکھتا ہوں جس سے شیر اُس شخص کو دیکھتا ہے جو اُس کے بچوں کو چھیڑتا ہے اور ایک حدیث ہے من عادی لی ولیًّا فقد اذنتہُ بالحرب فلیغر بحرب من اللّٰہ (یہ روایت تفسیر مظہری کی ہے) یعنی جو شخص میرے کسی مقرب بندہ سے عداوت رکھے میں اُسکو اعلانِ جنگ دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے لڑنے کے لیے تیار رہے العظمۃ للّٰہ۔ جب کسی دنیا کے حاکم سے بگاڑ ہو جاتا ہے تو کسی کی کچھ نہیں چلتی۔ خدا تعالیٰ کے سامنے کیا کوئی پیش لے جا سکتا ہے تو گو وہ شخص ضعیف ہے مگر اُس کی پناہ پر سب سے بڑا زبردست موجود ہے۔

غرض اس مضمون کے استحضار سے بھی وہی کام نکلے گا جو شیر کا کھٹکا ہاتھی کے سامنے رکھنے سے نکلا تھا۔ غرض اتنے علاج علماء نے لکھے ہیں گو کلام کو

طول ہوگیا۔ اور بظاہر زائد مضامین بیان ہوئے لیکن ان کی قدر وہ شخص جان سکتا ہے جو غصہ کو بُرا سمجھتا ہو اور جس کو غصہ کا علاج کرنا منظور ہو غصہ کی بُرائی کوئی معمولی بُرائی نہیں ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھ کو کوئی خاص نصیحت کیجئے حضورؐ نے فرمایا لَا تغضب اُس نے پھر اور درخواست کی آپ نے فرمایا لا تغضب اُس نے پھر اور درخواست کی۔ آپ نے فرمایا لا تغضب یعنی غصہ نہ کر، اور غصہ نہ کر اور غصہ نہ کر۔ تاکید کے واسطے تین دفعہ مکرّر فرمایا۔ اُس شخص کی درخواست پر ایک بار جواب دینے سے جو کچھ غصہ کی برائی ثابت ہوتی ہے وہی کیا کم تھی کیونکہ قرینہ مقام بتا رہا ہے کہ کوئی خاص نصیحت اور کام کی باتوں کا لُبِّ لباب ہے۔ چہ جائیکہ تاکید پر تاکید فرمائی۔

معلوم ہُوا کہ غصہ بہت ہی قابل اہتمام چیز ہے اور اُس کی برائی کوئی معمولی بُرائی نہیں۔ جب کوئی مرض بڑا اور خطرناک ہو تو اُس کے لیے علاج بھی بڑے ہونے چاہئیں بڑائی کمّاً بھی ہوتی ہے اور کیفاً بھی۔ اسی کمیت بڑھانے کے لیے علماء نے اتنے علاج بتلائے ہیں تو بلاشبہ علماء نے اسی تاکید پر عمل کیا جو اس حدیث میں تکرار لفظ سے نکلتی ہے۔ یہ علماء کے لکھے ہوئے علاج ... اصول دین سے مستنبط اس طرح ہیں کہ معالجات واردہ فی الحدیث اصل علاج بالضد ہے۔ وہی یہاں بھی موجود ہے۔ قرب من الاسباب وجود شئی میں دخل رکھتا ہے اور اس کی ضد بعد عن الاسباب ہے۔ سبب اصلی غصہ کا کیفیت اور مغضوب علیہ کا سامنے ہونا اُس کا معین ہوجاتا ہے۔ پچھلے دو علاجوں میں کبر کا دفعیہ ہے اور اس جگہ سے ٹل جانے میں معین غضب کا دفعیہ تو یہ سب علاج بالضد

ہوئے سبحان اللہ! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے کیسے طبیب ہیں کہ ایسی چیز بتادی جو دنیا اور دین دونوں کی خرابی سے بچانے والی ہے یہ غصہ ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی قتل کی مباشرت کر بیٹھتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے طلاق دے بیٹھتا ہے اور گھر ویران کر لیتا ہے۔ اور غصہ طبعاً بھی مضر ہے مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مجھے غصہ آیا تھا تو رات بھر نیند نہیں آئی نیند نہ آنے سے جو صحت پر برا اثر پڑتا ہے وہ پڑا تو یہ غصہ کی ہی خرابی ہوئی۔

غصہ کا محل

یہاں کوئی سوال کر سکتا ہے کہ جب غصہ ایسی بری چیز ہے تو انسان میں اسکی ترکیب کیوں رکھی گئی ہے اس کا جواب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصول سے دیتا ہوں۔ حضرت فرماتے تھے ہر چیز میں برائی اور بھلائی دونوں ہیں موقع استعمال کے فرق سے ایک ہی چیز خیر اور شر ہو جاتی ہے جیسے روپیہ کہ اسی سے آدمی کی بسر معاش ہے اور اسی کو جرائم میں خرچ کیا جاوے تو آدمی مجرم بن جاتا ہے تو اسی روپیہ کی بدولت جس سے آرام پاتا تھا۔ اب قسم قسم کی تکالیف اٹھاتا ہے وجہ یہی ہے کہ بے موقعہ خرچ کیا گیا۔ اسی طرح غصہ کو حق تعالیٰ نے مصرت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس میں دفعہ کا ایسا اثر ہے جیسے تلوار میں کاٹنے کا کسی اپنے عزیز کے گلے پر تلوار رکھدو جب بھی کاٹے گی اور کسی دشمن کے گلے پر رکھو۔ جب بھی کاٹے گی پس غصہ میں فی ذاتہ کوئی برائی نہیں بلکہ قصور کام لینے والے کا ہے۔ اعداء اللہ کے مقابلہ میں اس سے کتنا کام لے سکتے ہیں اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو حضرت حاجی صاحب اس کے استعمال کا موقع بتاتے ہیں کہ اپنے نفس پر اس کام لو کیونکہ سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے اعدی عدوک التی بین جنبیک۔ جب غصہ میں تلوار کی طرح سے دشمن کے دفع کرنے کی خاصیت ہے تو اس موقع پر بڑا اچھا

کام دیگا غصہ دوسروں پر چلانے سے پہلے اپنے اس بڑے دشمن پر چلائیے یہ نفس آپ کا ایسا چھپا دشمن ہے کہ جس کی دشمنی کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ دوسرے دشمن آپ کے کھلم کھلا مخالف ہوتے ہیں اور یہ جو کام آپ سے کراتا ہے لذات اور شہوات کے پردہ میں کراتا ہے تو اس کی ایسی مثال ہوگئی جیسے آپ کا ایک مخالف آپ کو سنکھیا دے اور کہے کہ یہ کھا لیجئے آپ اسکو ہرگز نہ کھائیں گے اور ایک آپ کا دوست جو درحقیقت دشمن ہو اور آپکے قتل کی فکر میں ہو لڈو میں ملا کر زہر دیدے تو آپ اسکو بڑے شوق سے کھالیں گے اور جب تک اس زہر کا اثر نہ ہوگا آپ کو ذرا بھی وہم نہ ہوگا۔

اسی طرح نفس آپ سے لذات اور شہوات کی آڑ میں ایسے بڑے کام کرا دیتا ہے کہ اُن کے نتیجے بہت ہی خراب ہیں اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا جس وقت وہ نتائج ظاہر ہوں گے تو اُن کا تدارک مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً کسی سے ناخوش ہو کر آپ نے اُس کی غیبت کی تو اُس وقت تو آپ کو ایک قسم کی لذت حاصل ہوئی لیکن وہ کام ہو گیا جس کا تدارک اب آپکے ہاتھ میں نہیں جیسا کہ تیر کمان سے چھوٹنے کے بعد تیرانداز کے قبضہ میں نہیں رہتا۔ اب یہ گناہ اپنے نتائج ضرور لائے گا توبہ سے بھی معاف نہیں ہو سکتا چونکہ حق العبد ہے اُس سے معاف کرائیے جس کی غیبت کی مگر اس سے کیا امید ہے کہ وہ معاف کریگا جب اُسے معلوم ہو گا کہ میرے بلا معاف کئے معاف نہیں ہو سکتا۔ اور معاف کرنے کی صورت میں اُس کو نیکیاں ملیں گی۔ دیکھئے کہ نفس نے لذت کی آمیزش سے آپ کو کس خطرناک بات میں ڈال دیا تو اُس کی دشمنی کیسی کچھ گھری ہوئی اُس ہتھیار کو جو خدا نے دفع مضرت کے لیے دیا ہے یعنی غصہ کو ایسے دشمن کے مقابلہ میں استعمال کیجئے تو اعلیٰ درجہ کی عقلمندی ہے۔

ضبطِ غضب کا انعام

مگر یہ کوئی آسان کام نہیں نفس پر تو اس کا استعمال بہت ہی مشکل ہے نفس کی خواہش کی جگہ سے غصہ کو روکنا بھی کچھ آسان نہیں۔ اسی واسطے اس کا اجر بھی بہت ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے غصہ کو روک لے ایسی حالت میں کہ وہ اُس کے اجراء پر قادر ہے اس کو خدائے تعالیٰ قیامت کے دن علیٰ رؤس الخلائق با اختیار کر دیں گے کہ جس حور کو چاہے پسند کرے جیسا عمل ہوتا ہے ویسا ہی اجر ہوا کرتا ہے اجر کا بڑا ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ عمل بھی مشکل ہے اور واقعی غصہ کا روکنا کوئی آسان بات نہیں آدمی غصہ میں اپنا قتل تک بھی کر ڈالتا ہے مگر آدمی ہمت کرے اور خیال رکھے تو کچھ دشوار بھی نہیں خدا تعالیٰ نے انسان کو قدرت بھی دی ہے غصہ سے مجبور نہیں پیدا کیا۔ ہاں ہمت شرط ہے نفس کے کہنے کے موافق نہ کیا یہ غصہ کا بیان ہوا۔ اس کو طول اس واسطے دیا گیا کہ عورتیں اس میں بہت بتلا ہیں۔

مرد و عورت کے غصہ کا فرق

اس میں کوئی بی بی یہ شبہ نہ کریں کہ غصہ تو مردوں میں زیادہ ہوتا ہے بات بات پر لڑتے اور چلاتے ہیں عورتیں اتنا کہاں چلاتی ہیں۔ بیبیو یہ سمجھ لو کہ چلانے کا ہی نام غصہ نہیں بلکہ دل میں ناخوش ہونے کا نام غصہ ہے مردوں کے مزاج میں حرارت ہوتی ہے اس واسطے اُن کی ناراضی کا اثر مارنے پیٹنے چلانے وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے اور عورتوں کی فطرت میں حیا و برودت رکھی گئی ہے اس واسطے اس ناراضی کا اثر کم ظاہر ہوتا ہے ورنہ درحقیقت اس ناراضی میں عورتیں مردوں سے کچھ کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں اور چونکہ عقل میں ان کے نقصان ہے موجب ناراضی کو صحیح سمجھ بھی نہیں سکتیں ان کو ایسے موقعوں پر بھی غصہ آ سکتا ہے جہاں مردوں کو نہیں آتا۔

[illegible]

خانگی لڑائیوں کا راز

[illegible]

تمہاری شکایت کر رہی تھیں سُننے والی کہتی ہیں کہ میرے بلا ہی بہت ایماندار ہے" بے سُنے اُس نے کبھی نہیں کہا ہو گا گھروں میں ہمیشہ لڑائی ایسی ہی باتوں پر ہوتی ہے کسی خدا کی بندی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ جب شکایت سُنے تو اُس بیچ کے واسطہ کو قطع کر کے خود اُس شکایت کرنے والی سے پوچھ لیں کہ تم نے میری شکایت کی مسنون طریقہ بھی ہے کہ اگر کسی سے کچھ شکایت دل میں ہو تو اُس شخص سے ظاہر کر دے کہ تمہاری طرف سے میرے دل میں یہ شکایت ہے اس شخص سے اس کا جواب مل جائے گا اور اگر وہ شکایت غلط تھی تو بالکل دفعیہ ہو جائے گا اور سُنی سنائی باتوں پر اعتبار کر لینا اور اُس پر کوئی حکم لگا دینا بالکل خلاف نصوص اور جہالت ہے۔ اسی موقعہ کے ارشاد ہے اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ اور قرآن شریف میں موجود ہے اِجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ اور ہم نے تو تجربہ سے تمام عمر دیکھا کہ سُنی ہوئی بات شائد کبھی سچ نکلتی ہو ایک شخص کا تو قول ہے کہ ایسے واقعات کی روائتیں کہ جن سے راوی کا کچھ ذاتی تعلق بھی نہ ہو اور راوی بھی ایسا ہو کہ جھوٹ کا عادی نہ ہو تب بھی جب کبھی دیکھا گیا تو تمام باتوں میں سے چوتھائی بھی سچ نہیں نکلیں اور اُن باتوں کی روایت کا تو پوچھنا ہی کیا ہے جن میں راوی کی ذاتی اغراض بھی شامل ہوں جیسے جلاہیوں اور بھنگنوں کی روائتیں گھروں میں جہاں کہیں خانہ جنگیاں ہیں وہ سب ان ہی بھنگنوں اور جلاہیوں اور کہاریوں وغیرہ کی روائتوں پر ہیں۔ بات کی اصلیت کچھ بھی نہیں ہوتی کچھ حاشیے اُس پر روایت کرنے والی لگاتی ہیں اُس سے یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ فلانی ہماری مخالف ہے بس اسی خیال و وہم سے کچھ حاشیے یہ سننے والی لگا لیتی ہیں بس اچھی خاصی لڑائی ٹھن جاتی ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے جنگل میں آدمی رات کے وقت اکیلا ہو اور شیر

سکا اس کو خوف ہو تو جب وہ ایک طرف کو دھیان جماتا ہے تو کوئی درخت اسے شیر معلوم ہونے لگتا ہے پھر جب خیال کو اور ترقی ہوتی ہے تو اُسی خیالی صورت میں ہاتھ پیر بھی نظر آنے لگتے ہیں اور سچ مچ کا شیر بن جاتا ہے حالانکہ واقع میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف وہم کی کارگزاری ہوتی ہے اسی طرح سُنی سُنائی باتوں میں نفس اختراع کرتا ہے اول تو کچھ آمیزش نقل کرنیوالے ہی سے شروع ہوتی ہے۔ پھر جسکے سامنے وہ خبر بیان کی گئی وہ پہلے سے عیب جوئی کے لیے تیار ہوتی ہے۔ ذرا سا بہانہ پاکر سب اگلی پچھلی باتوں کو تازہ اور خیالات کو واقعات کر لیتی ہیں اب بنی بنائی شکایت موجود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جیسے کہ اُس خیالی صورت میں ہاتھ پیر نظر آجاتے ہیں۔ بی بیو! ذرا یہ خیال کرو کہ اُس خیالی صورت میں ہاتھ پیر نظر آنا کچھ بُرا نہ تھا۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس خیالی صورت کو درندہ شیر یا اور کوئی موذی چیز سمجھ کر آدمی بھاگتا ہے۔ بس صرف تکلیف اسکو یہ پہنچتی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے ڈر جاتا ہے۔ یہاں امر بالعکس ہے کہ کسی کی شکائتیں سنکر اس میں حاشیے وہ پیدا کیئے جاتے ہیں جن سے اپنے لیے اور مضرت بڑھتی ہے اگر کوئی یُوں کرے کہ ان شکایتوں میں بھی ایسے حاشیے لگائے جن سے وہی خوف پیدا ہو جو اُس خیالی صورت میں ہاتھ پیر نظر آنے سے پیدا ہوا تھا۔ اور اس خوف کے سبب وہ مضار سے بچنے کی کوشش کرے تو ہم اس کو بخوشی جائز رکھتے ہیں۔

انتقام میں زیادتی

اس کی ترکیب یہ ہے کہ جب کسی کی شکایت سُنو تو یہ سوچو کہ بیان کرنے والے نے ایک بات میں دس باتیں غلط مِلائی ہوں گی اگر ہم نے وہ بات اپنی آنکھ سے دیکھی ہوتی تو اگر بے جا بھی تدارک کرتے تو ایک بدی کا بدلا ایک بدی کرتے اور اب دس بدی کریں گے تو انجام کیا ہوگا یہ ایسا ہوا جیسے ہمارا کوئی ایک پیسہ کا نقصان کرے اور ہم اسکے

بدلہ میں دس پیسہ کا نقصان کردیں۔ جب یہ مقدمہ حاکم کے سامنے جائے تو گو زیادتی پہلے اُسی نے کی تھی مگر اب ملزم ہم ہی ہوں گے اور ہم سے تو پیسے اسکو دلادیئے جائیں گے یہ خیال کر کے ذرا ڈرو بلکہ اُن دس برائیوں کو بھی پھر ذرا غور سے دیکھو کہ جیسے یہ اس کمیت میں ایک سے زیادہ ہیں ایسے ہی اگر کیفیت میں بھی زیادہ ہوئیں تو اُن کا وبال بدرجہا زیادہ ہوگا مثلاً کسی کی شکایت سُنی کہ اُسنے ہماری غیبت کی اور اُس سے تم نے یہ بدلا لیا کہ تم نے بھی غیبت کرلی تو یہ بدلہ تو ہوگیا اور مان لیا جائے کہ بالکل برابر سرابر کا بدلا ہے یعنی کمیت میں برابر ہے کہ ایک غیبت اُس نے کی ایک تم نے کرلی مگر اس بات سے کیا اطمینان ہے کہ یہ بدلا تمہارا کیفیت میں بدلا ہوا نہیں ہے یا آئندہ نہ بڑھ جائے گا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کی طرف سے بُرائی دل میں بیٹھ جاتی ہے تو انسان اُسکی صرف اس زیادتی کے بدلے ہی پر اکتفا نہیں کرتا اور بدلا لیکر اسکی برائی دل سے نکل نہیں جاتی۔ بلکہ کینہ رہ جاتا ہے۔ یا حسد پیدا ہوجاتا ہے اور کینہ اور حسد غیبت سے کیفیۃً بہت زیادہ بُرے ہیں۔

حسد کی نسبت حدیث شریف میں ہے کہ حسد نیکیوں کو ایسا کھاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھاتی ہے تو یہ برائی جو تمہارے دل میں اُس غیبت کے مقابلہ میں پیدا ہوئی بدرجہا کیفیت میں زیادہ ہے کہ تمہاری اور نیکیوں کو بھی غارت کرے گی یہاں قوت واہمہ سے کام لو اور نفس کے خلاف حاشیے لگاؤ اور یہ سوچو کہ اگر ہم اُس ایک غیبت کے بدلے میں ان برائیوں میں پڑ گئے تو کیسے بڑے بُرے نتیجہ ہوں گے وہم سے اس طرح کام لینے سے وہی نتیجہ نکلے گا جو اس خیالی صورت میں وہم کے تصرف سے ہاتھ پیر نمودار ہوجانے سے نکلا تھا جیسا کہ اُسکے ڈر کر دیکھنے والا بھاگتا ہے اسی طرح ان برائیوں سے بھاگے گا کام کی بات یہ ہے مگر ایسی امید کسکی کیجائے یہ تو سُنی ہوئی باتوں کی حالت ہے۔

چشم دید روایات میں غلطی

عورتوں کی تو دیکھی ہوئی باتیں بھی اس قابل نہیں کہ اُن کو صحیح کہا جاوے

اکثر عورتیں اپنی دیورانی جیٹھانی وغیرہ سے اپنی بچشم دید باتوں پر ناراض رہتی ہیں اور جب اُن کو سمجھایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس بات پر تم ناراض ہو وہ بات یوں ہے تم نے غلط سمجھا تو کہتی ہیں کیا میں بچی ہوں کیا میں سمجھتی نہیں فلاں کام میرے ہی چڑھانے کے لیے تو کیا گیا تھا۔ خدا کو دیکھا نہیں عقل سے تو پہچانا۔ بس پھر لاکھ سمجھائیے جو اس فعل کی بنا اپنے ذہن سے گھڑی ہے وہی رہیگی اور اُسی پر ردّے پہ ردّا رکھتی چلی جائیں گی اور ذرا دیر میں آپس میں رنج ہو جائے گا۔ اب طرفین سے غیبت شروع ہوگی اور ایک دوسرے کی عیب جوئی میں، ور نیچا دکھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھیں گی۔ بڑی خیر یہ ہے کہ خدا نے ناخن نہیں دیئے۔ ان کے اختیارات بہت کم رکھے ہیں اور مردوں کو اُن کے اوپر مسلط کیا ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ ورنہ ایک گھڑی بھر بھی ایک گھر میں دونوں نہ رہتیں۔ بلکہ ایک شہر میں بھی نہ بستیں۔ یہ سب نتائج غصہ کے ہیں عورتیں غصہ سے ایسی مغلوب ہیں کہ یہی نہیں کہ دوسروں کو غصہ میں تکلیف پہنچائیں۔ بلکہ پہلے گھر والوں پر غصہ اُتارا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ مشق ماما پر ہوتی ہے اس کے ساتھ تو ہر وقت کی گفتگو میں یہی تکیہ کلام ہے۔ دیدوں پھوٹی، پیاروں پیٹی۔ اور بعضے بیبیوں کا تو ہاتھ بھی اُن پر بہت چلتا ہے ذرا سے قصور پر اتنی مار پیٹ ہوتی ہے کہ دیکھا نہیں جاتا۔

بی بیو! ذرا اس بات کو خیال کر لو کہ وہ بھی تمہاری جیسے آدمی ہے جیسے ہاتھ پیر تمہارے ہیں ایسے ہی ہاتھ پیر اس کے بھی ہیں۔ جیسے زبان تمہارے ہے ایسے ہی زبان اس کے بھی ہے کیا وہ تم کو نہیں مار سکتی۔ یا زبان سے کوس نہیں سکتی وہ کون سی چیز ہے جس سے تم کو قدرت ہے اور اس کو قدرت نہیں وہ احتیاج ہے۔

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ احتیاج اس کو کہاں سے آئی اور تم کو کہاں سے نہیں آئی ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے اُسکو احتیاج دی اور تم کو نہیں دی اور یہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے جس خدا نے اُس کو محتاج بنایا کیا تم کو نہیں بنا سکتا تھا یا اب نہیں بنا سکتا ہے۔ ایسے واقعات دن رات ہوتے ہیں کہ ایک وقت میں جو لوگ بڑے سمجھے جاتے ہیں اور ہر طرح سے قابو یافتہ ہوتے ہیں۔ دوسرے وقت وہ چھوٹے اور دوسرے بڑے ہو جاتے ہیں اور ہر طرح سے یہ اُن کے دستِ نگر ہو کر رہ جاتے ہیں پھر اس وقت کیا وہ چھوٹے اُن زیادتیوں کو بھول جائیں گے جو تمہارے ہاتھوں سے ہوئی ہیں ہرگز نہیں خوب آپ سے بدلہ لیں گے۔

بھاوج کا غصہ

بہت جگہ ایسا ہوتا ہے کہ گھر کا کوئی بزرگ مر گیا اور بڑی اولاد کے ساتھ چھوٹے بچے بھی چھوڑے وہ چھوٹے بچے بڑے بھائیوں کی پرورش میں آجاتے ہیں۔ اور بھاوج کا اختیار ہوتا ہے چونکہ بچے گھر میں رہتے ہیں اس واسطے اُن کی نگرانی وغیرہ عورتوں ہی کے ہاتھ میں زیادہ رہتی ہے۔ بڑا بھائی باہر رہتا ہے اور بھاوج صاحب اُن سے دل کے کینے نکالتی ہیں ہر بات پر مارنا بُرا بھلا کہنا ہر چیز کو ترسانا کھانا پیٹ بھر نہ دینا کپڑے کی خبر نہ لینا اور نوکروں سے زیادہ ذلیل کر کے انکو رکھنا یہ اُن کا برتاؤ رہتا ہے اور اس پر بھی چین نہیں بطور حفظ ماتقدم خاوند سے الٹی شکایتیں کرتے رہنا غرض ایسے خلافِ انسانیت برتاؤ رکھتی ہیں کہ ان کا بیان کرنا بھی مشکل ہے یہاں پر میں مردوں کو بھی خطاب کرتا ہوں کہ یتیم بچوں کی نگرانی خود بھی رکھو۔ عورت کے کہنے میں اتنے نہ رہو کہ ہر بات کو سچ جان لو۔ جب یہ کھلی بات ہے کہ بھاوج دیوروں کے ساتھ مغائرت کا علاقہ رکھتی ہے تو اسکی شکایتوں کا کیا اعتبار۔

میں تو کہتا ہوں کہ ایسے موقعہ پر مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں کو سُنا دیں کہ تم سچ بھی کہو گی تو ہم جھوٹ سمجھیں گے۔ سب مردوں کو نہیں کہتا ہوں بہت سے مرد ایسے بھی ہیں کہ واقعی مرد ہیں اور ایسے موقعہ پر پوری عقل سے کام لیتے ہیں اور اس ساتھ کو بھیڑیئے بکری کا ساتھ سمجھتے ہیں جہاں بھیڑیا بکری اکٹھا ہوں گے وہاں بھیڑیئے کی طرف سے بکری کے ساتھ ایذا رسانی ہی ہوگی کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ بھیڑیا بکری کی طرفداری یا اُس پر رحم کرے گا۔ عورت کے کہنے سے بھائیوں کو نہ ستاؤ۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "یتیم بچہ زندوں میں شمار ہی نہیں" اپنے ماں باپ کے ساتھ وہ بھی مر گیا پھر مرے ہوئے کو مارنا کیا جوانمردی ہے اُس کی۔ اگر حد سے زیادہ دلدہی کرو گے تب بھی اُس کا دل زندہ نہیں ہو سکتا۔

یتیم کی صورت پر مُردنی چھائی ہوتی ہے۔ دو بچوں کو برابر بٹھاؤ جن میں سے ایک یتیم ہو اور دوسرا یتیم نہ ہو اور ایک چیز دونوں کے سامنے رکھ دو اور کہہ دو کہ جو کوئی پہلے اُٹھائے یہ چیز اُسی کی ہے۔ یقین کامل ہے کہ یتیم کا ہاتھ نہیں اُٹھے گا۔ وجہ یہی ہے کہ اُس کا دل مُردہ ہو چکا ہے۔ باقی بفضلہٖ تعالیٰ ایسے بھی لوگ دیکھے جاتے ہیں جو یتیموں کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

صحابہؓ کے قصے تو بہت سے سُنے ہوں گے مگر اب بھی بحمداللہ ایسے لوگ موجود ہیں وہ بھی مرد ہیں اُن کے سامنے عورت کی ایک بھی نہیں چلتی۔ ایسے مرد نے قوامون کے معنی یہی ہیں یہ بیان بیچ میں زائد ہو گیا مگر بے ربط نہیں کیونکہ عورتوں کے عیوب کا بیان تھا اور اُن عیوب کی اصلاح میں مردوں کو بڑا دخل ہے۔ اس واسطے مردوں کو بھی خطاب کیا گیا۔ عورتوں کے برتاؤ کا بیان ہو رہا تھا کہ وہ اپنے چھوٹوں پر اپنے اختیار کے وقت کوئی بات اُٹھا نہیں رکھتی۔ مگر مثل مشہور ہے کہ بارہ برس میں کوڑی کے بھی دن پھرتے ہیں زمانہ پلٹتا ہے اور اُن کا وقت بگڑ جاتا ہے۔

مثلاً بیوہ ہوکر دوسرے کے اختیار میں ہوگئی - اور اُن کا وقت بن جاتا ہے جو ان کے دستِ نگر تھے پھر آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ ان پر کیا کچھ مصیبت نہ ٹوٹ پڑیگی وہ ستمدیدہ لوگ ان پر قابو پاتے ہیں اور اٹھتے بیٹھتے جوتیاں مارتے ہیں - یہ واقعات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں دین سے قطع نظر دنیا کے نشیب و فراز بھی اسی کے مقتضی ہیں کہ اپنے اختیار کے وقت کسی کے ساتھ بدسلوکی نہ کی جاوے جس وقت ماما پر یا اپنے کسی چھوٹے پر غصہ آیا کرے تو یہ یاد کر لیا کرو - اور اچھی طرح ذہن میں اس کا خاکہ جمایا کرو کہ ممکن ہے کہ جیسے اس وقت یہ چھوٹا ہے اور ہم بڑے ہیں کسی وقت ہم اسکے سامنے چھوٹے اور یہ بڑا ہو جائے پھر کیا تم کو پسند ہوگا کہ تمہارے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے جو تم اُس کے ساتھ کر رہے ہو۔

اس تدبیر سے ایک ہی دو بار میں غصہ کا جوش کم ہو جائیگا اور غصہ قابو میں آجائے گا - اور جتنے مفاسد اس پر متفرع ہیں سب سے امن ہو جائیگا اور سب چھوٹے بڑے تم سے محبت کرنے لگیں گے - دیکھا ہوگا کہ جو شخص اپنے اختیار کے وقت اپنے ماتحتوں اور چھوٹوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے - اگر انقلاب زمانہ سے اسکو کوئی احتیاج پیش آتی ہے تو وہ ماتحت اور چھوٹے اسکی اوپر جان نثار کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں - اور دونوں حالت عسر و یسر میں چاروں طرف سے واہ واہ ہوتی ہے یہ حالت اچھی ہے یا وہ حالت ۔

تنبیہ و شفقت

میں یہ نہیں کہتا کہ ماتحتوں کو سر چڑھالو تنبیہ اور دباؤ رکھنا اور چیز ہے اور ظلم و زیادتی اور چیز - اپنے ماتحتوں سے کام لو - مگر اُن کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ پہنچاؤ اور نہ انکو ذلیل کرو اور نہ بے وجہ مار دو بیٹھو - اور نہ قصور سے زیادہ سزا دو بقدر ضرورت سیاست رکھو اور موقعہ و محل پر ان کا ساتھ بھی دو - اُن کی تکلیف کو

اپنی تکلیف سمجھو۔ دیکھو باپ اپنی اولاد کو ڈانٹ ڈپٹ میں رکھتا ہے مگر ذراسی تکلیف اولاد کو پہنچے تو باپ کا دل دُکھتا ہے۔ اور ذرا کوئی اولاد کو ذلیل کرے تو باپ اسکو اپنی ذلت سمجھتا ہے۔

اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ تنبیہ اور دباؤ رحم و محبت کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں مگر عورتوں کی عادت ہے کہ ماما کو تو کبھی سیدھے منہ پکارتی ہی نہیں ماما تو خیر غیر ہے۔ غصہ سے ایسی مغلوب ہیں کہ بچوں کو کوستی ہیں مر جاؤ کھپ جاؤ گھر کو کہتی ہیں آگ لگ جائے بعض وقت خود اپنے آپکو ہی کوستی ہیں میں مٹ جاؤں یا اللہ! مجھے تو اٹھالے بس اس جینے سے میں مرنے ہی خوش ہوں ـــــ کبھی اللہ میاں پر بھی مشق ہوتی ہے کہتی ہیں ساری مصیبتیں میرے ہی واسطے رہ گئی تھیں اور جب کہا جاتا ہے توبہ کرو۔ شرع کے خلاف باتیں نہ بکو۔ تو جواب ملتا ہے ہاں جی شرع بھی ساری میرے ہی واسطے ہے۔ دنیا میں آکے آرام نہ دیکھا۔ چین نہ دیکھا پھر زبان کاٹنے کے لیے شرع بھی تیار ہے۔

بہنو! یہ کلمات کفر کے ہیں۔ ذرا ہوش میں رہو غصہ سے ایسے مغلوب ہو بعضے باتوں سے نکاح جاتا رہتا ہے۔ ایک عجیب لطف ہے کہ ان بیہودہ کلمات کے ساتھ جب انہیں ٹوکا جائے تو جو بی بی محتاط ہیں وہ یہ بھی فوراً کہتی ہیں شرع میرے سر آنکھوں پر۔ مگر مجھ کو تو دوزخ میں رہنا ہے جو جنت میں جائے وہ شرع کی پابندی کرے۔ اپنے نزدیک یہ کہہ کر اس الزام سے بچ جاتی ہیں کہ شرع کا مقابلہ کیا جب قیامت میں باز پرس ہو گی تب معلوم ہوگا کہ یہ جواب کافی ہے یا نہیں۔ ابھی سے سمجھ لو کہ یہ جواب کافی نہیں ہے۔ اللہ میاں کسی کے بہلانے میں نہیں آتے۔ اللہ میاں کی شان علام الغیوب اور علیم بذات الصدور ہے۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند ‏ حق را بسجودے و نبی را بدرودے

دنیا کے کسی حاکم کے سامنے کسی الزام سے بری ہونا خواہ وہ الزام جھوٹا ہی ہو مشکل

ہو جاتا ہے - چہ جائیکہ خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹی بات کی تاویل کر کے کوئی چھوٹ سکے جو بات اپنی سمجھ میں نہ آوے - اس کو دوسرے کے کہنے سے مان لو ایسے کلمات دین و دنیا دونوں کو غارت کرنے والے ہیں اپنی عادتوں کو بدلو اور بے تکلف بدلو - زبان کو قابو میں رکھو - ظلم و زیادتی کے دینی و دنیوی نتائج کو یاد رکھو اور جوان سب کی اصل ہے یعنی غصہ اس کی بہت ہوشیار ہو - یہ سب نتائج غصہ کے ہیں - اس مرض کی طرف بہت توجہ رکھو - اول تو غصہ کو آنے مت دو اور اگر آجائے تو اس کا علاج کر لیا کرو - جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے - اور اس مرض کو معمولی ہرگز مت سمجھو اس کے نتائج بہت بُرے ہیں - میں نے بالقصد غیبت اور غصہ ہی کا بیان کیا ہے - ان دونوں مرضوں میں سے اصل غصہ ہے اور غیبت فرع — اصل کا بیان اول کیا گیا اب فرع کا بیان ہوتا ہے اور غصہ کی فرع صرف غیبت ہی نہیں ہے اور بھی فروع ہیں - میں غیبت میں بالقصد کلام کرتا ہوں کیونکہ اس میں ابتلاء عام ہے خصوصاً مستورات کا اور بقیہ فروع میں بھی تھوڑا تھوڑا عرض کروں گا -

غیبت کا ابتلاء

سنئے غصہ کی ایک فرع غیبت ہے یہ ایسی چیز ہے کہ اس کی برائی اگر دل میں بیٹھ جائے تو آدمی کبھی اُس کے پاس بھی نہ جائے اور اُس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جس کی یہ فرع ہے یعنی غصہ سے وہ کس درجہ بری چیز ہوگی -

دیکھئے حدیث شریف میں صاف موجود ہے اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا - بحمداللہ یہ بات نہایت خوشی کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ مسلمان بی بیاں آوارگی سے بالکل محفوظ ہیں اس میں جس حد تک بھی مبالغہ کیا جائے بالکل صحیح ہے - مگر افسوس ہے کہ اس سے زیادہ بُرے عیب میں گرفتار ہیں حرام کاری کا بُرا ہونا ہم کو کیسے معلوم ہوا - اللہ و رسول کے فرمانے سے وہی اللہ و رسول فرماتے ہیں کہ غیبت اس سے زیادہ بُری ہے اس

جو کچھ خوشی ہم کو اُس عیب سے بری ہونے سے ہوسکتی ہے وہ سب ملیامیٹ ہوئی جاتی ہے یہ ایسا ہوا جیسے کوئی خوش ہو کہ میرا ایک پیسہ کا نقصان نہیں ہوا اور جب تحقیق کر لے تو ثابت ہو کہ پیسہ کا تو واقعی نہیں ہوا مگر ایک روپیہ جاتا رہا۔ تو اُس کو خوشی رہ سکتی ہے نہیں غیبت میں ایسا ابتلاء عام ہوا ہے کہ بہت سی بیبیوں کو یہ بھی نہیں معلوم رہا کہ غیبت کیا چیز ہے جب آدمی کسی چیز کو جانتا بھی نہ ہو تو اُس سے بچنے کی کیا امید ہوسکتی ہے بچہ کے سامنے سانپ یا بچھو رکھ دیں تو وہ اُس کو ایسا ہی پکڑ لیتا ہے جیسے روپیہ پیسہ کو۔ میں غیبت کی ماہیت بیان کرتا ہوں اُس سے معلوم ہوگا کہ ہم لوگ دن رات کس قدر گناہ کرتے ہیں کوئی لمحہ ہمارا ایسے گناہ سے خالی نہیں جو زنا سے بھی سخت ہے اور یہ ماہیت میں اپنی طرف سے نہیں بیان کرونگا۔ بلکہ حدیث نقل کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا تعلمون ما الغیبۃ جانتے ہو غیبت کیا چیز ہے۔ صحابہ کی یہ عادت تھی کہ غایت ادب کی وجہ سے اکثر سوال کے جواب میں یہی عرض کر دیتے تھے کہ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ چنانچہ خود ہی حضورؐ نے ارشاد فرمایا ذکر الرجل بما یسوءہ یعنی کسی شخص کی نسبت ایسی بات کہنا کہ اُس کے سامنے کہی جائے تو اُس کو بُری معلوم ہو۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ اگرچہ وہ بات ایسی ہو کہ واقع میں اُس شخص میں موجود ہو۔ حضور نے فرمایا ہاں اُسی کو غیبت کہتے ہیں اور جو ایسی بات بیان کی جائے جو واقع میں اُس میں ہو بھی نہیں تو یہ غیبت سے بھی بڑھ گئی اس کا نام بہتان ہے یہ حدیث کتنی صریح ہے اس سے غیبت کے متعلق کوئی بات دریافت طلب نہیں باقی رہتی۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ کون سا لمحہ ہمارا اس گناہ سے خالی ہے جب کوئی کسی کی برائی کرتا ہو اور اُس کو ٹوکا جائے کہ یہ غیبت ہے تو جواب ملتا ہے جھوٹ تھوڑا ہی ہے ہم اُس کے منہ پر کہہ دیں۔

معلوم ہوا کہ اُن کے نزدیک جھوٹی بات کو غیبت کہتے ہیں حدیث اس کو رد کرتی ہے اس کا نام بہتان ہے۔ غیبت اُسی عیب کے بیان کو کہتے ہیں جو واقع میں موجود ہو اس معنی کر یہ کہنا صحیح ہے کہ آجکل لوگ غیبت میں ہی نہیں بلکہ اُس سے بڑے مرض یعنی بہتان میں بھی مبتلا ہیں اس غیبت اور بہتان کا عام مشغلہ ہو گیا ہے بالخصوص کیا مرد اور کیا عورتیں۔ سب کے واسطے دیگر ضروری شغلوں میں سے یہ بھی ایک مشغلہ ہے جیسے کھانا پینا سونا ہے کہ بلا ان کے زندگی نہیں ہوتی ایسے ہی یہ بھی ہو گیا ہے مرد سو کام میں رہتے ہیں مگر اُنہیں کے بیچ بیچ جیسے حُقّہ پان کی طلب پوری کرتے ہیں وہاں یہ فرض بھی ساتھ ساتھ ادا کرتے جاتے ہیں۔

بے شغلی کا مرض

اس کی وجوہات بہت سی ہیں ایک بڑی وجہ اُن میں سے بے شغلی ہے۔ مسلمانوں میں بے شغلی کی عادت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے نقصانات کا احساس تو در کنار اس کا حسن اور ضروری ہونا ذہن میں بس گیا ہے جتنا کوئی شخص بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی عادی ہونا اور دوسروں کا محتاج ہونا اس کے لیے لازم ہوتا جاتا ہے۔ رؤسا کے یہاں جا کر دیکھ لیجئے حقہ پیتے وقت نے کو ہاتھ لگانا بھی عیب ہے۔ بعض جگہ تو رئیس صاحب کو کھانا بھی نوکر کھلاتا ہے اپنے ہاتھ سے لقمہ بھی منہ میں رکھنا ناممکن ہے یہ تو مردوں کی حالت ہے عورتوں کو کہ اُنہیں تو بجز غیبت کے کچھ بھی کام نہیں مرد کچھ تو کام کرتے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے واسطے یہی فخر سمجھا ہے کہ اپنے ہاتھ سے کچھ کام نہ کریں۔ جس بی بی کو ذرا سی بھی آسودگی ہے وہ اسی کو شان سمجھتی ہیں کہ پلنگ پر چڑھی بیٹھی رہیں۔ کسی وقت میں بھی اپنے ہاتھ سے پانی پی لینا تک گوارا نہیں۔ خاص کر اس زمانہ میں یہ خبط بہت بڑھ گیا ہے ابھی تھوڑا زمانہ ہوا کہ عورتوں میں اتنا تنعم نہ تھا۔ اپنے گھر کے کام کاج کو فخر سمجھتی تھیں کہا جاتا تھا۔ فلانی بی بی بڑی کام کرنے والی ہے

اچھے اچھے گھروں میں چکی پیسنا اور چرخہ کاتنا رائج تھا- اور اب عورتیں چرخے پر تو بہت ہنستی ہیں اور بہت ذلیل کام سمجھتی ہیں اور چکی پیسنے سے یوں چھوٹیں کہ کہتی ہیں پہلے زمانہ کی عورتوں میں طاقت تھی اب وہ طاقت نہیں رہی - میں کہتا ہوں- آٹا کھانا تو اب بھی بند نہیں ہوگیا- اور آٹا چکی ہی میں پیسا جاتا ہے - اور مرد تو یہ کام کرتے ہی نہیں- پیسنے والی اکثر عورتیں ہی ہیں - وہ بھی تمہاری بہنیں ہی ہیں اور تمہارے ہی زمانہ کی ہیں اُن میں طاقت کہاں سے آگئی-

اصل یہی ہے کہ تم نے خود اپنے آپ کو کمزور کر لیا ہے تم نے عادت چھوڑ دی اب تمہیں چکی چلانا ایک بار معلوم ہوتا ہے اور تمہاری بہنیں اب تک عادی ہیں اور پیستی ہیں - پھر دیکھ لو کہ تمہاری صحت اچھی ہے یا ان کی - بیبیو! اس تنعم کو چھوڑ دو گھر کے کام کاج کو عیب نہ سمجھو- اس میں دنیا اور دین دونوں کے فائدے ہیں دین کا فائدہ تو یہ ہے کہ اُن تمام آفات سے بچو گی جو بیکاری میں نازل ہوتی ہیں جیسے غیبت طعنہ بناوٹ وغیرہ یہ سب اُسی وقت سُوجھتے ہیں - جب کوئی کام نہیں ہوتا اور جب گھر کے دھندوں میں لگی رہو گی تو اتنی فرصت ہی نہ ہوگی کہ کسی کی بُرائی بھلائی میں پڑو - نیز دل اُن دھندوں میں پڑا رہے گا تو ان لغویات کا خیال ہی کم آئیگا یہ دین کا فائدہ ہُوا اور دنیا کا فائدہ یہ ہے کہ گھر کی نگرانی خوب ہوگی- اگر اپنے ہاتھ سے کام کرو گی تو نوکر کا خرچ بچے گا- اور اگر نوکر موجود بھی ہوگی اور تمہارے ساتھ لگی رہے گی- تب بھی نگرانی تو خوب رہے گی نوکر خیانت نہ کر سکے گی - یہ بھی فائدہ کی صورت ہے اور ساتھ ہی اس کے گھر میں اُٹھ بیٹھ رہے گی تو بدن کی ریاضت ہوگی صحت اچھی رہے گی - تو اس میں مالی بھی فائدہ ہُوا اور جانی بھی اور دُنیاوی بھی اور دینی بھی- غرض گھر کے کام کو عیب نہ سمجھو اور صرف معمولی کام نہیں- بلکہ محنت کے کام بھی کرو- چکی خود پیسا کرو- اور اگر چکی پیسنا ایسی ہی شان کے خلاف ہے تو اچھا

بیٹھو مت۔ کچھ دیر ہلا ہی لیا کرو۔ تاکہ عادت رہے اور چکی پیسنے والیوں کی محنت یاد رہے اور اُن سے اُن کی طاقت سے زیادہ کام لینے کی تمہاری عادت نہ ہو پلنگ پر ہر وقت چڑھے رہنے کی عادت بالکل چھوڑ دو۔ آج کل ہر بات میں ترقی کی فکر کی جاتی ہے اور ترقی کا لفظ ایسا زبان زد ہو رہا ہے کہ ہر شخص سے سُن لو۔ عورتوں نے بھی اس میں قدم رکھنا شروع کر دیا ہے۔ میں اُن ترقی کرنے والوں سے پوچھتا ہوں ایک طرف آرام و آسائش کو رکھو اور ایک طرف محنت و جفاکشی کو۔ اور ان دونوں میں سے بتاؤ کہ ترقی کا ذریعہ کون ہے کبھی کسی کو بلا محنت کے ترقی کرتے نہ دیکھا ہوگا۔ آپ کو تنعم اور آسائش میں ڈال کر اپنے کام کاج دوسروں کے حوالے کر دینا کس عقلمند کے نزدیک ترقی کا ذریعہ ہو سکتا ہے تن پروری اور بے کاری سے نہ جسمانی کوئی فائدہ ہو سکتا ہے نہ مالی۔ اس واسطے میں مردوں کو بھی کہتا ہوں کہ محنت کی عادت کرو اور اگر دین کے کام میں نہ سہی تو دنیا ہی کے مباح کاموں میں لگے رہو۔ مگر خدا کے واسطے بیکار مت بیٹھو جو لوگ محنت کے عادی ہیں اُن کی جسمانی صحت دیکھو کیسی اچھی ہے۔ دیہاتیوں کو دیکھو تم سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ سردی گرمی کی اُن کو مطلق پرواہ نہیں ہوتی۔ اور شہروں میں دیکھو تو مسجد کے موذن تک ایسے نازک مزاج ہو گئے ہیں کہ اذان کے لیے مسجد سے باہر نکلنا بھی اُن کو مشکل ہے۔ اگر خدانخواستہ شہر والوں کو کوئی اتفاق پڑ جائے تو کیا کریں یہ بات کچھ میں ہی نہیں کہتا سب جانتے ہیں کہ آرام طلبی اچھی چیز نہیں اور محنت اور جفاکشی اچھی چیز ہے۔ مگر رواج اس زمانہ کا ایسا بدلا ہے کہ محنت ہوتی ہی نہیں۔

مگر صاحبو! رواج آپ کے اختیار کی چیز ہے اس رواج کو بدلیے اور بے شغلی کی عادت چھوڑیئے۔ یہ ساری مصیبتیں بے شغلی سے ہیں۔ دنیا بھی برباد اور دین

بھی۔ جب انسان کو کوئی شغل نہیں ہوتا تو طبعی بات ہے کہ نفس کوئی نہ کوئی شغل تراش لیتا ہے پھر آپ خیال کر سکتے ہیں کہ نفس کے اختراع کردہ اشغال کیسے ہوں گے وہ اشغال یہی ہوں گے کہ مثلاً جہاں دو آدمی بیٹھے اور کسی کی غیبت شروع کر دی یہ ایسا لذیذ شغل ہے کہ ہر وقت نیا لطف آتا ہے۔ عورتوں کو تو کیا کہوں میں مردوں کو کہتا ہوں کہ اس شغل کو ایسا داخلِ عادت کیا ہے جیسے مزدوروں میں حقہ کہ دو ہاتھ پھاوڑے کے مارے یا دو موگری چھت پر ماریں اور حقہ کا دم لگالیا۔ بلا اس کے اُن سے کام ہی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی آجکل لوگوں نے غیبت کی عادت ڈال رکھی ہے کہ کوئی کام کریں جب تک درمیان میں غیبت نہ کرلیں اُس وقت تک وہ کام نہیں ہوتا۔ واللہ میں سچ کہتا ہوں کہ ہندوؤں میں ایسا نہیں وہ دین سے تو بے خبر ہیں مگر اپنی دنیا میں تو مشغول ہیں کسی نہ کسی کام کے سر لگے ہوئے ہیں۔ بیکار بھی نہیں بیٹھتے اور ہمارے یہاں بیکاری اور آرام طلبی اور ان لغو مشغلوں ہی کو کچھ مایۂ ناز سمجھتے ہیں اگر کسی اور مشغلے چھوڑے تو رُوم و روس ہی کا قصہ لے بیٹھے اخبار دیکھ رہے ہیں اور جنگ میں اپنی اپنی رائے دے رہے ہیں حالانکہ رُوم و روس تم کو پوچھتا بھی نہیں تمہاری تجویز وہاں پہنچتی بھی نہیں یہ سب بے کاری کے مشغلے ہیں۔

قلم کی غیبت

بعض لوگوں کو یہ سوجھتی ہے کہ کوئی خبر معتبر یا غیر معتبر معلوم ہوئی جھٹ سے اس پر ایک مضمون لکھا اور کسی اخبار کو روانہ کیا یا کسی سے اپنے خلافِ طبع بات دیکھی یا سُنی تو خواہ واقع میں وہ ٹھیک ہی ہو۔ مگر اپنے خلافِ طبع ہونے کی وجہ سے اس پر ہجو آمیز بلکہ سبّ وشتم سے بھرا ہوا مضمون لکھ ڈالا۔ اسکی کچھ پرواہ نہیں کہ کتنا اس میں جھوٹ ہے اور کتنا سچ۔ اور کیا کیا مفاسد شرعی اس میں بھرے ہوئے ہیں۔

خوب یاد رکھو! کہ جو حکم زبان کا ہے وہی قلم کا ہے۔ زبان سے جھوٹ بولنا

جس طرح جائز نہیں قلم سے بھی جائز نہیں ۔ زبان سے غیبت کرنا جس درجہ کا گناہ ہے اسی درجہ کا گناہ قلم سے بھی کسی کی نسبت ایسی بات لکھنے میں ہے جو اسکو بری معلوم ہو زبان سے جیسے فضول بکنا برا اثر رکھتا ہے اور حسن اسلام کے خلاف ہے ۔ حسب ارشاد ان من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ ۔ ایسے ہی قلم سے فضول مضامین لکھنے کا اثر ہے ۔ بہت موٹی بات ہے کہ جیسے زبان ترجمان قلب ہے ایسے ہی قلم بھی ہے جو بات زبان سے منع ہو گی وہ قلم سے کیوں منع نہ ہو گی ۔ بلکہ قلم کے گناہ زبان سے سخت ہونے چاہئیں کیونکہ زبان کی باتوں کو ثبات اور بقا نہیں زبان کی باتوں کا اثر تھوڑی دور تک پہنچتا ہے ۔ یعنی صرف وہاں تک کہ جہاں تک وہ آواز پہنچے اگر کسی نے زبان سے کسی کی غیبت کی تو سننے والے دو چار یا دس پانچ ہی آدمی ہو سکتے ہیں ۔ اس گناہ میں اگر شرکت ہوئے تو اتنے ہی مجمع کی ہوئے غیبت کرنیوالا اتنے ہی مجمع کے گنہگار کرنے کا سبب بنا اور اس شخص کی آبرو ریزی صرف اتنے ہی مجمع کے سامنے ہوئی بخلاف قلم کے کہ اس کی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچتی ہے جتنے آدمی اس برائی میں شریک ہوں گے ان سب کا سبب یہی شخص ہو گا نیز اس معصیت کی کیفیت بڑھ جائیگی کیونکہ ہزاروں اشخاص کے سامنے اس شخص کی آبرو ریزی ہو گی ۔ ظاہر بات ہے کہ تنہائی میں کسی کے جوتا مارنا اور اثر رکھتا ہے اور دو چار آدمی کے سامنے مارنا اور اثر رکھتا ہے اور ہزار دو ہزار کے مجمع میں مارنا اور اہل قلم اپنے آپ کو مرفوع القلم سمجھتے ہیں یہ ایسا خیال ہے جیسے آجکل کے شاعروں نے سمجھ رکھا ہے کہ شعر میں سب روا ہے جو مضمون بھی برے سے برا شعر میں باندھ دیا جاوے جائز ہے ۔ یہ خیال بالکل غلط ہے ایسے ہی یہ خیال بھی غلط ہے کہ قلم اور زبان میں کچھ فرق ہے ۔

غور کرنے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قلم کے گناہ زبان سے زیادہ شدید ہیں

خوب یاد رکھیئے کہ یہ مفاسد نظر انداز کرنے کی چیز نہیں اس کی علاج کے لیے اسباب میں غور کرنا چاہیئے۔

تفریح کے نام پر گناہ

اور میں تحقیق سے کہتا ہوں کہ ان کا بڑا سبب بیکار بیٹھنا ہے۔ اسی قبیل سے یہ بھی ہے جو ہمارے قصبہ میں رواج ہے کہ چوپالوں اور بیٹھکوں میں جمع ہو کر بیٹھتے ہیں اس کا نام تفریح طبع اور دل بہلانا رکھا ہے۔ وہاں نہ کوئی دنیا کا کام ہوتا ہے اور نہ دین کا کام ہوتا ہے۔ سوائے ہنسی مذاق اور ان مشغلوں کے جن کا میں بیان کر چکا۔ اور مجمع ایسا ہوتا ہے جن میں کوئی درویش نہیں کوئی بڑا نہیں کوئی عالم نہیں۔ سب مثلاً بالطبع جمع ہیں نفسانی خواہشوں کا کوئی مانع موجود نہیں پھر جو کچھ بھی ہوگا وہ افعال نفس کی ہی جنس سے ہوگا اور عادت غیبت وغیرہ کی پہلے سے پڑی ہوئی ہے اور وہاں کوئی اور مشغلہ ہے ہی نہیں تو یہ لذیذ مشغلہ ضرور شروع ہوگا اگر کسی کو ذرا تعلیم کے اثر سے یا کسی وجہ سے ان باتوں کا شوق نہیں تو وہاں بیٹھ کر کم سے کم یہی ہوتا ہے کہ زائد از کار باتیں ہوتی ہیں کہ آم فلاں باغ کے اچھے ہوتے ہیں۔ اب کے بارش اچھی ہوئی ہے باغوں میں لطف آرہا ہے کھیل کود کا موسم ہے وغیرہ وغیرہ۔

حرمانِ ذکر

یہ یاد رکھیئے کہ زائد از کار باتیں غیبت اور جھوٹ کے درجہ کی بُری نہ سہی تاہم فی نفسہ بُری ہیں اور منکرات اللسان میں داخل ہیں حدیث میں ہے: ما جلس قوم مجلسا لم يذكروا الله فيه الا كانت عليهم ترة يوم القيامة یعنی کوئی جماعت نہیں بیٹھتی کسی جگہ کہ اس میں خدا کا نام نہ لیں مگر کہ یہ بیٹھنا قیامت کے دن ان کے واسطے حسرت ہوگا۔ تضیع وقت پر افسوس کریں گے وقت وہ چیز ہے کہ اس کی قدر

جبب ہی سمجھ میں آئے گی کہ جب یہ ہاتھ سے نکل جائے گا زبان اس وقت ہمارے قبضہ میں اور قابو میں ہے اس واسطے قدر نہیں جب زبان قابو میں نہ رہے گی تو یہ چاہیں گے کہ ایک دفعہ اتنا قابو پھر مل جائے کہ ایک دو بار اللہ کہہ لیں اس وقت معلوم ہوگا کہ ذکر اللہ کیا چیز ہے۔ یہ قدر تو ذکر کی باعتبار نتیجہ کے ہے میں کہتا ہوں کہ لذیذ بھی اس قدر ہے کہ اور باتوں میں اسکے سامنے حظ بھی نہیں آسکتا اور باتوں میں آدمی جبب ہی تک پڑتا ہے جب تک کہ اس کے خطرے سے واقف نہیں ذکر کی عادت ڈالنے تو خود منکرات لسان بھی چھوٹ جائیں ان منکرات میں لطف جب ہی تک ہے کہ جب تک ذکر کا ذائقہ نہیں چکھا۔ اگر ایک ہفتہ ذکر کے عادی ہو جائے تو فضول باتیں ایسی لگیں جیسے گولی لگ گئی۔ تو ذکر کو چھوڑ کر بیکار باتوں میں رہنا فاحش ہے اور کوئی معمولی بات نہیں منکلات کا اثر قلب پر بُرا پڑتا ہے تو چوپالوں میں بیٹھ کر اور منکرات سے بچنے بھی تو اس منکر میں تو ضرور ہی پڑوگے اور یہی کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ اور منکرات سے بچے رہے کسی میں بذاتِ خود اور کسی میں دوسرے کے ساتھ ضرور شرکت ہوتی ہے جب زائد باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ذکر جیسی چیز سے حرمان ہوتا ہے تو غیبت اور ناجائز باتیں تو کس درجہ میں ہوں گی۔ ان چیزوں کی بڑائی کچھ اس حدیث سے معلوم ہو سکتی ہے

حضرت عائشہؓ نے حضرت صفیہؓ کی نسبت [جیسا کہ سوکنوں میں ہو جاتا ہے] صرف اتنا کہا کہ یہ کس قدر پست قد ہیں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ایسا کلمہ کہا کہ اگر دریا پر ڈال دیا جائے تو اسکو مغلوب کر دے۔ یہ اس ایک کلمہ کی بُرائی ہے۔ جسکے لوگ دن رات عادی ہیں اور بیٹھکوں اور چوپالوں میں اور مجمعوں میں سوائے اس کے کوئی شغل ہی نہیں اور اسی سے طبیعتیں مالوف ہو گئیں ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی ان باتوں سے مجمع میں احتراز کرنا چاہے تو یقیناً اس کی زبان اتنی نہیں چلے گی۔ جتنی کہ ان باتوں کے کرنیوالے کی چلے گی تو مجمع والے بطور تمسخر کہتے ہیں

آپ تو ولی اللہ ہیں آپ نے ناحق تکلیف کی مجمع میں آنا کیا ضرور تھا مسجد ہی میں بیٹھے رہے ہوتے۔

اس لفظ میں غور کیجئے ظاہراً تو مہذب ہے مگر درحقیقت تہذیب سے بالکل خارج ہے اسکے معنی حقیقی یہ ہیں کہ تم ہماری صحبت کے قابل نہیں ہمارے لطف کو کیوں مکدر کر دیا کیا تہذیب ہے کہ ایک شخص کو مجمع میں ذلیل کیا جائے یہ لفظ اُس کے واسطے تو صدائے غیب ہے اور فال نیک، مگر آپ کے واسطے نہایت سخت لفظ ہے اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ آپ ولی اللہ نہیں ہیں ولی اللہ کے پاس بیٹھنے سے خوش ہیں جب ولی اللہ نہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں تو ولی شیطان ہوئے اس سے آپ کا خود اقرار ثابت ہوا کہ آپ کی نشست گاہیں مجالس خیر نہیں مجالس شر ہیں۔ یہ لفظ بالکل کلمۃ حق ارید بہ الباطل کا مصداق ہے اور عجب نہیں کہ بل یکب الناس علی جباھھم فی النار الا حصائد... السنتھم میں داخل ہو۔ آپ اس سے تمسخر کرتے ہیں یہ خبر نہیں کہ جو شخص اپنی زبان کو روکتا ہے وہ اپنے دل سے بات کرتا ہے اُسکے دل میں وہ دولت ہے کہ آپ کے ہزار طعنہ گوارا ہیں اور اُس کا چھوڑنا گوارا نہیں اور جتنا کہ آپ اُس سے تنگ ہوئے وہ اس سے زیادہ آپ سے تنگ ہوتا ہے اتنا فرق ہے کہ آپ اپنی تنگی ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکے اور وہ اپنی تنگ دلی بھی ظاہر نہیں کرتا کہ مبادا زبان سے کوئی کلمہ ایسا نکل جائے جس سے آپ کو تکلیف پہنچے اور منکرات لسان کی جنس سے ہو ایسا شخص آپ کی نظر میں بے وقوف ہے۔

کم گوئی سے علمِ باطن

اور عند اللہ بڑا عقلمند ہے اسکے دل میں حکمت کا بیج بویا جا رہا ہے۔ حدیث میں ہے اذا رأیتم العبد یعطی زھدا فی الدنیا وقلۃ منطق فاقتربوا منہ فانہ

یلقی الحکمۃ یعنی جب کسی بندے کو تم دیکھو کہ دنیا سے اُس کو بے رغبتی ہوتی جاتی ہے اور کم گوئی پسند کرتا ہے تو اُس سے قرب حاصل کرو کیونکہ اُس کے قلب میں حکمت القا ہوتا ہو وہ حکمت کے معنی ہیں علم باطن خیال کرنے کی بات ہے کہ جس کے دل میں نور اور علم القا ہوتا ہو وہ غیبت اور زبان کے گناہ کو کب پسند کر سکتا ہے وہ تو ان سے ایسا گھنائے گا جیسا کہ کوئی نجاست سے گھناتا ہے۔ وہ غیبت کے شبہوں میں بھی پڑنا نہ چاہے گا۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ یہ بھی غیبت ہے کہ کسی کے مکان میں یا گھوڑے میں یا اور کسی چیز میں یا اُس کے متعلقات میں سے کسی چیز میں عیب نکالا جائے۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ آج کل کے محتاط لوگ بھی اس کا کم خیال رکھتے ہیں اور جہاں مجمع ہوتا ہے وہاں کا تو ذکر ہی کیا میرا تجربہ ہے کہ علاج اس کا یہی ہے کہ لوگوں سے علیحدہ رہیے جب لوگوں سے میل ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ ان مفاسد کا دخل ہو ہی جاتا ہے حتیٰ کہ لوگ جن بزرگوں کے پاس ان کے چھوٹے بن کر اور دین سیکھنے کے واسطے جاتے ہیں۔ وہاں بھی غیبت سے نہیں چوکتے تیری میری شکوہ شکایت ضرور کرتے ہیں اور اس سے اس طرح بھی چھٹکارا نہیں ہوتا کہ وہ بزرگ کان میں تیل ڈالے چپکے بیٹھے رہیں اگر چپ بیٹھتے نہیں تو غیبت کرنے والے منتظر رہتے ہیں کہ یہ بھی اس میں کچھ کہیں اگر کچھ نہ کہیں تو بڑی بے لطفی ہوتی ہے۔ اور دوسری جگہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم فلاں کے پاس گئے تو وہ بات بھی کرنا نہیں جانتے بالکل مٹی کے تھوبے یا گوبر کے ڈھیر ہیں خود تو گنہگار تھے ہی دوسرے کو بھی اپنے ساتھ گنہگار کرنا چاہتے ہیں دین کے علاوہ یہ لوگ عقل سے بھی تو کام نہیں لیتے عقلی قاعدہ یہ ہے کہ آدمی جس کام کا ہو اس سے وہی کام لینا چاہیئے موچی سے موچی کا کام درزی سے درزی کا کام حلوائی سے حلوائی کا کام لینا صحیح طریقہ ہے۔ اور جب ایک سے دوسرے کا کام لیا جائے تو کام لینے

والا تو عقل سے خارج ہے ہی وہ کام بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا کہ جوتا گٹھوانے کے واسطے درزی کے پاس چلا گیا ہو وجہ کیا ہے کہ جانتے ہیں درزی کا کام اور ہے موچی کا کام اور مگر تعجب ہے کہ اہل اللہ کے پاس جا کر یہ نہیں یاد رہتا کہ ان کا کام کیا ہے اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں یا تو اُن کے کام کو نہ پہچاننا یا پہچاننا مگر اُن کی وقعت نہ کرنا اور اُن کی وقعت نہ کرنا۔ درحقیقت ان کے کام کی... وقعت نہ کرنا ہے ان کا کام دین سکھلانا ہے تو یا تو آپنے تمیز نہیں کیا کہ دنیا اور دین دو چیز ہیں اور یا تمیز کیا مگر دین کی وقعت ذہن میں نہیں اور دنیا کی وقعت ہے کہ اُن کے لیے بھی یہی چاہتے ہو کہ اس بے وقعت چیز میں کیوں ہیں ہماری باوقعت چیز میں کیوں نہ شامل ہوں ان دونوں صورتوں میں بس کیا کہوں سوا اس کے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کبھی یہ نہیں سُنا کہ درزی کے پاس جا کر یہ خواہش کی ہو کہ چمار کا کام کرنے لگے اس خیال سے کہ چمار کا کام بہت ذلیل ہے پھر نہ معلوم کہ دین کو درزی کے کام کی بھی برابر نہیں سمجھا کہ دینداروں کے پاس آ کر یہ خواہش ہوتی ہے کہ دین چھوڑ کر دنیا میں بتلا ہوں۔

صاحبو! جب اہل اللہ کے پاس جاؤ تو اُن سے دین سیکھو اگر اسکی بھی توفیق نہ ہو تو خاموش ہی بیٹھے رہو اور خدا کے واسطے یہ تو نہ کرو کہ اُن کو اپنی دنیا سکھاؤ اور دنیا بھی کون سی دنیائے قبیح و مذموم یعنی غیبت و دیگر گناہ ؎

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں۔

آپ اس کو ہلکی بات سمجھتے ہیں کہ کسی کی شکوہ شکایت کریں۔ ان کے دل سے پوچھو کہ وہ تلوار سے زخمی کرنے کو اتنا برا نہیں سمجھتے جتنا گناہ میں ڈالنے کو سمجھتے ہیں آپ کی تفریح طبع کے اور بہت موقع ہیں یہ کیا ضرور ہے کہ اُن کی مجلس بھی آپ ہی کی سی مجلس ہو۔

آپ کو چاہیے کہ اُن سے خاموشی سیکھیں نہ کہ آپ اُن سے بھی خاموشی چھڑاتے ہیں وہ تو بوجہ دین کے خاموش ہیں دین سے قطع نظر کر کے دنیا والوں کو دیکھو۔ بلکہ ان لوگوں کو کہ جو دھرے اور گمراہ کہے جاتے ہیں مگر دنیا میں عقل مند مانے جاتے ہیں اُن میں سے بھی کسی کا قول آپ نہیں دکھا سکتے کہ بک بک کرنا اچھی چیز ہے جس کہا یہی کہا ہے کہ خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید۔ آپ اہل اللہ کو کم سے کم اپنے حال پر چھوڑ دیجئے اُن کو آپکے کچھ بتلانے سکھلانے کی ضرورت نہیں اُن کو حق تعالےٰ نے بہتیرا سکھلا دیا ہے انہوں نے تو یہ پڑھا ہے لیقل احدکم خیراً او لیصمت یہ حدیث ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کو چاہیئے کہ اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔ آپ اُن کو مٹی کا کھوایا گوبر کا ڈھیر کہئے ان کی آپکے مدح وذم پر نظر ہی نہیں پڑتی۔ اُن کی نظر اس پر رہتی ہے کہ یہ حالت ان کی حق تعالیٰ کے نزدیک بھی پسندیدہ ہے یا نہیں تو دنیا بھر کچھ بکا کرے انکے کان پر جوں نہیں چلتی ہاں اگر خدا تعالےٰ کے نزدیک کوئی حالت ناپسندیدہ ہو تو اُس پر جان لڑا دینے کے لئے تیار ہیں۔ غرض آپ انکی اصلاح نہ کریں اگر آپ اُن کو اچھا سمجھیں تو اُن کے پاس جائیں ورنہ اسکو اُنکے حال پر چھوڑ دیں ـــــ مگر یہ نہ کریں ـــــ کہ اُن کو بھی جا کر تباہ کریں وہ کبھی خلوت سے نکلنا پسند بھی نہ کرتے۔ اگر خدا تعالیٰ کا انکو حکم نہ ہوتا حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو آپ کی اصلاح کے واسطے مامور کیا ہے۔ اس نعمت کی قدر یہ ہے کہ آپ اُن سے اپنی اصلاح سیکھیں جہاں بہت سا وقت چوپالوں اور بیٹھکوں میں قیل وقال میں گذرتا ہے وہاں تھوڑا وقت ان کے پاس خاموشی سے گذاریئے۔

مجلس آرائی کے مفاسد

وہ ہی چار دفعہ میں معلوم ہو جائیگا کہ مجلس آرائی اچھی ہے یا گوشہ نشینی مجلس آرائی کا شوق جب ہی تک ہے جب تک خلوت کا مزہ نہیں پایا۔ اور جب تک کہ مجلس آرائی کے مفاسد پر نظر نہیں پڑی۔ میں کہتا ہوں کہ مجلس آرائی مت کرو ہر گز نہیں ہرگز

نہیں ہو سکتا کہ مجلس آرائی کر کے مفاسد سے بچ سکو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

قعر چہ بگزید ہر عاقل ست زانکہ در خلوت صفاہائے اوست

اگر کوئی کنوئیں میں بھی رہنے لگے تو گناہ سے تو بچ جائے گا دنیا سے گیا سہی دین تو غارت نہ ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں کچھ آدمی دیکھے کہ ان کے ناخن تانبے کے اور وہ اُن ناخنوں سے اپنا منہ نوچ رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں انہوں نے کہا کہ یہ غیبت کرنے والے ہیں۔ یہ ہیں تحفے آپ کی مجالس کے مگر آپ اس مجلس آرائی اور فضولیات کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ جہاں چھوٹے بن کر بھی جانے ہیں یعنی بزرگوں کی خدمت میں وہاں بھی اپنا اثر ڈالنا چاہتے ہیں اور جو آپ کی مجلس میں برابری کے ساتھ یا چھوٹا بن کر پہنچے اسکو تو کیا کچھ آپ فیض پہنچادیں گے یہاں سے اس کا جواب نکل آیا کہ بعض شوخ طبیعت کہتے ہیں کہ ہم چوپالوں اور بیٹھکوں میں ان مفاسد میں مبتلا ہیں تو علماء کو چاہیے کہ تشریف لاویں اور ہماری اصلاح کریں وہ تشریف جب لاسکتے ہیں کہ ان کو خود مفاسد میں پڑ جانے کا خوف نہ ہو چوپالوں میں یہ مرض متعدی ایسا پھیلا ہوا ہے کہ کوئی جا کر اُس کا دفعیہ تو کیا کرے خود ہی اس میں مبتلا ہو جاوے گا۔ قطع نظر اسکے علماء کے ذمہ تو دوسروں کی اصلاح آپ رکھتے ہیں اور اپنے ذمہ اپنی اصلاح بھی نہیں رکھتے از رُوئے انصاف تو آپ کو چاہیے کہ اپنا مرض محسوس کریں اور علماء سے اصلاح کے طالب ہوں اور یہ بھی نہ سہی اتنا ہی آپ وعدہ کریں کہ ان کو اپنے رنگ میں نہ رنگیں گے۔ تب بھی علماء اس خدمت کے لیے تیار ہیں اور جب بھی یہ نہیں تو اُن کی جوتی سے "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد"۔ یہ آپ کی مجالس کے مفاسد ہیں جن کی اصل بیکاری ہے یہ سب باتیں بیکاری میں پیدا ہوتی ہیں اسکی عادت چھوڑیئے اور اول تو دین کے اور

نہ ہو سکے تو دنیا کے مباح کاموں میں لگے رہیئے تو غیبت وغیرہ سے تو امن رہے گا

چغل خوری

ایک شاخ غیبت کی چغل خوری ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی کی کوئی شکایت آمیز بات دوسرے کو پہنچائی جاوے غیبت تو مطلق کسی عیب کی نقل کرنے کو کہتے ہیں۔ اور چغلی وہ غیبت ہے جس میں شکایت بھی ملی ہوئی ہو اکثر سننے سے سننے والے کو ضرور غصہ آجاتا ہے اور اس کی اگر ایک شکایت پہنچی ہے تو وہ دس گنا بدلہ لینے کو تیار ہوجاتا ہے پس دونوں میں لڑائی ہوجاتی ہے ؎

میان دو کس جنگ چوں آتش ست　　　سخن چین بدبخت ہیزم کش است

اگر غور سے دیکھا جاتے تو چغلی بھی اکثر بے بنیاد ہوتی ہے سننے والوں سے تعجب کرتا ہوں کہ وہ اس پر کیسے عمل کر لیتے ہیں جس شخص کی عادت چغلی کھانے کی ہے وہ ایک ہی جانب کی چغلی نہیں کھاتے گا۔ بلکہ تمہاری بات بھی اس کے سامنے لگائے گا اگر اس چغلی کو سچ سمجھا ہے تو اپنے اس عیب کو بھی سچ سمجھنا۔ مگر یہ کوئی نہیں کرتا دوسرے کی شکایت کو تو سمجھ لیتے ہیں کہ ضرور کچھ اصل ہو گی جب تو ہم سے کسی نے کچھ آکر کہا تو اسی طرح اپنی بات کو بھی سمجھو کہ کچھ تو اصل ہو گی جب تو دوسرے تک پہنچی۔

غرض! چغلی کھانا اور چغلی کھانے والے کی بات پر یقین کر لینا دونوں بے عقلی کی بات ہیں۔ اس مرض سے بھی بہت بچنا چاہیئے یہ عادت بھی عورتوں میں زیادہ ہے کہ ایک کی بات دوسرے کو ضرور پہنچاتی ہیں اور یہ کبھی توفیق نہیں ہوتی کہ اچھی طرح سمجھ کر بات کو روایت کریں آدھی بات سُنی اور دوسری جگہ جا لگائی کہ فلانی تجھے یوں کہہ رہی تھی اس کی خرابیاں بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں سب کو معلوم ہیں۔

زہر آلود مٹھائی

اور میں غیبت کے بیان میں بہتیرا لکھ چکا ہوں اب میں ایک اور مشغلہ کا بیان کرتا ہوں جو شعبہ اسی عیب گوئی و عیب جوئی کا ہے اور جس میں بہت پڑھے لکھے آدمی بھی پڑے ہوئے ہیں اور اُس کے مفاسد پر تو نظر کیسی اُس کو اچھا کام سمجھے ہوئے ہیں وہ یہ ہے اپنی فکر چھوڑ کر دوسروں کی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں۔ یہ بادی النظر میں ایک عمل صالح معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ایک شیطانی دھوکہ ہے اس وقت میں اپنا مخاطب اُن... لوگوں کو بناتا ہوں جو اُس کے اہل نہیں ہیں۔

اصلاح فی نفسہٖ عمل صالح اور مامور بہ ہے لیکن نہ ہر شخص کے لیئے اس کام کو وہ انجام دے جو پہلے اپنی اصلاح پر قدرت رکھتا ہو اور رہے عالم لوگ تو اُن کی اس میں بھلائی نہیں بلکہ بُرائی ہے اور بُرائی بھی بہت خفی ہے جس پر بہت گہری نظر والا اطلاع پا سکتا ہے وہ خفی بُرائی یہ ہے کہ درحقیقت اصلاح نہیں عیب جوئی ہے بیان اس کا یہ ہے کہ بعض لوگ غیبت اور عیب جوئی وغیرہ احتراز کرنا چاہتے ہیں۔ اور شیطان ان کو بہت ترکیبوں سے اس میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ جب کوئی داؤ نہیں چلتا تو یہ سمجھاتا ہے کہ دوسرے کی اصلاح کرو۔ بنظر عیب جوئی نہ سہی بنظر اصلاح اس کے حالات میں غور کرو یہ ایسا دھوکہ ہے کہ اس سے بچنا بہت ہی مشکل ہے۔ اس دام میں آکر دوسروں کے عیوب پر نظر ڈالنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اور دل میں یہ اطمینان ہوتا ہے کہ ہم عیب جوئی تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی اصلاح کے درپے ہیں جہاں کہیں بیٹھے ہیں اُن عیبوں کو ذکر کرتے ہیں اور اچھی طرح غیبت کر لیتے ہیں۔ ہاں آخر میں دل کو تسلی دینے کے لیے اور اپنی برات قائم رکھنے کے لیئے کہہ دیتے ہیں کہ بھائی خدا اُس کے حال پر رحم کرے یہ عیب اس میں ہے اُن کو دیکھ کر بڑا دل دکھتا ہے ہم بطور غیبت کے نہیں کہتے بلکہ ہم کو اُن سے

تعلق ہے یہ برائیاں دیکھ کر ہم کو رحم آتا ہے خدا کرے یہ برائیاں کسی طرح چھوٹ جائیں۔ سبحان اللہ! بڑے خیر خواہ ہیں۔ سر سے پیر تک تو اس کا گوشت کھالیا۔ مجمعوں میں اسکو ذلیل کیا اور ایک کلمہ سے بری ہو گئے۔

صاحبو! یہ سب نفس کی چالیں ہیں اس سے آپ کو دو نقصان پہنچتے ہیں ایک اپنی اصلاح سے رہ جانا دوسرے غیبت وغیرہ معاصی میں پڑنا اور چونکہ اس کی برائی بھی نظر میں نہیں ہے اس واسطے اس بلا سے نکلنا بھی بڑا مشکل ہے

طاعت کے پیرایہ میں معصیت

میں آپ کو ایک پہچان بتلائیے دیتا ہوں جس سے اگر آپ کام لیں گے تو انشاء اللہ ان دھوکوں میں نہ پڑیں گے وہ یہ ہے کہ یاد کر لیجئے کہ طاعت میں لذت نفس نہیں ہوتی اور جس کام میں لذت نفس ہو وہ طاعت نہیں ہوتا اگر آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ ہمارا فعل غیبت اور طعن ہو یا نہیں تو انصاف کے ساتھ حالت نفس کو تلاش کیجئے کہ ان بیانات کے وقت آپ کو لذت حاصل ہوتی ہے یا نہیں اگر لذت حاصل ہوتی ہے تو کھٹک جائیے کہ اس میں نفس کی چال پوشیدہ ہے اور یہ عمل شیطانی ہے طاعت نہیں ہے اس کی ایک بہت موٹی پہچان یہ ہے کہ ان عیوب کو بار بار کہنے کو جی چاہتا ہے اگر وہ معصیت نہ ہوتا تو وہ آپ کی زبان پر ایسے آتا کہ جیسے آپ کا کوئی بیٹا نالائق ہو اور برے افعال میں مبتلا ہو اور آپ کو تنگ کرتا ہو۔ اسکے عیب آپ کی زبان پر ہر جگہ نہ آئیں گے۔ بلکہ ان کی زبان پر آنے سے آپ کا دل دکھے گا اور خفت بھی ہو گی اور حتی الامکان یہ چاہیں گے کہ یہ عیب کسی پر ظاہر نہ ہوں اور اس کو مناسب طریق سے اور تنہائی میں آپ سمجھائیں گے کہ یہ حرکتیں نازیبا ہیں ان کو چھوڑ دو یہ کبھی نہ ہو گا کہ آپ ان عیبوں کو جگہ جگہ گاتے پھریں اصلاح اسکو کہتے ہیں اگر آپ کو اس شخص کی اصلاح کرنی ہے

جس کی غیبت میں آپ مبتلا ہیں تو دوسروں کے سامنے اس کے عیب ظاہر کرنے سے کیا فائدہ۔ اس کو تنہائی میں سمجھا دیجیے اور اسی طرح سمجھائیے جیسے اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جو اثر آپ کے دس جگہ ان عیبوں کے مجمع میں ذکر کرنے سے ہوتا اس سے زیادہ ایک جگہ علیحدگی میں سمجھانے سے ہوگا یہ عمل مستحسن اور ماثور ہے اور اگر اس کی ہمت نہیں ہوتی کہ اس کو تنہائی میں سمجھائیں بلکہ مجمعوں میں اس کے عیبوں کو ظاہر کرنے میں لطف آتا ہے۔ تو سمجھ لو کہ یہ وہی شیطان کا دھوکہ ہے جو زہر آلود مٹھائی کا کام دیگا کہ حلق سے اترتے تک تو اچھی معلوم ہوتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد اسکی حالت یہ ہوگی کہ ؎

توان بحلق فرو بردن استخوانِ درشت ولے شکم بدرد چوں بگیرد اندر ناف

اس خبط میں عورتیں بہت پڑی ہوئی ہیں شاید ہی کوئی بھلی مانس اس سے خالی ہو۔ دوسرے کی عیب جوئی ان کی طینت میں داخل ہے ذرا سا بہانہ چاہیئے کہ دوسرے کے کاموں میں گھس بیٹھیں۔ اگر کسی میں کچھ دنیا کا عیب ہو تو اس پہ ان کی نظر ضرور پڑے گی اور اگر دنیا کا نہ ہو اور دین کا ہو تو چاہے اپنے آپ اس سے سینکڑوں درجہ بدتر گناہوں میں مبتلا ہوں مگر اس پر طعن کر ہی دیں گی اپنے آپ چاہے روزہ نماز قضا ہوتی ہو مگر دوسرے کسی کو ایک دن دیکھ لیں کہ نماز دیر سے پڑھی تو جھٹ سے لوگ دیں گی کہ یہ تو مولوی بنتے ہیں نماز تک وقت پر پڑھتے نہیں اور جو ان سے کہو کہ یہ عیب جوئی ہے تو کہتی ہیں کہ کیا نماز کے لیے بھی کہنا برا ہے۔

خوب سمجھ لو کہ یہ کہنا نماز کے لیے نہیں ہے بلکہ طاعت کے پیرایہ میں معصیت ہے اور اس میں وہی گہرا مکر شیطان کا پوشیدہ ہے جس کو میں نے ابھی بیان کیا کہ اپنی نماز قضا کرنے میں مبتلا ہے ہی دوسرے کی عیب جوئی کے گناہ میں بھی مبتلا کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی کو نماز پر تنبیہ و تاکید نہ کرو۔ بلکہ یہ کہتا ہوں

کہ دوسرے کو جتنی تاکید کرو اتنی اپنے آپ کو بھی کرو۔ یہ کیسا امر بالمعروف ہے کہ دوسرے کو تو نماز دیر سے پڑھنے پر ملامت کی جاتی ہے اور اپنے آپ برابر نماز قضا ہونے پر بھی کچھ خیال نہیں ہوتا بس سمجھ لو کہ امر نہی کچھ بھی نہیں ہے صرف شیطان نیکی کے پیرایہ میں بُرائی کراتا ہے۔ بے نماز تو پہلے ہی سے بنا رکھا ہے جو حق اللہ تھا۔ اب حق العبد میں بھی مبتلا کرتا ہے اور اس پیرایہ سے کہ پتہ بھی نہ چلے ـــــ بعض بدطینت ایسے ہوتے ہیں کہ ہر شخص کے کاموں میں گھستے ہیں۔ اور اس کی بھی بحث نہیں کہ کوئی کام اچھا ہے یا بُرا۔ ایک نہ ایک عیب لدنکال دیتے غرض! حتیٰ کہ اگر کوئی عیب نہ ملے تو یہ ہی سہی کہ اگر نیک ہیں تو اپنے لیے ہیں کیا۔ اور آپ نیک بن گئے تو کیا فلاں رشتہ دار ان ہی کے کیسے ہی خراب لوگ ہیں اُن کو نہیں درست کیا جاتا۔ اپنے آپ ولی بنتے ہیں۔ میں کہتا ہوں تمہیں کیا اگر اُن کے رشتہ دار بُرے ہیں تو کیا انہوں نے بُرا کر دیا ہے اور اگر ان میں یہ تاثیر ہے کہ دوسروں کو بُرا کر دیتے ہیں تو تم ان سے بچتے رہو کہیں تمہیں بھی بُرا نہ کر دیں یہ بہت بُری حالت ہے جتنا وقت اور خیال آدمی دوسروں کے تجسس میں صرف کرتا ہے اگر اتنا اپنے تجسس میں صرف کرے تو نہ معلوم کہاں پر پہنچے۔

ان مشغلوں کو چھوڑو قصہ خود آں چناں است کہ فرصت نمی دہد۔ اپنی فکر کرو۔ دوسرے کی بات کہنا تو درکنار سنو بھی مت اس میں دنیاوی نقصان بھی تو ہے تم نے اگر کسی کی شکایت توجہ سے سن لی تو کیا تمہیں اطمینان ہے کہ وہ شکایت کرنیوالا تمہاری شکایت دوسرے کے پاس نہیں لے جاویگا ضرور لے جاویگا پھر تم سے اور اُس سے لڑائی ہوگی۔

امراضِ روحانی کا انسداد

اس کی انسداد کا طریقہ یہی ہے کہ تم کسی کی بات مت سنو بلکہ اپنے حالات میں غور کرو

اپنے عیبوں کی تلاش کرو۔ اور اُن کی اصلاح کے درپے رہو۔ ہم لوگوں نے یہ عادت ہی چھوڑ دی ہے اس واسطے اپنے عیب نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ اگر ذرا بھی عادت ڈالیں تو اپنے بھی عیب نظر آنے لگیں پھر اس وقت دوسروں کی عیب جوئی ایسی معلوم ہونے لگے کہ اپنے بدن پر تو سانپ بچھو لپٹے ہوئے ہیں اور دوسرے کی مکھیوں کی فکر ہے۔ واللہ! تمہارے اندر اتنی امراض ہیں کہ تمام عمر گھسیٹتے گھسیٹتے مشکل سے نکلیں گے کیونکہ یہ امراض باطنی ہیں۔ جب کسی کے سر میں درد ہوتا ہے جو امراض جسمانی میں سے ہے اور وہ بھی ایک عضو میں تو اُس کے ازالہ کے لیے کتنی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں اور کتنی دیر لگتی ہے۔ طبیب کے پاس جانا پڑتا ہے وہ نسخہ لکھتا ہے ایک پینے کا نسخہ ہوتا ہے اور ایک لیپ کا نسخہ ہوتا ہے کچھ دیر دوا خرید نے میں لگتی ہے کچھ بنانے میں۔ جب ایک دردِ سر کا یہ حال ہے تو اُن امراض کی نسبت کیا کہا جاوے کہ جن کا آپ کو خود حس بھی نہیں امراض جسمانی تو ایسی چیز ہیں کہ اُن کی تکلیف ضرور محسوس ہوتی ہے اور وہ مجبور کرتی ہے کہ انسان اُس کی تدبیر کرے۔

ادراکِ امراض

اور امراض باطنی ایسی چیز ہیں کہ بجائے اس کے کہ اُن کی تکلیف محسوس ہو۔ اُن میں اور آرام و لذت حاصل ہوتی ہے پھر کسی کو کیسے معلوم ہو کہ مجھ کو یہ مرض ہے اور تدبیر کیسے ہو طبعاً تو اس کی حس ہونے سے رہی ہاں اپنے اختیار سے محسوس کیجئے اور اسی کی حق تعالیٰ نے تکلیف دی ہے۔ آپ جب تک قصد نہ کریں گے اصلاح کیسے ہو گی اس کے لیے حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور ان کے بعد اُن کے نائبین کو مقرر فرمایا۔

مگر یہ خوب یاد رکھیے! کہ امراض جسمانی کی طرح آپ کی طبیعت میں اُن امراض

کا حس نہیں دیا۔ یہاں اختیار کو دخل رکھا ہے۔ ہاں برے بھلے کے واضح کر دینے کا ذمہ لیا ہے اور جب آپ ارادہ کریں تو مدد دینے کا بھی وعدہ فرمایا ہے تو اپنے اختیار کو کام میں لایئے اور کوشش کیجئے اور ان امراض کی ایک ایک کی تلاش کیجئے اور باقاعدہ علاج کیجئے۔ اگر آپ کا ارادہ پکا ہے تو امید سے زیادہ امداد ہو گی اور ان امراض کے معلوم کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ کتابوں کو پڑھیئے یا پڑھنے والوں کی صحبت میں بیٹھئے تھوڑے دنوں میں آپ کو وہ امراض ایسے نظر آنے لگیں گے جیسے آئینہ میں اپنی صورت کا برا بھلا نظر آ جاتا ہے۔ اس وقت معلوم ہو گا کہ جن عادات سے ہم مانوس تھے۔ وہ حقیقت میں داغ دیتے تھے مثلاً چغل خوری جو شخص اس کا عادی ہے اس کو اس میں کیسا مزہ آتا ہے کہ بلا اس کے گویا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اور جب وہ اس کو چھوڑ دے اور وہ عادت اس کی بدل جائے تو کہتا ہے لاحول ولاقوۃ الا باللہ کیسی گندی عادت تھی اور مجھے کیوں مزہ آتا تھا۔ ایسے ہی تمام منہیات کی حالت ہے کہ جب تک آدمی ان کا عادی ہے اس میں کیفیت آتی ہے اور جب خدا فضل کر دے اور کسی کی صحبت نصیب ہو جائے یا کسی ذریعے سے انکو تنبیہ ہو جائے تو ان سے ایسا ہی گھنتا ہے جیسے پیشاب پاخانہ۔ غرض! معاصی سب نفس الامر میں برے اور گھنانے کی چیزیں ہیں مگر ہماری عادت نے اس کا حس مٹا رکھا ہے کوشش کر کے اس حس کو لوٹایئے۔

چغلی کی خاصیت

اور یقین سے جان لیجئے کہ جو اثر معاصی کا نصوص میں وارد ہوا ہے وہ ضرور واقع ہو گا تو کیا اچھی بات ہے کہ اس اثر مرتب ہونے سے پہلے ان سے بری ہو جاؤ۔ چغل خوری کے بارہ میں فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنۃ۔ قتات یعنی نہ داخل ہو گا جنت میں چغل خور۔ یہ کیسی سخت وعید ہے مسلمان کی تو ساری تمنائیں

اور آرزو میں اس پر ختم ہیں کہ جنت ملنے والی ہے اور یہاں خبر ہیں صاف انکار ہے کہ جنت نہ ملے گی۔ گویا تمام حوصلوں کی پست کردینے والی وعید ہے اس میں جس قدر مبتلا ہیں اُس کو کہاں تک بیان کروں زیادہ تر وجہ عورتوں میں آپس بگاڑ کی یہی چغل خوری ہے۔ اس میں ذاتی خاصیت ہے کہ کچھ نہ کچھ اثر لاتی ہے۔ جب کسی سے چند بار شکایت کی جائیگی تو کچھ تو اثر ہوہی گا اس واسطے اہل اللہ نے ایسے شخص کی بات سُننے سے بہت احتراز کیا ہے۔

ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالے علیہ کے سامنے جب کوئی کسی کی شکایت کرتا کہ فلاں شخص آپ کو یوں کہتا تھا تو فرماتے کہ خیر اُس شخص نے تو پیچھے ہی بُرا کہا۔ اور تو نے تو میرے سامنے اس جواب سے پھر اُس کا حوصلہ آئندہ چغلی کھانے کا نہ پڑتا۔ یہ عمدہ طریقہ ہے ورنہ اُس کا آئندہ حوصلہ بڑھے گا۔

اور بعضے یہ سمجھ کر سُن لیتے ہیں کہ ہم پر اثر نہیں ہوتا یہ ہرگز ماننے کے قابل بات نہیں۔ چغل خوری کی مثال تیر کی سی ہے کہ جب وہ کمان سے چھوڑا گیا تو کسی نہ کسی کے ضرور لگے گا۔

دیکھئے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرماتے ہیں کسی کی شکایت نہ کیا کرو فانی احب ان اخرج الیکم وانا سلیم الصدر یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ تمہاری جانب سے صاف دل رہوں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ سے بڑھ کر کون سلیم الصدر اور قوی القلب ہوسکتا ہے اور آپ منع فرماتے ہیں کہ شکایت نہ کیا کرو تاکہ میرے دل میں کسی کی جانب سے میل نہ ہو تو دوسرا کون اس کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ چغلی سے متاثر نہ ہوگا۔ بعض لوگ شکایت سنتے ہیں اور کہہ دیا کرتے ہیں میاں ہم نے سُن تو لی مگر اثر کچھ نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں ضرور ہوا اور یہ کہنا اُسکی غلطی ہے کیا یہ اثر نہیں ہے کہ ایک منکر میں آپ کو لطف آنے لگا۔ یہ تو سب برائیوں کی

جرأت ہے۔ جب ایک بُری بات میں آپ کو لطف آنے لگتا ہے تو دوسری میں بھی آنے لگے گا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ حسِ قلب باطل ہو جائے گا۔ اور کہیں وہ حالت نہ پیدا ہو جائے جس کی نسبت فرمایا گیا ہے فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ عقل کی بات یہ ہے کہ نفس جیسے اپنے دشمن پر اعتماد نہ کیجئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مشفق اور دل سوز مربی پر اعتماد کیجئے جب حضور یہ کھٹکا بیان فرماتے ہیں کہ چغل خوری سے دل پر میل آجاتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں ضرور یہ اثر ہے اور اس کو نفس کا دھوکہ سمجھئے کہ ہم پر اثر نہیں ہوتا ایسے ہی ہر گناہ کی حالت سمجھئے کہ اُن میں نفس کے کہنے سے کوئی بھلائی نہ سمجھئے اللہ و رسول کے فرمانے کو اپنا معتمد علیہ قرار دیجئے اور ہر گناہ کو اپنے لیے مضر سمجھئے اور ظاہر و باطن سب کو درست کیجئے۔ طاعت صرف اسی کا نام نہ سمجھئے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لی جیسے خدا تعالیٰ نے نماز کا حکم کیا ہے ایسے ہی باطنی امراض کے ازالہ کا بھی حکم کیا ہے جن کو آپ نے کس قدر تفصیل کے ساتھ سُن لیا۔

حاصلِ وعظ

اب میں ظاہر و باطن کے علاج کا خلاصہ بتلائے دیتا ہوں جو میرے تمام بیان کا ماحصل ہے ایک تو دل کو روکنا چاہیئے کہ غصہ میں بے قابو نہ ہو جائے غصے کے بُرے نتائج بار بار یاد کرنے چاہئیں کہ غصہ نہ آوے اور اگر غصہ آدے تو اسکی وہ تدبیر کرنی چاہیئے جو میں نے آج بیان کی ہیں۔ اگر آپ تھوڑی ہمت سے کام لیں گے تو حق تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوگی اور بہت جلد آپ کا غصہ آپ کا تابعدار ہو جائے گا۔ اور ظاہر کی اصلاح یہ ہے کہ اعضائے ظاہری میں زبان کے گناہ بہت ہیں ہمت کر کے اُن سے بچیئے اور اُن تدابیر سے کام لیجئے جو میں نے بیان کیں خصوصاً غیبت سے زیادہ بچئے اگر اس میں کامیاب ہو جائیں تو سمجھئے کہ زبان کے بہت سے گناہ چھوٹ

گئے اور جب زبان کی اصلاح ہوگئی تو سمجھ لیجیے کہ ظاہر کے بڑے حصے کی اصلاح ہوگئی۔ بس اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین

بالخیر

وبک نستعین

اِصلاح ذات البین

۳ر ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ بروز پنجشنبہ محلہ قلعہ جلال آباد ضلع مظفر نگر
میں تین گھنٹہ بیس منٹ تک کرسی پر بیٹھ کر وعظ فرمایا
جس میں نا اتفاقی کے مفاسد اور اتفاق محمود
کی حقیقت واضح کی گئی۔ سامعین کی
تعداد تقریباً ۲۰۰ تھی حضرت
مولانا ظفر احمد صاحب
عثمانی مرحوم نے
قلمبند
فرمایا

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم وفساد ذات البین فانہا ھی الحالقۃ لا اقول انہا تحلق الشعر ولکن تحلق الدین

تمہید

یہ ایک ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس میں آپ نے آپس کی خرابی و نااتفاقی و فساد کے ضرر پر مطلع فرمایا ہے ہر چند کہ یہ کوئی نیا مضمون نہیں اور نیا ہونا بھی نہ چاہئے کیونکہ اس وقت جو کچھ بیان ہوگا وہ دین کا مضمون ہوگا۔ اور ہمارا دین پرانا ہے تو پھر مضمون نیا کیونکر ہو سکتا ہے پس یہ تو نہ دیکھنا چاہئے کہ مضمون نیا ہے یا نہیں۔

حسب ضرورت مضمون

ہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ ضرورت کے موافق بھی ہے یا نہیں کیونکہ مضمون کا نیا ہونا کچھ

خوبی نہیں یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی طبیب ایک نسخہ لکھے اور دعویٰ کرے کہ یہ نسخہ ایسا ہے کہ نہ کسی کتاب میں لکھا ہے نہ کسی طبیب نے تجویز کیا ہے تو اُسکو کوئی قبول نہ کرے گا۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ نسخہ کی خوبی تو یہ ہے کہ حکماءِ سلف کے اصول کے مطابق ہو اور اُس کے اجزاء کی ترتیب کسی طبیب حاذق کی رائے سے ہوئی ہو۔ ورنہ گھڑت ہوگی اسی کو شریعت میں بدعت کہتے ہیں۔ پس جس طرح نسخہ میں نیا ہونا مطلوب نہیں۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مزاج کے موافق ہو اور اصول وقواعد کے مطابق ہو۔ اسی طرح وعظ میں بھی یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ مضمون پرانا ہے یا نیا بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ضرورت اور حالات مخاطبین کے مناسب ہے یا نہیں۔

محقق ہمیشہ ضرورت کا لحاظ کرکے وقت اور موقعہ کے موافق مضمون بیان کرتا ہے چاہے وہ پرانا ہی کیوں نہ ہو۔ مگر آج کل واعظ دو قسم کے ہیں ایک تو پیشہ ور واعظ ہیں اُن کا مقصود تو یہ ہوتا ہے کہ مضمون ایسا ہو جس سے مجلس پہ رنگ جم جائے چاہے اُن کی ضرورت کا ہو یا نہ ہو۔ اسی لیے وہ نئے نئے مضامین کا اہتمام کرتے ہیں اور پرانا مضمون بھی بیان کریں گے تو اس میں ضرورت کا لحاظ نہ کریں گے۔ بلکہ وہ مضمون اختیار کریں گے جس سے مجلس گرم ہو جائے چنانچہ اسی لیے بعضے ہر جگہ شہادت نامہ کو لے دوڑتے ہیں کیونکہ وہ واقعہ ہی ایسا سنگین ہے کہ سنگدل سے سنگدل بھی اُس سے موم ہو جاتا ہے مگر جو محقق ہیں وہ اس پر نظر نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ہمیشہ ضرورت کا لحاظ کرتے ہیں۔

مجلس شیعہ میں حضرت شہیدؒ کا وعظ

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید دہلوی جب لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں اُس وقت وہاں شیعہ کی حکومت تھی مولانا ایک سُنّی کے مہمان ہوئے جو دربار شاہی میں کسی عہدہ پر ممتاز تھے اُس زمانہ کے اکثر سلاطین میں تعصب نہ تھا

اس لیے سُنّی بھی اُن کے دربار میں عزّت سے رہتے تھے۔ جب بادشاہ کو مولانا کا تشریف لانا معلوم ہوا تو زیارت کا اشتیاق ہوا۔ کیونکہ مولانا اسمٰعیل صاحب کی شہرت اور عزّت اُس زمانہ میں بہت زیادہ تھی آپ کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا جو علمأ میں کسی کو بھی اُس زمانہ میں حاصل نہ تھا۔ حالانکہ مولانا اپنے کو مٹائے ہوئے تھے مگر خدا تعالٰے نے آپ کو خاص عزّت دی تھی اسکی نظیر اسی قریب زمانہ میں بھی گذر چکی ہے۔ یعنی مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ مولانا نہ مدرّس تھے نہ مصنّف۔ چنانچہ دیوبند کے مدرسہ میں مدرّس اوّل مولانا محمد یعقوب صاحب تھے مولانا محمد قاسم صاحب خود مدرّس نہ تھے اور نہ مولانا نے کوئی کتاب تصنیف کی اور جو رسائل آپکے نام سے طبع ہوئے ہیں وہ اکثر خطوط کے جوابات ہیں جن کو لوگوں نے طبع کرا دیا۔ مگر بایں ہمہ آپ کی عزّت و شہرت ایسی تھی کہ مخالفین بھی مولانا کے کمال کے معتقد تھے۔

یہی حال مولانا اسمٰعیل صاحب کا تھا کہ مخالفین بھی اُن کے کمال کو مانے ہوئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ لکھنؤ گو مذہباً شیعہ تھے۔ مگر مولانا کا نام سن کر زیارت کے مشتاق ہوئے اور آپ کا وعظ سُننا چاہا تو انہوں نے مولانا کے میزبان سے کہا کہ ہم نے سُنا ہے کہ آپکے یہاں مولانا اسمٰعیل صاحب تشریف لائے ہیں ہم اُن کی زیارت کرنا اور وعظ سُننا چاہتے ہیں۔ میزبان کو بڑی فکر ہوئی کہ یہ بلا سر لگی کیونکہ مولانا صاف گو بہت ہیں وہ وعظ میں کسی کی رعایت نہ کریں گے شیعہ کی بھی ضرور خبر لیں گے جو بادشاہ کو ناگوار گذرے گی۔ اسلیے چاہا کہ کسی طرح اس بلا کو ٹالیں۔ مگر اُدھر سے اصرار بڑھتا گیا۔ آخر سُنّی میزبان نے مولانا سے آکر عرض کیا کہ بادشاہ آپ کی زیارت اور وعظ کے مشتاق ہیں۔ میں کئی روز تک اُن کو ٹالتا رہا۔ مگر وہ اصرار پر اصرار کیے جاتے ہیں اسلیے بہتر ہے کہ اُن کی

درخواست کو آپ منظور فرمالیں۔ مگر خدا کے لیے وعظ میں شیعہ وسنّی کے اختلاف کا ذکر نہ فرمائیے گا کیونکہ بادشاہ شیعی ہے اُس کو یہ امر ناگوار ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ اس سے بے فکر رہیں۔ میں ایسا بے وقوف نہیں ہوں جو کچھ کہوں گا موقع کے مناسب کہوں گا۔ واقعی سچ فرمایا کیونکہ آپ نے تو جو کچھ بھی فرمایا وہ موقعہ کے مناسب ہی تھا۔ گو بعض کی سمجھ میں نہ آوے اس کے بعد مولانا محل شاہی میں تشریف لے گئے اور بادشاہ نے بڑی تعظیم کے ساتھ آپ کا استقبال کیا پھر وعظ شروع ہوا جس میں تمام درباری مع بادشاہ کے اور لکھنؤ کے سب علماء اور شیعوں کے مجتہد وغیرہ سبھی جمع تھے۔ مولانا نے تمہید میں فرمایا کہ صاحبو! اوّل وعظ کی... حقیقت سُن لیجئے وہ ایک روحانی علاج ہے اور علاج ہوتا ہے امراض کا تو اب اگر میں وعظ کی حقیقت پر نظر کرتا ہوں تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ جس مرض میں مخاطب بتلا ہیں۔ اس کا علاج کروں ورنہ پھر وعظ ہی کیا ہوگا۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ میں مرض ہے رفض کا مگر ہمارے فلاں میزبان صاحب کہتے ہیں۔ کہ مذہبی نزاعات وخلافیات کا بیان نہ ہو۔ مگر میں وعظ میں اُسی بدعلت کا علاج کروں گا۔ اس تمہید میں آپ نے میزبان کو بھی آفت سے بچالیا۔ اور تبلادیا کہ وہ تو نزاعی مسائل کے بیان سے منع کرتے تھے۔ مگر میں نے ہی ان کی رائے قبول نہ کی تو ان پر کچھ الزام نہیں اس کے بعد مولانا نے ایک آیت پڑھ کر صحابہ کے مناقب بیان کرنا شروع کئے اور ساتھ ہی اہل بیت کے مناقب بھی بیان فرمائے اور درمیان درمیان میں شیعہ وسنّی کے اختلافی مسائل کا بھی بیان فرمایا اور مذہب شیعہ کا خوب ابطال کیا۔ بادشاہ کی تو یہ حالت تھی کہ اوّل سے اخیر تک سکتہ کی سی حالت میں بیٹھے رہے اور وعظ ختم ہوتے ہی بادشاہ اُٹھے اور بہت تعظیم وتکریم کے ساتھ مولانا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعض علماء شیعہ کو نواب صاحب کی اس تعظیم و

بحیثیم سے مولانا کے ساتھ حسد پیدا ہوا اور انہوں نے بعد وعظ کے مولانا پر کچھ اعتراضات شروع کئے جن میں سے ایک اعتراض منقول بھی ہے وہ یہ کہ مجتہد شیعہ نے کہا کہ مولانا تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کو کبھی بُرا نہیں کہا[ع] اور حضرت معاویہؓ نے ہمیشہ آپ کی شان میں گستاخی کی ہے اسکی دونوں کی حالت کا فیصلہ ہوتا ہے مولانا نے جواب دیا کہ اسکی ان دونوں حضرات کا تو فیصلہ ہوا ہو۔ یا نہ ہوا ہو۔ مگر ہمارا اور آپ کا فیصلہ تو ہو ہی گیا۔ کیونکہ اسکی معلوم ہو گیا کہ آپ حضرت معاویہ کے طریقہ پر ہم کسی کو بُرا بھلا نہیں کہتے اور تم رات دن تبرّا کرتے ہو۔ اس جواب سے مجتہد دم بخود رہ گیا۔

بادشاہ نے کہا قبلہ کچھ اور سننا ہو تو اور اعتراض کر لیجئے۔ یہ حکایت میں نے اس پر بیان کی تھی کہ محقق ہمیشہ ضرورت و حالت مخاطب کے لحاظ سے مضمون اختیار کرتا ہے۔ چاہے مکرر ہو یا پُرانا ہو۔ کیونکہ وعظ علاج روحانی ہے اور علاج میں ہمیشہ مریض کی حالت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص کو بخار ہے تو وہ دس دفعہ بھی حکیم کے پاس جائے گا تو وہ بخار ہی کا نسخہ لکھے گا یہ نہیں کہ آج بخار کا لکھے اور کل کو زکام کھانسی کا۔ پرسوں کو کسی اور مرض کا۔ تاکہ نسخہ مکرر نہ ہو۔ وہ اسکی رعایت کبھی نہ کریگا۔ بلکہ جب تک بخار ہے بخار ہی کا نسخہ دیگا پس لوگ اسکو

ع۔ اس دعویٰ میں بھی مجتہد نے تقیہ سے کام لیا۔ اور مولانا نے علیٰ سبیل التسلیم جواب دیا۔ ورنہ نہج البلاغہ شریف رضی کی موجود ہے۔ جس کو یہ لوگ حضرت علیؓ کے اقوال و خطبات و مکاتیب کا مجموعہ صحیحہ کہتے ہیں اُس کو مطالعہ کر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت علی نے حضرت معاویہ کو کیسا برا بھلا اور سخت سُست کہا ہے کلب ابن الکلب اور منافق تک کہا ہے اسی لیے ہم اسکو موضوع و مفتری سمجھتے ہیں۔ ۱۲ جامع۔

نہ دیکھیں کہ مضمون پرانا ہے یا نیا طالب علاج کو اس سے کیا بحث!

مقصود بیان

ہاں جو لوگ وعظ کو علاج روحانی سمجھ کر نہیں سنتے بلکہ طالب لذت ہو کر آتے ہیں۔ وہ البتہ کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ کے قاعدہ سے نئے نئے مضامین کے طالب ہوتے ہیں کیونکہ مزا تو واقعی نئی باتوں میں ہے پرانی باتوں میں کیا مزا۔ کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ پر مجھے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا لطیفہ یاد آیا کہ مولانا کا معمول تھا کہ اُمراء کو تو چٹنی ساگ دال پات کھلاتے تھے اور غرباء کو پلاؤ زردہ اور مرغن کھلاتے۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا قاعدہ ہے کل جدید لذیذ نئی چیز مزیدار ہوتی ہے تو میں اپنے مہمانوں کو نئی چیز کھلاتا ہوں تاکہ لذت زیادہ آئے پس اُمراء کے لیے تو یہ معمولی کھانے جدید ہیں۔ مرغن تو وہ اپنے گھر میں روز ہی کھاتے ہیں اور غرباء کے لیے مرغن کھانے جدید ہیں۔ یہ تو مولانا کا لطیفہ تھا ورنہ اصل وجہ یہ تھی کہ مولانا کے دل میں غرباء کی وقعت امراء سے زیادہ تھی۔

بہر حال یہ بات صحیح ہے کہ لذت جدید ہی میں ہے اسی لیے جو لوگ لذت کے لئے وعظ سنتے ہیں وہ مضامین جدیدہ کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ وعظ سے مقصود لذت نہیں ہے۔ بلکہ علاج امراض ہے۔ پس لذت کے طالب نہ بنئے۔ بلکہ اصلاح حال کے طالب بن کر وعظ میں آیا کیجئے اور بیان کو اپنی حالت پر منطبق کر کے یہ دیکھئے کہ بیان کا موقعہ کا ہے یا نہیں۔ کیونکہ پرانی شے اگر اپنے موقعہ پر ہو تو وہ بھی لذیذ ہوتی ہے۔

دیکھئے بارش حالانکہ ہر سال ہوتی ہے مگر جب موقعہ پر ہوتی ہے تو اس سے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح کھانا ہم ہر روز کھاتے ہیں مگر جب وقت پر آتا ہے کہ خوب بھوک لگی ہو تو کتنا لذیذ معلوم ہوتا ہے۔ گو نیا نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ کسی شے کا جدید ہونا مطلوب نہیں بلکہ موقعہ پر ہونا مطلوب ہے۔

غرض: بیان سے اصلاح حال کا قصد کرنا چاہیئے اور اُس کو اپنی حالت پر منطبق کرنا چاہیئے۔ حق تعالےٰ نے بھی عاد و ثمود کے قصے بیان فرماکر ہم کو تطبیق کا حکم دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ اور مولانا رومی نے بھی اسی تطبیق کو مقصود بتلایا ہے چنانچہ شروع ہی میں جو بادشاہ اور کنیزک کا قصہ بیان فرمایا ہے تو اُس کے پہلے ارشاد فرماتے ہیں ؎

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں — خود حقیقت نقد حال ماست آں

نقد حالِ خویش را گر پے بریم — ہم ز دنیا ہم ز عقبیٰ برخوریم

انطباق وعظ

اور بعض لوگ جو بیان کو اپنے حال پر منطبق بھی کرتے ہیں تو وہ ایک دوسری غلطی میں پڑجاتے ہیں یعنی وہ وعظ میں بعض امراض کا حال سنکر اور اُن کو اپنے حال پر منطبق دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ آج تو ہماری خبر لی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے ہماری چغلی کھادی ہے۔ پھر بدگمانی کر کے کسی سے عداوت کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

بات یہ ہے کہ وعظ میں امراض عامہ کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں اکثر لوگ مبتلا ہیں تو وہ لامحالہ مخاطبین کے حال پر منطبق ہوں گے یہ کیا ضرور ہے کہ کسی نے آپ کی چغلی کھائی ہو۔ دوسرے عادۃ اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ بیان کرنے والے کے دل میں ڈال دیتے ہیں کہ اس وقت فلاں مرض کا علاج بیان کرنا چاہیئے اس وقت جو مضمون واعظ کے دل میں آئے گا وہ ضرور موقعہ کے موافق اور سامعین کی حالت پر منطبق ہوگا۔ اُس کو بدگمانی سے چغلی پر محمول کرنا سخت غلطی ہے اور فرض کرو کسی نے چغلی بھی کھائی ہو تو آپ کا نقصان کیا ہوا۔ آپکو تو ایک مرض کا علاج ہی معلوم ہوگیا اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مریض طبیب سے اپنا مرض ظاہر کرتے ہوئے شرماتا ہو اور کوئی دوسرا شخص طبیب سے کہدے کہ اسکو یہ مرض ہے۔ اور طبیب اُس کا علاج

بتلادے تو بتلایئے مریض اُس شخص کا شکر گزار ہوگا یا اُس کی دشمنی کریگا۔ بقیناً... شکر گذار ہوگا۔ اسی طرح آپ کو شکر گزار ہونا چاہیئے۔ پس جو لوگ وعظ میں اپنے امراض کا علاج سنکر دوسروں سے ناخوش ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وعظ میں علاج کے واسطے نہیں آتے۔ پس اب نئے مضمون کا انتظار نہ کیجیے بلکہ یہ دیکھئے کہ بیان ضرورت وموقعہ کا ہے یا نہیں۔

حصولِ یکسوئی

اس وقت یہاں کے بعض پریشان کُن واقعات اس بیان کے مقتضی ہوئے جن سے پریشانی کا احساس صرف میں نے ہی نہیں کیا۔ بلکہ بعض احباب نے بھی ان واقعات سے اپنی پریشانی ظاہر کی اور یہ ان کے قلوب کی صلاحیت ہے کہ ان کو گناہ سے پریشانی کا احساس ہوا ورنہ کثرتِ گناہ سے دل کا حس خراب ہوجاتا ہے تو گناہ کی پریشانی اور ظلمت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اور گو مجھ سے ابتداءً واقعہ ہی میں بیان کی درخواست کی گئی تھی۔ مگر میں نے درخواست کو منظور کرکے اس کا انتظار کیا کہ ذرا فی الجملہ یکسوئی ہوجائے تو بیان کروں کیونکہ غلبۂ... پریشانی میں بیان کا اثر کامل نہیں ہوتا۔ باقی کامل یکسوئی کی ضرورت نہیں یہ تو... ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلیئے اس کا انتظار بھی فضول ہے اور بعض احباب کی اس درخواست کو چغلی نہ سمجھا جاوے۔ چغلی اُس عیب کا اظہار ہے جس کا ضرر عام نہ ہو اور یہاں اس واقعہ کا دینی ضرر عام تھا اس لئے اس کا اظہار اور اس کی اصلاح کی درخواست ضروری تھی اور یہ جو میں نے ابھی کہا ہے کہ کامل یکسوئی کا انتظار فضول ہے یہ اس لیے کہدیا کہ بعض سالکین اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ تعلق مع اللہ پیدا کرنے کے لیے کامل یکسوئی کے انتظار میں رہتے ہیں کہ ذرا بیٹے کی شادی سے فراغت ہوجائے پھر اللہ کی یاد میں مشغول ہونگے بیٹے کی شادی ہوگئی تو اب لڑکی جوان ہوئی اب اس فراغت کے منتظر ہیں اسکی فراغت ہوئی تو اُدھر لڑکے کے اولاد ہوگئی۔ اب پوتے

کی خفتنے سے فارغ ہونا چاہتے ہیں۔ پس رات دن اسی سلسلہ میں گرفتار رہتے ہیں کام میں سے کام نکلتا آتا ہے اور فراغت نصیب نہیں ہوتی کیونکہ دنیا کی حالت ہی یہ ہے کہ سے لاینتھی ارب؛ لا الیٰ ارب اور دنیا دار کی حالت یہ ہے کہ سے

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

اسلیے کامل یکسوئی کا انتظار فضول ہے یہ تو دنیا میں پھنسکر ہو ہی نہیں سکتی اس کے حصول کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اسی پریشانی کی حالت میں تعلق مع اللہ کا سلسلہ بھی شروع کر دو۔ پھر رفتہ رفتہ اطمینان کلی نصیب ہو جائے گا ورنہ عمر یوں ہی ختم ہو جائیگی اور یکسوئی نصیب نہ ہو گی اسلیئے میں نے کہدیا کہ کامل یکسوئی کا مجھے انتظار نہ تھا۔ ہاں فی الجملہ یکسوئی کا منتظر تھا۔

جمال شریعت

شریعت نے بھی فی الجملہ یکسوئی کا اہتمام کیا ہے چنانچہ حکم ہے اذا حضر العشاء والعشاء فابدؤا بالعشاء کہ جب کھانا سامنے ہو اور عشا کی نماز تیار ہو تو نماز کو مقدم نہ کرو بلکہ کھانے کو مقدم کرو۔ سبحان اللہ! شریعت بھی کتنی آسان ہے کہ ہم کو پریشانی کی حالت میں نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ پہلے کھانے سے فراغت کر لینے کی اجازت دی۔ افسوس! اب بھی لوگ شریعت کو دشوار کہتے ہیں۔ صاحبو! آپ نے ٹھوکروں کو دیکھا ہے اسلیئے شریعت کا جمال آپ سے مخفی رہ گیا۔ میں آپ کو شریعت کا جمال دکھانا چاہتا ہوں۔ واللہ شریعت نہایت حسین وجمیل ہے اُس کی تو یہ حالت ہے کہ سے

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

باقی معترضات سے بچانا اگر سختی ہے اور مہذب بنانا اگر ظلم ہے تو آپکے باپ بڑے

ظالم ہیں جنہوں نے آپکو مار مار کر پڑھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج آپ تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹر بننے کے قابل ہو گئے اگر یہ سختی آپ پر نہ کی جاتی تو آج بجز اسکے کہ دوآنہ کے مزدور ہوتے اور کسی قابل نہ ہوتے تو کیا کوئی عاقل اسکو ظلم کہے گا ہرگز نہیں پھر اگر شریعت آپ کو مہذب بنانے کے لیے چند گناہوں اور حرام کاموں سے روکتی ہے تو اسکو ظلم وتشدد کیوں کہا جاتا ہے صاحب اس کی ساتھ شریعت کی سہولت کو بھی تو دیکھئے کہ شریعت میں کتنی سہولت ہے کہ کھانے کو نماز سے مقدم کر دیا۔

مزاج شناسی کی ضرورت

مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ تم ہر جگہ اسسے کام لینے لگو کہ روزانہ نماز کے وقت ہی کھانا کھایا کرو بلکہ اسکے لیے کچھ حدود ہیں جن کے سمجھنے کے لیے مزاج شناس ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلطان ہیں اور سلاطین کا کلام سمجھنے کے لیے مزاج شناس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر شخص ان کے کلام کو نہیں سمجھتا۔

اس پر میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں اسکے اس کا اندازہ ہو جائیگا۔ علی حزیں شاعر ایران کے شاہی خاندان سے تھا اور بڑا نازک مزاج تھا۔ شاہ زادے نازک مزاج ہوا ہی کرتے ہیں مگر علی حزیں کی طبیعت بہت ہی نازک تھی۔ ہر شخص اس کا مزاج شناس بننے کے قابل نہ تھا صرف ایک خادم رمضانی نام اس کا مزاج شناس تھا ایران سے جب علی حزیں ہندوستان آیا تو یہی رمضانی اس کے ساتھ تھا جو محض خادم ہی نہ تھا۔ بلکہ خود بھی شاعر اور تعلیم یافتہ تھا۔

علی حزیں کبھی بات شعر کے اندر کرتا تھا۔ رمضانی شعر ہی میں جواب دیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ علی حزیں کھانا کھانے بیٹھا اور مکھیوں نے پریشان کیا تو وہ کہتا ہے رمضانی مگساں می آیند۔ اس نے فوراً جواب دیا ناکساں پیش کساں می آیند

ایک دفعہ رات کو علی حزیں کی آنکھ کھلی اور رمضانی سے پوچھا ؎

از شب چہ قدر رسیدہ باشد

رمضانی نے جواب دیا۔ ؎

زلفش بکمر رسیدہ باشد

اس قسم کے لطیفے ان دونوں کے بہت ہیں ہر وقت رمضانی بے چارہ اسکی نزاکت کا تحمل کرتا تھا نہ رات کو چین تھی نہ دن کو آرام۔ علی حزین نے اسکی مصیبت کو دیکھ کر شاہ دہلی کو خط لکھا کہ میرے پاس صرف ایک خادم ہے جس پر کام بہت زیادہ ہے ایک خادم مجھے اور دیدیا جائے تاکہ رمضانی کو بھی آرام کا موقعہ مل جایا کرے۔ شاہ دہلی نے اپنا خاص خادم جو نہایت شائستہ اور مہذب تھا بھیجدیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ علی حزیں کے یہاں ہر شخص کا گذر مشکل ہے۔ اب اس کی حالت سنیئے دو چار دن وہ علی حزیں کے پاس رہا اور رمضانی سے پوچھ پوچھ کر کام کرتا رہا۔ ایک دن یہ دروازہ پر بیٹھا ہوا دربانی کی خدمت انجام دے رہا تھا کہ علی حزیں کے کسی دوست کا ایک رقعہ آیا جس میں ترش لیموں کی فرمائش تھی۔ شاہی خادم علی حزیں کے پاس جواب لینے کے لیے رقعہ لے گیا۔ وہ اس وقت شطرنج میں مشغول تھا رقعہ پڑھ کر منہ بنا دیا۔ اور رقعہ اسکے حوالہ کیا زبان سے کچھ نہیں کہا۔

یہ بڑا پریشان ہوا کہ یہ بات کیا ہوئی۔ میں قاصد کو رقعہ کا کیا جواب دوں آخر گھبرایا ہوا رمضانی کے پاس آیا کیونکہ وہی مزاج شناس تھا۔ اس سے سب واقعہ کہا کہ شاہزادے نے پڑھ کر زبان سے تو کچھ جواب دیا نہیں صرف منہ بنا دیا۔ اب میں پریشان ہوں کہ کیا کروں۔ رمضانی نے کہا کہ شاہزادے نے لیموں دیدینے کی اجازت دی ہے کیونکہ منہ بنانے کو ترش روئی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ترش

لیموں دیدو۔ شاہی خادم نے اُسی وقت اپنا بستر باندھا اور سیدھا دہلی کا رستہ لیا اور رمضانی سے کہا کہ بھائی میرا گذر نہیں۔ یہاں تو وہ رہے جس کو کشف و الہام ہوتا ہو۔ اور دہلی جاکر بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور مجھے علی حزیں کے پاس رہنا منظور نہیں وہاں تو بڑی مصیبت ہے۔ بات بات میں الہام کی ضرورت ہے۔ میں ان کے اشاروں کنایوں کو نہیں سمجھ سکتا۔

صاحبو! حیرت ہے کہ علی حزیں کا مزاج شناس تو رمضانی کے سوا کوئی نہ ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس بننے کا ہر شخص دعویٰ کرتا ہے بھلا یہ حماقت ہی نہیں۔ پس حضور کا کلام سمجھنے کے لیے بھی خاص مزاج شناسوں کی ضرورت ہے۔ وہ کون ہیں حضرات صحابہ و ائمہ مجتہدین رضی اللہ عنہم اجمعین۔

چنانچہ امام صاحب نے اس کا راز سمجھا ہے اور اُس کو اس طرح بیان فرمایا ہے لان یکون اکلی کلہ صلوٰۃ احب الی من ان یکون صلوٰتی کلھا اکلا یعنی میرا کھانا نماز بن جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ نماز کھانا بن جائے۔ یعنی نماز کے انتظار میں کھانا کھانا نماز ہی کے حکم میں ہے کیونکہ حدیث میں ہے لا یزال احدکم فی الصلوٰۃ ما انتظر الصلوٰۃ یعنی نماز کا انتظار بھی ثواب کے اعتبار سے نماز کے برابر ہے۔ تو اب جو شخص اس حالت میں کھانا کھا رہا ہے کہ دل نماز کی طرف لگا ہوا ہے اُس کو کھانے میں بھی نماز کا ثواب مل رہا ہے۔ اور یہی راز ہے اعتکاف کی فضیلت کا۔ کیونکہ رُوح اعتکاف انتظار صلوٰۃ ہی ہے۔ معتکف کو ہر وقت نماز کا ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ وہ نماز جماعت ہی کی پابندی کے لیے معتکف ہوا ہے۔ اسی لیے اعتکاف کے لیے مسجد جماعت شرط ہے جس مسجد میں جماعت نہ ہوتی ہو وہاں اعتکاف جائز نہیں پس نماز کے اندر دل اٹکا ہوا ہو۔ اور کھانا کھا رہا ہو تو اس کو نماز کا ثواب اس وقت بھی ملے گا۔ اور اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور

دل کھانے میں اٹکا ہوا ہو تو اس کی نماز کھانا ہو جائے گی - وہ گویا نماز میں کھانا کھا رہا ہے پس شریعت نے کھانے کو نماز سے مقدم نہیں کیا - بلکہ وہ آپ کے کھانے کو نماز بنانا چاہتی ہے نماز کو کھانا بنانا نہیں چاہتی -

ہجرت مکہ مکرمہ کے آداب

اسی لیے ہمارے حاجی صاحبؒ ہر شخص کو مکہ میں رہنے کی اجازت نہ دیتے تھے - کیونکہ مکہ میں رہنا ہر اک کا کام نہیں بعضے تو مکہ ایسا جاتے ہیں کہ سہ

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود — چوں بیاید ہنوز خر باشد

چنانچہ ایک نواب پر گورنمنٹ کا کچھ عتاب ہوا اور ان کو جلا وطن کرنا چاہا تو خود نواب صاحب ہی سے پوچھا گیا کہ آپ کہاں رہنا چاہتے ہیں انہوں نے اپنے لیے مکہ تجویز کیا گورنمنٹ نے ان کو مکہ ہی بھیجدیا - اب وہاں جا کر ان کا یہ شغل تھا کہ روزانہ سڑک پر کھڑے ہو جاتے اور عورتوں کو گھورا کرتے تھے - بھلا اس طرح مکہ میں رہنے سے کیا فائدہ - بلکہ یہ زیادہ مضر ہے کیونکہ جس طرح مکہ میں طاعات کا ثواب اور مقامات سے زیادہ ہوتا ہے اسی طرح معاصی کا گناہ بھی اور جگہ سے زیادہ ہوتا ہے -

مفسرین نے وَمَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ مکہ میں نیت معصیت پر بھی کامل مواخذہ ہوتا ہے اسلئے حاجی صاحب ہر شخص کو ہجرت کی اجازت نہ دیتے تھے - آپ دو قسم کے لوگوں کو ہجرت سے منع کرتے تھے ایک تو کٹے دنیاداروں کو - کیونکہ یہ لوگ مکہ کے حقوق کیا ادا کریں گے -

دوسرے علمار اور مقتداؤں کو - علمار کو اسلئے روکتے تھے کہ ان کی ہجرت سے ہندوستان تو بم پلیس ہو جائیگا - اگر سارے علمار مکہ چلے جائیں گے تو ہندوستان میں فیض کون پہنچائے گا - اسلئے گو ان کا دل مکہ جانے کو کتنا ہی چاہے اور یہاں

سکے حقوق بھی ادا کر سکیں ۔ مگر ان کو ہندوستان ہی میں رہنا ضروری ہے بس قید خانہ ہی میں رہیں اور تڑپتے رہیں ۔ ان کی یہی ہجرت ہے ان کو ہجرت کر کے مکہ جانا جائز نہیں جبکہ یہ اندیشہ ہو کہ ہمارے جانے سے یہاں دین کا کام مختل ہو جائے گا ۔۔۔۔۔ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کسی وقت جہاد کا موقعہ ہو تو عالم بلد کو جس کے سوا شہر میں کوئی عالم محقق نہ ہو ۔ جہاد میں شرکت جائز نہیں اسکو اپنے گھر ہی پر رہنا چاہیئے ۔ آج کل لوگ تحریکات کو لیئے پھرتے ہیں اور حدود کو نہیں دیکھتے ۔

صاحبو! یہاں تو ہر کام کے لیے حدود ہیں ۔ چنانچہ جہاد و ہجرت کی ہر اک کو... اجازت نہیں ۔ بلکہ اس کے لیے بھی حدود ہیں اگر یہ حدود نہ ہوتے اور ان اہل تحریکات کی طرح شریعت بھی بے اصولی سے کام لیتی تو نہ معلوم یہ دین کب کا فنا ہو گیا ہوتا ۔

مگر شریعت کے قربان جائیے کہ اس نے ہر کام کے لیے حدود مقرر کر دی ہیں چنانچہ عالم بلد کے لیے جہاد سے ممانعت فقہ میں مصرح ہے اسی لئے حاجی صاحب نے علماء کے لیے ہجرت کو ناپسند کیا ۔

جہادِ نفس

مگر ان کے لیے یہ بھی جہاد ہے کہ دل جہاد کو چاہتا ہے مگر حکم کی وجہ سے نہیں جاتا یہ جہادِ نفس ہے اور وہ جہاد کفار ہے اور یہ بھی اس سے کچھ کم نہیں بلکہ زیادہ ہے کیونکہ کفار کو تو شیطان نے گمراہ کیا ہے اور شیطان کو نفس نے گمراہ کیا ہے ۔ شیطان کے گمراہ کرنے کو کوئی دوسرا شیطان نہیں آیا تھا ۔ بلکہ یہی نفس تھا جس نے اس کو ابلیس بنا دیا ورنہ وہ تو... عزازیل تھا تو نفس کا مغلوب کرنا کفار کے مغلوب کرنے سے بھی اہم ہے ۔ دوسرے جہاد کفار اس سے آسان بھی ہے یہ بہت سخت ہے کیونکہ وہاں تو ایک بار تلوار چل گئی اور خاتمہ ہو گیا اور یہاں ہر دم آرہ چلتا ہے سے

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

جو لوگ جہاد نفس میں مشغول ہیں، اُن کے دل پر جو گذرتی ہے اُس کو وہی جانتے ہیں سے اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست ؛ حالِ شیرانے کہ شمشیرِ بلا بر سر خورند

صاحبو! میں بقسم کہتا ہوں کہ جس شخص کو ہجرت اور جہاد سے شریعت روکتی ہے اور وہ شریعت کے حکم سے اپنے گھر پر رہتا ہے اُس کے دل میں جو بے چینی ہوتی ہے اُس سے دل میں گھاؤ ہو جاتا ہے دل چاہتا ہے کہ ایک کام کریں اور شریعت کہتی ہے کہ دوسرا کام کرو وہ حکم کی وجہ سے دوسرا کام کرتا ہے مگر کیا اُس کو جہاد اور ہجرت کا شوق نہیں ہوتا ضرور ہوتا ہے بلکہ دوسروں سے زیادہ کیونکہ وہ ان کے فضائل سے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ واقف ہے مگر اُس کی حالت یہ ہے سے

خوشا وقت شوریدگانِ غمش اگر تلخ بینند وگر مرہمش
دمادم شرابِ الم در کشند وگر تلخ بینند دم در کشند
گدایانے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

جہادِ عشّاق

خوب فرمایا ہے دمادم شراب الم در کشند۔ واقعی عشّاق تو ہر وقت جہاد میں رہتے ہیں کہ نفس کو اُس کی خواہشوں پر دباتے رہتے ہیں جس سے دل میں زخم اور گھاؤ ہو جاتا ہے کسی نے خوب کہا ہے سے

درونِ سینۂ من زخم بے نشاں زدہ بہ حیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہ

تیر تو لگتا ہوا نظر نہیں آتا مگر گھاؤ موجود ہے پھر کسی کو تو وصل سے سکون ہو جاتا ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ وصل سے دونی آگ بھڑکتی ہے اُنکو وصل کی بھی تاب نہیں بس وہ حال ہے کہ سے

من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چو رُخ نمائی
نزدیک آں چنانم دور آں چناں کہ گفتم
نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

جب لیلے کے ساتھ مجنوں کا عشق مشہور ہوا تو مجنوں کے باپنے لیلی کے باپ کو نکاح کا پیغام دیا لیلی کے باپنے جوابدیا کہ مجھے نکاح سے انکار نہیں مگر مجنوں کا عشق اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ اگر لیلی سے اُس کا نکاح ہوگیا تو اوّل ہی شب میں مرجائے گا۔ بعض عشاق محبوب حقیقی کو بھی یہ حالت پیش آئی ہے۔

ایک وکیل صاحب نے کسی سے نقل کیا کہ جب ہم حج کو چلے تو ایک شخص ہمارے ہمراہ تھا۔ اور اُس کی یہ حالت تھی کہ ہاتھ میں ایک ڈھیڑی تھی اُسے لے کر گاتا بجاتا اور ناچتا کودتا تھا۔ لوگوں نے کہا میاں تم عجب مسخرے ہو حج کو جاتے ہوئے بھی تم کو یہ مستی سوجھ رہی ہے۔

غرض وہ اسی طرح ہنستا کودتا جارہا تھا لوگ سمجھتے تھے مسخرہ ہے جب مکہ پہنچے تو وہ بھی طواف بیت اللہ کو چلا جس وقت حرم کے دروازہ پر پہنچے اور مطوف نے کہا دیکھو وہ بیت اللہ ہے۔ بیت پر نظر پڑتے ہی اس شخص کی حالت دگرگوں ہوگئی آنسو جاری ہو گئے اور وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور بے ساختہ یہ شعر پڑھا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر
کہ مبادا بار دیگر نہ رسی بدیں تمنّا

یہ کہتے ہی دھڑام سے گرا اور جان دیدی۔ طالب بیت کو دیکھ کر اُس تک پہنچنے کی بھی تاب نہ ہوئی پہلے ہی جان دیدی۔ اور وہاں پہنچ کر ہی کیا ہوتا وہ بیت سے پہلے رَبُّ الْبَیت سے جا ملا۔

اشتیاق مکہ مکرمہ

غرض حاجی صاحب علماء کو ہجرت سے منع کرتے تھے تاکہ ہندوستان میں علمی فیض بند نہ ہوجائے وہ بیچارے ہندوستان ہی کی قید میں رہتے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے اسکے متعلق حاجی

صاحب کا ارشاد ہے کہ دل بمکہ وجسم بہندوستان بہ ازانکہ جسم بمکہ ودل بہندوستان یعنی دل مکہ میں اٹکا رہے اور جسم ہندوستان میں ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ جسم تو مکہ میں ہو اور دل ہندوستان میں۔ کیونکہ جو شخص مکہ کے اشتیاق میں رہے وہ گویا ہر وقت مکہ ہی میں ہے گو بظاہر ہندوستان میں ہو اور جو شخص بظاہر مکہ میں ہو اور دل ہندوستان میں اٹکا ہوا ہو وہ مکہ میں نہیں۔ بلکہ ہندوستان ہی میں ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے جو ظاہر میں بہت اچھے تھے اور مکہ میں ہجرت کر کے رہتے تھے مگر اُن میں یہ مرض تھا کہ ہندوستان کو بہت یاد کرتے تھے۔ چنانچہ مرض الموت میں اُن پر بے ہوشی طاری ہوئی تو بار بار زبان سے یہ نکلتا تھا کہ ہندوستان لے چلو۔ خدام کو بڑی پریشانی ہوئی کہ مکہ سے ہندوستان کیونکر لے چلیں، لوگ تو مکہ میں مرنے کی تمنا کرتے ہیں ہم اپنے ہاتھوں اُن کو یہاں سے کیونکر نکال دیں پھر اُن کی حالت سفر کے قابل نہ تھی مگر ان کا بار بار یہی اصرار تھا اور جان نہ نکلتی تھی۔ بعضے خدام ذہین تھے انہوں نے یہ کیا کہ ان کے پلنگ کو ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں لے گئے اور کہا حضرت ہندوستان آگیا۔ پس یہ سنتے ہی آنکھیں کھل گئیں اور فوراً انتقال ہو گیا۔ گویا وہ اپنے نزدیک ہندوستان میں مرے پھر اس حالت میں ہجرت کرنے سے کیا نفع ہوا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث ابدءوا بالعشاء قبل العشاء کا یہی راز سمجھا ہے کہ جو شخص کھانا نماز سے پہلے کھائیگا اُس کا دل نماز میں اٹکا رہے گا اس حالت میں وہ کھانا بھی نماز میں داخل ہو گا اور جو شخص نماز کھانے سے پہلے پڑھے گا اُس کا دل کھانے میں اٹکا رہے گا تو اُس کی ساری نماز کھانا بن جائے گی۔ پس اس تعلیل سے یہ مستفاد ہوا کہ یہ اُس شخص کے لیئے ہے جس کو شدت سے بھوک لگی ہو کہ وہ اگر نماز پہلے پڑھیگا تو اُس کا اشتیاق کھانے ہی کی طرف رہے گا ہر شخص کے لیے نہیں مگر ہر حال میں اس سے

یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ شریعت نے بھی یکسوئی کا اہتمام کیا ہے اگر کامل یکسوئی نہ ہو تو بقدر ضرورت تو ہونا چاہیئے۔ اسی لیے مجھے اس بیان کے لیے فی الجملہ یکسوئی کا انتظار تھا ——— چنانچہ اب بحمد اللہ بہت کچھ یکسوئی ہو گئی اور اس پریشانی کا خاتمہ ہو گیا ہے[عـــہ] اور خاتمہ بھی اچھا ہوا مگر خاتمہ کے اچھا ہونے سے پہلی کوتاہیاں معاف نہیں ہو گئیں۔ وہ ہنوز قابل تلافی ہیں ان کا تدارک ہونا چاہیئے۔

دیکھئے اگر کسی شخص کا خاتمہ کلمہ پر ہو تو گذشتہ گناہوں سے استغفار و توبہ بھی تو ضروری ہے محض خاتمہ اچھا ہونے سے پہلے گناہوں کی تلافی نہیں ہو جاتی اس لئے میں اس وقت ان ہی پہلی کوتاہیوں کی اصلاح کا طریقہ بتلانا چاہتا ہوں کیونکہ مجھ پر اس واقعہ کا بے حد اثر تھا۔ اور بے اختیار دل چاہتا تھا کہ اپنے بھائیوں کو اصلاح کا طریقہ بتلاؤں جس کا آج بحمد اللہ موقعہ مل گیا۔ میرے اشتیاق کا اندازہ آپ کو اس سے ہو گا کہ میں آج کل اچھا نہیں ہوں عرصے سے طبیعت ناساز ہے[عـــہ] اس لئے میں اپنی بستی میں کہیں آنے جانے سے یہ عذر کر دیتا ہوں کہ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ مگر پھر بھی میں

عـــہ جس شخص نے اپنی منکوحہ لڑکی کا دوسرا نکاح ایک اور شخص سے کیا تھا اس پر شوہر اول نے دعویٰ کر دیا کہ اس نے میری ہتک عزت کی اور میری بیوی مجھ کو ملنی چاہیئے۔ عدالت نے یہ مقدمہ باہمی تصفیہ کے لئے ثالثوں کے سپرد کر دیا۔ ثالثوں نے لڑکی پہلے شوہر کو دلوا دی فیصلہ شریعت کے موافق ہوا۔ ۱۲ جامع۔

عـــہ حضرت اقدس کے زانو میں عرصے سے درد ٹھہرا ہوا ہے بہت علاج ہوئے مگر ہنوز افاقہ نہیں ہوا۔ شفاہ اللہ تعالیٰ و عافاہ و شفاءً کاملاً لا یغادر سقماً و عافیۃً تامۃً تعم روحاً و جسماً آمین ۱۲ جامع
پھر بحمد اللہ ایسی شفا ہو گئی کہ درد کا واقعہ یاد کرنے سے بھی یاد نہیں آتا۔ والحمد للہ۔ اشرف علی

میں یہاں آیا۔ گو سواری میں آیا ہوں مگر پھر بھی تکلیف تھی کیونکہ بہلی میں چڑھنا اور اس سے اترنا بھی درد کو بڑھاتا ہے۔

علماء پر نااتفاقی کا الزام

اب میں اس حدیث کا ارتباط اس واقعہ سے بتلاتا ہوں کیونکہ بظاہر ربط نہیں معلوم ہوتا سو بات یہ ہے کہ گو بظاہر اس واقعہ میں ایک نکاح کا معاملہ تھا۔ مگر اس کا منشا یہ تھا کہ بعض لوگوں کے معاملات دوسروں سے شگفتہ نہ تھے قلوب میں باہم تخالف تھا: کسی نااتفاقی کی وجہ سے یہ صورت پیش آئی۔ پس منشا اس کا وہی امر تھا جس کی بابت اس حدیث میں وعید ہے یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ایاکم وفساد ذات البین یعنی باہم تعلقات کے بگاڑنے سے بچو۔ یہاں لفظ فساد اختیار کرنے میں ایک علمی نکتہ ہے جس کو بعض اہل علم بھی نہ جانتے ہوں گے اس لیے میں اسکو بتلاتا ہوں۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری ایک غلطی پر ہم کو متنبہ کیا ہے وہ یہ کہ آجکل یہ لفظ لوگوں کی زبان زد ہے کہ باہم اتفاق و اتحاد رکھنا چاہیئے نااتفاقی بری چیز ہے اور علماء میں جو بعض مسائل میں اختلاف ہے اس پر بھی لوگوں کو اعتراض ہے کہ علماء رات دن نزاع ہی میں رہتے ہیں لڑتے جھگڑتے ہیں اور امت میں تفریق پیدا کرتے ہیں اور صرف یہی ایک الزام نہیں ہر قسم کا الزام علماء ہی کو دیا جاتا ہے۔

انگریزی تعلیم کی ممانعت کا الزام

چنانچہ ایک عہدہ دار صاحب نے جو کہ ایک تقریب میں ہمارے یہاں مہمان تھے میرے بچپن میں علماء پر اعتراض شروع کیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو تباہ کردیا۔ انگریزی پڑھنے سے منع کرتے ہیں اور حکومت کے عہدے لینے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ عہدوں ہی سے مسلمانوں کی عزت ہے اور وہ بغیر انگریزی کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اول اول تو میں نے صبر کیا

خاموش رہا۔ کیونکہ وہ معترض صاحب مہمان تھے۔ مگر جب وہ اس سلسلہ کو دراز ہی کرتے رہے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا صاحب مجھے آپ کی باتوں پر صبر کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ مگر آپ بات کو بڑھاتے ہی چلے جاتے ہیں اسلیئے اب مجبوراً میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ مجھے اس وقت اس کی بحث نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی انگریزی پڑھنے پر موقوف ہے یا نہیں۔ فرض کر لیجیے کہ اسی پر موقوف ہے اور بدون اسکے مسلمانوں کو ترقی نہیں ہو سکتی مگر اس پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے انگریزی نہ پڑھنے کا الزام آیا علماء پر لگانا صحیح ہے یا غلط۔ سو میں پوچھتا ہوں کہ کیا علماء صرف انگریزی ہی سے منع کرتے ہیں یا علم دین حاصل کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں۔ اب بتلائیے کسی اور بات سے بھی منع کرتے ہیں۔ یقیناً وہ بہت سی باتوں سے منع کرتے ہیں مثلاً جھوٹ بولنے غیبت کرنے اور کسی کا حق دبانے۔ مسلمان انگریزی علماء کے منع کرنے سے نہیں پڑھتے تو ان کے کہنے سے علم دین کیوں نہیں پڑھتے۔ اگر یہ مولویوں کا اثر ہوتا تو دوسری باتوں میں بھی تو ہوتا۔ صرف اسی ایک بات میں کیوں اثر ہوا

اصل بات یہ ہے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے میں دوسری قوموں سے اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے ہیں کہ ان سے محنت نہیں ہوتی یا افلاس کی وجہ سے کہ ان کے پاس انگریزی تعلیم کے مصارف کے لیے رقم نہیں۔ علماء کے منع کرنے سے کوئی نہیں رکتا (الا ماشاء اللہ وھو نادرٌ والنادر کالمعدوم) مگر آجکل تو الزام ملنے میں علماء کی وہی حالت ہے۔ جیسے ایک بھٹیاری کی حکایت ہے گو حکایت تو فحش ہے۔ مگر مولانا نے اس سے بھی زیادہ فحش حکایتیں۔۔ مثنوی میں لکھی ہیں۔ اور ان سے علوم نکالے ہیں اسلیئے بیان کرتا ہوں۔

قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں ٹھہرا اور بھٹیاری کو کھانا پکانے

کے بیے جنس دی - بھٹیاریاں اکثر جنس چُرایا کرتی ہیں اسلئے سپاہی اُسکے پاس مسلط ہوکر بیٹھ گیا - اُسنے بہت کوشش کی کہ آنکھ بچاکر کچھ چُراؤں مگر سپاہی نے موقع ہی نہ دیا - اب اُسنے یہ تدبیر کی کہ جب سپاہی کھانا کھانے بیٹھا تو ساتھ میں اپنے لڑکے کو بھی بٹھا دیا کہ تو بھی کھالے - شریف آدمی کو دسترخوان پر سے کسی کا اٹھانا گوارا نہیں ہوتا - اسلئے سپاہی خاموش ہوگیا - اتفاق سے بھٹیاری کی ریح زور سے صادر ہوئی اسنے خفت اتارنے کو اپنے بچے کے ایک دھپ لگایا کہ دور موے کھانا کھاتے ہوئے یہ کیا کرتا ہے سپاہی کو انتقام کا موقع ملا اُسنے قصداً ریح صادر کی - اور زور سے ایک چپت لڑکے کے رسید کیا اور کہا یاد رکھ کریگا کوئی مگر پٹے گا تو ہی - اسنے بھٹیاری کو بھی بتلادیا کہ تیری حرکت کو میں سمجھ گیا ہوں بس یہی حال آج کل کے مسلمانوں نے علماء کا کر رکھا ہے کہ کریگا کوئی مگر الزام انہی پر ہوگا - انگریزی نہ پڑھنے کا الزام بھی مولویوں پر اور مسلمانوں کے تنزل و افلاس کا الزام بھی علماء پر اور جاہلوں کے مرتد ہونے کا الزام انہی پر مسلمانوں کی نااتفاقی کا الزام بھی انہی پر -

گیارہویں کا اختلاف

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مولویوں نے مسلمانوں میں تفریق کردی ہے ایک بات کو بعض مولوی جائز کہتے ہیں بعض ناجائز - ایک جگہ وعظ کہنے کا اتفاق ہوا جس میں گیارہویں کی رسم سے منع کیا - وعظ کے بعد ایک داروغہ صاحب جو گیارہویں کے معتقد تھے کہنے لگے کہ صاحب علماً کے اختلاف نے ہم کو پریشان کردیا آپ تو گیارہویں کو منع کرتے ہیں اور فلاں مولوی صاحب جائز کہتے ہیں - ہماری بڑی مشکل ہے کس کی بات کو مانیں - میں نے کہا داروغہ صاحب - میں اس بات کے جواب سے پہلے آپسے ایک سوال کرتا ہوں کہ جس طرح آپ ہم سے یہ کہتے ہے

ہیں کہ فلاں مولوی صاحب گیارہویں کو جائز کہتے ہیں - ایمان سے بتلائیے کبھی آپنے
اُن سے بھی کہا کہ فلاں مولوی صاحب اس کو ناجائز بتلاتے ہیں اب ہم کیا
کریں - ؟ بس اب تو کھوئے گئے اس کا اُن کے پاس کچھ جواب نہ تھا - میں نے
کہا داروغہ صاحب اتنا تو دروغ نہ بولو -

حقیقت یہ ہے کہ آپ کو تحقیق مقصود نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ
کے دل کو لگتی ہے اور جس کی بات خواہش نفس کے خلاف ہوتی ہے اس پر
اعتراض ہے اگر تحقیق مطلوب ہوتی تو جو اعتراض آپ یہاں کر رہے ہیں کبھی وہاں
بھی تو کیا ہوتا - بے چارے تھے منصف اپنی غلطی کا اقرار کر لیا -

خطبۃ الوداع کا اختلاف

ایسے ہی الوداع کے خطبہ میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب مولویوں کے اختلاف نے
تنگ کر دیا - اس کا بھی یہی جواب ہے کہ یہ اعتراض دونوں جگہ کیوں نہیں کیا جاتا
یہ تو الزامی جواب ہے اور تحقیقی جواب یہ ہے کہ پہلے لوگ تو رمضان کے عاشق تھے
انکو واقعی رمضان کے جانے کا رنج ہوتا تھا - اسلئے ان کو الوداع کے خطبہ کا حق تھا
مگر اب تو لوگ دوسرے معنی میں رمضان کو الوداع کرتے ہیں یعنی رخصت دُور
دور ، حالت یہ ہے کہ زبان سے تو الوداع کا خطبہ ہو رہا ہے - ظاہر میں رو رہے
ہیں اور اب تو کوئی روتا بھی نہیں - بلکہ منہ تک بھی نہیں بناتے بلکہ دل میں خوش
ہیں کہ اچھا ہوا رمضان ختم ہوگیا - اب خوب کھائیں پیئیں گے -

صاحب ! الوداع کا خطبہ پڑھ سنکر کچھ تو غم زدوں کی سی حالت بنائی ہوتی
مگر یہاں تو یہ مستیاں ہیں کہ شیر کے لیے آٹھ آنہ سیر اور بارہ آنہ سیر دودھ خریدتے
ہیں - ایسے غمزدوں کی یہی صورت ہوتی ہے جس کے سر پر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہو کیا اسکو
شیر کے اہتمام کی بھی سوجھتی ہے ہم تو جب جانیں کہ کسی کا باپ وداع ہو جائے

اور اُسکی مرجانے پر شیر پکا کر کھائے۔ تو یہ یہاں تو اگر کوئی اس کا نام بھی لے دے تو اُسکو کچا کھا جائیں کہ کمبخت! ہمارا تو باپ مرے اور تو ہمیں شیر کی ترغیب دلاتا ہے۔ اگر رمضان کے جانے کا رنج ہوتا تو یہاں بھی یہی حالت ہوتی۔ بہر حال ممانعت کے وجوہ موجود مگر مانع پر اس کا پھر بھی الزام۔ کہ مولویوں کے اختلاف نے عوام میں اختلاف پیدا کر دیا اسلیے اس کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی کسی سے نزاع نہ کرے سب اتفاق و اتحاد سے رہیں۔

باہمی اتفاق کا طریق کار

پھر بعض تو اہل حق ہی سے کہتے ہیں کہ آپکو دوسروں سے اتفاق کر لینا چاہیئے اور بعض ایسے بھی ہیں جو دونوں سے کہتے ہیں کہ دونوں کو باہم اتفاق کر لینا چاہیئے یہ لوگ اہل حق کو بھی اہل باطل سے اختلاف کرنے کی وجہ سے مجرم سمجھتے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ اہل حق کو اہل باطل کے ساتھ اتفاق رکھنا چاہیئے۔ خواہ تو وہ ان کی بات کو مان لیں اگر وہ نہ مانیں تو پھر ان کو ان کی بات مان لینا چاہیئے کیونکہ اختلاف مذموم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اختلاف مطلقاً مذموم ہے تو پھر آج سے اگر کاشتکار آپ کی زمین کا لگان نہ دے تو اس کی نالش نہ کرنا کیونکہ نالش کرنا نزاع ہے اور نزاع مطلقاً مذموم ہے اور اگر وہ گھر مانگے اور اس وقت اُس سے پوچھا جائے کہ تو ہمارا گھر کیوں لیتا ہے اور وہ یہ جواب دے کہ ناحق لیتا ہوں اور اگر آپنے گھر نہ دیا تو مجھ میں اور آپ میں اتفاق نہ رہے گا۔ اختلاف ہو جائے گا تو آپ کو چاہیئے کہ نزاع سے بچنے کے لیے اپنا گھر بھی اسکو دیدیں۔ اور اگر وہ زمین دبا لے تو اتفاق کے لیے زمین بھی دیدو۔ جیسے دہلی میں شہزادہ ثریا جاہ نے تماشا کیا تھا کہ وہاں ایک واعظ صاحب کسی مسجد مکان پر تولیت کے بہانہ سے قبضہ کرنا چاہتے تھے اور حق تولیت ثابت کرنے کے لیے ایک استفتاء بھی لکھا ہے، جس پہ بڑے بڑے علماء کے

دستخط کرانا چاہتے تھے۔

چونکہ ان کے زعم میں بعض علماء ثریا جاہ کے اثر میں تھے اسلیے ان کے ذریعہ سے یہ کام کرانا چاہا۔ ثریا جاہ کو ایک صاحب نے پہلے سے خبر کر دی کہ کل فلانے ایک مولوی صاحب اس قسم کا استفتاء لائیں گے اور وہ تولیت کے بہانہ سے مسجد کے مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ثریا جاہ نے کہا بہت اچھا میں اُن کا اچھی طرح علاج کر دوں گا کہ پھر اس کا نام لینا بھی بھول جائیں گے۔

چنانچہ اگلے دن مولوی صاحب پالکی پر سوار ہو کر ان کے مکان پر آئے انہوں نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ اور صدر پر بٹھلایا اور چائے پان وغیرہ سے خوب تواضع کی۔ پھر پوچھا کہ جناب نے کیسے تکلیف فرمائی کوئی خدمت میرے لائق ہو تو ارشاد فرمائیے۔ کہا جی ہاں۔ مجھے ایک استفتاء پر علماء کے دستخط کرانے ہیں آپ دستخط کرا دیجیے۔ ثریا جاہ نے استفتاء کو پڑھا اور پڑھ کر اپنے خزانچی کو بلایا کہ ہمارے خزانہ کی کنجیاں مولانا کے سپرد کر دو اُس نے کنجیاں لاکر سامنے رکھ دیں۔ مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ثریا جاہ نے کہا مولانا یہ تو خزانہ کی کنجیاں ہیں اور یہ گھر مع سامان کے حاضر ہے اگر آپ کو گھر کی ضرورت ہے تو میں اپنا گھر اور اپنا خزانہ پیش کر سکتا ہوں لیکن خدا کا گھر نہیں دے سکتا۔ اسکے بعد باہر نکل کر محلہ والوں کو پکارا کہ بھائی ذرا یہاں آنا سب لوگ گھبرائے کہ آج ثریا جاہ کو کیا ہو گیا جو یوں باؤلوں کی طرح چلا رہا ہے لوگ جمع ہو گئے تو ثریا جاہ نے سب سے کہا کہ بھائی یہ مولوی صاحب مجھ سے خدا کا گھر مانگتے تھے میں نے عرض کر دیا کہ آپ کو مکان کی ضرورت ہو تو میں اپنا گھر دے سکتا ہوں خدا کا گھر نہیں دے سکتا اب تم سب گواہ رہو کہ آج سے یہ گھر میرا نہیں۔ بلکہ مولوی صاحب کا ہے میرے لیے اگر تھوڑی سی جگہ ایک جھونپڑے کے برابر آپ لوگ دیدیں گے تو میں اُسی میں اپنا

گذر کر لوں گا۔

اس ترکیب سے مولوی صاحب کی تو یہ حالت ہوئی کہ اُن کا رنگ زرد ہو گیا اُن میں کاٹو تو خون نہیں تھا۔ بیٹھے بیٹھے مارے ندامت کے کانپنے لگے اور ثریا جاہ سے کہا شاہزادے صاحب مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی کہ آپ میرے ساتھ یہ معاملہ فرمائیں گے۔ ثریا جاہ نے کہا مولانا مجھے بھی آپ سے یہ اُمید نہ تھی کہ میرے ذریعہ سے خدا کے گھر پر قبضہ کرنا چاہیں گے۔

بس مولوی صاحب تو اُسی وقت ہانپتے ہانپتے بخار کی حالت میں سوار ہو کر اپنے گھر چلے گئے اور مہینوں تک گھر سے باہر نہ نکلے اور ادھر تمام شہر میں اس واقعہ کا شور ہو گیا کہ فلاں مولوی صاحب مسجد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد پھر ان کو دعوے تولیت کی ہمت نہ ہوئی تو جیسے ثریا جاہ نے رفع نزاع کے لیے اپنا گھر اور خزانہ پیش کر دیا تھا۔ ایسے ہی آپ بھی کر دیا کیجئے مگر وہاں تو مولوی صاحب نے گھر لیا نہیں تھا لیکن کاشتکار کو اگر تم دینا چاہو گے وہ تو سب کچھ لے لیگا ذرا اس طرح کر کے دیکھو انشاء اللہ گھر کا صفایا ہو جائے گا۔

تحقیق حق

اب انصاف سے تبلایئے کہ اگر کاشتکار اس قسم کی ناحق حرکتیں کرے تو آپ کو اس سے اختلاف نزاع کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نالش کر دیں تو کیا کاشتکار کی طرح آپ بھی اختلاف کے مجرم ہوں گے یا صرف کاشتکار ہی مجرم ہو گا۔ آپ ضرور کہیں گے کہ مجرم صرف کاشتکار ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیوں؟ اختلاف تو طرفین نے کیا تھا پھر ایک ہی مجرم کیوں ہوا آپ ضرور کہیں گے کہ وہ باطل پر ہے اور ہم حق پر ہیں اور اہل باطل کو اہل حق سے اختلاف کرنے کا حق نہیں۔ اور صاحب حق کو صاحب باطل سے اختلاف کا حق ہے بارک اللہ جزاک اللہ۔

بس تمہارے ہی اقرار سے اختلاف کی دو قسمیں ہیں ایک اختلاف محمود اور ایک اختلاف مذموم۔ اختلاف محمود، وہ ہے جو صاحب حق کو صاحب باطل سے ہو۔ اور مذموم وہ ہے جو اہل باطل کو صاحب حق سے ہو۔ پھر علماء کے اختلاف میں یہ اقسام کیوں جاری نہیں کی جاتیں۔ یہاں اختلاف ہو تو دونوں جماعتوں کو کس لیے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ آخر اسکی کیا وجہ کہ آپ سے کسی کا اختلاف ہو وہاں تو دو قسمیں نکل آدیں اور علماء کے اختلاف ایک ہی قسم میں داخل ہو۔ پس جہاں حق متعین معلوم ہو۔ وہاں تو اہل باطل کو اتفاق پر مجبور کرنا چاہیے کہ تم اہل حق سے نزاع نہ کرو جیسے حاکم ایک فریق کو دوسرے فریق کی بات ماننے پر مجبور کیا کرتا ہے۔ اور اگر وہ حاکم کا فیصلہ ماننے سے انکار کرے تو پھر خود سرکار اس فریق کی مخالف اور مقابل بن جاتی ہے اور گو ظاہر میں یہ بھی اختلاف ہے مگر اس پر ہزار اتفاق قربان ہیں کیونکہ یہ اختلاف احداث نزاع کے لئے نہیں بلکہ رفع اختلاف کے لیے ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کو کرنا چاہیے کہ جہاں علماء میں اختلاف ہو اور ایک جماعت کا حق پر ہونا معلوم ہو وہاں اہل باطل کو اہل حق کے راستہ پر آنے کے لیے مجبور کریں اور اگر وہ نہ مانیں تو سب مل کر ان کی مخالفت کریں اور جہاں حق معلوم نہ ہو وہاں کسی کو بھی مجبور نہ کریں بلکہ پہلے حق کی تحقیق کریں۔ قاعدہ عقلیہ کا مقتضیٰ یہی ہے۔ یہ کیا واہیات ہے کہ جہاں دو مولویوں میں اختلاف دیکھا اور لگے دونوں کو.. برا کہنے۔

حدودِ اتفاق

لوگ آج کل اتفاق اتفاق تو پکارتے ہیں مگر اُسکی حدود کی رعایت نہیں کرتے بس اتنا یاد کر لیا ہے کہ قرآن میں حکم ہے لَا تَفَرَّقُوْا افتراق نہ کرو۔ مگر اسکے پہلا جملہ نہیں دیکھتے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا کہ اس میں اللہ کے راستہ پر قائم رہنے کا پہلے حکم ہے اسی کے

بعد ارشاد ہے کہ حبل اللہ پر متفق ہو کر اسکی تفرق نہ کرو تو اب مجرم وہ ہے جو حبل اللہ سے الگ ہو۔ اور جو حبل اللہ پر قائم ہے وہ ہرگز مجرم نہیں گو اہل باطل سے اسکو ضرور اختلاف ہوگا۔ پس یاد رکھو کہ نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے جیسا کہ ابھی ثابت کیا گیا اور نہ اتفاق مطلق محمود ہے بلکہ اتفاق محمود وہ ہے جو حبل اللہ کے اعتصام پر ہو ورنہ کفار نے بھی تو بت پرستی پر اتفاق کیا تھا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کہ تم لوگوں نے حیات دنیا میں اتحاد اور دوستی قائم کر کے چند بتوں کو معبود بنالیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کفار میں اتحاد و اتفاق تھا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اتفاق کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ دوسرے مقام پر اس کا بھی ذکر ہے قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ابراہیم علیہ السلام نے اس اتفاق کی جڑیں اکھاڑ دیں اور اہل باطل سے صاف صاف بیزاری کا اعلان کر دیا اور فرما دیا کہ.. قیامت تک کے لیے ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت و بغض قائم ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اہل باطل کے ساتھ اس طرح اتفاق کرنا محمود نہیں کہ وہ اپنے باطل پر جمے رہیں اور اسی حالت میں ہم اُن سے اتفاق کر لیں۔ بلکہ اس صورت میں تو اُن سے بیزاری اور اختلاف و عداوت رکھنا ہی مطلوب ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اتباع نے کیا اور انہی کی اقتداء کا حق تعالیٰ ہم کو حکم فرما رہے ہیں۔

عوامی اتفاق

مگر آج کل تو لوگ ایسا اتفاق چاہتے ہیں جیسا کہ نعمان خاں نے اتفاق کرنا چاہا تھا یہ ایک ان پڑھ شخص ہیں مگر اہل کتاب سے مناظرہ کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ کوئی پادری کہہ رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام و سیدنا محمد صلی

اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام اندھوں کو سوانکھا کرتے تھے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی اندھے کو سوانکھا نہیں کیا۔ نعمان خاں نے جواب دیا کہ لاؤ تم تمہیں کر دوں۔ حضورؐ تو بڑی چیز ہیں۔ وہ پادری یک چشم تھا۔ کہنے لگا اچھا تم میری دونوں آنکھوں کو برابر کر دو۔ اب آپ نے کہا نبی اور اُمتی میں کچھ فرق ہونا چاہیئے نبی تو دوسری آنکھ کو بینا کر کے دونوں کو برابر کرتے مگر میں یہ کر سکتا ہوں کہ تندرست آنکھ کو بھی پھوڑ دوں اس سے بھی دونوں برابر ہو جاویں گی اور اسکے بعد اُس کی آنکھ میں انگلی دینے لگے کہ بولو پھوڑ دوں اس پر مجمع کو ہنسی آگئی اور پادری کی تقریر کا رنگ اکھڑ گیا اور یہ حضرت جیت گئے۔ گو بات بیڈھنگی تھی۔ مگر آجکل مناظرہ میں ایسے ہی لوگ اچھے رہتے ہیں کیونکہ آجکل جیتنے اور ہارنے کا مدار اس پر ہے کہ مجلس پر کسی کا اثر جم جائے اور مقابل کا رنگ اکھڑ جائے۔ چاہے بات معقول ہو یا نا معقول ہو۔ چنانچہ ایک گنوار کا قصہ ہے کہ وہ بازار میں کو گذر رہا تھا۔ سڑک کے کنارہ پر ایک پادری کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں گنوار نے آگے بڑھ کر پادری سے پوچھا کہ تیرا خدا کتنی عمر کا ہے اُس نے کہا کہ خدا کی کوئی ابتداء ہی نہیں وہ تو آسمان و زمین سے بھی پہلے موجود تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ گنوار نے کہا کہ اتنی بڑی عمر میں تیرے خدا کے ایک ہی بیٹا ہوا۔ تیرے خدا سے تو میں ہی اچھا رہا اس وقت میری عمر پچاس سال سے زیادہ ہے اور اس وقت بیس ۲۰ بچے میرے ہو چکے ہیں اور اگر زندہ رہا تو اور بھی ہوں گے تو تیرے خدا سے تو میں ہی اچھا ہوں اس جواب سے پادری لاجواب ہو گیا۔ لوگوں نے اُسے دھمکایا کہ بے وقوف خدا کی شان میں بے ادبی کرتا ہے کہا میں اپنے خدا کو تھوڑا ہی کہتا ہوں میں تو اسکے خدا کو کہتا ہوں جس کا بیٹا یہ عیسیٰ علیہ السلام کو بتاتا ہے۔

اسی طرح مولوی مسیح الدین الہ آبادی کے والد ان پڑھ تھے مگر بہت عاقل و دانا تھے اور اس کے ساتھ مالدار بھی تھے۔ ایک دفعہ وہ جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک پادری کو تقریر میں یہ کہتے ہوئے سُنا کہ عیسائی دنیا میں بہت زیادہ ہیں اور مسلمان کم ہیں اس سے ثابت ہوا کہ عیسائی مقبول ہیں۔ انہوں نے پادری سے خطاب کیا کہ یہ تو کوئی دلیل حقانیت کی نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ ابھی اسٹیشن پر چلیں ہم دکھلا دیں گے کہ تھرڈ کلاس کا مسافر زیادہ ہوتا ہے اور فسٹ کلاس بہت کم ہے پس مسلمان فسٹ کلاس ہیں اور تم تھرڈ کلاس ہو۔ پادری اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔ یہ حکایتیں تو درمیان میں تبعاً آگئیں۔ زیادہ مقصود پہلی حکایت تھی کہ جس طرح مولوی نعمان خان نے اس پادری کی دونوں آنکھیں برابر کرنا چاہی تھی اسی طرح آجکل لوگ اہل حق و اہل باطل میں یوں اتحاد کرانا چاہتے ہیں کہ اہل حق بھی اپنی آنکھوں کو پھوڑ کر کانے لوگوں کے برابر ہو جائیں۔ حالانکہ مقتضائے عقل یہ تھا کہ کانوں سے یہ کہا جاتا کہ تم اپنی ایک آنکھ بنوا کر سوانکھوں میں داخل ہو جاؤ۔

اختلاف محمود

اگر نزاع و اختلاف مطلقاً مذموم ہے اور اہل حق کو بھی اہل باطل کے ساتھ اتحاد پر مجبور کیا جا سکتا ہے تو کیا نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بھی موجب اختلاف شمار کیا جائے گا کہ حضور نے تعلیم توحید سے تمام عرب میں ہلچل مچا دی۔ اس دعویٰ کے اظہار سے پہلے مذہباً تمام اہل عرب متحد تھے مگر دعویٰ توحید کے بعد سب میں پھوٹ پڑ گئی مگر یہ اختلاف محمود تھا کیونکہ ابطال باطل پر تھا۔

معلوم ہوا کہ نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اختلاف کا لفظ نہیں اختیار فرمایا

کیونکہ اختلاف ہر حالت میں ممنوع و موجب ملامت نہیں بلکہ آپ نے لفظ فساد اختیار فرمایا کہ آپس میں بگاڑ اور فساد ڈالنے سے بچو اور فساد کا مصداق وہی امر ہے جو خلاف شرع اور معصیت ہو۔ فساد میں محمودیت کا احتمال نہیں ہو سکتا وہ تو ہمیشہ مذموم ہی ہوگا۔ خواہ اس کا مصداق اتفاق خلاف شرع ہو یا نا اتفاقی ہو لفظ فساد دونوں کو عام ہے صرف نا اتفاقی اور اختلاف ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ پس اب ان لوگوں کو احتجاج کا موقع نہیں رہا جو اختلاف کو مطلقاً مذموم کہتے ہیں کیونکہ حضور نے اس لفظ ہی کو اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ فساد فرمایا ہے تو مذمت کے قابل وہ شخص ہے جو مفسد ہو اور مفسد وہ ہے جو شریعت سے ہٹا ہوا ہے اور شریعت پر قائم رہ کر جو کوئی دوسروں سے اختلاف کرے وہ مفسد ہرگز نہیں گو اختلاف اور مخالفت کرنے والا ہے۔ اور اگر کسی روایت میں بجائے فساد کے اختلاف کا لفظ وارد ہوا ہو تو بقاعدۃ الاحادیث یفسر بعضھا بعضاً اُن سے مطلق اختلاف مراد نہ ہوگا۔ بلکہ خاص وہ اختلاف مراد ہوگا جو فساد میں داخل ہو۔

مذمّت فساد

اس کے بعد ارشاد ہے فانھا ھی الحالقۃ یعنی فساد باہمی سے اس لیے بچو کہ وہ مونڈنے والی چیز ہے لا اقول تحلق الشعر بل تحلق الدین میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈ دیتی ہے یعنی فساد باہمی سے دین برباد ہو جاتا ہے۔ شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ حضور نے تو اس حدیث میں ایک دین کا ضرر بتلایا ہے سو اس سے دنیا داروں کو کیا خوف۔ تو سمجھ لیجئے کہ دین ایسی شے نہیں ہے جس کے ضرر سے دنیا کا ضرر نہ ہو۔ دین کا ضرر وہ چیز ہے جو دنیا کے ضرر کو بھی موجب ہے۔ کیونکہ گو دین کے ساتھ دنیا کم ملتی ہے مگر پُر لطف ہوتی ہے اور بدوں دین کے خود دنیا بے لطف ہے تو اس سے بڑھ کر کیا ضرر ہوگا حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ

فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ؕ

لطف زندگانی

شاید کسی کو شبہ ہو کہ جب دین کے ساتھ مال زیادہ نہیں ملتا تو پھر لطفِ زندگانی کیا خاک ہوتا ہوگا۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ لطفِ زندگانی کا مدار مال پر نہیں ہے بلکہ نشاط طبیعت پر ہے۔

لکھنؤ میں ایک نواب صاحب تھے اُن کی یہ حالت تھی کہ بکری کے قیمہ کو کپڑے میں پوٹلی بنا کر چوستے تھے جب ہضم ہوتا تھا۔ اگر ذراسی بوٹی کھالیتے تو دست لگ جایا کرتے۔ ایک دن یہ اپنے بالاخانہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے ایک لکڑہارا آیا اور اُس نے ایک درخت کے نیچے اپنا بوجھ رکھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ہوا لی۔ اس کے بعد ندی میں گومتی میں منہ ہاتھ دھویا اور سکون کے بعد چادرہ میں سے چار روٹ موٹے موٹے نکالے اور پیاز و نمک کے ساتھ چاروں کو کھا گیا۔ اور وہاں زمین پر لیٹ کر سو کر خراٹے لینے لگا تو نواب صاحب نے اس کی صحت اور یہ حالت دیکھ کر حسرت کے ساتھ اپنے مصاحبین سے کہا کہ میں خوشی کے ساتھ اس پر راضی ہوں کہ اس کی صحت اور غریبی مجھے مل جاوے اور میری ساری دولت اسکو مل جاوے۔

معلوم ہوا کہ کثرت مال پر لطفِ زندگانی کا مدار نہیں بلکہ اس کا مدار نشاطِ رُوح پر ہے وہ غریب جو دونوں وقت چبا اور مٹر ہضم کر لیتے ہیں۔ اُن رؤسا سے ہزار درجہ افضل ہیں جن سے دو چپاتی بھی ہضم نہیں ہوتی۔ کیونکہ غربا بھوک کے وقت کھانا کھاتے ہیں اور کھانے کے بعد محنت و مشقت ریاضت وغیرہ کرتے ہیں تو سب ہضم ہو جاتا ہے۔ اور رؤسا تو کمیٹی اور مشورہ کر کے کھاتے ہیں۔ ان کو خاک بھی کھانے کا لطف نہیں آتا۔ اسی طرح اور کاموں کے اندر بھی ان کو نشاطِ روح حاصل نہیں ہوتا۔

اب میں بیانگِ دہل کہتا ہوں کہ لطفِ زندگانی جو کچھ ہے دیندار کے پاس ہے دنیادار کے پاس کچھ نہیں اور اگر کسی دنیادار کو لطف میں دیکھا بھی جاتا ہے تو وہ یا تو دنیا

کا اثر نہیں بلکہ اُس حصۂ دین کا اثر ہے جو اُس کو حاصل ہے اور جس قدر اُس کے دین میں کمی ہے اُتنا ہی لطف بھی کم ہے اور یا اُس کی ظاہری حالت سے دھوکا ہوتا ہے اندرونی حالت کی تفتیش کی جاوے تو پریشانی ہی ثابت ہوگی اور یا اُس نے حقیقی لطف دیکھا نہیں اسلئے وہ اس صورت لطف کو لطف سمجھتا ہے۔

کیفیت اہل اللہ

اور راز اس کا وہی ہے کہ لطف و راحت اور چیز ہے اور سامان لطف و راحت اور چیز ہے۔ جن اسباب دنیا کو لوگ سامانِ راحت سمجھتے ہیں اگر حقیقی راحت نہ ہو تو واللہ حقیقت میں وہ عذاب ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا ۔ واقعی بعضے اموال و اولاد تو عذاب ہی ہو جاتے ہیں۔ جیسے ایک شخص کثیر العیال تھا اُس سے کسی نے پوچھا کہ میاں تمہارے یہاں خیریت بھی ہے تو وہ بڑا خفا ہوا اور کہا ہمیں کوستے ہو۔ خیریت کسی رنڈے منڈے کے یہاں ہوگی ہمارے یہاں خیریت کیوں ہونے لگی کہ ماشاء اللہ بچوں اور بہوؤں سے گھر بھرا ہوا ہے کسی کے آج کان میں درد ہے کسی کی ناک دکھتی ہے۔ کسی کے چوٹ لگ گئی ہے کوئی گر پڑا ہے۔ ہمارے یہاں کہاں خیریت۔ ہائے بس اس شخص کا عمر بھر یہ حال رہتا ہے ؎

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد ——— اور مولانا فرماتے ہیں ؎

جاں ہمہ روز از لگد کوب خیال   میشود مجروح و خستہ پائمال

نے صفا می ماندوش نے لطف و فر   نے بسوئے آسماں راہِ سفر

بھلا ان لوگوں کو کیا لطف زندگی۔ اور ان کے مقابل اہل اللہ کی یہ کیفیت ہے کہ اگر اُن کے پاس کچھ ہو تو خوش نہ ہو تو خوش۔ دنیا دار کو یہ بات کہاں نصیب اسے تو کبھی ایک شئے کے ہونے کا رنج ہے اور کسی چیز کے نہ ہونے کا غم ہے اور یہاں

یہ کیفیت ہے کہ حضرت غوثِ اعظمؒ کے پاس ایک آئینہ چینی آیا جو بہت قیمتی تھا حضرت نے خادم سے فرما دیا کہ جب ہم کنگھا کیا کریں اسکو سامنے رکھ دیا کرو (یہ بات مُہدی کی تطییبِ قلب کے لیے فرمادی) خادم اس کو وقت پر لے آیا کرتا۔ اتفاق سے ایک روز خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ خادم کو عتاب کا اندیشہ ہوا ڈرتے ڈرتے سامنے آیا اور عرض کیا۔ ؎

از قضا آئینۂ چینی شکست

قضا اس لیے بڑھا دی تاکہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے کیونکہ شیخ آخر کو عارف تھے تقدیر کا نام سُنکر زیادہ تیز نہ ہوں گے حضرت نے فوراً جواب دیا ؎

خوب شد اسبابِ خود بینی شکست

بھلا بتلائیے ایسا شخص کیا غمگین ہوگا اس کے پاس غم کہاں جس کو نہ کسی چیز کے جانے کا غم نہ آنے کی خوشی یہ تو حالت اُن کی محبت کی ہے۔ اور خوف کی یہ کیفیت ہے کہ

ایک بادشاہ کسی دُرویش کے یہاں پہنچے خانقاہ کے دروازہ پر ایک مُرید بطور دربان کے بیٹھا تھا جب بادشاہ دروازۂ خانقاہ پر پہنچا تو دربان نے روک دیا۔ کہ میں شیخ سے دریافت کرلوں یہ شیوخ کے خدام بڑے آزاد ہوتے ہیں یہ اپنے شیخ کے سامنے کسی بادشاہ کی بھی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ بادشاہ کو اس روک ٹوک سے غصہ تو آیا مگر تہذیب کی وجہ سے وہ کچھ بولا نہیں۔ بالآخر شیخ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے بادشاہ کو اندر آنے کی اجازت دیدی یہ تو بھرا ہوا تھا ہی۔ درویش سے سلام و مصافحہ کرتے ہی اعتراض جڑ دیا کہ ؎

درِ دُرویش را دربان نباید

انہوں نے فوراً بے ساختہ فرمایا ؎

بباید تا سگِ دنیا نیاید۔

بادشاہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ آخر اُن کو خوف کا ہے کا ہو۔ بہت سے بہت بادشاہ یہ کریگا کہ جان لے لے گا تو جان تو پہلے ہی سے اتری ہوئی رکھی ہے۔ ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

پھر جس کو نہ کسی سے طمع ہو نہ خوف ہو اُس کے لطف کا کیا پوچھنا حقیقت میں اُسکو حیاتِ طیبہ حاصل ہوگی۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اہل اللہ کے پاس گو مال زیادہ نہ ہو مگر لطف اُنہی کے پاس ہے۔

لذتِ غمِ آخرت

شاید کوئی کہے کہ انکو ایک غم بھی تو ہے آخرت کا پھر لطف کہاں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ غم خود لذیذ ہے اگر یہ کہو کہ غم تلخ ہوتا ہے تلخی میں لذت کہاں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے پاس بھی اسکی نظیر موجود ہے کہ تلخ چیز لذیذ ہے۔

دیکھئے لوگ مرچیں کھاتے ہیں اور نہایت تیزی و تلخی سے منہ سے آنکھ سے پانی جاری ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی کہے کہ میاں روتے ہو تو بس جانے دو مت کھاؤ۔ تو کہتے ہیں واہ اسی میں تو مزہ ہے جن لوگوں نے دہلی کا حلیم کھایا ہے۔ (نہ معلوم کس نے اس کا نام حلیم رکھ دیا۔ یہ تو غضب ناک بلکہ عذاب الیم ہے) وہ جانتے ہیں کہ اُس میں کیسی لذت ہوتی ہے۔ میں نے بھی ایک دفعہ کھایا تھا بہت ہی مرچیں تھیں مگر لذیذ ایسا تھا کہ ایک رکابی کے بعد دوسری خریدی پھر تیسری خریدی پہلے مجھے مرچوں کا بہت شوق تھا اور والد صاحب زیادہ مرچیں کھانے سے منع کیا کرتے تھے کہ اسکے نقصان ہوگا اُس وقت اُن کی بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی لیکن جب بڑھاپا آیا تو معلوم ہوا اُن کی بات ٹھیک نکلی۔ اب میں دوسرے جوانوں کو مرچوں سے منع کرتا ہوں مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ تو میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ تو نے بھی تو

والد صاحب کی بات کو نہ مانا تھا۔ اسی طرح یہ تیری بات کو نہیں مانتے۔ اور لیجیے تمباکو اکثر لوگ کھاتے ہیں جو کچھ مزہ کا نہیں ہوتا بلکہ کڑوا ہوتا ہے مگر جو لوگ اس کے عادی ہیں اُن کو اس تلخی ہی میں لذت آتی ہے۔

چنانچہ ایک تمباکو فروش سے کسی نے کہا کہ بہت کڑوا تمباکو دینا اُس نے ایک تمباکو دکھا دیا۔ خریدار نے کہا اس سے بھی کڑوا دے تو وہ دکاندار کہتا ہے کہ بس جی (توبہ توبہ) اس سے کڑوا اللہ کا نام! استغفر اللہ نعوذ باللہ! کمبخت نے عنوان بہت بُرا اختیار کیا باقی مطلب میں کچھ کفر نہیں کیونکہ کڑوا ہونا اُس کے نزدیک صفت کمال تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اُس سے کامل تر اللہ کا نام۔ مگر عنوان بہت بُرا تھا۔

اسی طرح جب کوئی کسی پر عاشق ہوجاتا ہے تو اُس کو اپنی ذلت اور رسوائی میں مزا آتا ہے چنانچہ عاشق اسی لیے اپنی عزت وغیرہ سب خوشی سے قربان کر دیتا ہے۔ جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ اُس کی بیوی بہت حسین تھی مگر پھر بھی وہ کمبخت ایک بازاری عورت پر عاشق تھا اُس کی بیوی نے خیال کیا شاید وہ کچھ مجھ سے زیادہ حسین ہوگی جو میاں کو اُدھر ہی التفات ہے اور مجھ سے بے رُخی ہے اتفاق سے ایک دن وہ بازاری عورت خود اس شخص کی بیٹھک میں آئی بیوی کو خبر ہوئی تو اُس نے جھانک کر دیکھا تو وہ اتنی کالی تھی کہ کوے سے بھی زیادہ۔ اب بیوی کو بڑی حیرت ہوئی۔ میاں کو اس کی کون سی ادا بھائی ہے وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اتنے میں شوہر باہر سے آیا تو بازاری عورت نے صورت دیکھتے ہی اُس کے چار جوتے لگائے کہ بھڑوے تو اب تک کہاں تھا ہم تو انتظار میں سوکھ گئے اور تیرا پتہ ہی نہیں جوتے کھا کر میاں صاحب ہنسے اور اُس کی خوشامدیں کرنے لگے بیوی نے بھی یہ انداز دیکھے تو سمجھ گئی کہ اس مرد کو مار کھانے ہی میں مزا آتا ہے۔ اب جو شام کو مرد گھر میں آیا تو بیوی نے بھی چار جوتے لگائے کہ نالائق اب تک کہاں تھا۔ دن بھر سے تیرا پتہ نہیں کہاں مارا مارا

بچھڑتا ہے۔ تو آپ ہنس کر فرماتے ہیں کہ بی! بس تیرے اندر اسی کی کسر تھی۔ اب میں کہیں نہ جاؤں گا۔ اب تو گھر ہی میں دعوت موجود ہے۔

حضرت جیسا عشق مجازی کی یہ کیفیت ہے کہ اس میں ذلت خوشگوار و لذیذ ہو جاتی ہے تو عشق حقیقی کا کیا کہنا مولانا ارشاد فرماتے ہیں ؎

عشق مولے کے کم از لیلیٰ بود　　　گوے گشتن بہر او اولیٰ بود

اور کہتے ہیں ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

پس اہل اللہ کو اگر غم آخرت لذیذ ہو جائے اور لوگوں کے سخت کلمات میں مزا آنے لگے تو کیا تعجب ہے۔ اب اس مسئلہ میں کوئی شبہ نہ رہا کہ جتنا دین کامل ہو گا اتنی ہی لذت و لطف زندگانی میں ترقی ہو گی گو سامان زیادہ نہ ہو۔

حقیقت راحت

لوگ آجکل سامان راحت کو مقصود سمجھتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو جائے اور سامان راحت اس کے پاس سب کچھ ہو تو کیا اسے کچھ راحت ہو گی ہرگز نہیں اور کچھ نہیں۔ اور اگر ایک لنگوٹا بند بھی اس کے ساتھ قید ہوا ہو اور چند روز کے بعد وہ رہا ہو جائے تو گو اس کے گھر میں سامان راحت کچھ نہیں مگر دیکھ لیجئے کہ رہائی کی خبر سن کر اس کے یہاں کیسی عید آئے گی۔

معلوم ہوا کہ راحت اور چیز ہے اور سامان راحت اور چیز ہے یہ ضرور نہیں کہ جس کے پاس سامان راحت نہ ہو اس کو راحت حاصل نہ ہو اور میں فقط دلیل ہی سے نہیں بلکہ مشاہدہ سے دکھلاتا ہوں کہ آپ ایک تو کامل دیندار شخص کو لیں مگر ہم جیسا دیندار نہیں بلکہ واقع میں کامل دیندار ہو اور ایک نواب یا رئیس کو لے لیں پھر ان کی نجی حالت کا موازنہ کریں تو واللہ ثم واللہ وہ دیندار تو

آپ کو سلطنت میں نظر آئے گا اور یہ نواب رئیس مصیبت میں گرفتار نظر آئے گا۔ مشاہدہ کے بعد تو آپ مانیں گے کہ راحت کا مدار سامان پر نہیں۔ باقی میں سامان سے منع نہیں کرتا بلکہ دین کے برباد کرنے سے منع کرتا ہوں اگر دین کے ساتھ یہ سامان دنیا بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ شریعت نے ضعفاء کو سامان راحت جمع کرنے کی اجازت دی ہے۔ بلکہ بعض عارفین بھی کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں وہ بھی جمعیت قلب کے لیے کچھ سامان رکھتے ہیں مثلاً کپڑوں کے چار جوڑے اور سال بھر کا اناج۔ سو دین کی نگہداشت کے ساتھ اس کا بھی مضائقہ نہیں مگر عبدالدینار وعبدالدرہم ہونا بُرا ہے اس کے لیے حدیث میں وعید وارد ہے تعس عبد الدینار و تعس عبد الدرھم ان اعطی رضی و ان لم یعط سخط۔ پس تین قسم کے لوگ ہوئے ایک تو کامل دیندار کہ دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک کامل دنیادار جو اسی میں منہمک ہے اور اُس کی حالت مستسقی جیسی ہے جس طرح اُس کو پانی سے ایک منٹ کو صبر نہیں ہوتا اسی طرح اسکو دنیا کی فکر سے کسی دم فرصت نہیں وہی حال ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں ٭ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

بس ایسا ہونا بُرا ہے اور اسی پر حدیث میں وعید ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جو دین پر قائم ہے مگر حصول اطمینان کے لیے بقدر ضرورت سامان رکھتا ہے یہ بُرا نہیں۔

فساد باہمی کے اثرات

الغرض دین کو چھوڑ کر سامان راحت موجب راحت نہیں ہوتا۔ مسلمان کے لیے تو ہے ہی نہیں گو کفار کے لیے ہو۔ شاید کوئی کہے کہ جب کفار کو سامان راحت سے بدوں دین کے راحت مل جاتی ہے تو ہم کو کیوں نہ ملے گی اس کا جواب یہ ہے کہ آخر تمہارا کوئی مالک بھی ہے؟ یقیناً ہے بس اُن کی عادت ہے کہ وہ مسلمان تارک دین کو راحت سے

محروم کر دیتے ہیں۔ اس تقریر سے ظاہر ہوگیا کہ دین کا ضرر ایسا ضرر ہے جس سے دنیا کی راحت بھی برباد ہو جاتی ہے۔ اور صاحبِ فساد سے دنیا کا برباد ہونا ایسا بدیہی ہے کہ اس کے لیے مقدمات و دلائل کی ضرورت نہیں بلکہ مشاہدہ ہی کافی ہے چنانچہ پہلا اثر فساد کا یہ ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں عداوت ہو جاتی ہے۔ ہر شخص دوسرے سے غیر مطمئن ہو جاتا ہے پھر عداوت میں ہر قسم کے ضرر کا احتمال ہوتا ہے گو دشمن ضعیف ہی ہے بقول سعدیؒ ؎

دشمن نتواں حقیر و بے چارہ شمرد　　دانی کہ چہ گفت زال با رستم گرد

یعنی دشمن کو کبھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے اس سے ہوشیار رہنا چاہیے مانا کہ تمہارا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا مگر دشمنی نکالنے کی اور بہت صورتیں ہیں۔

کرانہ میں ابھی ایک قصہ ہوا کہ ایک صاحب کا عالی شان مکان تازہ بنا ہوا تھا رات کو اس میں کسی نے آگ لگا دی۔ صاحبِ مکان سے تو کسی کو عداوت نہ تھی وہ تو بے چارے بڑے اچھے اخلاق کے ہیں مگر اس مکان میں ایک سپاہی کرایہ دار رہتا تھا اس نے محلہ والوں میں سے کسی کی نالش کر دی تھی وہ دشمن ہو گیا۔ اور انتقام کا منتظر رہا وہ سپاہی مکان کے بالاخانہ پر رہتا تھا اور نیچے کا حصہ مقفل تھا جس میں مالک مکان کا بہت کچھ سامان رکھا ہوا تھا۔ اس دشمن نے رات کو روشندان کے ذریعے سے یا کسی اور راستہ سے مکان کے حصہ زیریں میں مٹی کا تیل ڈالا پھر.... دیا سلائی اندر پھینک دی۔ مٹی کے تیل میں آگ لگنا غضب ہے تھوڑی ہی دیر میں تمام سامان میز کرسیاں صندوق وغیرہ جل گئے اور آگ کے شعلے چھت تک پہنچے تو کڑیوں میں بھی آگ لگ گئی وہ سپاہی مع اپنے اہل و عیال کے اوپر پڑا ہوا سو رہا تھا کہ دفعتاً اس کو زمین سے گرمی محسوس ہوئی۔ اگر تھوڑی دیر وہ اور توقف کرے تو ہلاک ہو جاتا مگر اس نے نہایت ہوشیاری اور پھرتی سے فوراً اپنے بچوں اور بیوی کو چھت سے علیحدہ

کر کے زینے سے نیچے اتار لیا۔ ان کا اُترنا تھا کہ چھت فوراً گر پڑی اور اب آگ کے شعلے آسمان تک پہنچنے لگے۔ کیونکہ اب تک تو چھت حائل تھی۔ اسلئے آگ اندر ہی اندر رہی جب چھت گر پڑی تو شعلے بلند ہونے لگے اب محلہ والوں کو خبر ہوئی اور سب چاروں طرف سے دوڑے اور پانی ڈالنے لگے مگر کیا ہوتا تھا اُس وقت پانی بھی مٹی کے تیل کا کام دے رہا تھا۔ لوگوں نے آگ بجھانے کی ہزار تدبیریں کیں مگر سب بے کار ہوگئیں۔ تین دن کے بعد آگ کو سکون ہوا۔ تو صاحب! کمزور آدمی مقابلہ نہ کر سکے تو یہ حرکتیں تو کر سکتا ہے کہ گھر میں آگ لگا دے رات کو اینٹیں پتھر پھینک دے۔

اسی لیے عقلاء کہتے ہیں کہ دشمن چاہے چمار ہی کیوں نہ ہو وہ بھی بُرا۔ کسی کو دشمن بنانا اچھا ہی نہیں۔ پھر کمزور آدمی مقابلہ سے اُسی وقت تک رُکتا ہے جب تک اُسے جان کا خوف ہو اور اگر کوئی جان پر کھیل جائے تو مقابلہ بھی مشکل نہیں۔ بریلی کا قصہ ہے کہ وہاں ایک کوتوال بڑے جاہ و جلال کے تھے وہ گالیاں بہت دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کانسٹیبل کو گالی دیدی جو شاید راجپوت تھا یا برہمن اُسے گالی کا تحمل نہ ہوا جان پر کھیل گیا اور موقع پا کر کوتوال پر اور اُس کے ایک بیٹے پر ہاتھ صاف کر دیا۔ بعد میں اُسے بھی پھانسی ہوگئی۔ غرض بعض دفعہ کمزور دشمن جان پر کھیل جاتا ہے تو مقابلہ بھی کر بیٹھتا ہے۔ پس فسادِ باہمی کا پہلا عذاب تو یہ ہے کہ طرفین کو ایک دوسرے کی عداوت سے اندیشہ اور خوف ہو جاتا ہے اور یہ خوف کا عذاب سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس سے ہر وقت دل میں کانٹا سا چبھتا رہتا ہے اسی لیے حق تعالیٰ نے اپنے مقبول بندوں سے اوّل خوف ہی کی نفی کی ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ پھر جب ہر ایک کو دوسرے کی طرف سے اندیشہ ہوگیا تو اب ایذا رسانی کا سلسلہ چلا کیونکہ قاعدہ یہ ہے ؎

ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم وگر با چنوں صد بر آئی بجنگ

ازاں مار بر پائے راعی زند ۔۔۔ کہ ترسد سرش را بکوبد بسنگ

دشمنوں میں سے ہر ایک کو یہ فکر ہوتی ہے کہ پہلے میں حملہ کر لوں چنانچہ سانپ اسی لیے پہلے کاٹتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نہ کاٹوں گا تو انسان مجھے کاٹ ڈالے گا

ایک دفعہ میں کھنکجورے کو مار رہا تھا ایک صاحب کہنے لگے کیوں مارتے ہو میں نے کہا یہ موذی ہے اسلئے مارتا ہوں کہنے لگے اس نے تم کو تو کچھ ایذا نہیں دی میں نے کہا قتل الموذی قبل الایذاء کہنے لگے کہ وہ بھی اسی قاعدہ سے ایذا پہنچاتا ہے ۔ میں نے کہا پھر اسے کس نے منع کیا ہے وہ بھی اس قاعدہ سے کام لے ہم بھی کام لیں ۔ جس کا بھی موقعہ لگ جائے سو عداوت میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ اسکی فکر میں رہتا ہے اور یہ اس کی فکر میں ۔ بس دق سی لگ جاتی ۔ ہے اور ہر شخص کا حال مدقوق سا ہو جاتا ہے دونوں کے دل کو گھن لگ جاتا ہے ۔

زوجین کا فساد

پھر آگے عداوت کا سلسلہ نسل بہت دور تک چلتا ہے وہ اسکو ذلیل کرنا چاہتا ہے یہ اس کو ۔ وہ اسے مالی اور جسمانی نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور یہ اسکو ۔ یہ اس کی آبرو اتارنا چاہتا ہے وہ اس کی یہاں تک کہ جائز و ناجائز کا بھی خیال نہیں رہتا ۔ اب اگر کسی سے کہو کہ بھائی یہ طریقہ انتقام کا ناجائز ہے تو کہتے ہیں کہ اگر ہم جائز و ناجائز ہی میں رہے تو دوسرا اچھی طرح سے کسر نکال لے گا جب دوسرے کو دین کی پرواہ نہیں تو ہم کیسے پرواہ کریں ۔

اب دنیا کے ساتھ دین بھی برباد ہونے لگا ۔ چنانچہ اسی واقعہ میں بھی جو کہ اس بیان کا محرک ہے ایسا ہی ہوا کہ اول دو شخصوں کے خیالات ایک دوسرے کی طرف بدلے تھے پھر عداوت ہو گئی ۔ پھر ہر قسم کے اضرار کا سلسلہ چلا یہاں تک کہ دین کی بھی پرواہ نہ رہی ۔ شیطان اسی لیے اس شخص سے بہت خوش ہوتا ہے جو میاں بی بی میں لڑائی کرا دے ۔

حدیث میں آتا ہے کہ شیطان شام کو دریا پر اپنا تخت بچھاتا ہے اُس وقت سارے شعلو نگڑے اپنی اپنی کارروائی آکر بیان کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کی نماز قضا کر دی۔ ایک کہتا ہے کہ میں نے ایک آدمی سے زنا کرا دیا شیطان سب کہتا ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا (کیونکہ ان گناہوں کا کفارہ ایک توبہ و استغفار سے ہو سکتا ہے) پھر ایک کہتا ہے کہ میں نے میاں بی بی میں لڑائی کرا دی پھر وہاں سے ٹلا نہیں یہاں تک کہ شوہر نے بی بی کو طلاق بھی دے دی۔ شیطان اس کو گلے سے لگا لیتا اور بہت شاباشی دیتا ہے کہ ہاں تو نے بڑا کام کیا۔ اس میں راز یہ ہے کہ اگر دو شخصوں میں عداوت ہو تو اس کا اثر دُور تک نہیں پہنچتا اور میاں بی بی میں لڑائی اور طلاق ہو جائے تو دونوں کے خاندان میں جنگ ہو جاتی ہے۔ دو کی عداوت سے سَو میں عداوت قائم ہو جاتی ہے۔ شیطان کو اتنی فرصت کہاں جو سَو آدمیوں میں الگ الگ عداوت پیدا کرے بس وہ دو میاں بی بی میں عداوت کرا دیتا ہے اس سے خود بخود دُور تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔

جیسے ایک ولایتی کی حکایت ہے کہ اس نے جب عربی شروع کی تو اوّل ہی سے شرح جامی پڑھنے لگے اور برسوں اسی کو پڑھتے رہے۔ مگر سمجھ میں نہ آتی تھی لوگوں نے کہا میاں اس طرح فائدہ نہ ہوگا اوّل میزان منشعب پنج گنج وغیرہ پڑھو پھر شرح جامی سمجھ میں آئے گی۔ کہنے لگا نہیں کہ ہم نے اپنی اماں کو دیکھا ہے کہ انہوں نے مرغیاں پال رکھی تھیں۔ ہم شام کو مرغی کے بچوں کو پکڑ کے بند کرنا چاہتے تو وہ بہت دق کرتے تھے۔ ایک اِدھر کو بھاگ گیا ایک اُدھر کو۔ اس وقت ہماری اماں مرغی کو پکڑ لیتی تھی تو سارے بچے چوں چوں کرکے اس کے ساتھ ہو لیتے تھے۔ اسی طرح شرح جامی سب کتابوں کی مرغی ہے ہم نے اس کو پکڑ لیا ہے بس اس کے پکڑنے سے سب کتابیں خود بخود قبضہ میں آجائیں گی۔

اسی طرح میاں بی بی کا فساد سب فسادوں کی مرغی ہے ان میں لڑائی کرا دیتا ہے جس سے سینکڑوں میں لڑائی ہوجاتی ہے پھر وہ لڑائی دین کو بھی ضائع کردیتی ہے پھر ایک پریشانی بے تعلق لوگوں کو پیش آتی ہے کہ ان لڑنے والوں سے ملیں یا نہ ملیں چنانچہ اسی واقعہ میں بعض لوگ میرے پاس آئے اور پوچھا کہ یہاں ایسا ناجائز قصہ ہوا ہے۔ ہم کو ان سے ملنا جائز بھی ہے یا نہیں۔

یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے سوال تو کیا ہمارے قصبہ میں تو خدا اُسے ہدایت کرے اور شاید اُس کو ہدایت ہوگی قصبے جو قصبے کے اول ہیں ہے ایسا کوئی سوال بھی نہیں کرتا وہ لوگ ہیں تو شیخ مگر دماغ پٹھانوں سے بھی زیادہ ہے۔ وہاں بھی طلاق کا ایک شرمناک قصہ ہوا تھا۔ مگر کسی کو بھی اس سوال کی توفیق نہ ہوئی کہ ہم کو ان لوگوں سے ملنا جائز ہے یا نہیں۔ بس سب کے سب بے تکلف ملتے ملاتے ہیں کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی کہ یہاں کچھ قصہ ہوا تھا یا نہیں اسلئے میں جلال آباد والوں کی دینداری کی تعریف کرتا ہوں کہ یہاں ابھی تک دین کا خیال باقی ہے کہ بعض لوگ یہ پوچھنے آئے کہ ہم کو ان ناجائز کام کرنے والوں سے ملنا جائز ہے یا نہیں۔ میری عادت تشدد کی نہیں ہے گو بعض دفعہ تشدد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

دیکھئے! اگر آپ ایک کندۂ ناتراشش لکڑی کو خوب صورت بنانا چاہیں تو کیا بدون تبر بازی کے وہ خوب صورت ہوسکتا ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ اول کلہاڑے یا آرہ سے چیرنا ہوگا پھر اُس پر بسولے پڑیں گے پھر رندہ چلے گا تب وہ کندۂ ناتراشش اس قابل ہوگا کہ اُس کو لین باندھ کر رکھا جائے۔ جیسے حق تعالیٰ ایک تشبیہ میں فرماتے ہیں۔ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ یہ منافقین کی تشبیہ ہے اور کیا غضب کی بلاغت ہے کہ منافقین ظاہر میں بہت چکنے چپڑے اور لسان ہوتے تھے

اور باطن میں خبیث تھے تو حق تعالیٰ نے دونوں باتوں کی رعایت کرکے کیا عجیب تشبیہ دی ہے کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ یعنی وہ ایسے ہیں جیسے لکڑیاں لین باندھ کر رکھی ہوئی۔ لکڑیوں کو تراشنے کے بعد ہی لین باندھ کر رکھتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ چونکہ ظاہر میں یہ منافق بہت شائستہ ہیں اس لیے ان کو کندۂ ناتراش تو نہ کہو۔ ہیں کندۂ تراشیدہ مگر ہیں لکڑیاں ہی۔ یعنی عقل و شعور سے خالی جماد محض ہیں۔ غرض کندۂ تراشیدہ کو حق تعالیٰ بھی خوب صورت بناتے ہیں مگر یہ خوبی تبر کی ہے۔

سختی کا نتیجہ

اسی طرح انسانوں میں بھی بعض دفعہ تشدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بدون سختی کے ان میں خوبی اور کمال نہیں پیدا ہوتا جس پر ابتدا میں سختی نہ ہوئی ہو اس کے اخلاق درست نہیں ہوتے اور کمالات سے محروم رہتا ہے آج جو لوگ باکمال کہلاتے ہیں۔ ان پر کسی وقت ضرور سختی ہوئی ہے پھر آج اس سختی کا یہ نتیجہ ہے کہ تعزیرات شرعیہ میں بھی اہل عزت اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ساتھ رعایت کا حکم کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر ان سے کوئی خطا ہو جائے تو حکم ہے اقیلوا ذوی الھیئات عثراتھم کہ ان کو سزا نہ دو۔ بلکہ عدالت میں بلا کر برسر اجلاس دھمکا دیا کرو کہ آئندہ ایسا نہ ہونے پائے۔ شریف و معزز آدمی کے لیے یہی سزا بہت ہے۔ سو آج یہ رعایت اس سختی کا اثر ہے جو بچپن میں ان پر ہو چکی ہے۔ مگر یہ حکم تعزیرات کا ہے اور حدود میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں بلکہ وہاں تو سفارش بھی جائز نہیں۔

بہرحال بعض دفعہ سختی کی ضرورت ہوتی ہے اس کی پہلے جو یہاں میرے ایک دوست کا بیان ہوا تھا۔ لوگوں نے ان کو متشدد کہا مگر ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا ان کی رائے میں اسی کی ضرورت تھی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اگر میں تشدد سے بھی کام لیتا۔ تو ان سے کم ہی کہتا۔ لیکن میں نے تشدد سے کام ہی نہیں لیا کیونکہ میں

دیکھتا ہوں کہ گو تشدد کی بعض جگہ ضرورت ہوتی ہے مگر بعض طبائع ایسی اچھی ہیں اور اُن پر اُلٹا اثر ہوتا ہے اور نرمی کا اثر اچھا ہوتا ہے اس لیے میں نے ان سوال کرنے والوں سے یہ نہیں کہا کہ اپنے گنہگار بھائیوں سے نہ ملو۔ بلکہ یہ کہا کہ جاؤ ملو مگر اُن کو سمجھاؤ۔

فساد کا متعدی اثر اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ باوجود اجازت دینے کے بھی نہ ملے کیونکہ اجازت کے ساتھ جو یہ شرط لگادی گئی تھی کہ اُن کو سمجھاؤ اس شرط کے پورا کرنے پر انہوں نے اپنے کو قادر نہ دیکھا اس لیے ملے ہی نہیں تو دیکھئے دو شخصوں کی عداوت سے اوپر والوں کو یہ تنگی پیش آئی۔ اور بعض کو یہ تنگی پیش آئی کہ وہ اُن سے نہ ملنے پر قادر نہ تھے کیونکہ اُن کی طبیعت ضعیف تھی۔ پھر وہ رات دن ایک ہی جگہ رہتے تھے اُن سے نہ ہو سکا کہ پاس رہتے ہوئے بھی نہ ملیں اسلئے وہ اُن سے ملے اور ان لوگوں کو گناہ ہوا کیونکہ انہوں نے مل کر کچھ تشدد نہیں کیا نہ اُس فریق کی خلافِ شرع حرکتوں سے ناگواری ظاہر کی۔ گو بوجہ اسکے کہ اس کا منشا ضعفِ طبیعت تھا۔ اس لیے اُن کو ان لوگوں سے کم گناہ ہوا جو باوجود قدرتِ تشدد کے بدون تشدد کے ویسے ہی ملتے رہے جیسے پہلے ملا کرتے تھے۔ ان دونوں کی سزا میں بھی تفاوت ہوگا۔

تو اس فساد سے یہ کتنی بڑی خرابی ہوئی کہ اُسکی اسباب ایسے جمع ہو گئے کہ بعضے بے گناہ بھی گناہ میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ حدیث میں آیت وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً کی یہی تفسیر آئی ہے کہ ایک شخص کسی بستی میں گناہ کر کے رہتا ہے لوگ اس کو دیکھتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں اُس سے کنارہ کشی نہیں کرتے نہ اُس پر کچھ تشدد کرتے ہیں تو اُس شخص کی وجہ سے سینکڑوں بے گناہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالےٰ نے جبریل علیہ السلام کو کسی بستی کے اُلٹ دینے کا حکم دیا کہ یہ لوگ بہت حد سے نکل گئے ہیں ان کا تختہ اُلٹ دو۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔ خداوندا اس بستی میں ایک شخص ایسا ہے جس نے عمر بھر بھی کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی۔ کیا اُس سمیت اُلٹ دوں۔ فرمایا ہاں اُس سمیت ہی اُلٹ دو کیونکہ اُس نے بظاہر کوئی گناہ نہیں کیا۔ مگر گنہگاروں کو دیکھ کر اُس کے چہرہ پہ بل بھی نہیں پڑا۔ وہ ہمارے دشمنوں سے ویسی ہی دوستی اور محبت کے ساتھ ملتا رہا۔ جیسا دوستوں سے ملا کرتے ہیں تو یہ کیسی محبت ہے کہ ہمارے دشمنوں پر بھی غصہ بھی نہ آئے۔ اسلئے وہ بھی انہی کے مثل ہے اُس کو بھی الٹ دو۔

صاحبو! اس بلا میں ہم لوگ بھی گرفتار ہیں۔ ہمارے ملنے والوں میں بھی بعضے مبتلائے معاصی ہیں اور ہم اُن سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور ملتے ملاتے ہیں ہاں ایک صورت میں اس کی اجازت بھی ہے وہ یہ کہ کسی پر تشدد یا قطع تعلق کرنے میں مفسدہ کا اندیشہ ہو۔ اور اُس کی طرف سے اضرار کا اندیشہ ہو اور اپنے اندر تحمل کی طاقت نہ ہو۔ اس کو سکوت کی اجازت ہے باقی جس کو ہمت ہو اُس کو سکوت کی اجازت نہیں ہے بلکہ اُس کیلیے یہ حکم ہے یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۔ اُس کو چاہیئے کہ صاف صاف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور جو خطرہ پیش آئے اُس کا تحمل کرے۔

تغییرِ منکر

شیخ ابوالحسن نوریؒ ایک دفعہ ساحل کی طرف گئے تو دیکھا کشتیوں پر مٹکے لدے ہوئے ہیں اور ساحل پر اُتارے جارہے ہیں آپنے مُلّاح سے پوچھا کہ ان مٹکوں میں کیا ہے کہا خلیفہ کے لیئے شراب آئی ہے آپ کو یہ سُنتے ہی غصہ آیا اور فرمایا ذرا لکڑی تو دو۔ اُس نے لکڑی دیدی

اور سمجھا کہ ویسے ہی مذاق کر رہے ہیں۔ مگر آپ ڈنڈا لے کر کشتیوں پر جا چڑھے اور ایک طرف سے مٹکوں کو توڑنا شروع کیا۔ دس مٹکے تھے نو کو تو توڑ دیا۔ ایک چھوڑ دیا۔ مخبر نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ ابوالحسن نوریؒ نے شاہی شراب کے مٹکے توڑ دیئے۔ دربار میں بلائے گئے اور سوال ہوا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی۔ فرمایا حدیث میں ہے من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ او بلسانہ او بقلبہ اس لیے میں نے منکر کو دیکھ کر اس کو مٹا دیا۔ خلیفہ نے کہا کہ یہ کام محتسب کا ہے تم کو محتسب کس نے بنایا۔ فرمایا مجھے اس نے محتسب بنایا جس نے تجھ کو خلیفہ بنایا کہا سند؟ فرمایا حق تعالیٰ فرماتے ہیں یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ ط اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۔ اس میں کسی کی تخصیص نہیں پس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو کر چکا ہوں۔ اب تو جو کچھ میرے ساتھ معاملہ کرے اس پر صبر کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ خلیفہ نے کہا کہ اسکی کیا وجہ کہ ایک مٹکہ چھوڑ دیا اس کا انہوں نے جواب عجیب دیا۔ فرمایا کہ جب میں نو مٹکے توڑ چکا تو میرے نفس نے کہا اے ابوالحسن! آج تو نے بڑا کام کیا کہ خلیفہ کی بھی پرواہ نہ کی۔ واقعی تو دین کے معاملہ میں بڑا جری ہے اس خیال کے آتے ہی میں نے ہاتھ روک لیا۔ کیونکہ اب میرا توڑنا اللہ تعالیٰ کیواسطے نہ ہوتا نفس کے واسطے ہوتا۔ اور میں نے یہ گوارا نہ کیا کہ جو کام اللہ کے واسطے کیا جائے اس میں نفس کی آمیزش ہو اس لیے دسویں مٹکے کو چھوڑ دیا۔ یہ ویسا ہی قصہ ہوا جیسا حضرت علیؓ کا واقعہ مثنوی میں ہے کہ آپنے ایک دفعہ معرکہ جہاد میں ایک یہودی کو پچھاڑ لیا اور سینہ پر بیٹھ کر ذبح کرنا چاہا۔ یہودی نے آپکے چہرہ پر تھوک دیا تو فوراً چھوڑ کر کھڑے ہو گئے مولانا فرماتے ہیں ؎

او خدو انداخت بر روئے علی — افتخار ہر نبی و ہر ولی

بعض لوگوں نے اس شعر کو الحاقی کہا ہے کہ کسی شیعی نے مثنوی میں بڑھا دیا ہے

کیونکہ اس میں حضرت علیؓ کو افتخارِ ہر نبی کہا ہے مگر یہ خیال غلط ہے کیونکہ فخر ہمیشہ... چھوٹوں ہی کو بڑوں پر نہیں ہوتا کبھی بڑوں کو بھی چھوٹوں پر فخر ہوتا ہے کہ دیکھو یہ ہمارا لڑکا کیسا لائق ہے حدیث میں بھی تو ہے تزوجوا الودود الولود فانی اباھی بکم الامم حضور ہمارے اوپر فخر کریں گے ویسا ہی افتخار یہاں مراد ہے۔ جب حضرت علیؓ یہودی کو چھوڑ کر الگ ہو گئے تو اس نے سوال کیا کہ حضرت دشمن پر قابو پاکر اور اس کی گستاخی دیکھ کر چھوڑ دینا تعجب خیز ہے۔ فرمایا گستاخی کی وجہ سے چھوڑ دیا کیونکہ اس سے پہلے تو میں اللہ کے واسطے مار رہا تھا۔ اور گستاخی کے بعد نفس کو ہیجان اور جوشِ انتقام ہوا اب میرا تجھے مارنا خالص اللہ کے واسطے نہ ہوتا۔ بلکہ اس میں شفاءِ غیظ نفس بھی شامل ہوتا۔ اسکو میں نے گوارا نہ کیا۔ کیونکہ یہ شانِ اخلاص کے خلاف تھا۔

یہ سنتے ہی یہودی ایمان لے آیا۔ صاحبو! ہمارے امر بالمعروف میں اثر نہ ہونے کی یہ بھی وجہ ہے کہ ہمارے اندر خلوص نہیں۔ ہمارے سب وعظ و نصائح اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ورنہ اخلاص ہو تو ضرور اثر ہو۔

چنانچہ شیخ ابوالحسن نوری پر یا تو خلیفہ کو غصہ آ رہا تھا۔ اور دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا کہ دیکھئے اب شیخ کے لیے کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ مگر دسویں مٹکے کے چھوڑنے کی وجہ جب معلوم ہوئی تو خلیفہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اخلاص کا اثر ہوا۔ اور کہا جاؤ ہم نے آج سے تم کو باقاعدہ محتسب بنایا تم بازاروں اور کوچوں میں خلاف شرع کام کرنے والوں کو سزا دیا کرو۔ جس کو ایسی ہمت ہو اور خطرات کے تحمل کی طاقت ہو اس کو تو سکوت جائز نہیں اور جس کو تحمل نہ ہو اسے سکوت جائز ہے۔ مگر جو واقعہ یہاں ہوا ہے اس میں سکوت کی اجازت کسی کو نہ تھی کیونکہ حق کے ظاہر کرنے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض کرضعفِ طبیعت کی وجہ سے سکوت کرنے میں

گناہ کم ہوا ہو۔ مگر گناہ سے وہ بھی نہیں بچے۔ یہ کتنا بڑا ضرر ہوا۔ دو شخصوں کے باہمی فساد سے۔

مقدمہ بازی

پھر بعض دفعہ اس فساد میں مقدمہ بازی کی نوبت آتی ہے جس میں وکلاء سے مشورہ لیا جاتا ہے وکلاء ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ بعضے جھوٹے مقدموں کو بھی لے لیتے ہیں اور مکر و فریب کی تدبیریں بتلا کر اس کو چلاتے ہیں۔

ایمان فروشی

میں کیا کہوں آجکل تو بعضے علماء بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ المورڑہ میں ایک عورت نے ایک عالم سے پوچھا کہ کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ شوہر سے بدون طلاق کے علیحدگی ہو جائے۔ وہ عورت اپنے کسی آشنا سے نکاح کرنا چاہتی تھی اور شوہر طلاق نہ دیتا تھا تو اس ظالم نے کہا ہاں ایک صورت ہے کہ تو کافر ہو جا (نعوذ باللہ منہ) کفر سے بدون طلاق ہی کے نکاح ٹوٹ جائے گا۔ پھر بعد عدت کے مسلمان ہو جانا اور جس سے چاہے نکاح کر لینا۔ مگر اس کمبخت نے کفر خرید کر بھی مسئلہ ناتمام بتلایا کیونکہ یہ تو مسئلہ ہے کہ ارتداد سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی حاکم اسلام کو یہ حکم بھی ہے کہ اس عورت کو اسلام پھر اور اسی پہلے مرد سے نکاح کرنے پر مجبور کرے۔ ارتداد کے بعد یہ عورت مرتدہ کسی اور مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ جبر سے نکاح کیونکر ہو گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نکاح اور طلاق جبر سے بھی صحیح ہو جاتا ہے مگر اس کا استعمال ضرورت کے موقعہ ہی پر جائز ہے۔ بلا ضرورت جبر سے نکاح کرنا اور طلاق دلوانا گناہ ہے باقی اس کا انتظام حکومت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ جہاں بضرورت جبر ہوا ہو گا اسکو حاکم اسلام باقی رکھے گا۔ اور جہاں بلا ضرورت جبر ہوا ہو گا اس کو نکاح کی صورت میں تو فسخ کرا دیگا۔ اور طلاق کی صورت میں جبر کرنیوالوں کو سزا دیگا مگر طلاق کو باطل

نہ کریگا۔ اور گو یہ مسئلہ کہ جبر سے نکاح و طلاق نافذ ہو جاتا ہے ظاہر کرنے کا نہ تھا مگر میں نے اس لیے ظاہر کر دیا کہ شریعت پر تنگی کا شبہ نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ واقعی جبر کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ایک لڑکی نکاح نہیں کرتی جب اُس سے نکاح کو کہتے ہیں۔ انکار کر دیتی ہے اور اس کی حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بدون نکاح کے عفت کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی۔ اس صورت میں جائز ہے کہ جبراً کسی سے اس کا نکاح کر دیا جائے اور مجبور کر کے اُس کی زبان سے ایجاب قبول کرا لیا جائے ایسے ہی کوئی شخص نامرد ہے اور بیوی کو طلاق نہیں دیتا یا بازاری عورتوں سے خراب ہے اور بیوی کی خبر نہیں لیتا نہ اُس کو نان و نفقہ دیتا ہے اس صورت میں اگر کہیں حاکم اسلام ہو تو اُس سے مرافعہ کیا جائے اور اگر حاکم اسلام نہ ہو تو طلاق جبر سے لے سکتے ہیں کہ دو چار آدمی جنگل میں لے جا کر اُس کو دھمکا دیں اور طلاق کا لفظ زبان سے نکلوا دیں اگر نکاح و طلاق میں جبر کی گنجائش نہ ہوتی تو ان واقعات میں لوگوں کو شریعت پر تنگی کا شبہ ہوتا۔ اسی طرح اگر کوئی عورت نکاح توڑنے کے لیے مرتد ہو جائے اس کو اسلام پر مجبور کر کے پہلے ہی شوہر کے ساتھ نکاح کرنے پر مجبور کیا جائے گا وہ کسی دوسرے سے نکاح نہیں کر سکتی پس اُس عالم کا یہ کہنا غلط تھا کہ کفر کے بعد تو جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے وہ مولوی تو فوراً ہی کافر ہو گیا کیونکہ رضا بالکفر کفر ہے خواہ اپنے کفر سے رضا ہو یا غیر کے کفر سے۔

یعنی اگر کوئی شخص اپنے لیے کفر کو پسند نہ کرے مگر دوسرے کے کافر ہونے سے راضی ہو تو خواہ دوسرا کافر ہو یا نہ ہو مگر یہ راضی ہونے والا فوراً ہی کافر ہو گیا اگر اسلامی حکومت ہوتی اور مولوی صاحب اپنے اس فعل پر مُصر ہوتے تو ان مولوی صاحب کو قتل کیا جاتا کیونکہ مرد کو ارتداد کے بعد زندہ نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ اگر وہ دوبارہ اسلام لے آئے فبہا ورنہ تین دن کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے۔ مگر عورت ارتداد کے

بعد قتل نہیں کی جاتی۔ بلکہ اُس کو قید میں رکھ کر اسلام لانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

دیکھئے یہ عورتوں کی کتنی رعایت ہے لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں کی رعایت نہیں بالکل غلط ہے اسلام سے زیادہ کسی مذہب میں بھی عورتوں کی رعایت نہیں ہاں اسلام نے عورتوں کو ایسی آزادی نہیں دی کہ جہاں چاہیں اور جس کے ساتھ چاہیں چلی جائیں اور نہ اُن کو سب باتوں میں مردوں کے برابر کیا ہے یورپ کو حریت و مساوات کا بڑا دعوےٰ ہے مگر پارلیمنٹ میں عورتوں کو کیوں نہ داخل کر لیا۔ اب وہ مساوات وحریت کہاں جاتی رہی تو اسلام میں عورتوں کو بیہودہ آزادی تو نہیں دی گئی باقی ان کی رعایت اور حقوق کی نگہداشت بہت کی گئی ہے

ایک اور مولوی صاحب کا قصہ ہے کہ اُس نے ساس کو حلال کر دیا تھا کسی شخص نے ایک عورت سے شادی کی تھی پھر ساس پر دل آگیا۔ تو ایک غیر مقلد عالم کے پاس گیا اور کہا مولوی صاحب کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ ساس سے نکاح حلال ہو جائے کہا ہاں! تبلا کیا دیگا اُسنے کچھ سو دو سو روپے دینا چاہے کہا اتنے میں یہ فتوے نہیں لکھ سکتا۔ واقعی ایمان فروشی بھی کرے تو دنیا کچھ تو ہو غرض ہزار پر معاملہ طے ہوا اور فتویٰ لکھا گیا۔ وہ فتوے میں نے بھی دیکھا ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ ساس بیشک حرام ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ ساس کسے کہتے ہیں۔ ساس کہتے ہیں منکوحہ کی ماں کو اور منکوحہ وہ ہے جس سے نکاح صحیح منعقد ہوا ہو۔ اور اس شخص کی عورت چونکہ جاہل ہے اور جاہل عورتوں کی زبان سے اکثر کلمات کفریہ نکل جاتے ہیں اس لیے ضرور ہے کہ اس کے منہ سے بھی کوئی کلمہ کفریہ نکلا ہوگا اور نکاح کے وقت اس کو کلمے پڑھائے نہیں گئے۔ اس لیئے یہ مرتدہ ہے اور مرتدہ کے ساتھ نکاح صحیح نہیں ہوتا لہٰذا یہ عورت منکوحہ نہیں ہے تو اس کی ماں ساس بھی نہیں۔ پس اس کی ماں سے نکاح درست ہے۔ رہا یہ کہ وہ منکوحہ کی ماں نہیں تو موطوءہ کی ماں تو ہے جس سے حرمت مصاہرت

کا مسئلہ ابو حنیفہ کا اجتہادی مسئلہ ہے جو ہم پر حجت نہیں۔ حرمت مصاہرت کو اُس نے غیر مقلدی کی مد میں اڑا دیا۔ اور ساس کو منکوحہ کی تکفیر سے اڑا دیا اور یہ سب ترکیبیں ہزار روپے نے سکھلائیں۔

وکلاء کا کردار

جب علماء میں بھی ایسے ایسے موجود ہیں تو بیچارے دنیا دار وکلاء کا تو کام ہی ہے چٹنے بٹے لڑانا اُن سے تو کوئی بات بھی بعید نہیں اگر وہ ایسے اختلاف کے وقت کہ مرد و عورت میں نزاع ہو اور وہ عورت کو مرد کے قبضہ سے نکلنے کے لیے عیسائیت کا مشورہ دیدیں تو کیا بعید ہے۔ یہ سب نتیجہ اُسی فساد کا ہے جس نے عداوت سے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ دین ہی اُڑ گیا۔

دیکھئے اب متعلق الدین ہو گیا کہ نہیں! اس شخص پر کفر تو اسی وقت سے لکھا گیا جب سے اسنے ارادہ کیا مگر اب بھی رحمت کا دروازہ بند نہیں اگر اس کا پھر اسلام کا ارادہ ہو جائے تو پھر اسلام قبول ہے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

صدق توبہ

اگر کوئی شخص ہزار دفعہ بھی کافر ہو اور پھر صدق دل سے اسلام لانا چاہے تو حق تعالیٰ ایسے کریم ہیں کہ پھر قبول کرنے کو تیار ہیں اللہ اللہ ایسا رحیم اُن کے سوا کون ہے۔ پس اگر کسی سے کوئی کفر کا کلمہ صادر ہوا ہو یا ایسا ارادہ ہوا ہو تو وہ پھر سچے دل سے اسلام لے آئے تو حق تعالیٰ کے یہاں قبول ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بار بار کفر کرنے کے بعد پھر اسلام قبول نہیں یہ غلط ہے۔ ایک صاحب نے میرے سامنے دعویٰ کیا کہ تین مرتبہ کفر کر کے پھر اسلام قبول نہیں ہوتا۔ اور دلیل میں یہ آیت پڑھی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا

ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا
میں نے کہا بندۂ خدا! بیچ میں ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا بھی تو ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بار بار ایمان لاتے ہیں اور پھر کافر ہوتے ہیں پھر کفر ہی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں یعنی اخیر انجام کفر ہی ہے ان کی مغفرت نہ ہوگی اور اگر اخیر انجام اسلام پر ہے تو قبول ہے اور اس کی دلیل دوسری آیات ہیں جن میں فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ آیا ہے اور موت علی الکفر پر حبط اعمال وغیرہ کو مرتب فرمایا ہے اگر کفر پر موت نہ ہو۔ بلکہ موت سے پہلے ہزار برس کا کافر اسلام لانا چاہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں لبیک آجاؤ ان کی شان یہ ہے کہ نہ آنے والے کو آنے سے روکیں نہ جانے والے کو جانے سے روکیں کہ تو کیوں جاتا ہے بس ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو دار و گیر و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

چاہے کتنا ہی بڑا عابد ہو اگر جانا چاہے تو فوراً نکال دیتے ہیں شیطان کتنا بڑا عابد تھا مگر ایک دفعہ اُس نے جرأت کی تھی تو خود ہی فرما دیا اُخْرُجْ فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ دور ہو نالائق! تو مردود ہے۔ اور کتنا ہی بڑا کافر ہو اگر اُن کے پاس آنا چاہے تو فوراً دربار میں لے لینے کو تیار ہیں۔ اس لئے نہ عبادات پر مغرور ہو نہ معاصی سے مایوس ہو۔ اگر کسی سے خطا ہوگئی ہو فوراً توبہ کرلے حق تعالیٰ معاف فرما دیں گے پھر گناہ یا کفر کی بھی حالتیں مختلف ہیں۔ بعضے تو ایسے ہیں جن کی زبان سے کلمہ کفر نکل جاتا ہے اور وہ جانتے بھی نہیں کہ اس سے کفر ہوگیا۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ جانتے ہیں اور پھر بھی ایسے کلمات بک دیتے ہیں یہ پہلے سے بھی اشد ہے چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک صاحب نے کہا کہ اگر اسلام میں یہ مسئلہ ہے تو ایسے اسلام کو سلام ہے (نعوذ باللہ) کتنا سخت کلمہ ہے اس کے کفر ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ تھانہ بھون میں ایک انگریز میرے پاس مسلمان ہونے کو آیا تھا

اتفاق سے اس وقت سفر میں تھا۔ وہ بستی میں ایک صاحب کے یہاں ٹھہر گیا تو ایک اور مسلمان صاحب اُس سے ملنے آئے اور پوچھا کہ آپ کس ارادہ سے آئے ہیں کہا میں اسلام لانا چاہتا ہوں مگر مجھے چند شبہات ہیں جن کو فلاں شخص سے (میرا نام لیا) حل کرنا چاہتا ہوں تو وہ مسلمان صاحب کہتے ہیں کہ آپ مسلمان ہو کر کیا کریں گے بس ایک بدمعاش کا اور اضافہ ہو جائے گا (نعوذ باللہ نعوذ باللہ) اس کے تو یہ معنی ہیں کہ نعوذ باللہ مسلمان سب کے سب بدمعاش ہیں اور جو کوئی اسلام لاتا ہے وہ بدمعاشوں میں اضافہ کرتا ہے۔ اور یہ قول کسی رند کا نہیں۔ بلکہ ایسے شخص کی زبان سے نکلا ہے جن کی داڑھی بھی بڑی ہے۔

واللہ! بعضے رندان لوگوں سے ہزار درجہ اچھے ہیں جن کی ظاہری وضع تو... نیکوں کی سی اور دل کی یہ حالت بس ان کی وہی حالت ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حُلل : زاندروں قہر خدائے عزوجل

ہمارے قصبہ میں ایسے ایسے تبرکات بھی ہیں سارے عقلاء ہی نہیں ہیں جیسے کابل میں گھوڑے ہی گھوڑے نہیں ہیں بلکہ گدھے بھی ہیں ——— اس پر ایک لطیفہ یاد آیا ہمارے قرب جوار میں ایک قصبہ ہے جہاں کے آدمی بھولے زیادہ ہیں کسی نے اُس قصبہ کا نام لے کر کہا کہ وہاں گدھیاں بہت ہیں تو اُس قصبہ کے ایک رہنے والے فوراً فرماتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے وہاں تو سب گدھے ہی ہیں اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔

اچھے گنہگار میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر معاصی یا کفریات کا صدور ہو جاوے اور کوئی توبہ کرے تو پھر غنیمت ہے۔ یہاں یعنی مقام وعظ میں ایک اتفاق کا بھی قصہ ہوا تھا اس میں بھی بعض لوگوں سے غلطی ہوئی تھی مگر اُس وقت بھی لوگ مسئلہ پوچھنے آئے تھے کہ ہماری زبان سے یہ کلمات نکلے ہیں ان کا کیا حکم ہے

گنہگار یہاں بھی ہیں۔ مگر یہاں کے گنہگار ہمارے قصبے کے گنہگاروں سے اچھے ہیں کیونکہ یہ لوگ گناہ کر کے توبہ کر لیتے ہیں اور وہ توبہ بھی نہیں کرتے اور حدیث میں ہے کلکم خطاؤن وخیر الخطائین التوابون میں تو کہا کرتا ہوں کہ تم شیخ زادہ نہیں ہو بلکہ شیخ سے زیادہ ہو۔ یہاں کے لوگ گو دنیا کے معاملہ میں کتنا ہی دماغ کریں (آخر تو پٹھان ہیں) مگر دین کے معاملہ میں اینٹھ مروڑ نہیں کرتے۔ بلکہ حکم شرع معلوم ہوتے ہی فوراً جھک جاتے ہیں اور ہمارے قصبہ والے اول تو پوچھتے ہی نہیں اور اگر کبھی بے پوچھے ہی معلوم ہوگیا کہ شریعت کا یہ حکم ہے تو اس کے سامنے گردن نہیں جھکاتے بلکہ مسائل میں اپنی رائیں ٹھونسنے لگتے ہیں۔

جلال آباد والوں کی دین کے معاملہ میں ایک تواضع یہ بھی ہے کہ یہاں عیدین میں اب تک ہمارے ہی یہاں سے امام بھی آتے ہیں گو ہم اقتدار کے بھی قابل نہیں ہیں مگر خطیبوں اور قاضیوں کی اولاد میں ہیں اسلئے امام بنے ہوئے ہیں اور یہ جلال آباد والوں کی اہلیت ہے کہ اب تک اس بات کو نباہ رہے ہیں۔

میراث امامت

اور یہ اُن کی تو خوبی ہے مگر ہم لوگوں کے لیے جن کو وہ امام قرار دے رہے ہیں ایک بدنما عیب ہے کیونکہ ہم امامت میں میراث جاری کرتے ہیں اور آجکل یہ مصیبت عام ہو رہی ہے کہ قضا اور خطابت میں بھی میراث چلنے لگی کہ قاضی کی اولاد قاضی اور خطیب کی اولاد خطیب چاہے علم اور دین سے کورے ہی ہوں۔

گنگوہ میں ایک جاہل قاضی تھے انہوں نے مولانا گنگوہیؒ کی نقل اُتارنا چاہا۔ مولانا کی عادت تھی کہ عیدین کے خطبہ میں کچھ مسائل صدقہ فطر و قربانی کے متعلق بیان فرما دیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے سوچا کہ ہم مولانا سے کسی بات میں کم کیوں رہیں ہم بھی مسئلے بیان کریں گے تو آپ نے مسئلہ بیان کیا کہ قربانی میں

لگانے پورے سال بھر کی ہونا چاہیئے اور نہ معلوم کیا گڑبڑ کی۔ لوگ ہنس پڑے کہ جاہل کو مسائل تو معلوم نہیں اور مولانا کی ریس کرتا ہے۔ مگر اس پر بھی وہ قاضی بنے ہوئے تھے کیونکہ قاضی کی اولاد میں تھے حیرت ہے کہ ان باتوں میں تو میراث چلتی ہے اور اس میں میراث نہیں چلتی کہ باپ لنگڑا ہو تو بیٹا بھی لنگڑا ہو اور اگر صحیح سالم ہو تو لنگڑا بن جایا کرے کیونکہ لنگڑے کی اولاد میں ہے اور اگر باپ آنکھوں کے حافظ جی ہوں تو لڑکا بھی حافظ ہو یعنی اندھا۔ کیونکہ عرف میں ہر اندھے کو حافظ ہی کہتے ہیں۔

دڑکی میں ایک مستری حافظ تھا۔ وہ ایک دفعہ بازار میں کو جا رہا تھا تو ایک بنئے نے پکارا اجی ہانج جی (حافظ جی) یہاں آئیو۔ دوسرے بنئے نے کہا کہ اس کو تو دیکھے ہے اس نے جواب دیا یہ او سا ہانج نہیں یہ کران کا ہانج ہے (یعنی ویسا حافظ نہیں جیسا تم سمجھے بلکہ قرآن کا حافظ ہے ۱۲) میں نے اس وقت اسی اصطلاح کو استعمال کیا ہے تو چاہئے کہ کسی کا باپ اندھا کانا ہو تو اولاد بھی آنکھیں پھوڑ لیا کرے تاکہ میراث باقی رہے مگر ان باتوں میں کوئی میراث کا دعویٰ نہیں کرتا۔ ہاں قضا اور خطابت میں میراث چلتی ہے۔

مشیخت کی میراث

اسی طرح آجکل سجادہ نشینی بھی میراث ہو گئی ہے چاہے گدی پر گدھے ہی بیٹھیں۔ اور تماشا ہے کہ کبھی تو مشائخ مریدوں کے سر پہ خلافت کی پگڑی باندھتے تھے۔ آج کل مرید مشائخ کو خلافت کی پگڑی دیتے ہیں کہ جہاں پیر کا انتقال ہوا اور مریدوں نے اس کے بیٹے کو گدی پر بٹھلا کر خلافت کی دستار دیدی بس اب وہ سب کے پیر ہو گئے۔

ہمارے حاجی صاحب نے اس گدی نشینی کی رسم کو بالکل مٹا دیا چنانچہ حاجی صاحب کی گدی پر کوئی نہیں ہے بلکہ ان کی گدی ایک گنگوہ میں تھی ایک دیوبند میں تھی (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) اور ایک کہیں ایک کہیں۔ میں کہتا ہوں

کہ اس میں زیادہ شان ہے کہ ایک شخص کی گدیاں جا بجا ہوں - یہ کچھ نہیں کہ ایک ہی گدی ہو۔

سو خوب سمجھ لو کہ یہ چیزیں میراث کا محل نہیں مجھ سے میرے قصبہ والوں نے ایک بار جمعہ کی مستقل امامت قبول کرنے کے لیے کہا تھا تو میں نے چند شرطوں کے بعد قبول کیا تھا۔ ایک یہ کہ امامت میرا حق نہ ہوگی - دوسرے میں پابند نہ ہوں گا۔ جب چاہوں گا چھوڑ دوں گا اس کے بعد میں نے اعلان کر دیا کہ میں لوگوں کے اصرار سے امامت کرتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ یہ میرا حق نہ ہوگا نہ اس میں وراثت چلے گی اور جس وقت کسی ایک شخص کو بھی میری امامت ناگوار ہو چاہے وہ جلاہا یا قصائی ہی کیوں نہ ہو وہ ڈاک میں ایک کارڈ پر اتنا لکھ کر میرے نام ڈال دے کہ ہم کو تیری امامت ناگوار ہے۔ بس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک جلاہا بھی منع کر دیگا تو اسی روز سے امامت چھوڑ دوں گا۔

یہ انتظام کر کے پھر میں نے امامت کی کیونکہ اب وراثت کا خطرہ نہ رہا تھا پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے خود ہی چھوڑ دی۔ غرض آجکل امامت کی طرح گدی نشینی بھی میراث ہو گئی ہے اور بعض لوگ ایسی گدی کی تعظیم کرتے ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ بس اسی میں سب کچھ ہے یہ سب رسم پرستی ہے ان لوگوں میں ایک اور رسم دیکھی گئی کہ گدی نشینی کے بعد خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے ـــــ میں بھاگل پور گیا تو ایک سجادہ نشین کی نسبت سنا کہ وہ چالیس سال سے خانقاہ سے علیحدہ نہیں ہوئے اور ان کے مرید اس بات کو فخر کے طور پر بیان کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ کیا وہ مستورات ہیں۔ مرد تو وہ ہے جو شمشیر برہنہ لئے پھرے۔ ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا مردانگی نہیں البتہ کوئی معذور ہو یا کوئی ضروری مصلحت مقتضی ہو تو اور بات ہے پھر اس التزام کے بعد اگر کبھی سجادہ صاحب کی عدالت میں طلبی ہو گئی تو اس کی کوشش

کی جاتی ہیں کہ کسی طرح سجادہ صاحب کو حاضری عدالت سے مستثنیٰ کرایا جائے کیونکہ آج کل کے مشائخ عدالت کی حاضری کو بھی عیب سمجھتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں عیب یا ذلت کی کیا بات ہے کانپور میں ایک مقدمہ چل رہا تھا کسی طرح طے ہی نہ ہوتا تھا۔ حاکم نے کہا کہ بہتر یہ ہے تم کسی کو حَکم بنا کر فیصلہ کرالو پھر اس فیصلہ کو عدالت کی طرف سے نافذ کر دیا جائیگا۔ فریقین حکم بنانے پر راضی ہوگئے اس کے بعد عدالت کی طرف سے کئی علماء کا نام لیا گیا۔ مگر کسی پر دونوں فریق کا اتفاق نہ ہوا پھر میرا نام لیا گیا تو دونوں راضی ہوگئے۔ بالآخر میرے نام سمن آیا۔ اور مجھے شہادت کے لیے عدالت میں بلایا گیا تو اس وقت بعض دوستوں کا یہ خیال تھا۔ کہ عدالت میں جانا ذلت ہے۔ میں نے کہا اس میں ذلت کی کیا بات ہے۔ بلکہ یہ تو عزت کی بات ہے کہ ہماری شہادت پر ایک مقدمہ کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ میں گیا اور میرا بیان ہوا اور میری شہادت پر اٹھارہ[۱۸] سال کا مقدمہ طے ہوگیا۔

اسی طرح ایک دفعہ میں بریلی گیا تو وہاں کے جنٹ نے مجھ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ کیونکہ اسکو اہل علم سے ملنے کا شوق تھا۔ اس وقت بھی بعض دوستوں کی یہ رائے تھی کہ جنٹ صاحب مکان پر آئیں اسمیں عزت ہے اور خود جانے میں ذلت ہے مگر میں نے سوچا کہ اگر وہ یہاں آیا تو ہم کو اس کی تعظیم و استقبال کرنا پڑے گا اور اگر میں جاؤں گا تو وہ میری تعظیم و استقبال کریگا پھر میں خود گیا اور جنٹ نے نہایت عزت سے تعظیم و استقبال کیا۔ یہ جواب تو دوستوں کے مذاق پر تھا ورنہ اصل بات یہ ہے کہ خدا نے اُن کو حکومت دی ہے ہمارے اوپر حاکم بنایا ہے مجھے شرم آتی ہے کہ حاکم کو محکوم بناؤں اور اُس کو اپنے یہاں بلاؤں۔ جب خدا نے ایک شخص کو ہم پر حاکم بنایا ہے تو ادب تکوین کا مقتضا یہ ہے کہ ہم اُس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو محکوم کو حاکم کے ساتھ کرنا چاہیئے اسلیے جب کوئی حاکم مجھ سے

ملنا چاہتا ہے تو میں خود جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر آجکل رسم کا غلبہ ہے لوگ اسکو ذلت سمجھتے ہیں۔

اصل مضمون گدی نشینی اور قضا میں میراث چلنے کے متعلق تھا۔ اُسکی ایک خرابی یہ ہے کہ ہندو ریاست میں ایک مقام پر کوئی قاضی صاحب ایک بنئے کے مقروض ہو گئے اُس نے نالش کر دی تو جہاں قاضی صاحب کی زمین وغیرہ قرق ہوئی وہاں خطابت کی آمدنی بھی قرق ہو گئی کیونکہ عید بقرعید کو قاضی صاحب کی آمدنی ہوتی تھی۔ راوی کہتے تھے کہ انہوں نے ایک سال یہ دیکھا کہ سب لوگ کپڑے بدل بدل کر عیدگاہ میں پہنچتے رہے اور امام صاحب کے منتظر ہیں۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک لالہ صاحب دھوتی باندھے ہوئے آرہے ہیں اُس کے آتے ہی لوگوں میں شور ہوا کہ امام صاحب آگئے۔ میں بڑا حیران کہ یا اللہ! یہ کیسا امام ہے کیا بنیا عید کی نماز پڑھائے گا۔ اب وہ بنیا آکر سلام کرکے ممبر پہ کھڑا ہو گیا اور کہا صاحبو! اجازت ہے لوگوں نے کہا جی ہاں اجازت ہے اس کے بعد اُس نے کپڑا بچھا دیا۔ اور لوگوں نے روپیہ پیسہ ڈالنا شروع کیا، جب سب دے چکے تو اُس نے رقم کو جوڑا اور بہی میں لکھ لیا کہ اس سال عید کو اتنی آمدنی وصول ہوئی پھر پوٹلہ باندھ کر گردن پر رکھا اور کہا صاحبو! اجازت ہے لوگوں نے کہا اجازت ہے وہ سلام کرکے اپنے گھر کو چل دیا۔ اور اسکے بعد لوگ بھی اپنے اپنے گھر چلے گئے نہ نماز تھی نہ خطبہ انہوں نے پوچھا کہ میاں کیا عید کی نماز نہ ہو گی، تب لوگوں نے قصہ بیان کیا کہ امام صاحب اس بنئے کے مقروض ہیں۔ عیدین کی آمدنی بھی اسنے قرق کرالی ہے اس لیے امام صاحب کئی سال سے نہیں آتے ہم لوگ بدستور آجاتے ہیں اور یہ بنیا آمدنی لے جاتا ہے کئی سال سے نماز نہیں ہوتی۔

قضا میں موروثیت

یہ نتیجہ ہے امامت اور قضا کی موروثیت کا کہ ہندو بھی اس کی آمدنی قرق کرانے لگے۔ ایک خرابی اس موروثیت میں یہ ہے کہ بزرگوں کے نام کی آمدنی رنڈی بھڑووں میں صرف ہوتی ہے۔ ہزاروں اوقاف آجکل برباد ہو رہے ہیں کیونکہ بزرگوں کی خانقاہوں کے لیے جو آمدنی وقف تھی اس گدی نشینی کیوجہ سے اُن کی اولاد ہی اس کی متولی ہوتی ہے خواہ وہ لائق ہوں یا نالائق۔ پھر تولیت سے گذر کر ملکیت کا دعویٰ ہونے لگا اور اس طرح ہزاروں اوقاف برباد ہو گئے۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ جلال آباد والوں کو دین کے معاملہ میں تکبر اور اینٹھ مروڑ نہیں ہے۔

ہمارے قصبہ کی یہ حالت نہیں وہاں کے شیخ زادوں کے دماغ بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہاں یہ خوبی ہے کہ اب تک عید کا امام موروثی چلا آرہا ہے اور جب کوئی واقعہ ہوتا ہے فوراً مسئلہ دریافت کرنے آتے ہیں۔ چنانچہ یہاں ایک واقعہ اس اختلاف سے پہلے اتفاق واتحاد کا بھی ہوا تھا جس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک عورت مسلمان ہوئی تھی۔ بعض لوگوں کو اتفاق واتحاد کی وجہ سے اس کے خاوند پر رحم آیا کہ بے چارہ اکیلا رہ گیا۔ اسلیے یہ چاہا کہ اُسکی بیوی اُسی کو واپس دیدی جائے۔ گو یہ اتفاق مذموم تھا کیونکہ اس میں ایک مسلمان عورت کو کافر بنایا جاتا ہے مگر پھر بھی مسئلہ پوچھنے تو آئے اور جن لوگوں نے مسلمان عورت کو پہلے خاوند کے سپرد کردینے کی .... کوشش کی تھی۔ چونکہ وہ ظاہر میں ایک مسلمان کے کفر سے راضی تھے اسلیے مسئلہ کی رُو سے ان کی تجدید ایمان وتجدید نکاح کی ضرورت ظاہر تھی اور میں نے مسئلہ ظاہر بھی کردیا مگر چونکہ وہ لوگ حکم شرعی پوچھنے آئے تھے اسلئے ایسے موقع پر میری عادت ہے کہ حتی الامکان اس کی رعایت کرتا ہوں کہ سائل پر سختی اور تنگی نہ ہو کیونکہ تجدید نکاح کو عام لوگ رسوائی سمجھتے ہیں اسلئے میں نے اظہار مسئلہ کے ساتھ یہ بھی

کہہ دیا کہ تجدید ایمان تو علی الاعلان ہونا چاہیئے پھر اعلان کے لیے اسکی ضرورت نہیں کہ باقاعدہ کسی کے پاس مسلمان ہونے جاؤ۔ بلکہ دو چار آدمیوں کے سامنے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ زور سے کہہ دینا اور اُس اپنی غلطی پر اظہار ندامت کافی ہے اور نکاح کی تجدید میں اعلان عام کی بھی ضرورت نہیں نہ خطبہ کی ضرورت ہے نہ قاضی کی۔ نہ پانچوں کلموں کی۔ بلکہ کسی خاص مجلس میں دو آدمیوں کے سامنے ایجاب قبول کر لیا جائے۔ گو آجکل عوام کے خیال میں بدوں خطبہ اور کلموں کے نکاح نہیں ہوتا۔ مگر یہ غلط خیال ہے شرعًا دو گواہوں کے سامنے ایجاب قبول کر لینا کافی ہے لیکن یہ غلط عقیدہ عوام میں ایسا رائج ہوا ہے کہ بدوں خطبہ اور کلموں کے نکاح پڑھانے پر ہرگز راضی نہیں ہوتے۔

ہمارے مدرسہ کانپور میں ایک طالب علم تھے۔ مولوی فصیح الدین ایک دفعہ محلہ کے لوگوں نے اُن سے نکاح پڑھنے کو کہا وہ گئے مگر خطبہ یاد نہ تھا وہ بدوں خطبہ کے ایجاب قبول کرانے لگے۔ لوگوں نے خطبہ کا مطالبہ کیا وہ کہنے لگے خطبہ سُنّت ہے کوئی شرطِ نکاح نہیں مگر لوگ ہرگز راضی نہ ہوئے اور کسی مسجد کے مُلّا سے نکاح پڑھوالیا جسے خطبہ یاد تھا۔ اُس روز سے میں نے جامع العلوم کانپور کے مدرسہ میں یہ قانون کر دیا تھا کہ جب تک طالب علم کو خطبۂ نکاح اور ایک خطبہ جمعہ کا اور جنازہ کی نماز اور دعائے قنوت حفظ یاد نہ ہو اُس وقت تک داخل نہ کیا جائے۔ کیونکہ گو ان میں بعض باتیں تو زیادہ ضروری نہیں مگر ان کے یاد نہ ہونے سے عوام میں ہنسائی ہوتی ہے۔ بعض جگہ نکاح کے وقت پانچوں کلمے پڑھائے جاتے ہیں اگر کسی دولہا کو یاد نہ ہوں تو بڑی رسوائی ہوتی ہے۔

چنانچہ میرٹھ میں ایک لوہار کے لڑکے کا نکاح ہونے والا تھا اور اُس کو سب کلمے یاد نہ تھے وہ بڑے پریشان ہوئے ایک مختار صاحب اُس کے دوست تھے

اُن سے کہا کہ میں اس پریشانی میں گرفتار ہوں مختار صاحب نے کہا کہ اسکی کچھ ضرورت نہیں بے فکر رہو کہا یہ تو درست ہے مگر جب قاضی کلمے پڑھوائے گا اُس وقت رُسوائی تو ہو گی کہا میں قاضی کا ایسا علاج کروں گا کہ وہ بھی یاد رکھیں گے۔ چنانچہ نکاح کے وقت جب قاضی صاحب نے دولہا سے کلمے پڑھنے کو کہا تو مختار صاحب بولے کہ قاضی صاحب بہتر یہ ہے کہ آپ خود پڑھتے جائیں اور ساتھ میں یہ بھی کہتے جائیں کیونکہ کلمہ کا معاملہ ہے کہیں ان میں غلطی کرنے سے کفر وغیرہ نہ ہو جائے۔ وہاں قاضی صاحب بھی کورے تھے ان کو بھی کلمے یاد نہ تھے۔ کیونکہ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ کہ دولہا پہلے سے کلمے یاد کرکے آتا۔ اور قاضی صاحب کے کہنے سے پڑھ دیا کرتا تھا کبھی اُن کو خود پڑھنے پڑھانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اسلیے بے فکر تھے کہ مجھے یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے غالباً مختار صاحب کو یہ راز معلوم ہو گا اسلیے انہوں نے یہ چال چلی۔ اب قاضی صاحب بڑے گھبرائے کہ آج تو میں بُری طرح پھنسا کہنے لگے کہ پھر کلموں کی ضرورت ہی کیا ہے مختار صاحب نے اصرار شروع کیا کہ نہیں صاحب ہمیشہ سے بزرگوں کا یہی دستور چلا آرہا ہے کلمے ضرور پڑھائیے۔

اب قاضی صاحب تو ٹالنا چاہتے اور یہ اصرار کرتے۔ آخر کار ایک ہی کلمہ پڑھا کر قاضی صاحب نے خطبہ شروع کر دیا۔ اور نکاح پڑھ کر وہاں سے جلدی سے بھاگے کہ مبادا یہاں اعتراض ہونے لگے۔ غرض نکاح میں اعلان تو قاضی کے بلانے اور خطبہ پڑھنے اور کلمہ پڑھنے سے ہوتا ہے اور اگر یہ قیود نہ ہوں تو پھر چُپکے سے دو آدمیوں کے سامنے بھی نکاح ہو سکتا ہے اس لیے میں نے کہدیا کہ قاضی اور چھوارے اور خطبہ اور کلمہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ خفیہ طور پر دو آدمیوں کے سامنے نکاح کی تجدید کر لی جائے اور یہ میں نے اسلیے کہہ دیا کہ بعض دفعہ تجدید نکاح سے ہنسائی ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دیکھو یہ آج دولہا بنے ہیں کوئی کہتا ہے ان کا نکاح ٹوٹ گیا تھا

اس لیے دوبارہ نکاح جوڑا گیا۔ پھر عورتیں الگ، بیوی پر ہنستی ہیں کہ دیکھو بڑھاپے میں یہ دولہن بنی ہیں کوئی کہتی ہے کہ لال جوڑا تو پہن لیا ہوتا۔ مہندی تو لگالی ہوتی۔

سید حسن رسول نما کی کرامت

اس ہنسائی پر مجھے ایک حکایت یاد آئی دہلی میں ایک بزرگ تھے سید حسن رسول نما ان کی یہ کرامت تھی کہ بیداری میں جس کو چاہتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرادیا کرتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ قید بھی تھی کہ دو ہزار روپے لیا کرتے تھے مجھے اول اس سے دنیا طلبی کا شبہ ہوا تھا کہ یہ تو دنیا دار معلوم ہوتے ہیں۔ پھر یہ خیال ہوتا کہ اگر دنیا دار ہیں تو ان کو اتنی بڑی کرامت کیونکر حاصل ہو گئی مگر ؎

درنیابد حال پختہ ہیچ خام ۔ ٭ پس سخن کوتاہ باید والسلام

کامل کا حال ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر یہ شبہ ایک حکایت سے رفع ہوا وہ یہ کہ میں نے حاجی صاحب سے سنا کہ ایک دفعہ ان بزرگ کی بیوی نے درخواست کی کہ تم غیروں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کراتے ہو مجھے بھی کرادو۔ میرا تم پہ زیادہ حق ہے فرمایا لاؤ دو ہزار روپے۔ کہا میرے پاس دو ہزار روپے کہاں۔ ہاں یہ صورت ہوسکتی ہے کہ تم مجھ کو دیدو پھر میں تم کو دیدوں گی۔ فرمایا اس سے کیا ہوتا ہے وہ بے چاری مایوس ہونے لگیں تو فرمایا اچھا تمہارے لیے ہم ایک اور صورت نکالتے ہیں وہ یہ کہ تم دولہن بنو۔ کہا بھلا بڑھاپے میں دولہن بنا کر کیا میرا مذاق کروگے فرمایا پھر نہ بنو تم نے ہی درخواست کی تھی ہم نے اس کی آسان ترکیب بتادی اگر تم سے نہیں ہوسکتا نہ کرو جب وہ سمجھ گئیں کہ یہ بدون اسکے زیارت نہ کرائیں گے تو وہ دولہن بننے پر راضی ہوگئیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر مسلمان کو عشق ہے اور یہ عشق سب کچھ کرا دیتا ہے ؎

عشق دانا زم کہ یوسف ابا ز آورد ٭ ہمچو صنعا زاہدے از زنار آورد

وہ بے چاری بڑھاپے میں دولہن بنیں اور لال جوڑا پہن کر سر سے پیر تک زیور سے

آراستہ ہوئیں۔ ہاتھوں کو مہندی لگائی۔ اور دولہن کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئیں جب سب کچھ کر چکیں تو سید صاحب وہاں سے اٹھ کر اپنے سالے کے پاس آئے کہ ذرا یہاں آ نا تم کو ایک تماشا دکھاؤں اور گھر میں بلا کر کہا کہ دیکھئے آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کو کیا دن لگے ہیں۔ بڑھاپے میں آپ کو دولہن بننے کا شوق ہوا ہے بھائی تو لاحول پڑھ کر چلے گئے بھائی کے دیکھ لینے سے ان بی بی پر اتنا رنج وغم طاری ہوا کہ بے چاری روتے روتے بے ہوش ہونے کے قریب ہوگئیں کہ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ میرا فضیحتا ہوگا جب رونے روتے ان کا برا حال ہوگیا تب ان بزرگ نے توجہ کی اور اسی رنج وغم کی حالت میں بی بی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوگئی۔ حضورؐ کی زیارت سے ان کا رنج وغم سب جاتا رہا۔ اور دل پر سرور کا غلبہ ہوگیا۔ تب بزرگ نے فرمایا کہ بی بی میں تم سے معافی چاہتا ہوں کہ تم کو مجھ سے تکلیف پہنچی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کیا یہ سب تمہاری درخواست پوری کرنے کی تدبیر تھی۔ بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بیداری میں ہو جانا ایک قسم کا کشف ہے اور کشف کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے اور باقاعدہ مجاہدہ کے لیے تو زمانہ دراز چاہیئے۔ میں نے یہ سوچا کہ کوئی فوری مجاہدہ ایسا ہونا چاہیئے جس سے دل پر گرانی سخت ہو تو میں نے دیکھا کہ مال خرچ کرنے سے دل بہت دکھتا ہے اسلئے میں نے مالی مجاہدہ تجویز کیا اور اس کی مقدار بھی اتنی رکھی ہے جس کا خرچ کرنا ہر شخص کو دکھتا ہے یعنی دو ہزار روپے جو شخص اتنی بڑی رقم اپنے ہاتھ سے نکالتا ہے اس کا دل ویسا ہی شکستہ ہو جاتا ہے جیسا کہ باقاعدہ مجاہدے ہوتا ہے اسی لیے میں دو ہزار روپے لے کر زیارت کراتا ہوں پھر جب تم نے درخواست کی تو میں نے دیکھا کہ مالی مجاہدہ تم کو نافع نہ ہوگا کیونکہ تم جو کچھ دو گی وہ میرا ہی دیا ہوگا پھر میرے پاس آکر بھی وہ تمہاری ہی چیز ہوگی۔ میاں بی بی میں کونسی بانٹ کی ہے اسی لیے میں نے تمہارے لیے مجاہدہ کی یہ صورت تجویز کی کہ تم دولہن بنو اور دو چار میں...

تمہاری ہنسائی ہو جس سے تمہارے دل پر چوٹ لگے تب تم زیارت کشفیہ کے قابل ہوگی۔
واقعی ہے

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　بس سخن کوتاہ باید والسلام

اب معلوم ہوا کہ اُن کے دو ہزار روپے لینے میں کیا حکمت تھی سو چونکہ بڑھاپے میں کسی عورت کے دولہن بننے سے اُس کی ہنسائی ہوتی ہے اس لیے میں نے نکاح کے اعلان کو ضروری قرار نہیں دیا۔ ہاں اول دفعہ جب کسی عورت کا نکاح مرد سے ہو اس میں تو اعلان ہونا چاہیئے اور خفیہ نکاح کرنا بہت سے مفاسد پیدا کرتا ہے مگر پھر کسی ضرورت سے اگر ان دونوں میں تجدید نکاح کی ضرورت ہو تو اب اعلان کرنا لازم نہیں (بلکہ عجب نہیں کہ اس وقت تو اخفاء ہی لازم ہو کیونکہ اس وقت اعلان نکاح سے فی الجملہ معصیت کا اظہار ہوگا لوگ سمجھیں گے کہ ان میاں بی بی میں سے کسی نے کوئی کلمہ کفر کا کہدیا ہوگا یا طلاق دی گئی ہوگی کہ وہ بھی منکر ہے وغیرہ وغیرہ اور اظہار منکر جائز نہیں ۱۲) بہرحال فساد ذات البین کے یہ مفاسد ہیں جن سے دین بھی برباد ہوتا ہے اور دنیا کا لطف بھی خاک میں مل جاتا ہے۔

اختلاف سے قلب پر ظلمت

اور ایک مفسدہ یہ ہے کہ اختلاف سے قلب پر ظلمت چھا جاتی اور زنگ لگ جاتا ہے جس کو قرآن مجید میں رین فرمایا ہے کَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ - اور حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے اُس کے قلب پر ایک سیاہ نکتہ یعنی دھبہ لگ جاتا ہے پھر جتنی معصیت بڑھتی ہے اتنا ہی وہ نکتہ بڑھتا ہے اور اگر توبہ کی توفیق ہو جائے تو وہ نکتہ سیاہ قلب سے دھل جاتا ہے مگر عداوت میں توبہ کی بھی توفیق کم ہوتی ہے اسلئے ہر شخص اُس میں ترقی ہی کرتا چلا جاتا ہے اور اس اصرار سے وہ نکتہ اتنا بڑھتا ہے کہ بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے

اسی اصرار کی نسبت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کَانُوْا لَا یَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ ۔ یعنی اُن پر عذاب شدید اس لیے آیا کہ وہ کسی بُرے کام سے جس کو ایک دفعہ کر لیا ہو باز نہ آتے تھے ۔ مولانا اُس حدیث کا گویا ترجمہ فرماتے ہیں ؎

ہر گنہ زنگے ست بر مرآۃ دل ۔ دل شود زیں زنگ ہا خوار و خجل

چوں زیادت گشت دل را تیرگی نفس دوں را بیش گردد خیرگی

اور گناہ کی ایسی ظلمت ہے کہ دنیا میں بھی دل کے اندر محسوس ہوتی ہے اور اگر کبھی ہم کو اس ظلمت کا احساس نہ ہو تو وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم کو نور کا احساس نہیں ہوا اور اسکے احساس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی عمر میں سے زیادہ نہیں صرف تین ہی دن ایسے نکال لیجئے جن میں کوئی کام خلاف شرع نہ کیا جائے ۔ بلکہ ان دنوں کو اللہ کی یاد میں اور قرآن کی تلاوت میں گذارا جاوے اس وقت قلب میں ایک خاص کیفیت ہوگی وہ نور ہے اسکے بعد ہم اپنی عادت کے موافق پھر وہ ورد وہ ہو ہی جائیں گے اس سے ایک کیفیت پیدا ہوگی اور وہ ظلمت ہے ۔ اس واقعہ میں چونکہ نور کا احساس ہو چکا ہے اب گناہ کا احساس ہوگا اور ایسا معلوم ہوگا کہ گویا دل میں سے کوئی چیز نورانی نکل رہی ہے اور اس کی جگہ ظلمت اور تاریکی پیدا ہو رہی ہے ۔

صاحبو! اگر ہمیشہ کے لیے ایسے نہ بن سکو تو امتحان کے لیے تین دن تو ایسے بن جاؤ اس سے کم از کم یہی نفع ہوگا کہ آپ کو ظلمت و نور کا احساس تو ہو جائیگا پھر اختیار ہے چاہے نور کو اختیار کر لو چاہے ظلمت کو ۔ مگر خدا کے لیے ایک دفعہ دونوں کی حقیقت سے تو آشنا ہو جاؤ امتحان ہی کے طور پر سہی ۔ مولانا نے اسی امتحان کی ترغیب دی ہے فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دل خراش آزموں را یک زمانے خاک باش

در بہاراں کے شود سر سبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

صاحبو! احباب نے اس واقعہ کے شروع میں جس پریشانی کا ذکر کیا تھا وہ گناہوں ہی کی ظلمت سے پریشانی تھی کیونکہ جیسے کبھی اپنے گناہوں سے پریشانی ہوا کرتی ہے ایسے ہی دوسروں کے گناہوں سے بھی پریشانی ہوا کرتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہو ہوگیا تو بعد نماز کے آپ نے فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ وضو اچھی طرح کر کے نہیں آتے جس سے امام کو نماز میں سہو ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ گنہگار کے گناہ کا اثر بے گناہوں پر بھی پہنچتا ہے ہائے یہ گنہگار ہر اک کو پریشان کرتا ہے اپنے کو بھی اور دوسروں کو بھی ہے

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند از سخنہا عالمے را سوختند

واقعی کلمات کفر اور معاصی سے ایک عالم میں آگ لگ جاتی ہے مگر اس آگ کا احساس قلوب کو ہوتا ہے اجسام کو نہیں ہوتا۔ اور قاعدہ ہے کہ ہر مرض کا علاج بالضد ہے تو گناہ کا علاج توبہ ہے پس توبہ کرنا چاہیئے اس سے پریشانی اور ظلمت دفع ہو جائیگی

خلاصۂ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ اس واقعہ میں لوگوں سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں کسی کی زبان سے کلمۂ کفر نکلا ہے کسی سے معاصی ہوئے ہیں اُن سے توبہ کریں اور کلمات کفر کہنے والے تجدید ایمان و تجدید نکاح بھی کریں اور معاصی سے آئندہ کو اجتناب کریں گو ہم گنہگار تو ہر وقت ہیں مگر یہ توبہ کی سیاہی تو ایک دفعہ زائل ہو جائے پھر اگر گناہ ہوگیا اس کا پھر بھی علاج ہے۔ اس وقت میں نے پریشانی کے دفع کرنے اور راحت حاصل کرنے کا طریقہ بتلادیا اب اس کا استعمال کرنا اُن حضرات کا کام ہے جو ان افعال کے مرتکب ہوئے ہیں یا ان کی خیر خواہوں کا کام ہے کہ سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے اُن کو سمجھائیں کہ بھائی توبہ و استغفار کر لینے میں کیا حرج ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو توبہ کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولٰنا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین تمت بحمد اللہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات

الوعظ

المسمّٰی بہ

الانسداد للفساد

حافظ سخاوت علی
صاحب کے مکان کے صحن میں جو کہ مظفر
نگر میں واقع ہے۔ ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ
کو تین گھنٹہ تک کرسی پر بیٹھ کر اتفاق کی خوبیاں اور اسکے اسباب حدود اور
شرائط و قیود نیز نا اتفاقی کے مفاسد کے بارے میں فرمایا ۔۔۔ مولانا ظفر احمد
صاحب عثمانی مرحوم نے قلم بند فرمایا ۔۔۔ سامعین کی تعداد عورتوں کے
علاوہ تقریباً پانچ سو تھی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم امّا بعد فقد قال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم وفساد ذات البین فانھا ھی الحالقۃ لا اقول تحلق الشعر ولکن تحلق الدین

تمہید یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موقعہ پر اسکے بیان کا ارادہ تھا اور یہاں کے لیے کوئی دوسرا مضمون بیان کرنے کا قصد تھا۔ مگر وہاں بیان کا اتفاق نہ ہوا اس لیے اس وقت اسی حدیث کو اختیار کر لیا ہے۔ تاکہ دوسرا مضمون اور دوسری حدیث تلاش نہ کرنا پڑے اور پہلے موقعہ کے لئے اسکے اختیار کی اصل وجہ یہ تھی کہ حق تعالیٰ نے یہ مضمون دل میں ڈالا تھا کیونکہ آج کل اس کی سخت ضرورت ہے یوں تو ہر مرض کے متعلق علاج کی ضرورت ہے مگر جس خاص مرض کی وبا کے زمانہ

میں کثرت ہوتی ہے اسکی علاج و دوا کا خاص اہتمام ہوتا ہے اگر وبا کا زمانہ ہو تو پھر کسی مرض کے علاج کے لیے کوئی خاص مرجح نہیں ہوتا۔ بلکہ جتنے امراض لوگوں میں موجود ہوں ان میں سے ہر مرض یہ چاہتا ہے کہ میرا علاج بھی کیا جائے اور علاج کا طریقہ بیان کیا جاوے لیکن جب کسی خاص کا شیوع ہو تو اب اس کے بیان کے لیے کسی مرجح کی ضرورت نہیں اس کا شیوع خود مرجح ہے پس جس طرح امراض جسمانی میں شیوع و عدم شیوع سے تفاوت ہوتا ہے اسی طرح امراض... نفسانی میں بھی کثرت مرجح ہو جاتی ہے جس مضمون کو میں نے اس وقت اختیار کیا ہے اسکے لیے یہی امر مرجح کافی ہے کہ اس میں جس مرض کے مفاسد پر متنبہ کیا گیا ہے آجکل اس کی بہت کثرت ہے اور آجکل سے مراد صرف یہی زمانہ حاضرہ نہیں بلکہ قریب دو تین سال سے اس کا شیوع ہو رہا ہے۔

ابتداءِ نزاع

اور اصل بنیاد تو اس کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعۂ قتل سے پڑی ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب میری امت میں تلوار نیام سے باہر ہو جائے گی تو پھر قیامت تک نیام میں نہ ہوگی۔ علماء سلف نے تصریح کی ہے کہ اس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے ہوئی ہے یہ پہلا واقعہ ہے کہ جس میں مسلمانوں کے اندر اختلاف و نزاع پیدا ہوا اس کے بعد پھر اختلاف بڑھتا ہی گیا کبھی کبھی انیس بیس کا تو فرق ہوا مگر استیصال کبھی نہیں ہوا تو یہ مرض اسلئے بھی اشد ہے کہ بہت پرانا ہے اور ظاہر ہے کہ پرانا بخار دق بن کر ہلاکت تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔ نیز یہ اس واسطے بھی سخت ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے تین دعائیں کی تھیں ایک یہ کہ میری امت قحط عام سے ہلاک نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ مخالفین کا ان پر غلبۂ عام نہ ہو جس سے مسلمانوں کا استیصال ہو جائے۔ تیسرے

یہ کہ مسلمان آپس میں نہ لڑیں۔ پہلی دونوں دعائیں قبول ہوئیں۔ اور بحمد اللہ آج تک برابر ان دونوں بلاؤں سے یہ اُمّت محفوظ ہے نہ اس پر قحط عام ہوتا ہے نہ مخالفین کا عام غلبہ ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کسی خاص مقام پر مسلمان مغلوب ہوں لیکن کسی دوسرے مقام پر مسلمانوں کا غلبہ بھی ہوتا ہے اور غلبہ نہ بھی ہو تو استیصال تو مسلمانوں کا قیامت نہ ہو سکے گا۔ بلکہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں مسلمان مغلوب بھی ہیں وہاں بھی اسلام کو روز بروز ترقی ہے بہت سے کافر آئے دن اسلام میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دعا کی برکت ہے تاکہ مسلمانوں کا استیصال نہ ہو جائے۔ مگر تیسری بات کے متعلق حدیث میں آتا ہے فمنعنیہا یعنی یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ اسلئے یہ مرض اور بھی سخت ہے کیونکہ اسکے متعلق دعا قبول نہ ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ مرض مسلمانوں میں باقی رہے گا۔ اس کا استیصال نہ ہوگا۔ پس اس کے علاج کی طرف ہر وقت توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ مادہ تو موجود ہی ہے۔ ذرا سی غفلت میں اسکے بڑھ جانے کا خطرہ ہے۔ ؏

؏ بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جس قوم نے مسلمانوں کے استیصال کا قصد کیا حق تعالیٰ نے اسی کو اسلام کا خادم اور حامی بنا دیا۔ چنگیز خاں نے اس کا ارادہ کیا تھا اور خلافت بغداد کو تاراج کیا تھا حق تعالیٰ نے اسی کی اولاد کو اسلام کا حلقہ بگوش کر دیا۔ اس سے پہلے فارسیوں نے اس کا ارادہ کیا تھا وہ بھی سب مسلمان ہو گئے ہرقل نے گو مقابلہ تو مسلمانوں کا کیا مگر استیصال کا ارادہ نہ کیا تھا۔ بلکہ ہر موقع پر اپنی قوم کو اسلام کی ترغیب دلاتا رہا۔ اسلئے اس کا کچھ ابتیہ موجود ہے پس ہم کو کسی کے اس ارادہ سے رنج نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکے اسلام لانے کی امید قوی ہو جاتی ہے۔ ۱۲ ظ۔

؏ یہ مضمون بہت عجیب ہے اہل علم غور سے دیکھیں۔ ۱۲ ظ۔

نااتفاقی کی پیشین گوئی

شاید کوئی کہے کہ جب حدیث میں پیشین گوئی آچکی ہے کہ یہ باہمی نااتفاقی کا مرض زائل نہ ہوگا تو پھر علاج کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی پیشین گوئی کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ طبیب کو کسی مریض کی بابت معلوم ہوجائے کہ یہ پرہیز نہ کرے گا۔ اسلیے پیشین گوئی کردے کہ یہ بیمار اچھا نہ ہوگا۔ مگر اس کی بدپرہیزی کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اچھا نہ ہوگا۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ مرض خود لاعلاج ہو جیسے دق جو درجہ چہارم میں پہنچ جائے۔ سو یہاں پیش گوئی دوسری صورت کی نہیں بلکہ پہلی صورت کی ہے تو اس سے مرض کا لاعلاج ہونا اور علاج کا غیر نافع یا غیر ضروری ہونا لازم نہیں آتا اور وجہ اس پیشین گوئی کی دوسری صورت نہ ہونے کی یہ ہے کہ یہ تقسیم امراض۔۔ جسمانی ہی کے ساتھ خاص ہے کہ ان میں بعضے خود لاعلاج ہوتے ہیں اور بعضے بدپرہیزی سے خطرناک ہوجاتے ہیں امراض نفسانی میں یہ تقسیم ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہاں سب امراض قابل علاج ہیں لاعلاج کوئی نہیں۔ بلکہ ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امراض جسمانیہ بھی فی نفسہ لاعلاج کوئی نہیں۔

ابوداؤد ترمذی کی حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَمْ یَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَہٗ دَوَاءً غَیْرَ دَاءٍ وَّاحِدٍ وَّھُوَ الْھَرَمُ۔ خدا تعالٰے نے کسی مرض کو پیدا نہیں کیا مگر اس کے لیے دوا بھی پیدا کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مرض جسمانی بھی قابل علاج ہے باقی جو ظاہراً اس پہ اشکال ہوتا ہے کہ پھر بعضے مریض مایوس العلاج کیوں ہوتے ہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مرض کے ہمارے نزدیک لاعلاج ہونے سے اس کا فی نفسہ لاعلاج ہونا لازم نہیں۔ ممکن ہے کہ خدا تعالٰی نے اس کی دوا پیدا کی ہو مگر ہمارے علم میں نہ آئی ہو۔ پس ممکن ہے کہ دق کے

لئے بھی علم الٰہی میں اور واقع میں کوئی دوا ہو جو ہم کو نہیں معلوم ہوئی اسلئے ہم اس کو لاعلاج کہنے لگے۔

سو اس تقریر سے تو امراض جسمانی میں بھی وہ تقسیم منفی ٹھہرتی ہے لیکن اگر تقسیم کو صحیح ہی فرض کر لیا جاوے اور حدیث کو اکثر پر محمول کیا جاوے تب بھی امراض روحانی میں وہ تقسیم نہیں ہے بلکہ تقسیم کہاجاتا ہے کہ ان میں ہر مرض کی دوا واقع میں بھی ہے اور ہم کو بتلائی بھی گئی ہے۔ یہاں کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا بتلائی نہ گئی ہو۔ سارا مطب مکمل ہے اور مکمل کر کے ہی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ نازل ہوا ہے۔ اگر کسی کا روحانی مرض لاعلاج ہوتا اور کوئی مریض روحانی مایوس العلاج ہوتا تو سب سے زیادہ مستحق اس کے وہ لوگ تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ نازل ہوا ہے۔ مگر ان کا کفر بھی فی نفسہٖ لاعلاج نہ تھا۔ بلکہ ان کی بدپرہیزی کی وجہ سے یہ پیشین گوئی کی گئی ہے

خاتمہ کا حال

بعض مفسرین کا قول تو یہ ہے کہ یہ آیت خاص خاص لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جن کا نام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا گیا تھا۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ بلاتعیین یہ ان سب لوگوں کے بارے میں جن کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے اور خاتمہ سے پہلے کسی کو بھی حتیٰ کہ ابوجہل کو بھی علی الاطلاق کافر نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ شاید اخیر میں اسلام لے آتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کافرا بخواری منگرید کہ مسلمان بودنش باشد امید

مگر اس وقت وحی کا زمانہ تھا۔ اس وقت خاتمہ کا حال معلوم ہو سکتا تھا کہ کس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے اس لیے جن کفار کی نسبت صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ معلوم ہوگیا کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے ان کے نام صحابہ نے

اس آیت کی تفسیر میں تمثیلاً بیان کر دیئے - اور مطلب یہ تھا کہ یہ آیت ان جیسے لوگوں کے بارہ میں ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہوگا سب کافروں کے بارہ میں نہیں ہے مگر اب تو خاتمہ کا حال معلوم ہونا دشوار ہے - اگر ظاہر میں کسی کا کفر ہی پر خاتمہ ہو جب بھی یقینی طور پر کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم کو دل کا حال کیا معلوم ہے شاید وہ دل میں مسلمان ہو اور زبان سے اقرار کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو یا ملا ہو - اور اس نے تساہل کیا ہو تو بہت سے بہت گنہگار ہوگا مگر کافر نہ ہوگا - بلکہ عند اللہ ایسا شخص مسلمان ہے - اسی طرح اگر کوئی مسلمان مرتے ہوئے کلمۂ کفر کہتا ہوا جائے جب بھی کفر کا حکم مشکل ہے - فقہاء نے اس کا راز سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مرتے ہوئے کسی کے منہ سے کلمۂ کفر نکل جائے تو اس کو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے شاید نزع کی وجہ سے اس کی عقل درست نہ ہو اور بے ہوشی کی غفلت میں یہ کلمہ زبان سے نکلا ہو اور شریعت میں ایسا شخص مکلف نہیں رہتا بے ہوشی میں جو فعل و قول بھی صادر ہو شرعاً معاف ہے یا ممکن ہے کوئی ہوش ہی میں کلمۂ کفر کہہ رہا ہو - مگر اس کا مطلب وہ نہ ہو جو تم سمجھے بلکہ کچھ اور مطلب ہو پھر اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے حکم کفر کیونکر لگایا جا سکتا ہے -

احوال و مقامات

اس پر مجھے ایک بزرگ کا واقعہ یاد آیا کہ جب وہ مرنے لگے - نزع کی حالت ہوئی تو لوگ ان کو کلمہ تلقین کرتے تھے اور وہ اس سے اعراض کرتے اور منہ پھیر پھیر لیتے تھے لوگوں نے ان کے پیر بھائی کو جو بجائے شیخ کے تھے اس حال سے اطلاع کی کیونکہ اس اعراض سے سب پریشان ہو گئے تھے - عوام کے نزدیک تو بس وہ نعوذ باللہ! کافر ہو چکے تھے - چنانچہ وہ تشریف لائے اور ان کو آواز دی تو فوراً آنکھیں کھول دیں اور تبسم فرمایا اس سے پہلے وہ کسی سے بات بھی نہ کرتے تھے کیوں؟ اسلئے کہ

ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا
بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

وہ ان کے ہم زبان نہ تھے۔ اب ہم زبان آ گئے تو آنکھیں کھول دی اور باتیں کرنے لگے۔ دوسری وجہ حافظ شیرازی بیان فرماتے ہیں سے

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

وہ اپنی حالت کسی اور سے اسلئے نہ کہتے تھے کہ اس کا سمجھنے والا کوئی نہ تھا اور ایسے لوگوں کے سامنے اسرار کا بیان کرنا حرام ہے مولانا فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند
از سخنہا عالمے را سوختند

یہ وہی لوگ ہیں جو نااہلوں کے سامنے اسرار کو بیان کرتے ہیں۔ ان بزرگ نے اسی لیے نااہلوں کے سامنے اپنی حالت بیان نہیں کی جب اہل آ گیا تب کھلے اور کہا کہ حضرت ان لوگوں کو منع کر دیجئے کہ مجھے تنگ نہ کریں فرمایا یہ تو کلمہ کی تلقین کرتے ہیں کہا یہ مجھ کو مسمیٰ سے اسم کی طرف لاتے ہیں خود محبوب کے سامنے ہوتے ہوئے نام کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب میں آپکے سامنے بیٹھا ہوا ہوں تو اب میرا نام لینے کی آپ کو کیا ضرورت ہے۔ مگر یہ ایک حال ہے اور صاحب مقام اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے کیونکر؟ اس طرح کہ وہ مشاہدۂ مسمیٰ کے ساتھ اسم کو بھی جمع کرتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ محبوب کو یہی پسند ہے کہ دیکھتے بھی جاؤ اور ہمارا نام بھی لیتے رہو۔ اسلئے وہ دونوں کو جمع کرتا ہے دوسرا راز اتفاقاً ابونواس شاعر کے منہ سے نکل گیا کہتا ہے

اَلَا فَاسْقِنِیْ خَمْراً وَقُلْ لِیْ ھِیَ الْخَمْرُ
وَلَا تَسْقِنِیْ سِرًّا مَتٰی اَمْکَنَ الْجَھْرُ

یعنی مجھ کو شراب پلاتا جا اور یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے یہ شراب ہے آخر پیتے ہوئے اس کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کو عاشق ہی سمجھ سکتا ہے اس کہنے کی یہ ضرورت تھی تاکہ نام سنکر کانوں کے ذریعہ سے لذت حاصل ہو اور دیکھ کر آنکھ کے ذریعہ سے لذت حاصل ہو اور پیکر زبان کے واسطے سے لذت حاصل ہو۔۔۔ الغرض تمام جسم اس کی

لذت سے بھرا ہوا ہو۔ یہی غرض صاحب مقام کی ہوتی ہے مستی کے ساتھ اسم کو جمع کرنے سے۔ تاکہ قلب کے ساتھ زبان اور کان بھی لذتِ ذکر میں سرشار ہوں جن کو اس کی یاد ہو۔ مگر صاحبِ حال مشاہدہ کے وقت اسم کو جمع نہیں کر سکتا۔ اس کی زبان ہی اس وقت نہیں اٹھتی تو وہ بزرگ اس حال میں تھے جو شیخ کو معلوم ہوا۔ بھلا عوام کیا سمجھتے۔ اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ صاحب مقام نہ تھے ممکن ہے وہ صاحب مقام بھی ہوں لیکن اہل مقام پر بھی حال کا غلبہ ہو سکتا ہے گو کم ہوتا ہے لیکن اس کم کا کوئی وقت مقرر نہیں ممکن ہے ان بزرگ پر وقت موت ہی کے غلبہ ہوا ہو۔

بہرحال اگر شیخ نہ آتے تو لوگ یوں کہتے کہ فلاں کافر بے ایمان ہو کر مرا۔ مگر شیخ نے حقیقت حال معلوم کر کے سب کو فرمایا کہ یہ تو اس وقت بڑے درجہ پر ہیں مشاہدہ ذات حق میں مشغول ہیں ان کو مت چھیڑو۔ اب لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہو کہ

درنیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

غرض اس وقت تو کسی کے کفر پر تیقن نہیں ہو سکتا مگر جس زمانہ میں اَلَّذِیْنَ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ کا مشاہدہ ہو سکتا تھا اس وقت بھی یہ لوگ مایوس العلاج اور ان کا کفر لاعلاج نہ تھا۔ بلکہ ان لوگوں کے اختیار میں تھا۔ اس طرح سے کہ ایمان لے آتے گو اس کا عدم وقوع حق تعالیٰ کو معلوم تھا مگر عدم وقوع کے یقینی ہونے سے اس کا اختیاری ہونا منتفی نہیں ہوا۔ اور میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا بھی ہے تو مریض کو مجبور نہیں کرتا۔ بلکہ بعض تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ مریض بچے گا نہیں اس کو دوا مت دو۔ اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبراً دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں وہ اپنے قواعد طبیہ سے اس

مرض کو لاعلاج سمجھتا ہے مگر یہ سمجھنا ظنی ہے قطعی نہیں۔ وہ قدرت خدا تعالےٰ پر نظر کر کے امیدوار ہے ؎

عقل در اسباب میدارد نظر — عشق میگوید مسبب را نگر

مگر حق تعالیٰ کو تو علم غیب ہے اگر خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ سے ان لوگوں کے لاعلاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی تو یہ دلالت قطعی ہوتی۔ کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے متعلق علم ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کے خلاف تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے کیونکہ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ میں خطاب عام ہے اور یہ آیت مکی ہے پھر لفظ یٰاَیُّھَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو توحید و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فرمایا گیا ہے پھر اس پر اجماع بھی ہے کہ ابو جہل و ابو طالب وغیرہ ایمان کے مکلف تھے اگر وہ ایمان کے مکلف نہ ہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے آپ نے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ نازل فرما دیا تھا حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کے ساتھ ہی وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلف وہ بھی تھے اس سے مستثنیٰ نہ تھے اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ نازل ہوا ہے ان کا مرض روحانی علاج نہ تھا اگر روحانی مطب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے مگر وہ مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لاعلاج نہیں۔

تدابیرِ اتفاق کی ذمہ داری

رہا یہ سوال کہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی جواب یہ ہے کہ یہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ نے حضورؐ کو بتلا دیا مگر اس کا بھی مطلب یہ ہے لَا یُؤْمِنُ اَبُوْ جَهْلٍ وَّ نَحْوُهٗ مَعَ بَقَاءِ اِخْتِیَارِہٖ کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا ان کے اختیار سے ہوگا یہ مطلب نہیں کہ ان کو ایمان پر قدرت و اختیار ہی باقی نہیں رہا۔ خوب سمجھ لو۔ اس سے زیادہ کلام کرنا خوض فی القدر جس کی اجازت نہیں۔ غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصوص میں کسی امر کی پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا اور جب وہ اختیار سے خارج نہیں تو اس کی تدبیر کرنا فضول نہیں ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو، تو چاہیے کہ آج سے حفظِ قرآن کو ترک کیا جائے کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ جس میں حفاظتِ قرآن کا وعدہ ہے تو پھر نعوذ باللہ قرآن کا پڑھنا بھی چھوڑ دو لکھنا بھی چھوڑ دو۔ چھاپنا بھی چھوڑ دو اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں ان کو دفن کر دو اور کہہ دو کہ بس قرآن کا حافظ اللہ ہی کافی ہے ایک ہی حافظ بہت ہے اور وہ حافظ بھی کیسا جو سحافظ بھی ہے جتنے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی کریں گے کیونکہ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں سب طریقے آ گئے مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہو چکی ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ یہاں تو آپ نے یہ تجویز کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی، چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر فرض بھی سمجھا اور نا اتفاقی کے متعلق پیشین گوئی وارد ہونے سے آپ نے یہ تجویز کر لیا کہ جب پیشین گوئی ہو چکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے میں کہتا ہوں کہ جب حفاظتِ قرآن کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے آپ پر بھی وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں اس کا جواب دیکھئے آخر دونوں میں ما بہ الفرق کیا ہے فرق کا مبنیٰ بتلائیے۔ اگر آپ نہیں بتلاتے تو لیجئے میں بتلاتا ہوں۔ آپ اس اعتراض کے

جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْن کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سعی کریں گے اور ہم حفاظت کے طریقے ان کے قلوب میں ڈال دیں گے کہ وہ اس کو یاد بھی کریں گے۔ لکھیں گے بھی۔ پڑھیں پڑھائیں گے بھی۔ گویا اس طرح ہم ہی قرآن کے محافظ ہیں تو میں کہتا ہوں کہ یہ مبنیٰ دونوں جگہ مشترک ہے یعنی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد آپ کی حفاظت کو بھی اس میں دخل ہے۔

اسی طرح نا اتفاقی کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی بدپرہیزی کو اس میں دخل ہے اور اس پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چونکہ یہ لوگ باختیار خود بدپرہیزی کریں گے اس لئے نا اتفاقی رہے گی۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ خدا اور رسولؐ کا کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کرنا اسکو مستلزم نہیں کہ وہ دائرۂ تکلیف سے باہر ہو جائے اور اس کی تدبیر نہ کی جائے اور اس کا راز وہی ہے جو میں نے شروع میں کہا تھا۔ کہ پیشین گوئی کبھی مرض کے لاعلاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مریض کے بدپرہیز ہونے کی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لاعلاج کوئی مرض نہیں یہاں جو پیشین گوئی بھی ہوتی ہے۔ مریض کے بدپرہیز ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

پس اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ نا اتفاقی کا دُور کرنا آپ کی قدرت سے باہر ہے تو اسلئے اس کی تدبیر بھی نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگ اس کے باختیار خود پرہیز نہ کریں گے۔ اس لئے یہ مرض باقی رہے گا۔ لیکن اگر علاج کریں تو علاج کے مفید ہونے کی یہاں نفی نہیں۔ شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ اگر سب نے اس مرض کا علاج کر کے اتفاق کر لیا۔ تو حدیث کی پیشین گوئی غلط ہو جاتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ مگر واقع میں سب ایسا کریں گے نہیں بلکہ تھوڑے بہت ضرور ایسے رہیں گے جو نا اتفاقی کرتے رہیں گے مگر ان میں تم ہی کو داخل ہونگی

کیا ضرورت ہے اور اس کی کیا دلیل ہے کہ تم ہی اس کے مصداق ہو۔
اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ میں اس پیشین گوئی کے سچا کرنے کے لیے نااتفاقی کرتا ہوں تاکہ اس کا مصداق موجود رہے یہ غلط نہ ہوجائے تو اسے کہا جائیگا کہ آپ کو اس کے سچا کرنے کی ضرورت نہیں تم کو اس کا مکلف نہیں کیا گیا۔ قیامت میں آپ سے یہ سوال ہرگز نہ ہوگا کہ تم نے ہماری پیشین گوئی کے سچا کرنے کا اہتمام کیا تھا یا نہیں بلکہ وہاں تو آپ سے ان امور کا سوال ہوگا جن کا امر کیا گیا ہے اور پیشین گوئی کے سچا کرنے کا آپ کو امر نہیں لہٰذا یہ جواب مسموع نہ ہوگا۔ میں اسکی نظیر دنیا میں آپکو دکھلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ پولیس میں مردم شماری کا تجربہ سے اوسط مقرر ہوتا ہے کہ اتنے آدمیوں میں اتنے بدمعاش اور جرائم پیشہ ضرور ہوتے ہیں تو کیا کوئی مجرم مجسٹریٹ سے کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو جرم اسلیے کیا ہے کہ پولیس کا قاعدہ میں نے دیکھا تھا کہ بدمعاشوں کا اوسط اتنا ہے تو میں نے اس اوسط کو پورا کرنا چاہا تاکہ یہ قاعدہ غلط نہ ہوجائے اسلئے میں مجرم نہیں ہوں بلکہ حقیقت میں خیر خواہ سرکار ہوں تو کیا مجسٹریٹ اس کا یہ عذر سُن لے گا ہرگز نہیں بلکہ وکیل سرکار فوراً کہے گا کہ نالائق کیا تیرا نام بھی اوسط میں لکھا ہوا تھا پھر تو اس میں کیوں داخل ہوا۔
جی یہ اوسط تو واقعہ ہے قانون تو نہیں ہے یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اوسط کو دیکھ کر خواہ مخواہ اس کے پورا کرنے کے لیے جرم کیا جاوے اسی طرح یہ پیشین گوئی حکم تکوینی ہے حکم تشریعی نہیں۔
اب میں اسکی زیادہ اس مسئلہ کی توضیح نہیں کرسکتا کہ سمجھدار میں خوض ہوجائے گا۔ میں تو اس حدیث کو پڑھ کر ہی پچھتایا کیونکہ اس کو پڑھ کر اتنا بڑا کام میرے سر پڑگیا کہ دقیق اشکالات کو حل کرنا پڑا مگر پچھتانے کی بھی کیا ضرورت ہے اگر میں اس حدیث کو پڑھ کر اشکالات رفع نہ کرتا تو خدا سلامت رکھے اردو مسلم انکو

کو کبھی نہ کبھی اس کی بدولت یہ حدیث آپ کی نظر سے گذر جاتی کیونکہ آجکل اُردو میں حدیث وفقہ کی کتابیں ترجمہ ہوگئی ہیں تو کسی اور جگہ دیکھ کر آپ کو یہ شبہات واقع ہوتے اس لئے اچھا ہوا کہ میں نے سب کا جواب دیدیا۔

وکلاء شرع کی ضرورت

اور اس تقریر سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ قرآن وحدیث کا ترجمہ دیکھ لینا علماء سے مستغنی نہیں کر سکتا۔ بتلائیے! اگر آپ اس حدیث کا ترجمہ دیکھ لیتے تو کیا اس سے یہ حقیقت آپ کی سمجھ میں آسکتی تھی جواب سمجھ میں آئی اور محض ترجمہ سے یہ اشکالات حل ہو سکتے تھے؟ جو اس وقت حل ہوئے کبھی نہیں۔ مگر حیرت ہے کہ آجکل اُردو تراجم نے لوگوں کو علماء سے مستغنی کر دیا ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ اردو میں طب کی کتابوں کا بھی ترجمہ ہوگیا ہے۔ مگر بایں ہمہ اطباء سے استغنا نہیں ہوا اور جو لوگ اُردو رسائل طبیہ دیکھ کر اطباء سے مستغنی ہوئے بھی ہیں ان کو سب لوگ احمق سمجھتے ہیں مگر یہاں اس حماقت میں سب مبتلا ہیں جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ آجکل بعض لوگ جو بندۂ اغراض ہیں اس کی کوشش کرتے ہیں لوگوں کو اطباء حقیقی وعلماء حقیقی سے پھیر کر اپنی کتابوں کی طرف یا اپنی طرف مائل کریں۔ شاید یہاں کسی کے دل میں یہ سوال... پیدا ہوا ہو کہ جب اردو ترجمہ کے بعد بھی علماء سے استغنا نہیں پھر ترجمہ ہی کیوں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسائل شرعیہ میں دو دقتیں تھیں ایک زبان کی ایک مضمون کے ترجمہ سے زبان کی دقت رفع ہوگئی اور یہ بھی بہت بڑا نفع ہے کہ آدھی محنت کم ہوگئی لیکن زبان اُردو ہو جانے سے مضامین کی دقت رفع نہیں ہوئی۔

دیکھئے! آجکل قانون سرکاری کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے جس کی زبان انگریزی کے سیکھنے کی دقت تو کم ہوگئی ہر اُردو خواں اس کو بے تکلف پڑھ سکتا ہے مگر کیا زبان اُردو ہونے سے مضامین کی دقت بھی رفع ہوگئی کہ ہر شخص اس کے ہر مقام کو خود ہی

سمجھ لیا کرے ہرگز نہیں۔ میں نے خود ایک بار قانون کی اردو کتاب دیکھی تھی مگر ایک مقام کا مطلب نہ سمجھ سکا کچھ نہ کچھ سمجھ گیا۔ پھر ایک وکیل نے اس کا مطلب صحیح بیان کیا۔ تب مجھے اپنی غلطی پر تنبہ ہوا۔ پھر قانون شرعی کے اردو میں ہوجانے سے آپ وکلاء شرع سے کیونکر مستغنی ہو سکتے ہیں۔

غرض چونکہ آجکل اُردو میں رسائل دینیہ کی کثرت ہوگئی ہے اس لیے اندیشہ تھا کہ کسی کتاب میں یہ حدیث آپ دیکھ لیتے اور اشکالات پڑتے اس لیے میں نے اس وقت شبہات حل کر دیئے اب مطلع بے غبار ہے۔

نااتفاقی کے ضرر کا درجہ

اب میں اپنی اصلی غرض کی طرف عود کرتا ہوں کہ نااتفاقی بہت سخت مرض ہے۔ اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دن بدن ترقی پذیر ہے ہمیں دوسری قوموں سے تو کچھ غرض نہیں اور سچ یہ ہے کہ ہم ان کی حالت کو جانتے بھی نہیں اور جان بھی لیں تو کیا کریں گھر سے فرصت ہو تو کسی کی خبر لی جائے۔ یہاں ہم کو اپنے ہی گھر سے فرصت نہیں اگر آپ کا ایک بھائی بیمار ہو اور ایک پڑوسی اور پڑوسی بھی بدخواہ۔ تو بھائی کو چھوڑ کر پڑوسی کے علاج کو آپ کبھی نہ دوڑیں گے۔ ہاں بھائی سے فراغت ہوجائے تو پھر یہ ہمت کی بات ہے کہ پڑوسی کا معالجہ بھی کر دیا جائے مگر یہاں تو اپنے ہی گھر میں اپنے بھائی بیمار پڑے ہیں۔ ہم کو انہی کے علاج سے فرصت نہیں ہمارا گھر اسلام ہے اور گھر والے اہلِ اسلام ہیں۔ سو خود مسلمانوں ہی میں نااتفاقی کا مرض دن بدن ترقی پر ہے جس کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کو نااتفاقی کا مذموم و مضر ہونا تو مسلم ہے مگر اس کا درجہ معلوم نہیں کہ اس کا ضرر کس درجہ کا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ اب تک اس مرض میں کمی نہیں ہوئی حالانکہ رات دن سب کی زبان پر یہ بات آتی ہے کہ آجکل مسلمانوں کو تنزل ہے اور اس کی وجہ سب یہ بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں میں اتفاق

نہیں اور اتفاق کی ضرورت پر ہمیشہ تقریریں ہوتی ہیں۔ مگر پھر بھی نااتفاقی دور نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ضرر کا درجہ معلوم نہیں اسی لیے اس سے اجتناب کا اہتمام نہیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ اجتناب کا اہتمام اسی چیز سے کیا جاتا ہے جس کے ضرر کا درجہ معلوم ہو جائے۔

چنانچہ اگر کسی کو سنکھیا کا مضر ہونا تو معلوم ہو مگر درجہ معلوم نہ ہو تو اسکو اس سے اجتناب کرنے کا زیادہ اہتمام نہ ہوگا اور جس کو درجہ معلوم ہو کہ سم قاتل ہے وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ نااتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم کیا جائے کیونکہ درجہ معلوم نہ ہونے ہی سے اس سے اجتناب کم ہو رہا ہے اور اجتناب کم ہونے کے بعد ارتکاب ہونے لگا اور ارتکاب کے بعد اب یہ حالت ہو گئی کہ بعض لوگوں کو نااتفاقی کی مذمت سے بھی کبیدگی ہوتی ہے کیونکہ اس کو نااتفاقی کا مزا پڑ گیا ہے جو اب صفت لازمہ ہو گئی اور ایسی صفات کو ذات سے لاعین ولاغیر کا تعلق ہے تو صفت بمنزلہ ذات کے ہو گئی اور اپنی ذات ہر اک کو محبوب ہے اس لیے اس کی صفات بھی محبوب ہیں اور محبوب کی مذمت کسی کو گوارا نہیں ہوتی تو اب وہ نااتفاقی کی مدح کرنا چاہتا ہے مگر اس کی مدح کیونکر کرے کیونکہ نااتفاقی کا مذموم ہونا سب کو مسلم ہے اس کی مذمت کا انکار تو یہ کر ہی نہیں سکتا تو اب اس کی کوشش کرتا ہے کہ یہ ثابت کرے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ نااتفاقی اور فساد ہی نہیں بلکہ اصلاح ہے اب وہ حال ہو جاتا ہے عہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ o جو کہ منافقین کی حالت میں وارد ہوا ہے اب ان کو مالیخولیا ہو جاتا ہے اور مالیخولیا کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا مریض اپنے کو مجنوں نہیں

عہ جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد برپا نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ ۱۲ منہ۔

سمجھا کرتا پھر اس کو دوا کیوں کر پلائی جائے اور اسے کیونکر یقین دلایا جائے کہ تو مجنون ہے اور یہ سارا فساد اس کا ہوا کہ اس شخص کو شروع ہی میں نا اتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم نہ ہوا اگر درجہ معلوم ہوتا تو قلت اہتمام اور عدم مبالات اور ارتکاب فساد کی نوبت ہی نہ آتی اس لئے میں نے اس وقت یہ حدیث اختیار کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نا اتفاقی کے ضرر کا درجہ تبلایا ہے فرماتے ہیں ایاکم وفساد ذات البین فانہا ھی الحالقۃ یعنی اپنے کو باہمی فساد سے بچاؤ کیونکہ باہمی فساد مونڈنیوالی چیز ہے اس میں ابہام وتفسیر کی بلاغت ہے کیونکہ ___ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول تو حالقہ فرمایا جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ فساد کی وجہ سے سر کے بال مونڈ جاتیں گے ۔پھر سامع کو اس کے مطلب کا انتظار ہوا کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ ہم نے بارہا نا اتفاقی کی ہے مگر سر کے بال کبھی نہیں گرے تو ابہام سے سامع کو تفسیر کا مشتاق بنا کر آگے فرماتے ہیں لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے سر کے بال مونڈ جاتے ہیں ۔بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اس سے دین مونڈ جاتا ہے اور مونڈنا کسے کہتے ہیں ،مونڈنا یہ ہے کہ خربوزہ سا سر نکل آئے بال کا نشان تک نہ رہے ۔تو حاصل یہ ہوا کہ فساد باہمی سے دین کا بالکل صفایا ہو جاتا ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نا اتفاقی اور فساد باہمی کے ضرر کا درجہ تبلا دیا ہے اور واقعی اس سے زیادہ کیا ضرر ہو گا کہ اس سے دین کا صفایا ہی ہو جاتا ہے مگر قربان جایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کے عتاب میں بھی رحمت ہے ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ۔۔۔ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

وعید میں عید

گو اس مقام پر حضور ؐ نے فساد باہمی پر بہت بڑی وعید فرمائی ہے مگر ساتھ ساتھ اس میں امید کی بھی جھلک ہے بالکل ہی نا امید نہیں کیونکہ آپ نے فساد کو حالقہ فرمایا ہے،

کہ یہ دین کو مونڈھ دیتا ہے اور مونڈنے سے اس وقت تو اوپر سے صفایا ہو جاتا ہے مگر اندر جڑ باقی رہ جاتی ہے اگر روز استرہ نہ پھیرا جائے تو اگلے دن کھونٹی نکل آتی ہے تو اس میں اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اگر کوئی شخص روز روز منڈانے کا شغل نہ کرے تو چند روز میں کھونٹی نکل آئیگی۔ اسکے بعد بال اور بڑھیں گے پھر زلفیں ایسی ہوں گی کہ لوگ ان میں پھنسا کریں گے اور وہ حال ہو گا ؂

ہم ہوتے تم ہوئے کہ میر ہوئے اسکی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ایک زبان والے نے اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا تھا کہ ہم اور تم اور میر صاحب اس کی زلفوں میں پھنس کر سب جیل خانہ چلا گیا (یہ تو ایک لطیفہ تھا) غرض کیا رحمت ہے کہ ایک ہی لفظ میں غضب بھی ہے اور رحمت بھی ہے آپ نے تَحْلِقُ الَّذِيْنَ فرما کر ڈرایا دھمکایا بھی ہے اور یہ بھی بتلا دیا کہ نا امید نہ ہونا فساد سے دین کی جڑ نہیں جاتی۔ اگر کوشش کرو گے تو جڑ سے شاخ اور شاخ سے پھل بھی نکل آویں گے ملے صاحبو! غضب کی حالت میں جس ذات کی یہ رحمت ہے ان کی رحمت تو کیا کچھ ہو گی اسی کو سعدی فرماتے ہیں ؂

نماند بعصیاں کسے در گرو کہ دارد چنیں سید پیشرو

بددعا بغلبۂ بشریت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُوْنَ فَاَيُّمَا رَجُلٍ اٰذَيْتُهٗ اَوْ شَتَمْتُهٗ اَوْ لَعَنْتُهٗ فَاجْعَلْهَا لَهٗ صَلٰوةً وَّزَكٰوةً وَّقُرْبَةً تُقَرِّبُهٗ بِهَا اِلَيْكَ

(اے اللہ! میں بشر ہوں مجھے بھی غصہ آجاتا ہے۔ جیسا اوروں کو غصہ آتا ہے تو جس شخص کو در جوش غضب میں میں کچھ ایذاء دوں یا برا بھلا کہوں یا بددعا کروں تو ان سب کو اسکے حق میں رحمت خاص اور سبب تزکیہ اور موجب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پر خدا تعالیٰ کی بھی لعنت ہوگی۔ غرض مخالفتِ احکام کے سبب سے جو بددعا ہوگی۔ اس کی یہ شان ہوگی۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اور یہ شان ہوگی ؎

آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم   در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

اور جب آپ کی بد دعا حق تعالیٰ کی بد دعا ہے تو گویا یہ دعا خود حق تعالیٰ ہی فرما رہے ہیں اور اس کی یہ شان ہوگی۔

چوں خدا از خود سوال و کد کند   پس دعائے خویشتن چوں رد کند

اور مولانا پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ حضورؐ کی بد دعا کو حق تعالیٰ کی بد دعا اور از خود سوال وکد کردن کیسے کہہ دیا۔ قرآن میں اس کی نظیر موجود ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ جس کی تفسیر میں مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں اِذَا قَرَءَ رَسُوْلُنَا جِبْرَئِیْلُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ یہاں حق تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کی قرارت کو اپنی قرارت فرما رہے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا جبرئیل علیہ السلام سے کچھ کم ہیں اگر آپ کے فعل دعا کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جائے تو بُعد ہی کیا ہے۔

صوفیاء کا صبر

لوگ صوفیوں پر مسئلہ وحدۃ الوجود میں اعتراض کرتے ہیں وہ ذرا بتلائیں کہ صوفیہ نے کیا بھوسہ ملا دیا ہے وہ بھی وہی کہتے ہیں جو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ مگر صوفی بے چارے ہر زمانہ میں بدنام رہے ہیں کیونکہ وہ خاموش اور صابر ہوتے ہیں۔ اور زمانہ کا قاعدہ ہے کہ لوگ صبر کرنے والوں کو زیادہ دباتے ہیں اور جو سامنے تن کر کھڑا ہو جاوے اس سے بھاگتے ہیں مگر معلوم بھی ہے وہ صبر کیوں کرتے ہیں۔

وہ صبر کر کے حق تعالیٰ کو اپنے ساتھ کرتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنا انتقام خود لے لیتا ہے تو حق تعالیٰ معاملہ کو اسی کے سپرد کر دیتے ہیں اور جو صبر کرتا ہے اس کی طرف سے حق تعالیٰ خود انتقام لیتے ہیں پھر وہ انتقام کیسا ہوگا اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے لیے ایسے غضبناک ہوتے ہیں جیسے شیر اپنے بچوں کے لیے غضبناک ہوا کرتا ہے پھر کبھی تو دنیا میں بھی مزا چکھا دیتے ہیں اور کبھی آخرت پر پوری سزا کو ملتوی رکھتے ہیں اور دنیا میں کبھی تو ایسی سزا دیتے ہیں جس کو یہ شخص بھی سزا سمجھتا ہے اور کبھی اس طرح میٹھی مار مارتے ہیں کہ یہ اسکو انعام سمجھتا ہے۔ چنانچہ ایک مجذوب کے کسی سپاہی نے ایک ہنٹر مار دیا۔ مجذوب نے بددعا دی کہ اے اللہ! اس کو تھانہ دار کر دے وہ چند ہی روز میں تھانہ دار ہوگیا اب تو بڑا خوش ہوا کہ مجذوب کی دعا قبول ہوگئی۔ چل کر اس سے اپنی خطا معاف کرانا چاہیئے اور کچھ ہدیہ پیش کرنا چاہیئے چنانچہ مٹھائی لے کر گیا۔ غنیمت ہے کہ اس نے دوسرا ہنٹر نہ مارا۔ ورنہ آجکل کے عقلاء تو شاید ایسا ہی کرتے کہ جب اسکی ایک ہنٹر مارنے سے یہ عہدہ ملا تو شاید اور مارنے سے کوئی دوسرا بڑا عہدہ مل جائے گا۔

غرض جب وہ مٹھائی لے کر گیا اور کہا جی آپ کی دعا سے مجھے وہی عہدہ مل گیا جو آپنے فرمایا تھا اس کی خوشی میں یہ ہدیہ لایا ہوں اور اپنی گستاخی سے شرمندہ ہوں کہ میں نے برائی کی اور آپنے بھلائی کی دعا کی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے کچھ خدمت لیجئے۔ مجذوب نے کہا ہم کو ایسے بچھو لا دو جو کالے ہوں اور ایک ایک بالشت لمبے ہوں اس نے کئی روز بعد آکر کہا حضور ایسے بچھو تو ملتے نہیں۔ مجذوب نے کہا چل میں بتلاؤں ایک قبر پر لے گیا اور اس کو کھودا تو ایسے ایسے سینکڑوں بچھو اسی لاش کو لپٹے ہوئے دیکھے دیکھ کر ڈر گیا اور معلوم ہوا کہ یہ ایک ظالم تھانہ دار کی قبر ہے اس وقت مجذوب نے کہا بچہ میں نے دعا نہیں دی تھی یہ بددعا دی تھی کہ تجھ کو بھی ایسی ہی سزا ملے۔ کیونکہ

اب تو حکومت کر کے مخلوق پر ظلم کریگا تو قبر میں بالشت بھر لمبے بچھو تجھے لپٹیں گے تو سمجھا کہ میں نے تیرے واسطے بھلائی کی دعا کی تھی۔

تو صاحبو! کبھی اہل اللہ کی ایذاء رسانی سے حق تعالیٰ ایسی میٹھی سزا بھی دیا کرتے ہیں جسکو آپ نعمت سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ وبال جان ہے پس اہل اللہ کو تکلیف پہنچا کر مطمئن نہ رہنا چاہیئے۔ الغرض! صوفیہ چونکہ صابر ہوتے ہیں اسلیئے ان پر سب اعتراض کرتے ہیں ورنہ ان کا یہ قول (یعنی وحدۃ الوجود کا مسئلہ) شریعت کے خلاف نہیں اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں اس کو ذرا بسط کے ساتھ بیان کرتا مگر اس وقت ایک ہی آیت پر اکتفا کرتا ہوں۔

باامید وعید

بہر حال تبلیغ کے ذیل میں جو وعیدیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں وہ سب حق تعالےٰ کی طرف سے ہیں لہٰذا ان سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے انہی وعیدوں میں سے ایک وعید یہ ہے جو حضور نے فساد ذات البین کے متعلق بیان فرمائی ہے۔ مگر عارفین کا مسلک ہے کہ وہ وعید کا بیان کرتے ہوئے ناامید نہیں کیا کرتے کیونکہ وعید کا جو مقصود ہے یعنی آئندہ کے لیے زجر اور اصلاح وہ ناامید کرنے سے فوت ہو جاتا ہے سو ناامیدی سے اول تعطل کی نوبت آتی ہے کہ آدمی غلبۂ حزن کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا پھر تعطل کے بعد گناہوں پر جرأت ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ وعید خالص کے سننے سے آدمی مر بھی جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت غوث اعظمؒ کا واقعہ ہے کہ آپ نے چالیس سال تک رحمت حق کا بیان فرمایا پھر خیال ہوا کہ شاید لوگوں کو اعمال سے بے فکری ہونے لگی ہوگی۔ اس لیے اس کے بعد آپنے ایک دن خالص ترہیب کا بیان فرمادیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ مجلس وعظ میں سے کئی جنازے اٹھائے گئے وہ بیان سن کر ان کے دل پھٹ گئے الہام ہوا کہ اے عبدالقادر! کیا ہماری رحمت

اتنی ہی تھی کہ چالیس برس میں اس کا بیان ختم ہوگیا۔ ہمارے بندوں کو مار دیا اسی لیے محققین غضب کے ساتھ رحمت کا بیان بھی کرتے ہیں اور وعید کے ساتھ امید کو بھی ملا دیتے ہیں تاکہ نا امیدی نہ ہو اور نوبت بہ ہلاک نہ پہنچے چنانچہ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فساد ذات البین پر جو وعید بیان فرمائی ہے اس میں لفظ تحلق اختیار فرمایا ہے جس میں وعید کے ساتھ امید بھی ملی ہوئی ہے کہ اس سے دین منڈتا ہی ہے جڑ سے زائل نہیں ہوتا کیونکہ مونڈنے سے پھر بھی بال نکل آتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ پہلے سے بھی سخت نکلتے ہیں مگر خدا کے لیئے تم اس غرض سے مونڈنے کا ارادہ نہ کیجیو کیونکہ شاید اسی دن خاتمہ ہوجائے تو منڈے کے منڈے ہی رہ جاؤ گے پس اس وعید سے ڈرنا چاہیئے اور قصدًا نا اتفاقی پر اقدام نہ کرنا چاہیے اور اگر کبھی صادر ہو جائے تو اصلاح سے نا امید بھی نہ ہونا چاہیئے۔

مفید نا اتفاقی

یہاں سے ایک مسئلہ اور مستنبط ہوا وہ یہ کہ آج کل جو عمومًا اتفاق کے فضائل اور نا اتفاقی کی مطلقًا مذمت بیان کی جاتی ہے اور علماء بھی عمومًا اس مرض میں مبتلا ہیں یہ غلط ہے کیونکہ حدیث سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نا اتفاقی اس واسطے مذموم ہے کہ یہ دین کو مضر ہے۔ اور اگر دین کو مفید ہو گو دنیا کو مضر ہو تو وہ مذموم نہیں ——— چنانچہ ایک نا اتفاقی وہ بھی ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا تھا حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

[ع] قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ الآية

[ع] ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین میں تمہارے لیئے اچھا نمونہ ہے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے بیزار ہیں اور اس چیز سے جس کو خدا کے علاوہ تم پوجتے ہو۔ ۱۲

ابراھیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے اپنی قوم سے صاف کہدیا کہ ہم میں اور تم میں عداوت و بغض ہمیشہ کے لیے پیدا ہو چکا ہے جب تک کہ تم اللہ وحدہٗ پر ایمان نہ لاؤ تو کیا اس نا اتفاقی کو بھی کوئی بھی مذموم کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں۔ اسی طرح اس کے مقابلہ میں ایک اتفاق وہ تھا جس کے بارہ میں ابراھیم علیہ السلام فرماتے ہیں

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ ط عہ

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ابراھیم علیہ السلام کے مقابلہ میں جو کفار تھے ان میں باہم اتفاق و اتحاد کامل تھا مگر کیا اس اتفاق کو کوئی محمود کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اس اتفاق کی بنیادیں اکھاڑ کر پھینک دی تھیں کیونکہ یہ اتفاق خلاف حق پر تھا پس خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اسی وقت مطلوب و محمود ہے جبکہ دین کو مفید ہو اور نا اتفاقی جبھی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نا اتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت وہ نا اتفاقی مطلوب ہوگی۔

اہل دنیا تک اپنے معاملات میں اس کو خوب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعیٰ علیہ عدالت سے مرافعہ کرتے ہیں تو اس وقت دونوں سے کبھی

عہ اور فرمایا بیشک تم نے اللہ کے علاوہ پکڑ لیا بتوں کو دنیاوی زندگی میں آپس کی دوستی و محبت کے لیے پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کروگے اور ایک تم کا دوسرے پر لعنت کریگا اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ کی آگ ہے۔

عہ ۲۶

نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوے سے دستبردار ہو جاؤ۔ کیونکہ اس دعوے سے تمہارے اندر نا اتفاقی پیدا ہو گئی ہے اور نا اتفاقی مذموم ہے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص خلاف حق پر ہو اس سے کہا جاتا ہے کہ تم حق کی طرف رجوع کرو اور ناحق پر اصرار کو چھوڑ دو۔ بلکہ بعض معاملات میں اگر کبھی صاحب حق دعوے سے دست بردار بھی ہو جائے تو گورنمنٹ مدعی ہو جاتی ہے اور وہ حق کی حمایت کرتی ہے۔

حمایتِ حق

صاحبو! اگر نا اتفاقی مطلقاً مذموم ہے تو چاہیئے کہ جب کوئی دعویٰ عدالت میں دائر ہو تو جج مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ نا اتفاقی کے مجرم دونوں ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہ عقلاء ایسی رائے دے سکتے ہیں۔ بلکہ یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ گو نا اتفاقی دونوں طرف سے ہے مگر ایک طرف سے حمایت حق کے لیے ہے اور دوسری طرف سے حمایت باطل کے لیے پس تفتیش و تحقیق کے بعد جو شخص حق پر ہو اس کی ڈگری ہونا چاہیئے۔ اور عدالت کو اس کا ساتھ دینا چاہیئے یہاں تو سب کا اتفاق ہے کہ نا اتفاقی مطلقاً مذموم نہیں مگر افسوس ہے! دین کے معاملہ میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ یہاں.. دونوں سے کہتے ہیں کہ نا اتفاقی چھوڑ دو اور اتفاق پیدا کرو۔

صاحبو! آخر یہاں یہ کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ ان دونوں میں سے کس کی نا اتفاقی... حمایت حق کے لیے ہے اور کس کی حمایت باطل کے لئے پھر جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جائے اور جو باطل پر ہو صرف اسی کو دبایا جائے۔ اور آپ جو دونوں کو اتفاق کا امر کرتے ہیں تو بتلایئے صاحب حق صاحب باطل کے ساتھ کیونکر اتفاق کر لے دونوں طرف سے اگر اتفاق ہو گا تو عقلاً اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ صاحب حق حق کو چھوڑ دے اور دونوں باطل پر ہو جائیں یعنی دیندار دین کو چھوڑ کر بددین ہو جائے۔ ایک یہ کہ دیندار تو دین پر قائم رہے اور بددین بددینی چھوڑ دے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ دیندار تو دین کو چھوڑ دیں اور کچھ بددین بددینی کو چھوڑ دیں۔

اس طرح دونوں طرف سے اتفاق ہو سکتا ہے۔ اب عقلاء خود فیصلہ کرلیں کہ ان میں سے کون سی صورت عقل کے مطابق ہے یقیناً صرف دوسری ہی صورت کو عقل کے مطابق کہا جائے گا کہ دیندار تو دین پر قائم رہے اور بددین بددینی کو چھوڑ دے اور اس کا حاصل یہی ہے کہ دیندار کو تو بددینی سے نااتفاقی کا حق ہے مگر بددین کو دیندار سے نااتفاقی کا حق نہیں بلکہ اس کو دیندار کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیئے۔

صاحبو! یہ وہ افتراق ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیدا کیا ہے کیونکہ آپ کی نبوت سے پہلے سب لوگ کفر پر متفق تھے آپ نے آکر اس اتفاق کو توڑ دیا اور باپ بیٹوں کو باہم جدا جدا کر دیا اور یہ وہ افتراق ہے جس کو حق تعالیٰ بشارت کے طور پر بیان فرماتے ہیں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایۂ بشارت بتلایا ہے جس کو تقوے پر مرتب فرمایا ہے اور اسی لیے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے جو لوگ حق پر ہوں۔ ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے اور جو باطل پر ہوں ان کے ساتھ فصل کا حکم ہے پس یہ سخت غلطی ہے جس میں لوگ آجکل مبتلا ہیں کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں دونوں کو مورد ملامت بنانے لگتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ آپس میں اختلاف کرتے ہو اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہیں جس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بددین ہو جانا چاہیئے اور صاحب حق حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کرلے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے بلکہ مقتضائے عقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو تو اول یہ معلوم کیا جائے کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون۔ جب حق متعین ہو جائے تو صاحب حق سے کچھ

نہ کہا جائے بلکہ اس کا ساتھ دیا جائے اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جائے ۔ قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْءَ اِلٰی اَمْرِ اللّٰہِ ۔

حلِ اشکال

اور اگر آپ کو تحقیق حق کی فرصت یا لیاقت نہیں تو آپ سے دخل در معقول دینے کو کس نے کہا ہے اپنے گھر بیٹھیے اور تحقیق سے پہلے کسی کو برا نہ کہیے ۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے اور نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے تو اب اس حدیث پر سوال وارد ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِیَّاکُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَیْنِ ہی کیوں فرمایا کسی جگہ اِیَّاکُمْ وَصَلَاحَ ذَاتِ الْبَیْنِ ۔ بھی فرمانا چاہیئے[تعلیق] اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ تر فساد نا اتفاقی[ع] سے ہوتا ہے ۔ اتفاق سے فساد کم ہوتا ہے کیونکہ اتفاق کی حالت میں قوائے سبعیہ بہیمیہ کو سکون ہوتا ہے ۔ ہیجان نہیں ہوتا اور معاصی زیادہ تر قوائے بہیمیہ کے ہیجان ہی سے ہوتے ہیں

ع اس جواب کا حاصل منشأ اشکال کو تسلیم کر کے جواب دینا ہے ۔ منشأ اشکال یہ تھا کہ سائل نے لفظِ فساد کو اختلاف اور افتراق کا ہم معنی سمجھا ہے اسلئے شبہ کرتا ہے کہ حدیث میں صرف افتراق ہی سے بچنے کی تاکید کیوں ہے حضرت حکیم الامۃ نے ایک دوسرے وعظ میں اس شبہ کا جواب منشأ اشکال کو منع کر کے بھی دیا ہے کہ سائل کا فساد کو افتراق و اختلاف کا مرادف سمجھنا غلط ہے ۔ بلکہ فساد کے معنی ہیں ۔ حالت کا اعتدال شرعی سے نکل جانا اور یہ افتراق ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کبھی اتفاق سے بھی فساد ہوتا ہے ۔ اس وعظ میں خلاف ذات البین کے بجائے حدیث میں فساد ذات البین وارد ہونے سے ہی یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ اختلاف فی نفسہٖ مذموم نہیں بلکہ فساد مذموم ہے پس اگر کسی وقت اتفاق سے فساد ہونے لگے اس وقت وہ اتفاق بھی مذموم ہو جائے گا ۔ فلیتنبہ ۱۲ ظ ۔

تو جب ان کو سکون ہوگا اس وقت معاصی کا صدور کم ہوگا۔ اور نا اتفاقی میں ان قویٰ کے اندر اشتعال و ہیجان ہوتا ہے اس وقت زیادہ گڑبڑ ہوتی ہے اسلئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اَلْاَھَمُّ فَالْاَھَمُّ کے لحاظ سے فساد ذات البین کے ضرر پر... خصوصیت کے ساتھ متنبہ فرمایا کیونکہ اس سے واقعی دین کا صفایا ہوجاتا ہے۔

گناہ کے کام میں اتفاق

اور اتفاق اگر معصیت میں بھی ہو تو گو خاص اس کام میں وہ اہل اتفاق کو ضرر پہنچا دے گا۔ مگر اس کا ضرر دوسروں تک متعدی نہ ہوگا اور پھر وہ ضرر مقصود بھی ایک دوسرے ارادۃً و قصداً نہ پہنچے گا۔ بلکہ اس دوستی کی وہ مثال ہوگی جیسے ایک شخص نے ریچھ سے دوستی کی تھی کر تعلیم سے اس کو مہذب بنایا تھا یہاں تک کہ آقا صاحب سو جاتے تو ریچھ کھڑا ہو کر پنکھا جھلتا۔ لوگوں نے منع کیا کہ میاں جانور جانور ہی ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں سونے کی حالت میں اس سے خدمت لینا مناسب نہیں اس نے کہا واہ میرا ریچھ تعلیم یافتہ ہے اس سے کچھ اندیشہ نہیں ریچھ کے تعلیم یافتہ ہونے پر ایک اور لطیفہ یاد آیا۔ رڑکی میں ہمارے ماموں صاحب نے بارش اور کیچڑ کے دن ایک صاحب کو دیکھا کہ پھرک پھرک تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ماموں صاحب نے کہا صاحب ذرا سنبھل کر چلئے کیچڑ زیادہ ہے کہا میں اقلیدس کے قاعدہ سے چل رہا ہوں میں گر ہی نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر تھوڑی دور چلے تھے کہ دھڑام سے گرے ماموں صاحب نے فرمایا کہئیے صاحب اب اقلیدس کی کون سی شکل بنی۔ بے چارے کھسیانے ہو گئے تو جیسے ریچھ تعلیم یافتہ تھا۔ ایسے ہی ان حضرات کے پیر تعلیم یافتہ تھے۔ پھر جس طرح ان کے پیروں نے دھوکہ دیا۔ ایسے ہی ریچھ نے دھوکہ دیا۔

کہ ایک دن آقا صاحب سو رہے تھے اور ریچھ پنکھا جھل رہا تھا کہ ایک مکھی ناک پر آ کر بیٹھی ریچھ نے اس کو اڑا دیا وہ پھر آ بیٹھی ریچھ نے اڑا دیا۔ بعض مکھی بڑی

لیچڑ ہوتی ہے کتنا ہی اڑاؤ پھر آبیٹھتی ہے یہاں تک ریچھ اڑاتا اڑاتا عاجز آگیا اور غصہ میں ایک پتھر اُٹھا کر لایا پھر جو مکھی آکر بیٹھی تو آپ نے تاک کر ناک پر پتھر مارا مکھی تو نہ معلوم مری یا اڑگئی مگر آقا کے بھیجے کا بھرتا ہوگیا۔

توجو لوگ کسی گناہ کے کام میں اتفاق کرتے ہیں ان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے کہ وہ ضرر پہنچانے کا قصد تو نہیں کرتے جیسا ریچھ نے آقا کے مارنے کا قصد نہ کیا تھا بلکہ اسنے تو آقا کے دشمن کو مارنا چاہا تھا مگر بدوں ارادہ کے ان کے ہاتھ سے ضرر پہنچ جاتا ہے اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم سے کیا ضرر پہنچا۔

خُدّامِ مشائخ کی حاشیہ آرائی

خصوصًا یہ علماء و مشائخ کے دوست تو ان کا ستیاناس کر دیتے ہیں خادم منہ پر تعریف کرتے ہیں اور بزرگ صاحب پھنگرتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکل ست اما خار جاں — از فریبِ اخلاں و خارجاں

اینت گویدنے منم انبار تو — آفت گویدنے منم ہمراز تو

او چو بیند خلق را سرمستِ خویش — از تکبر می رود از دست خویش

یہ تو شہرت سے دینی ضرر ہوتا ہے آگے فرماتے ہیں کہ اسکے دنیوی ضرر بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ مشہور آدمی پر مخلوق کا طعن و حسد اور رشک اور غصہ اس طرح برستا ہے جیسے مشک کے دہانے سے پانی گرتا ہے۔

چشمہا و خشمہا و رشکہا — برسرت ریزد چو آب از مشکہا

آگے گمنامی کی ترغیب دیتے ہیں کہ جہاں تک ہو شہرت سے بچو اور اس طرح رہو کہ کوئی تم کو جانے بھی نہیں ؎

اشتہار خلق بند محکم ست — بند او از بند آہن کے کم ست

خویش را رنجور سازو زار زار — تا ترا بیروں کنند از اشتہار

مگر یہ وہ شہرت ہے جو اختیار اور طلب سے حاصل ہو اور جو شہرت غیر اختیاری ہو وہ نعمت ہے۔ بعضے اللہ کے بندے گمنام ہونا چاہتے ہیں اور اپنے کو مٹاتے رہتے ہیں۔ مگر جتنا وہ اپنے کو مٹاتے ہیں اور زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں۔ ان کو شہرت سے ضرر نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں حق تعالیٰ کی مدد ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ بہر حال مذموم اتفاق کے یہ دوست بہت مضر ہوتے ہیں مگر بایں ہمہ دوستی کے مفاسد بہ نسبت اس دشمنی کے جو نا اتفاق میں ہوتی ہے بہت کم ہیں۔ مثلاً دوستی میں ایک دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی اور دشمنی میں غیبت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ یہ تو دینی ضرر ہوا۔ پھر یہ بیچ کے نمام اس بہ تشیں حمام کو دوسرے کے پاس لے جاتے ہیں اور ان باتوں کو مع حاشیہ کے جو بالکل غیر واقعی ہوتا ہے اس کے سامنے نقل کرتے ہیں۔

اب تو متن کے لیے حاشیہ ضروری ہی ہو گیا ہے اور ان حواشی کے غیر واقعی ہونے کا مجھ کو تو اس قدر تجربہ ہو گیا ہے کہ میں نے جب کسی واقعہ کی تحقیق کی ہے تو بات اتنی نہیں نکلتی جتنی کہی گئی تھی۔ پھر باوجودیکہ ہر تجربہ کار کا اس پر اتفاق ہے کہ نقل کرنے والے حاشیہ چڑھا کر بات کو نقل کرتے ہیں مگر پھر بھی سُنی سُنائی بات پر اعتماد کر لیا جاتا ہے اور اس کی تحقیق کوئی نہیں کرتا۔ بلکہ بعض تو تحقیق سے رکتے ہیں۔ تاکہ یہ بات کہیں جھوٹی ثابت نہ ہو جائے پھر سارا مزہ ہی جاتا رہے گا۔

غیبت کا نسب نامہ

اب غیبت سے دوسرے تک بات پہنچی اور اس کے دل میں اول کبیدگی پیدا ہوئی پھر وہ بھی اس کی غیبت کرتا ہے اور وہ بھی بیچ والوں کی بدولت پہلے شخص تک پہنچ جاتی ہے اس عداوت میں اور ترقی ہو جاتی ہے۔ تو غیبت عداوت کا باپ بھی ہے اور

اور بیٹا بھی۔ یعنی کبھی عداوت سے غیبت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی غیبت سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے جس کا سبب ایسا بیہودہ ہو اس کی بیہودگی کے لیے یہی بات کافی ہے پھر جب کوئی کسی کے درپے ہو جاتا ہے تو مشاہدہ ہے کہ دین کا خیال بالکل نہیں رہتا۔ اب نہ ایذا سے دریغ ہے نہ جھوٹ اور فریب سے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دشمن کو ضرر پہنچ جائے چاہے اس کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ کیوں نہ ہو جائے۔ پھر اس کے لیے ہر ممکن تدبیر سوچی جاتی ہے۔ خواہ دین اور حیا اس کی اجازت دے یا نہ دے کیونکہ آجکل شرافت تو رہی نہیں۔ ہمارے ماموں صاحب کا اس کے متعلق خوب شعر ہے ؎

ہے شرافت تو کہاں بس شرآفت ہے ... ست ریاست سے گیا ریا باقی ہے

اگر انسان میں دین بھی نہ ہو مگر شرافت ہو تو جب بھی بہت سے بیہودہ کاموں سے بچا رہتا ہے اور جب نہ دین ہو نہ شرافت تو اب اس سے کسی کام سے رکنے کی امید نہیں آجکل شرافتِ نسب گو باقی ہے مگر شرافتِ اخلاق نہیں رہی اسی لیے دشمنی میں انسان کسی قسم کی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔

خصوصاً عورتوں میں تو یہ مرض بہت زیادہ ہے گو ان کی دشمنی شدید تو نہیں ہوتی کیونکہ یہ دشمنی میں کسی کا خون نہیں کرتیں عدالت نہیں کرتیں۔ مگر یہ ان کا کمال نہیں بلکہ پردہ کا کمال ہے جس کی وجہ سے ان کی چادر سے باہر نکلنے کی قوت نہیں اور اسی میں خیر ہے۔ اگر پردہ نہ ہو تو پھر آپ دیکھیں یہ کیا ستم ڈھاتی ہیں آجکل لوگ اس پردہ کے بہت پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کا ثبوت کہاں ہے میں اس وقت تنگیٔ وقت کے سبب آپ کے سامنے حدیث و قرآن تو پیش نہیں کرتا مگر ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ خدا کے لیے اس پردہ کو نہ اٹھائیے ورنہ وہ مفاسد پیدا ہوں گے جن کا انسداد قبضہ سے باہر ہو جائے گا۔ پھر آپ تجربہ کے بعد

خود پردہ کرنا چاہیں گے مگر اس وقت ناکامی ہوگی۔ میں آپ سے ایک موٹی بات کہتا ہوں وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے جن کو مجنون بنایا ہے ان کو آپ خود قید کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نقص عقل موجب قید ہے۔ جب یہ بات مُسَلَّم ہوگئی تو عورتوں کے لیے بھی اسی وجہ سے قید پردہ کی ضرورت ہے کیونکہ ان کا بھی ناقص العقل ہونا مُسَلَّم ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہونا چاہیئے کہ جیسا نقص ہو ویسی ہی قید ہو مجنون کامل کے لیے قید بھی کامل ہوتی ہے کہ ایک کوٹھری میں بند کر دیتے ہیں ہاتھ پیر باندھ دیتے ہیں۔ اور مجنون ناقص کے لیے قید ناقص ہونا چاہیئے کہ اسکو بلا اجازت گھر سے نکلنے کا اختیار نہ دیا جائے اور جب جائے ڈولی یا گاڑی میں جائے۔

باقی تعلیم کے لیے پردہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے تعلیم پردہ میں بھی ہوسکتی ہے اگر بے پردہ ہونے کو تعلیم میں دخل ہوتا تو ساری باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہوتیں۔ مگر تجربہ یہ ہے کہ وہ تعلیم میں کسی پردہ والی کے برابر بھی نہیں اور اگر کسی خاص قوم میں باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہوں تو اول تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا ان کی عورتوں پر بے پردگی کی وجہ سے کوئی بُرا اثر نہیں ہوا تحقیق کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس آزادی نے ان کے اخلاق و عفّت پر کتنا بُرا اثر ڈالا ہے پھر ایسی تعلیم کو لے کر کیا چولہے میں ڈالے۔ دوسرے وہاں باہر پھرنے کو تعلیم میں دخل نہیں ہوا۔ بلکہ تعلیم میں دخل اس بات کو ہے کہ اس قوم کو تعلیم نسواں کا اہتمام ہے انہوں نے اپنی عورتوں کو تعلیم کی غرض سے بے پردہ نہیں کیا بلکہ وہ تو بے پردہ پہلے ہی سے تھیں کیونکہ اس قوم میں ہمیشہ ہی سے بے پردگی کا رواج ہے اگر بے پردگی کو تعلیم میں دخل ہوتا تو چاہیئے یہ تھا کہ ان کی عورتیں ہمیشہ ہی سے تعلیم یافتہ ہوتیں۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ اب ہی کچھ زمانہ سے ان میں

تعلیم پیدا ہوئی ہے جب سے ان کو تعلیم کا اہتمام ہوا ہے اور اس کے پہلے عورتیں تو کیا ان کے مرد بھی جاہل وحشی تھے۔ جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے۔

پس معلوم ہوا کہ تعلیم کا اصل مدار اہتمام پر ہے تو آپ بھی اہتمام کیجئے اور پردہ میں رکھ کر ہی اپنی عورتوں کو پڑھائیے۔ یقیناً تعلیم یافتہ ہو جائیں گی۔ آخر ایک زمانہ میں مسلمانوں کی عورتیں بھی تو بہت تعلیم یافتہ ہو چکی ہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی پردہ موجود تھا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عروج کے زمانہ میں کتنی عورتیں محدث اور مفسر اور ادیب عالم ہوئی ہیں۔ (۱۲ جامع)

مگر عورتوں کو پردہ میں رکھ کر بھی صرف دینیات کی تعلیم دینا چاہیے جغرافیہ اور تاریخ نہ پڑھانا چاہیے ورنہ ان کو بھاگنے کے راستے معلوم ہو جائیں گے پھر وہ گھر سے ایسی جائیں گی کہ پتہ بھی نہ دیں گی۔

غرض اپردہ کی وجہ سے عورتوں کی نااتفاقی شدید تو نہیں ہوتی مگر مدید ہوتی ہے کہ ان میں باہم کشیدگی ہوتی ہے تو زمانہ دراز تک اس کا سلسلہ چلتا ہے نیز ان میں ایک ایسی بری عادت ہے کہ جب کسی بات پر لڑائی ہوگی تو پہلے مردے اکھڑے جاتے ہیں۔ مردوں میں یہ مرض کم ہے مگر عورتیں جن باتوں کی صفائی بھی کر چکتی ہیں دوبارہ لڑائی کے موقعہ پر پہلی باتوں کو پھر دہراتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت کا معاملہ اگر فی نفسہٖ خفیف بھی ہو تو پہلی باتوں کی یاد دہانی سے سنگین بن جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یاد دہانی بھی دل خراش الفاظ سے جس میں عورتوں کو خاص ملکہ ہے۔ یہ طعن کے موقعہ پر اپنے احسان کو بھی ایسے عنوان سے جتلاتی ہیں جس سے دوسرے کا کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک خاندان میں نکاح کی تقریب تھی اور صاحب تقریب کی بھاوج بہت مفلس تھی۔ مگر اس نے قرض اور ادھار کر کے اس موقعہ کے

لیے جوڑے تیار کئے اور صرف دلہن ہی کا جوڑا نہیں بلکہ سب گھر والوں کے لیے جوڑے تیار کئے گو وہ بڑھیا تو نہ تھے مگر نام کرنے کو کافی تھے۔ چنانچہ اس نے اُمید سے زیادہ کام کر کے دکھلا دیا پھر کسی موقعہ پر بھاوج اور نند میں تکرار ہوا۔ تو بھاوج کیا کہتی ہے کہ "ارے میں تو وہ ہوں کہ میں نے نہ ہوت میں بھی تمہارے وقت میں سارے خاندان پر کفن ڈالا تھا" ـــــــ دیکھئے! اس نے جوڑے دینے کو کس لفظ سے ادا کیا کہ ساری ڈکشنری بھی ایسا لفظ نہ نکال سکتی مگر ان کی لڑائی باتوں ہی باتوں میں ہوتی ہے اس سے آگے یہ کچھ نہیں کر سکتیں۔

عورتوں پر بے جا اعتماد

البتہ ایک طرح ان کا فساد شدید بھی ہو جاتا ہے کہ بعض دفعہ یہ اپنے آپس کے تکرار کو مردوں سے بیان کر دیتی ہیں کہ فلانی نے مجھے یوں کہا۔ اور تمہیں یہ کہا۔ مردوں میں حرارت ہوتی ہے ان پر زیادہ اثر ہوتا ہے پھر یہ بات ہی تک نہیں رہتے بلکہ ہاتھ سے بھی بدلہ لیتے ہیں جس سے خون تک ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں کی باتوں پر اعتماد نہ کیا کریں۔ اور عورتوں کو بھی لازم ہے کہ ایسی باتیں، مردوں سے نہ کیا کریں۔

اس کی ایک تدبیر عمدہ یہ ہے کہ چند خاندان ایک گھر میں اکٹھے نہ رہا کریں کیونکہ چند عورتوں کا ایک مکان میں رہنا ہی زیادہ فساد کا سبب ہے۔ میرٹھ میں ایک باپ بیٹے ایک ہی گھر میں رہتے تھے بیٹے کو مجھ سے تعلق تھا ان کا ایک خط میرے پاس آیا جس کا خلاصہ دو مضمون تھے ایک یہ کہ میں بعضے خلافِ شرع باتوں پر والد صاحب وغیرہ کو نصیحت کرتا ہوں وہ نہیں مانتے اور خلاف شرع کام کرتے ہیں۔ دوسرا مضمون یہ تھا کہ والد صاحب اور میں دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ اسلئے بعض شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں نے سارے خط کے جواب میں ایک

شعر لکھ دیا ہے

کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن

یہ تو پہلی بات کا جواب تھا کہ جب وہ نہیں مانتے تو تم اپنے کام میں لگو۔ آئندہ ان سے تعرض نہ کرو اور یہ

در زمینِ دیگراں خانہ مکن

یہ دوسری بات کا جواب تھا کہ مکان بدل دو اور الگ مکان لے کر رہو۔ چنانچہ انھوں نے اس پر عمل کیا پھر جو خط آیا تو اس میں لکھا تھا کہ مکان بدلنے کے بعد ہی سے تمام پریشانیاں رفع ہوگئیں۔ اور اب ہمارے تعلقات شگفتہ ہوگئے ہیں۔

صاحبو! میرا تجربہ ہے کہ آجکل الگ الگ رہنا زیادہ موجبِ امن ہے۔ نیز آج کل امر بالمعروف اس طرح کرنا کہ کسی کے پیچھے ہی پڑ جائے مفید نہیں اسلیئے میں نے ان کو لکھا کہ جب امر بالمعروف کا اثر نہیں ہوتا تو تم اپنے والد صاحب سے کچھ تعرض نہ کرو۔ اب تم پر امر بالمعروف واجب نہیں۔ یہ تو فتوٰی تھا۔ اور دوسرا جملہ مشورہ کے طور پر تھا کہ تم الگ مکان لے کر رہو۔ کیونکہ آجکل ساتھ مل کر رہنے کا زمانہ نہیں بس اب تو زیادہ وقت تنہائی میں گذارنا چاہیئے۔ اسی میں راحت ہے۔

ـــــ جیساکہ ایک بزرگ فرماتے ہیں

جہد کن و با مردمِ دانا بنشیں
با صدق و صفا (مراد شیخ عارف)
یا با صنمِ لطیف و رعنا بنشیں
با شرم حیا (مراد زوجۂ عفیفہ) زیں ہر دو اگر یکے میسر نہ شود :: از طالع خویش ::
اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں در یادِ خدا

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل ہی وحشی بن جاؤ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت

نہ ملو۔ کہ اس وقت زیادہ ملنا تمام مفاسد کی جڑ ہے۔

انجمن سازی کا مرض

حسنؒ کہ آجکل جو انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور ناکام رہتی ہیں ان کا زیادہ تر سبب یہی ہے کہ یہ زمانہ مل کر کام کرنے کا نہیں ہے کیونکہ آجکل ہر کوئی دوسروں سے اپنی رائے کا اتباع چاہتا ہے اور جہاں بظاہر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار ہے جس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ نفع اختلاط کا ایسا ہے جو خلوت وحدت میں نہیں وہ کثرت بھی حقیقت میں وحدت ہی ہوتی ہے کیونکہ وہاں ایک ہی شخص اپنے اثر سے اپنی تائید کے لیے پہلے سے ایسے لوگوں کو سبق پڑھا پڑھا کر لاتا ہے جن کو اس معاملہ کی سمجھ تو کیا ہوتی ہے لفظ بولنا بھی نہیں آتا پس کثرت برائے نام ہی ہوتی ہے پھر اس کثرت کا مدار بھی کسی لیاقت پر نہیں ہوتا محض تموّل پر ہوتا ہے یعنی اپنے مقاصد و آراء کی تائید بھی ایسے لوگوں سے کرائی جاتی ہے جو زیادہ مالدار ہوں۔ حالانکہ اس کے لیے اصل ضرورت فہم کی ہے

اسی طرح آجکل صدارت بھی مالداروں کو دی جاتی ہے چاہے وہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ صدر کس کو کہتے ہیں —— کانپور میں ایک جلسہ تھا ایک صاحب کو اس میں اپنی رائے کو قوت دینا تھا تو وہ اپنی تائید کے لیے ایک سیٹھ کو ساتھ لائے اور ان کو راستہ میں خوب پڑھا دیا کہ جب میں تقریر کر چکوں تو تم کھڑے ہو کر اتنا کہہ دینا کہ میں اسکی تائید کرتا ہوں۔ وہ بے چارہ بالکل جاہل تھا اتنا لفظ بھی اسے نہ آتا تھا اسکو رٹتا اور یاد کرتا رہا تاکہ ذہن سے نہ نکل جائے اور دل میں دعا کرتا ہوگا کہ تقریر جلدی ختم ہو تو میں اس لفظ کو ادا کر کے چین سے بیٹھوں۔ چنانچہ خدا خدا کر کے تقریر ختم ہوئی تو سیٹھ صاحب کھڑے ہو کر فرماتے ہیں کہ میں اس کی تردید کرتا ہوں۔ غریب کو بجائے تائید کے تردید یاد رہ گیا اس پر مقرر نے چپکے سے کہا کہ نہیں تائید! تو آپ نے کہا میں اس کی تائید کرتا ہوں یہ بالکل ہی مہمل لفظ تھا۔ مقرر نے پھر

لقمہ دیا کہ تائید کہو تائید تو آپ نے تیسری دفعہ تاکید کہا۔ خیر! اس کو لوگوں نے غنیمت سمجھا کیونکہ یہ تائید کے قریب ہی تھا تو صاحبو! اول تو کثرتِ رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہوگی پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے تم یوں کہہ دینا جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں۔ اب وہ کثرت کیا خاک ہوئی وہ تو ایک ہی شخص کی رائے ہوئی جس کے اب لوگ مقلد ہوتے ہیں باقی شریعت میں تو کثرت رائے کوئی چیز نہیں۔ وقت میں گنجائش نہیں ورنہ اسکو بھی بیان کر دیتا۔ تو آجکل ہر شخص اپنی رائے کا اتباع دوسروں سے کرانا چاہتا ہے۔ اسی لیے انجمنوں کا کام نہیں چلتا۔ کیونکہ ارکین انجمن جو اوروں سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اخلاق کی اصلاح تک نہیں ہوئی ان میں کوئی کسی سے چھوٹا بن کر رہنا گوارہ نہیں کرتا اسی لیے بہت جلد ان میں اختلاف ہو جاتا ہے پھر ہر اک اپنی رائے پر ضد کرتا ہے تو چار دن ہی میں انجمن کا خاتمہ ہو جاتا ہے اس لیے میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو کام تنہا ہو سکے وہ مجمع کے ساتھ مل کر ہرگز نہ کرو۔ اکثر دیکھا ہے کہ مجمع میں کام بگڑ جاتا ہے۔ دنیوی کامیابی بھی اکثر نہیں ہوتی۔ اور اگر کبھی دنیا مل بھی گئی تو دین کا تو ستیاناس ہی ہو جاتا ہے اور جو کام تنہا نہ ہو سکے مجمع ہی کے ساتھ ہو سکے اس کے لیے اگر دینداروں کا مجمع میسّر ہو جائے تو کرو۔ بشرطیکہ سب دیندار ہوں یا دینداروں کا غلبہ ہو اور اگر غلبہ دنیا داروں کا ہوا اور دیندار مغلوب یا تابع ہوں تو ایسے مجمع کے ساتھ مل کر کام کرنا واجب نہیں اس وقت آپ اس کام کے مکلف ہی نہ رہیں گے کیونکہ یہ مجمع بظاہر مجمع ہے اور حقیقت میں یہاں تشتّت ہے وہی حال ہوگا ؎

تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى تو یوں کہنا چاہیے کہ مجمع میسّر ہی نہیں پھر جو کام اس پر موقوف تھا وہ واجب یا فرض کیونکر ہوگا۔

اتفاق کی جڑ

میں سچ کہتا ہوں کہ آجکل جو تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ اتفاق کرو، اتفاق کرو۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سب میرے ساتھ اتفاق کریں ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی دعوت دیتا ہے اور اس صورت میں قیامت تک اتفاق قائم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قیام اتفاق کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس کے لیے آمادہ ہو کہ اگر کوئی میرا اتباع نہ کریگا تو میں اس کا اتباع کر لوں گا [بشرطیکہ خلاف شرع کام نہ کرے] حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ آجکل لوگ اتفاق پر تو بہت زور دیتے ہیں مگر اس کی جڑ کو نہیں دیکھتے۔ اتفاق کی جڑ تواضع ہے یہ ایک حجرہ نشین صوفی کی تحقیق ہے جس کے سامنے تمام تحقیقات فلسفیہ گرد ہیں۔

آپ نے ایک صوفی کی تحقیق تو سُن لی۔ ذرا اس پر عمل کر کے اتفاق کیجیے دیکھیے کامیابی ہوتی ہے یا نہیں عمل کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقی فلسفی یہی لوگ ہیں یہ حضرات معانی کے ان خواص کو سمجھتے ہیں جن کی حکماء کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اس کا تجربہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کسی فلسفی کو کسی محقق صوفی کے پاس چھ مہینے کے لیے چھوڑ دیجیے ان شاء اللہ وہ خود اپنے کو احمق کہہ کر اُٹھیگا۔

افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس سے اول مشاہیر حکماء کے متعلق پوچھا سب کو لاشے بتلایا۔ پھر صوفیہ اسلام جنید اور شبلی وغیرہم کے متعلق پوچھا اس نے کہا اُولٰئِكَ هُمُ الْفَلَاسِفَةُ حَقًّا۔ کہ سچے فلسفی یہی لوگ ہیں۔

طلب اتفاق کے لیے طریق

بس جو لوگ اتفاق کے طالب ہیں اور میل کرنا چاہتے ہیں ان کو پہلے اپنے اندر تواضع پیدا کرنا چاہیے اور تواضع کیسے پیدا ہوگی؟۔ اس کے جواب میں تحقیق و دلائل کا تو وقت نہیں مگر تقلیداً مان لیجے کہ اس کا طریقہ یہ ہے ؎

قال را بگذار مرد حال شو ۔۔۔ پیش مرد کاملے پامال شو

تواضع حاصل کرنے کے لیے کسی کامل کے قدموں میں پامال ہونے کی ضرورت ہے ؎

نفس نتواں کُشت الا ظلِ پیر　　　　دامنِ آں نفس کُش را سخت گیر

سخت گیر کا مطلب یہ ہے کہ اُسکے احکام کا اتباع کرو اور اس کی بات بات پر ناک چڑھاؤ ورنہ وہی حال ہوگا جو اس شخص کا ہوا تھا جس نے ایک گودنے والے سے کہا کہ میری پُشت پر شیر کی تصویر بنا دے اُسنے ایک جگہ سوئی چبھوئی تو اُسنے آہ کی اور پوچھا کیا بناتے ہو کہا پیٹ بنا رہا ہوں کہنے لگا اس کو کھانا تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔ پیٹ کو رہنے دو اُسنے دوسری جگہ سوئی چبھوئی اُسنے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو کہا دُم، کہنے لگا کہ شیر دُم کٹا بھی تو ہوتا ہے اُسکو دُم کٹا ہی رہنے دو۔ اُسنے تیسری جگہ سوئی چبھوئی اُسنے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو کہا کان کہنے لگا۔ شیر بوچا بھی تو ہوتا ہے اسکو بوچا ہی رہنے دو۔ اُسنے چوتھی جگہ سوئی لگائی آپنے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بنا رہے ہو کہا سر، کہنے لگا اسکو بھی رہنے دو۔ یہ شیر بے سر ہی سہی۔ گودنے والے نے جھلا کر سوئی پھینک دی۔ اور کہا ؎

شیرِ بے گوش و سر و شکم کہ دید　　　　ایں چنیں شیرے خدا ہم نا فرید

آگے مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقتِ سوزن زدن　　　　از چنیں شیرِ ژیاں پس دم مزن

تو اسی طرح جس کو شیخ کی سختی کا تحمل نہ ہو اور بات بات پر ناک چڑھائے اس کو اصلاح نفس کا نام ہی نہ لینا چاہیئے وہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ ؎

گرم گوید سخت گوید خوش بگیر　　　　تجربہ یہ ہے جس طرح اولاد بدوں نکاح کے نہیں ہوتی اسی طرح اصلاح اخلاق بدوں کسی شیخ کے پاس پامال ہونے کے نہیں ہوتی۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　　　دامنِ رہبر بگیر و پس برآ

یار باید راہ را تنہا مرو ۔ بے قلاؤزاندریں صحرا مرو

اور بعض بزرگوں کی بابت جو سنا جاتا ہے کہ وہ بدوں کسی شیخ کے کامل ہو گئے مولانا نے اس کی بھی حقیقت تبلائی ہے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا دراین راہ بر ید ۔ ہم بعون ہمتِ مرداں رسید

یعنی وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور دعا ہی سے واصل ہوئے ہیں ۔ گو ظاہر میں کسی سے بیعت نہ ہوئے ہوں نہ کسی کی صحبت میں رہے ہوں ۔ اسکی صورت یہ ہوئی ہے کہ کسی اہل اللہ نے ایک شخص کو دین کے کام میں لگا ہوا دیکھا اسکے جی خوش ہوا انہوں نے دعا اور توجہ کر دی جس کی برکت سے وہ واصل ہو گیا ۔ مگر اس کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ اگر محبتِ اولیاء اللہ نہ ہو تو کم از کم ان پر انکار بھی نہ ہو ورنہ توجہ کیسے ہو گی پس یہ ہے تاریخ اتفاق کے حدوث وبقاء کی کہ اتفاق کا مدار تواضع پر ہے اور تواضع موقوف ہے اصلاح نفس پر اور اصلاح نفس موقوف ہے شیخ کامل کی صحبت پر یا کم از کم عدم انکار ہی ہو کہ ان کی غیبت و شکایت تو نہ کیا کریں ۔

اتفاق میں احتیاط

نیز اتفاق میں علاوہ ان شرائط کے اس کی بھی ضرورت ہے کہ اتنا اختلاط بھی نہ ہو کہ اپنے خاص اسرار دوسروں سے ظاہر کر دے کیونکہ ممکن ہے کسی وقت یہ تعلق نہ رہے تو پھر ان اسرار کے اظہار پر پچھتانا پڑے گا ۔ حدیث میں آتا ہے أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَا عَسَى أَنْ يَكُونَ بَغِيضَكَ يَوْمًا ۔ وَأَبْغِضْ بَغِيضَكَ هَوْنًا مَا عَسَى أَنْ يَكُونَ حَبِيبَكَ يَوْمًا ۔ یعنی دوست سے سنبھل کر دوستی کرو زیادہ گھال میل نہ کرو شاید کسی دن دشمنی ہو جائے تو گھر کے بھیدی کی دشمنی بہت ضرر دیتی ہے اور اگر کسی کو اپنے دوست کی نسبت عداوت کا احتمال نہ ہو تو وہ اپنی ہی نسبت یہ احتمال رکھے کہ شاید کسی دن میں ہی بدل جاؤں اسلئے اتفاق میں بھی

احتیاط کی ضرورت ہے اسی طرح اگر کسی سے عداوت کرو تو وہاں بھی حد کے اندر عداوت کرنا چاہیئے حد سے نہ بڑھے کیونکہ کیا عجب ہے کسی وقت پر دوستی کرنے کی ضرورت ہو تو اس وقت آنکھیں سامنے کرنے سے حیا دامن گیر ہو گی اور جس کی دوستی اور دشمنی اعتدال سے ہو گی اسکو کسی وقت بھی پریشانی نہ ہو گی۔

اتفاق و خوشامد کا فرق

یہ تو اتفاق کے حدود و اسباب تھے اور میں بتلا چکا ہوں کہ ایک درجہ نا اتفاقی کا بھی مطلوب ہے وہ یہ کہ کسی جماعت نے معصیت پر اتفاق کیا ہو ان کی مخالفت اور ان سے علیحدگی شرعاً مطلوب ہے یا اتفاق تو معصیت پر نہ ہوا تھا لیکن اتفاق کے بعد وہ لوگ معاصی اختیار کرنے لگے تو اس وقت دینداروں کو ان سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل جہاں دیندار اور بے دین لوگ کسی کام میں اتفاق کرتے ہیں وہاں بے دین تو اپنے طریقہ پر پختہ ہوتے ہیں۔ اور نہ معلوم دیندار کیوں ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ بے دین تو وہی کرتے ہیں جو ان کے مذاق کے موافق ہو اور ان کے مذہب کے موافق ہو۔ اور ان کی رائے میں مفید ہو اور دیندار باوجود یہ جان لینے کے کہ یہ کام ہمارے مذہب میں ناجائز یا حرام ہے یا یہ طریقہ ہمارے نزدیک مضر ہے مفید نہیں یا یہ کام ہماری جماعت کے مذاق کے خلاف ہے پھر بھی بے دینوں کے ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں تاکہ اتفاق میں فتور نہ آئے۔

سبحان اللہ صاحبو! اتفاق تو طرفین سے ہوا کرتا ہے جب دوسری جماعت آپ کے جذبات کی رعایت نہیں کرتی تو اب وہ اتفاق ہی کہاں رہا۔ بس یوں کہو کہ تم ان کی محض خوشامد کر رہے ہو۔ اگر اتفاق ہوتا تو دوسرے بھی تو تمہاری کچھ رعایت کرتے مگر لوگوں نے آجکل خوشامد کا نام اتفاق رکھ لیا ہے۔ اس لیے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مخلوق طعن کرے گی کہ انہوں نے اتفاق میں کھنڈت ڈال دی

میں کہتا ہوں کہ تم اس طعن سے کیوں ڈرتے ہو صاف کہہ دو کہ ہاں ہم نے اتفاق کو توڑ دیا۔ اس لیے کہ اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب نہیں۔ بلکہ بعض دفعہ نااتفاقی بھی مطلوب ہے جب کہ اتفاق سے دین کو ضرر پہنچ رہا ہو۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں کیونکہ بقدر ضرورت میں نے اختلاف کے مفاسد اور اتفاق و نااتفاقی کے حدود بیان کر دیئے ہیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق دیں۔ آمین۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وعظ کا نام الانسداد للفساد رکھ دیا جائے۔

وَصَلَّی اللّٰہ علٰی سیدنا ومولٰنا محمد وعلٰی اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

اشرف علی ۱۰ شوال المکرم ۱۳۵۰ھ

سلسلۃ التذکرہ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

الاتفاق

۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ

کو جامع مسجد تھانہ بھون میں

۲ گھنٹے چالیس ۴۰ منٹ تک

اتفاق کے اسباب کی تشخیص کے سلسلہ میں بیٹھ

کر بیان فرمایا

حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہی مرحوم

نے

یہ وعظ قلمبند فرمایا

سامعین کی تعداد

تقریباً دو سو ۲۰۰ تھی

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ○

یہ آیت سورۂ مریم کی ہے۔ مجھ کو اس کے ایک ضروری مضمون کا بیان کرنا مقصود ہے اور خود اُس کی ضرورت تو پہلے سے سب ہی کے نزدیک مسلّم ہے۔ مگر بیان کی ضرورت ذہن میں ابھی آئی ہے۔ میں گڑھی پختہ گیا تھا اُس کے متصل حسن پور ہے وہاں بھی جانا ہوا۔ اور وہاں وعظ بھی ہوا تھا۔ عین بیان کے وقت اس مضمون کی ضرورت بھی ذہن میں آئی۔ چنانچہ

کچھ ناتمام سا بیان بھی کیا۔ ارادہ یہ تھا کہ اس مضمون کو کسی موقع پہ مستقلاً بیان کرونگا آج بیان کا ارادہ نہ تھا لیکن بعض احباب اور بعض اعزّہ تشریف لے آئے اور زبانِ حال سے ان کی فرمائش اور اشتیاق ظاہر ہوا۔ اس لیے دل چاہا کہ اُس مضمون کو آج بیان کردوں۔ لیکن یہ سوچتا تھا کہ اُس مضمون کو کسی آیت یا حدیث سے بیان کردوں۔ کوئی آیت یا حدیث ایسی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ مضمون اس کا مدلول صریح ہو۔ جمعہ سے پہلے غسل وغیرہ کی تیاری میں پھر رہا تھا کہ اتفاقاً یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے زبان پر جاری ہوگئی لیکن اس خیال سے نہیں کہ اس مضمون سے اُس کا تعلق ذہن میں ہو۔ بلکہ اس طور سے کہ ہر مسلمان کو خالی وقت میں شوق میں کسی آیت یا حدیث کے زبان سے تکرار کرنے کی توفیق ہو ہی جاتی ہے۔ عین تلاوت کے وقت تو کچھ خیال نہیں آیا۔ بعد میں دفعۃً ذہن منتقل ہوا کہ یہ تو میرے مقصود پر صریح دال و ناطق ہے۔ میں نے اس کو من جانب اللہ سمجھا اور اسکو اپنے مضمون مقصود کا متمسک بنایا۔

ترجمۂ آیت

رہا یہ کہ وہ مضمون کیا ہے سو وہ نفس ترجمہ سے ذہن میں نہ آویگا۔ مگر برکت کے لیے اول ترجمہ کسی قدر تفسیر کے ساتھ کئے دیتا ہوں۔ حق تعالٰے فرماتے ہیں کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لیے محبت پیدا کردیں گے یعنی ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے لیے اللہ تعالیٰ ایک وعدہ فرماتے ہیں اور وعدہ بھی قریب کا۔ گو یہ آخرت کا وعدہ بھی ہوسکتا ہے کہ آخرت بھی قریب ہی ہے مگر سیجعل کے س سے متبادر یہی ہے کہ دنیا کا وعدہ ہے کیونکہ قرب متعارف دنیا ہی کو ہے چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کام جلدی ہوجائے گا تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہوجائے گا۔ پس ہم کو بناءً علی القواعد اللسانیہ یہ حق حاصل ہے جس شے

کی نسبت حق تعالیٰ جلدی ہو جانے کا وعدہ فرما دیں۔ اُس کو دنیا کے وعدہ پر اور دنیا میں بھی بہت جلد حاصل ہو جانے پر محمول کر لیں۔

بہر حال ایمان اور عمل صالح پر وعدہ وُدّا کا جس کا نام محبت ہے، فرماتے ہیں۔ یعنی ایمان اور عمل صالح والوں کی محبت اللہ تعالیٰ پیدا کر دیں گے اس مقام پر اہل علم اس کو یاد رکھیں کہ میں نے اس حاصل ترجمہ میں وُدّ کو مصدر مبنی للمفعول یعنی مصدر مجہول لیا ہے۔ آگے چل کر یہ بات کام آویگی۔ یہ تو ترجمہ ہوا۔ آیت کا۔ اس ترجمہ سے وہ مضمون ذہن میں نہ آیا ہوگا۔ قبل اس کے کہ میں آیت سے اپنا مضمون مقصود استنباط کروں۔ اوّل اُس مضمون کی تعیین کر دوں۔ اور اُس سے بھی اول سمجھنا چاہیئے کہ وہ مسئلہ جس طرح قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ تمدّن کا بھی مسئلہ ہے بلکہ تمدّن پرستوں کے نزدیک تو تمامی مسائل تمدّن کا وہی اصل الاصول اور اس اور اساس ہے، اور اُن کا کوئی لیکچر و تقریر اس سے خالی نہیں ہوتا وہ مسئلہ کیا ہے **اتفاق**! ساری دنیا اس کی دعوت دیتی ہے خواہ اُس کی حقیقت سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں لیکن اس پر اتّفاق ہے کہ اتّفاق ضروری ہے۔ اور تمدّن کے تمام اصول اس پر موقوف ہیں۔ کوئی اصل تمدّن کے بغیر اس کے بار آور نہیں ہو سکتی۔ ہر چند کہ اب شہرت کی وجہ سے یہ مسئلہ باوقعت نہیں رہا۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے اب بھی امہات مسائل سے ہے خصوص تمدّن کو اسکے ساتھ بہت ہی بڑا علاقہ۔ بلکہ اُس کا موقوف علیہ اور مبنیٰ ہے پس سے میں اس مسئلہ کو اس آیت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

کمالِ قرآنِ حکیم

اور اسکے سُننے کے بعد یہ بھی معلوم ہو جاویگا کہ قرآن مجید ہی وہ شے ہے کہ ہم کو ہر موقع اور ہر شے میں اس کی ضرورت ہے۔ کوئی حالت ہماری ایسی نہیں کہ ہم کو اُس

کی ضرورت نہ ہو لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ اگر کپڑا بُننے کی ضرورت ہو یا مکان بنانے کی ضرورت ہو۔ یا کوئی مشین چلانے کی ضرورت ہو تو اُس کا بھی طریقہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ ہم اس کا دعوے نہیں کرتے اور نہ ہم اسکو نباہ سکتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس کا بھی التزام کیا ہے۔ چنانچہ شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ کی ایک کتاب ہے۔ شجرہ نعمانیہ اس کا نام ہے۔ انہوں نے اپنے زمانہ سے لیکر نفخ صور تک کے حالات صرف سورۂ روم کی اوّل آیات سے لکھے ہیں اور اُس میں علم جفر و تکسیر وغیرہ سے کام لیا ہے حروف کے اعداد لے کر اُن کے اندر کچھ قواعد جاری کئے ہیں۔ اصل میں تو واقعات انکو منکشف ہوئے ہیں۔ انہوں نے خاص ذوق و سلیقہ سے ان آیات سے اُن کو چسپاں کر دیا ہے۔ اور یہ سب رموز ہیں پھر اُسکی شرح بھی خود ہی لکھی ہے وہ بھی رموز میں ہے۔ پھر کسی بزرگ نے اُس کی بھی شرح لکھی ہے لیکن وہ بھی رموز اور اشارات میں ہے باوجود اس قدر اخفاء کے پھر ڈر ہوا ہے کہ کوئی سمجھ کر ظاہر نہ کر ڈالے۔ اس لیے ماتن اور شارح دونوں نے بے انتہا قسمیں دی ہیں کہ اگر کوئی انکو سمجھ جاوے تو منہ پر نہ لاوے۔

بعضوں نے اور علوم بھی قرآن مجید سے نکالے ہیں اور اسی بناء پر بعض لوگوں نے کہا ہے ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنه افہام الرّجال

مگر میں کہتا ہوں ؎

و للناس فیما یعشقون مذاھب ومن مذھبی حب الدیار لاھلہا

شخص کا مذاق جُدا ہے ہمارا مذاق تو اسکے خلاف ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کتاب کا کمال اسکے موضوع کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی جس فن کی وہ کتاب ہے اُس فن میں یکتا ہونا اور زوائد سے خالی ہونا ہی اُس کی خوبی ہے۔ طبِّ اکبر کی یہ خوبی

نہیں ہے کہ اُس میں غیر طب کے بھی مسائل ہوں مثلاً صرف ونحو کے مسائل اس میں مذکور ہوں اُس کا کمال تو یہ ہے کہ اُس میں طب کے مسائل خوبی سے درج ہوں۔ ہاں اُن کے ضمن میں یا اُن مسائل کے تتمیم کے لیے اگر دوسرے فن کے مسائل آجاویں تو مضائقہ نہیں جیسے نفیسی کی کلیات میں فلسفہ سے کام لیا گیا ہے۔ پس قرآن مجید ایک طب کی کتاب ہے۔ آپ کو یہ جملہ سنکر شاید شبہ ہوا ہوگا کہ قرآن مجید میں گلِ بنفشہ کا تو کہیں ذکر نہیں پھر اس کو طب کیسے کہہ دیا؟ ——— صاحبو! میری مراد طب سے طب جسمانی نہیں ہے۔ طبِ رُوحانی ہے یہ طب وہ ہے جس کی نسبت فرماتے ہیں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں　　　حکمتِ ایمانیاں را ہم بخواں

آگے دونوں طبّوں کی غایت بیان فرماتے ہیں ؎

صحت ایں حس بجوئید از طبیب　　　صحت آں حس بجوئید از حبیب

صحت ایں حس ز معموریٔ تن　　　صحت آں حس ز تخریبِ بدن

تو قرآن مجید اس طب کی کتاب ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ طب بدنی کی کتابوں میں امراض بدنیہ اور ان کے علاج اور تدبیریں لکھی ہیں جس کا ثمرہ صحت و بقاء حیاتِ دنیوی ہے اور قرآن مجید جس طب کی کتاب ہے اُس میں امراض نفسانیہ اور ان کا علاج مذکور ہے اور اس کا ثمرہ ہلاکت ابدی سے نجات ہے۔ پس قرآن مجید میں صرف اس طب کے مسائل ہونا قرآن مجید کا یہی کمال ہے۔ اور دوسرے مسائل اپنے ذہن میں سے اُس میں نکالنا یہ قرآن مجید کے لیے نقص کا باعث ہے۔ باقی بزرگوں کے کلام میں جو غیر فن کے بعض اسرار کا تعلق قرآن مجید سے متوہم ہوتا ہے وہ مدلولات کی حیثیت سے نہیں بلکہ لطائف کے درجہ میں ہے۔

قرآن حکیم سے سائنسی مسائل کا استنباط

آجکل بہت سے قرآن مجید کے دشمن دوست نما پیدا ہوئے ہیں۔ جو قرآن مجید میں سے سائنس کے مسائل درجۂ دلالت میں ثابت کرتے ہیں یہ سخت دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ تو فخر کے طور پر کہتے ہیں کہ جو مسئلہ اہل یورپ اور سائنس دانوں نے آج سمجھا ہے وہ قرآن مجید میں تیرہ سو برس پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکل چکا ہے۔ لیکن فی الواقع ؎

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست　　حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

خدا کو اور خدا کے کلام کو اس خیر خواہی کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو! اس مسلک میں کئی طرح کی دشمنی ہے اور مولوی لوگ اُن مسائل کی تحقیق اور قرآن مجید کے ساتھ زبردستی چسپاں ہوسکنے کی تقریر سے بے خبر نہیں ہیں۔ چنانچہ میں حالانکہ ایک ادنیٰ طالب علم ہوں مگر خود میرے پاس اس کا بڑا دفتر ذہن میں موجود ہے لیکن اُن ہی خرابیوں کے سبب قرآن مجید سے اُن کو کبھی متعلق نہیں کیا جاتا بقول بزرگے ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

ہمارے زمانہ کے یہ محققین تو یوں سمجھتے ہیں کہ ان مُلّانوں کو خبر نہیں ہے۔ صاحبو! ان مدعیوں کو تو ایک ہی خبر ہے کہ یہ مسائل قرآن مجید سے اس طرح نکلتے ہیں اور مُلّانوں کو اس کی بھی خبر ہے اور اس میں جو مضرت ہے اس کی بھی خبر ہے۔ چنانچہ اہل نظر و تحقیق کے نزدیک ایک خرابی جو اس کے لیے لازم غیر منفک ہے یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے وہ مسئلے اُس فن کے نہیں۔

طب کی کتاب اگر کوئی لکھے اور اس میں ایک فصل تو لکھے امراض راس کی اور آگے اس کے فعل فعلا فعلوا کی بحث لکھے پھر دوسری فصل لکھے۔ امراض بطن کی اور تیسری فصل میں یفعل یفعلان کی بحث لکھ دے تو یہ کتاب کیا ہوگی۔ آدھی میزان الطب اور آدھی میزان

الصرف اس کو کہا جاویگا۔ پھر اُس کو اگر اہل علم کے روبرو پیش کیا جائے تو اُس کتاب کو کون پسند کریگا۔ تو کیا قرآن مجید کو آپ ایسا بنانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ قرآن مجید کیلیے نقص نہ ہوگا۔ دوسرے جو مسائل قرآن مجید سے یہ لوگ استنباط کرتے ہیں اور جن کے اوپر بڑا فخر و ناز ہے وہ کوئی وقیع مسائل بھی نہیں سب ممدو معاون شکم و دہن کے ہیں تو جن کے نزدیک شکم و دہن اور اُن کی خدمت بڑی چیز ہے اُن کے نزدیک یہ مسائل بیشک مہتم بالشان اور مایۂ فخر و ناز ہونگے۔ ہم تو اُن کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ اور اگر وہ ایسے مسائل ہوں جن میں شکم و دہان کی بھی امداد نہیں تو پھر تو بالکل ہی لغو ہونگے۔ کیونکہ نہ آخرت کے لیے مفید نہ دنیا کے لیے نافع۔ حاصل یہ کہ وہ مسائل اگر کچھ کام کے ہیں تو دنیا ہی کے کام کے ہیں تو جن کے نزدیک دنیا بڑی چیز ہے وہ ان مسائل پر فخر کرے اور جن کو دنیا اُس کی اصلی حالت پر نظر آرہی ہو اور وہ اصلی حالت کیا ہے یہ ہے کہ لو کانت الدنیا عند اللہ جناح بعوضۃ ماسقی منھا کافراً شربۃ ماء۔ یعنی اگر دنیا اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو کافر کو اُس میں سے ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ پلاتے۔ پس اُن کے نزدیک تو یہ مسائل باد در دست اور نقش بر آب سے بھی کم ہیں۔ ان تحقیقات کی اہل نظر کی نظروں میں ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص تھانہ بھون کا جغرافیہ لکھے اور اُس میں اُس نے یہ تو لکھا ہے کہ فلاں جگہ جامع مسجد ہے اور وہ ایسی ہے اور بازار اس قسم کا ہے۔ اور فلاں موقع پر قاضی نجابت علی خاں کا مکان ہے لیکن کسی جگہ لونڈیوں نے کھیلنے کے لیے گارے سے ایک گھوڑا بنایا تھا۔ بھلے مانس اُس جغرافیہ میں وہ بھی لکھ دیا تو ظاہر ہے کہ جغرافیہ داں اور اہل علم اُس شخص پر کیسا کچھ ہنسیں گے اور کس قدر بے وقوف بنائیں گے۔

سو اسی طرح اہل بصیرت بھی اس زمانہ کے محققین کی تحقیقات پر ہنستے ہیں واللہ! دنیا کے مسائل قرآن مجید میں ہونا ایسے ہی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی کمتر جیسے اُس

جغرافیہ میں لڑکیوں کا ریت کا گھر۔ اور منشا اصلی ان تحقیقات کے قرآن مجید میں داخل کرنے کا یہ ہے کہ یہ لوگ اہل یورپ کو اللہ و رسول کے برابر۔ بلکہ خدا و رسول سے بڑھ کر جانتے ہیں۔ چنانچہ اگر اللہ و رسولؐ کی بات اُن کے موافق ہو تو مانتے ہیں ورنہ اُس میں پھیر پھار کرتے ہیں۔ پس جو مسائل اُن لوگوں نے سمجھے ہیں۔ قرآن مجید کو اُن کے موافق بنانے کے لیے اُن کو قرآن سے استنباط کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اُن کے اقوال اور اُن کی تحقیقات کو تو ان لوگوں نے اصل ٹھہرایا اور قرآن کو تابع۔

سو اس منشأ کا فساد ظاہر ہے۔ سو بنا بھی فاسد۔ پھر اُس پر ان مسائل کا بوجہ دُنیوی ہونے کے بے وقعت ہونا گویا مبنی کا فاسد ہونا ہے۔ پھر قرآن مجید سے استنباط کرنا بناء الفاسد علی الفاسد۔ چنانچہ اُن کے بے وقعت ہونے کی مسلمان کے نزدیک یہ کافی دلیل ہے کہ خدا و رسول تو دنیا کی تحقیر اور توہین کرتے ہیں۔ اور پھر ان حضرات کو اُس پر فخر ہے۔

یاد رکھیے! آپ کے نزدیک اس وقت دنیا قابل قدر و وقعت ہے اور جب كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کا ظہور ہوگا۔ اور آپ جو اس وقت من چنیم من چنانم کر رہے ہیں آپ بھی اس مَنْ (عربی مَن) میں داخل ہو جائیں گے۔ اُس وقت معلوم ہوگا کہ ہم کس غفلات میں مبتلا تھے۔ آج جس سکہ کی قدر ہے کل وہاں اس کی کچھ قدر نہ ہوگی۔ اور اس سکہ کی وہی مثال ہوگی کہ باپ نے اپنے لڑکے نادان کو ایک روپیہ[عہ] جس پر سیاہی[عہ] لگی ہوئی تھی دیا۔ لڑکا اُس کو لے کر جو باہر نکلا تو کسی ٹھگ[عہ] نے دیکھ لیا ٹھگ کے پاس ایک شیشہ[عہ] کا ٹکڑا تھا جو چمک دمک ظاہری میں اس روپیہ سے بڑھ کر تھا

عہ استعداد قبول حق کی جو فطرۃً سب کو ملی ہے ۱۲ عہ ناگواری طبع و نفس ۱۲ جامع۔ عہ از جن دین من الجنۃ والناس ۱۲ جامع للعہ دُنیا و متاع دُنیا جس کو لوگ خریدتے ہیں اور دولت ایمان برباد یا بے رونق کر دیتے ہیں۔ یا کم از کم اُس میں لگ کر اُس دولت کو بڑھاتے ہیں ۱۲ جامع

اُس لڑکے کو اُس نے دھوکہ دیکر وہ روپیہ لے لیا۔ اور شیشہ کا ٹکڑا دیدیا۔ اب لڑکا خوش ہے کہ میرے پاس روپیہ ہے۔ جب بازار پہنچے تو میوہ فروش کو وہ روپیہ دیا اُس نے اٹھاکر پھینک دیا کہ یہ روپیہ یہاں نہیں چلتا۔ یہ مصنوعی اور ظاہری بازار میں چلتا ہے۔ یہ تو واقعی اور سچا بازار ہے —— یہاں سچا سکہ چلے گا اب یہ لڑکا تہی دست رہ گیا اُس وقت سمجھ میں آیا ہے

که بازار چندان که آگنده تر — تہیدست را دل پراگنده تر

اُس وقت سوائے حسرت کے کچھ ہاتھ نہ آوے گا۔ یہ سب قصہ موت کے ساتھ ہی نظر آجائے گا۔ یہ سائنس کے مسائل اور ان تحقیقات جدیدہ کا وہاں پتہ بھی نہ لگے گا وَضَلَّ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۔ الحاصل ایک خرابی تو قرآن شریف سے مسائل سائنس وغیرہ نکالنے کی یہ ہوئی۔

قرآن مجید کی بدخواہی

دوسری خرابی یہ ہے کہ سائنس کے مسائل ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں پرانی سائنس آجکل گرد ہو رہی ہے۔ حال کی سائنس کی خود اختلاف ہے۔ اور ممکن ہے کہ آئندہ جو محققین پیدا ہوں اُن کی تحقیقات اسکی بالکل خلاف ہوں تو آج اگر کسی سائنس کے مسئلہ کو قرآن مجید کی تفسیر بنادیا اور یہ ثابت کردیا اور تسلیم کرلیا کہ یہ مدلول قرآنی ہے تو کل کو جب کہ ان مسائل کی غلطی ثابت ہو جاویگی۔ ایک ادنیٰ سا ملحد اُس کو غلط ثابت کر کے پھر اسکی قرآن مجید کا نعوذ باللہ خلاف واقع کے ہونا دکھلاوے گا۔ اور مخالفین کو یہ کہنے کی گنجائش ہو جاویگی کہ تمہارے مذہب کی یہی کتاب ہے جس میں ایسے خلاف واقع مسائل ہیں۔ پس یہ مسلک درحقیقت قرآن کی خیر خواہی نہیں۔ بلکہ بدخواہی ہے۔

یورپ کی کاسہ لیسی

تیسری خرابی اور ہے اور اس کو میں بے غیرتی سے تعبیر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان مسائل کو مدلول قرآنی بناتے ہیں گویا اہل یورپ کو احسان جتلانے کی گنجائش دیتے ہو کہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بدولت آج قرآن مجید کے معنی معلوم ہوئے۔ اگر ہم ان مسائل کی تحقیق نہ کرتے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیکر اس وقت تک کسی کو قرآن مجید کا پتہ نہ لگتا اور تم کو غیرت دیتے کہ وہ کہیں گے کہ کہاں گئے ابوبکرؓ کہاں گئے عمرؓ کہاں ہیں۔ غزالیؒ اور کہاں ہیں ابن عباسؓ دیکھو ان حضرات میں سے کسی نے قرآن مجید کو نہیں سمجھا۔ پھر سمجھا کس نے یورپ کے دہریوں نے جرمن کے ملحدوں نے۔ افسوس جب ایسا ہوگا تو ڈوب مرنے کا وقت ہوگا۔ خدا کی قسم ہے ہمارے یہاں سب کچھ ہے اور دوسروں کے یہاں کچھ نہیں کیوں اُن کی کاسہ لیسی کی جاتی ہے اور کیوں قرآن مجید میں ان کی خاطر سے تحریف کی جاتی ہے ؎

بر ہوا تاویل قرآں میکنی ۔۔۔ پست و کژ شد از تو معنی سنی

چوں ندارد جان تو قندیلہا ۔۔۔ بہر بینش میکنی تاویلہا

کردہ تاویل لفظ بکر را ۔۔۔ خویش را تاویل کن نے ذکر را

خود تمہارے اندر سب کچھ ہے۔ تمہارے اندر وہ نور موجود ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تم کو کسی کی حاجت نہیں۔ اس نور کی طرف توجہ کرو۔ دیکھو تو کیا کیا علوم کھلتے ہیں۔ جن کے سامنے یہ علوم مادیہ سب خرافات نظر آویں گے ؎

بینی اندر خود علوم انبیا ۔۔۔ بے کتاب و بے معید و استا

اس وقت تم کو معلوم ہوگا کہ وہ سب تحقیقات بچوں کا کھیل تھا۔ پس اے مہذبین کی جماعت اس کا ہرگز ہرگز وسوسہ بھی نہ لاؤ کہ قرآن مجید میں ساری چیزوں کو ٹھونسو۔

قرآنی سائنس کا مقصود

ہاں اگر ضمناً تبعاً کوئی مسئلہ اس حیثیت سے آجاوے کہ اُس کو بھی طب روحانی میں دخل ہو تو اور بات ہے۔ چنانچہ اتنی سائنس قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ جہاں ارشاد ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

یعنی بیشک آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں۔ وہ چیزیں لے کر جو نفع دیتی ہیں لوگوں کو اور پانی میں جو اُتارا ہے اللہ نے آسمان سے۔ پھر جلا دیا اُس سے زمین کو اس کے مرنے (خشک ہونے) کے بعد اور پھیلا دیئے۔ اُس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادل میں جو گھرا ہوا ہے۔ آسمان زمین کے درمیان میں (سب میں) دلیلیں ہیں اُن لوگوں کے واسطے جو عقل رکھتے ہیں۔ سو ان آیات سے ان چیزوں کی تحقیقات منظور نہیں کہ اس حیثیت سے اس کا طب روحانی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس مصنوع سے صانع پر استدلال کیا ہے کہ یہ سب مصنوع ممکن ہیں ان کے لیے کوئی محدث ضروری ہے اور اس حیثیت سے اس کا تعلق طب روحانی سے ظاہر ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً

فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ۝

یعنی اور ہم نے بنایا آدمی کو سنی ہوئی مٹی سے۔ پھر ہم نے اُسکو رکھا نطفہ بناکر… مضبوط بناکر (عورت کے رحم) میں۔ پھر ہم نے بنایا اس نطفہ کو لوتھڑا۔ پھر ہم نے اُس لوتھڑے کی بنائی بوٹی۔ پھر بنائی بوٹی کی ہڈیاں۔ پھر پہنا دیا ہڈیوں کو گوشت۔ پھر اُس کو بناکر کھڑا کیا۔ ایک نئی صورت میں۔ تو بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔"

دیکھئے! اس آیت میں سائنس انسانی کے تمام تقلبات و اطوار موجود ہیں مگر اُس میں کاوش نہیں کی گئی۔ اور نہ اس حیثیت سے بیان کیا کہ ماہیات بیان کی جائیں۔ بلکہ مقصود قدرت پر استدلال ہے اور بیان بھی سیدھی طور سے ہے جس کو ساری دنیا سمجھ سکتی ہے۔ اس لیئے کہ قرآن مجید کے مخاطب تمام عالم کے افراد ہیں اور اُن میں سب طرح کے ہیں۔ اکثر تو عوام ہیں اس لیئے اس کے خطابات بھی ایسے ہیں کہ جس کو ہر عامی سمجھ سکتا ہے۔ غرض سائنس وغیرہ

عہ سوال۔ اس مقام پر شبہ ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ لا تنقضی عجائبہ کیا ان عجائب میں یہ مسائل فلسفیہ شامل نہیں ہوسکتے اور کیا ہر عامی کا سمجھنا اس حدیث کے معارض نہیں۔ جواب عجائب سے مراد اگر علوم فلسفیہ ہوں تو لازم آتا ہے کہ صحابہ میں سے کسی نے ان عجائب کی ایک فرد بھی نہیں سمجھی۔ کیونکہ کسی صحابی نے قرآن مجید سے ان چیزوں کو کبھی نہیں بیان کیا۔ عجائب سے مراد علوم نافعہ فی الآخرۃ ہی ہیں کہ وہ دوسرے دلائل صحیحہ سے بھی معلوم ہیں لیکن اہل فہم عالی کو قرآن مجید سے بھی مفہوم ہو جاتے ہیں جن کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے الا فہما اُوتیہ الرجل فی القرآن اور عامی کا سمجھ سکنا ہر مضمون کے لیے عام نہیں بلکہ مراد یہ ہے

کے مسائل قرآن مجید میں اتنے ہی لئے گئے ہیں کہ جن کو نجات ابدی میں دخل ہے پس میں نے جو دعوے کیا ہے کہ قرآن مجید کی ہم کو ہر موقع میں ضرورت ہے اور ہر جگہ کام آتا ہے۔ اُس ہر موقع سے مراد طبعیات اور ریاضیات و طرق معاش کے مواقع نہیں بلکہ مطلب اُس کا یہ ہے کہ جن امور کو فلاح اُخروی میں دخل ہے خواہ اُس کا وقوع دُنیا میں ہو یا آخرت میں ہو اُس میں ہم کو قرآن مجید کی ضرورت ہے اور جو محض دنیا ہی ہو یا کہ نہ دنیا ہو نہ آخرت کے متعلق ہو بلکہ لغو ہو۔ قرآن مجید کو اُس سے بحث نہیں۔

تعلیم اتفاق

سوا اُن امور دنیویہ نافعہ فی الدین میں سے ایک اتفاق بھی ہے کہ وہ قرآن مجید میں مامور بہ ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ۔

یعنی اے ایمان والو: اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو تم بزدل و سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ دیکھئے اس آیت میں مسئلہ اتفاق کو بیان فرمایا ہے۔ اس پر بے شک ہم فخر کریں گے کہ قرآن مجید نے ہم کو کیسے عجیب غریب مسئلہ کی تعلیم کی ہے۔ اور جی کھول کر ہم اس کو مدلول و منصوص قرآنی کہیں گے۔

حاشیہ گذشتہ صفحہ: کہ جتنے حصہ کو ضروریات دین میں دخل ہے اُس پر وجہ دلالت اور جو اُس کے لئے مقدمات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا مفہوم مدلول عام فہم ہے ولقدیسنا القرآن للذکر اس کی دلیل ہے اور ضروریات دین کی تعریف اہل علم کے نزدیک معروف ہے۔ ۱۲ اشرف۔

حاشیہ صفحہ ہذا۔ عہ یعنی اس کی تحصیل کے طرق قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ باقی جواز و عدم جواز کی حیثیت سے اُس سے بھی بحث ہے۔ ۱۲ جامع۔

قرآنی مدلول اور منطبق کا فرق

باقی اور علوم جو بزرگوں نے قرآن سے نکالے ہیں۔ اُن کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں۔ مدلول قرآن نہیں ہیں۔ یوں نہ کہیں گے کہ ثابت بالقرآن ہیں۔ ہاں منطبق موافق کہہ دیں گے۔ چنانچہ اوپر بھی اجمالاً عرض کیا گیا ہے۔

اور مدلول اور منطبق میں بڑا فرق ہے۔ ایک مثال سے آپ کو اس کا فرق ظاہر ہوگا ——— فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس حجام آیا اور اُس نے کہا کہ خط بنوا لیجئے۔ اسنے جواب دیا کہ بڑھنے دو۔ اتفاق سے جس وقت اُسنے جواب دیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے ڈوم بھی اُن کی لڑکی کی شادی کا خط لے کر آیا۔ وہ بھی اتفاق سے اس جواب سے اپنا مطلب نکال لے تو یہ جواب "بڑھنے دو" دونوں سوالوں کا ہوسکتا ہے۔ اوّل سوال کا تو اس طرح کہ خط بڑھنے دو۔ جب بڑھ جائے گا بنوائیں گے۔ دوسرے سوال کا اس طور پر کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے اس کو بڑھنے دو۔ پس پہلے معنی کو تو مدلول کہیں گے اور دوسرے کے مدعا پر اس کو صرف منطبق کہیں گے۔ قصد تو یہ تھا کہ نائی کا جواب دیں لیکن یہ کلام کی لطافت ہے کہ وہ ڈوم کا بھی جواب ہوگیا۔ پس اس کو نکتہ اور لطیفہ کہہ سکتے ہیں۔ اور تفسیر نہیں کہہ سکتے۔ یہاں سے ایک بات اور کام کی سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ صوفیہ کرام نے آیات کے متعلق کچھ بصورت تفسیر کے کہا ہے مثلاً اذھب الی فرعون انہ طغیٰ کے متعلق لکھا ہے اذھب ایھا الروح الی النفس انہ طغیٰ اور اذ یحول بقرۃ النفس۔ تو ان تاویلوں کو دیکھ کر دو جماعتیں ہوگئی ہیں۔ ایک تو جو صوفیہ کی محبت سے خالی ہیں اور حمل النصوص علی ظواہرہا کے پورے پابند ہیں۔ انہوں نے تو ان تاویلات کا بالکل انکار کردیا کہ کہاں فرعون کہاں نفس کہاں موسیٰؑ کہاں روح۔ یہ تو ایسا ہے کہ زمین بول کر آسمان مراد لے لیں۔ اور صوفیہ کو اس بنا پر ضال و محرّف کہہ کر اُن کے منکر ہوگئے۔ سو اُن کو تو یہ ضرر ہوا کہ

حضرات اہل اللہ کے برکات سے محروم ہوئے۔

دوسرے وہ تھے جو ان حضرات کی محبت میں غرق ہیں وہ یہ کہنے لگے کہ قرآن کا مدلول اور تفسیر یہی ہے علماء ظاہر نہیں سمجھے اس میں تو سارا قصہ باطن کا ہے۔ پھر اس بات میں ان غالین کا یہاں تک غلو بڑھا کہ بعض جگہ تو انہوں نے قرآن مجید کی گت ہی بنادی۔

جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک جلد ساز تھے جو شخص کتاب یا قرآن جلد بندھوانے لاتا تھا۔ وہ اُس میں کچھ اصلاح ضرور کر دیا کرتے تھے۔ ایک شخص قرآن شریف جلد بندھوانے کے لیے اُن کے پاس لائے اور کہا کہ اس کی جلد باندھ دو مگر شرط یہ ہے کہ کچھ اصلاح نہ دیجو کہنے لگے کہ اب تو میں نے توبہ کر لی ہے۔ جب جلد تیار ہو گئی اُس شخص نے پوچھا کہ کچھ اصلاح تو نہیں دی کہنے لگے کہ توبہ توبہ میں کیا اصلاح دیتا۔ مگر دو تین جگہ تو صریح غلطی تھی اُس کو صحیح کر دیا۔ ایک جگہ تو یہ تھا عصٰی آدم تو یہ صریح غلطی ہے عصا تو موسیٰؑ کا تھا۔ میں نے اُس جگہ بجائے آدمؑ کے موسیٰؑ بنا دیا ہے۔ اور ایک جگہ نادٰنا نوحؑ تھا تو نوح تو دانا تھے میں نے وہاں نا کاٹ کر اس طرح کر دیا ہے ولقد دانا نوح اور ایک مشترک اور عام غلطی تھی وہ یہ کہ جگہ جگہ فرعون۔ قارون، ابلیس کا نام تھا۔ تو ایسے کفار ملعونوں کا قرآن میں کیا کام۔ وہاں میں نے اپنا اور تمہارا نام لکھ دیا۔ کہا خدا تیرا ناس کرے تو نے میرا قرآن شریف ہی کھو دیا۔

تو وہ مصلح صاحب اسی مذاق کے ہوں گے۔ واللہ! یہ لوگ بالکل ہی برباد ہوئے خدا کی قسم ہے کہ قرآن کا یہ مدلول ہرگز نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نماز سب اڑ گیا۔ اس لیے کہ تمام نصوص کے مدلولات کو بلکہ تمام شریعت کو ان لوگوں نے بدل دیا۔ میرے ایک دوست رئیس پیران کلیر گئے تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی ابے او مُرغے! انہوں نے کچھ التفات نہ کیا پھر آواز آئی۔ انہوں نے اس طرف

دیکھا تو کہا ابے! تجھ کو ہی بلاتے ہیں یہاں آ یہ گئے کہ دیکھیں کیا کہتے ہیں کہنے لگے کہ دیکھ اللہ تعالیٰ نے جب روحوں کو پیدا کیا تو سب کو جمع کر کے حکم دیا کہ بنگ بوزہ مت چھوڑنا تو ہم تو قریب تھے ہم نے صحیح سُنا اور مولوی لوگ دور تھے انہوں نے بجائے بنگ بوزہ کے نماز روزہ سن لیا۔ جاؤ یہ نکتہ ہے مرشدوں کا۔

یاد رکھو! تو ان تفسیروں کی بدولت یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ ایسے صوفیوں نے ناس کیا ہے دین کا خود بھی تباہ ہوئے اوروں کو بھی تباہ کیا۔ سو یہ تو محض لغو و خرافات ہیں لیکن اس وقت کلام ہے صوفیہ محققین کی تاویلات و اشارات ہیں۔ سو اُس میں بعضے تو اُن کے ہی منکر ہو گئے اور بعضے مفسرین کے منکر ہو گئے۔

اب رہ گئے ہیں ہم بیچ میں کہ ہم قرآن کو کلام اللہ اور صوفیہ کو اہل اللہ جانتے ہیں تو دونوں کی امانت و حفاظت کے لیے ضرور ہوا کہ ان تاویلات کو ایسے معانی پر محمول کیا جاوے کہ کلام اللہ کی بھی تحریف نہ ہو اور اہل اللہ کا کلام بھی خلاف قواعد شرعیہ نہ ہو اس لیے ہم کہتے ہیں کہ صوفیہ کرام نے جو آیات کے معنی بیان کئے ہیں۔ یہ فی الواقع... تفسیر نہیں ہے اور نہ وہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر ہیں اُن کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن میں فرعون سے نفس اور موسیٰ سے روح اور بقرہ سے نفس مراد ہے جو کچھ وہ فرما رہے ہیں یہ علم اعتبار کہلاتا ہے اور علم اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو قیاس کیا جاوے۔

تو مطلب یہ ہے کہ فرعون و موسیٰ کے قصہ پر اپنے حال کو بھی قیاس کرو اسکی ایسی مثال ہے جیسے زید نے ایک کام عمرو کی دیکھا دیکھی کیا اور اُس میں اس کو ناکامی ہوئی تو اُس موقع پر کہتے ہیں کہ کوا چلا تھا۔ ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ تو اس کلام میں کوے سے مراد زید اور ہنس سے مُراد عمرو یقیناً نہیں ہے کوے سے مراد کوا ہے اور ہنس سے ہنس ہی مراد ہے۔ اور حاصل اس کا یہ ہے کہ دو موقع ایک حالت کے

اندر منطبق ہیں۔ ایک موقع پر جو نظر پڑی تو دوسرا موقع اس کو دیکھ کر یاد آ گیا۔ اور ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ دیدی ـــــــ مثلاً یہاں زید و عمرو اور ان کے قصہ کو کوئے بطش آور اُن کے قصہ سے تشبیہ دیدی۔ پس اذھب ایھا الروح الخ سے یہ مراد ہے کہ اے قاری! جب تو قرآن پڑھے اور یہاں پہنچے تو اس قصہ سے یہ سبق لو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز فرعون کی مشابہ اور ایک چیز موسیٰؑ کے مشابہ ہے۔ قصہ کو قصہ ہی کے طور پر مت پڑھو۔ بلکہ قرآن شریف کے ہر ہر موقع سے اپنی حالت پر مطابق کرتے جاؤ۔ اور اُس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ یہ مطلب ہے صوفیہ کرام کا۔ پس دونوں فرقے غلطی پر ہیں جو ان کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں۔ اور جو ان کو تفسیر مدلول قرآنی قرار دیتے ہیں وہ تو بالکل ہی گئے گذرے ہیں۔ یہ تاویلات لطائف اور نکات کے درجہ میں ہیں تفسیر نہیں ہیں اور ان کو علوم قرآنیہ نہیں کہہ سکتے علوم قرآنیہ وہ ہی ہیں جس پر عبارۃ النص یا اشارۃ النص یا اقتضاء النص یا دلالۃ النص سے استدلال ہو سکے۔ ورنہ وہ نکات و لطائف کا درجہ ہے۔ جیسے کسی شخص نے آیۃ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا کے متعلق کہا تھا۔ کہ قیامت آئندہ آنے والی ہے اس لیے قرآن مجید میں فرداً کہا گیا۔ فردا کہتے ہیں کل کے دن کو۔ یہ ایک نکتہ ہے ورنہ فرداً بمعنی کل فارسی ہے اور آیت میں فرداً سے مراد متفرداً متوحداً ہے۔ اہل لطائف نے کہیں کہیں ایسے نکتوں سے کام لیا ہے گو نثر عاً بعض جگہ پسندیدہ نہیں ہے۔

جیسے ایک جولاہا تھا اُس نے دو چار سورتیں پڑھ لیں تھی۔ مگر ماں کا حق ادا نہ کرتا تھا۔ اُس کی ماں اُس کو لے کر ایک بزرگ کی خدمت میں آئی کہ دیکھئے حضرت! یہ میرا حق ادا نہیں کرتا اُن بزرگ نے فرمایا کہ بھائی تم ماں کا حق کیوں نہیں ادا کرتے کہا کہ حضرت قرآن میں تو ماں کا حق ہی نہیں آیا۔ اُن بزرگ نے پوچھا کہ تو نے کچھ قرآن پڑھا ہے کہنے لگا جی ہاں الم تر کیف تک یاد ہے اُن بزرگ نے فرمایا کہ تبت تو پڑھو اُس نے پڑھی

جب مَا اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ پر پہنچا تو فرمایا کہ دیکھو تو کہتا ہے کہ ماں کا کچھ حق نہیں قرآن میں تو یہ ہے کہ ما کاسب یعنی ماں کا سب ہے وہ مان گیا اور اسی دن سے عہد کیا کہ ماں کی خدمت کیا کروں گا۔ اس لطیفہ سے یہ تو فائدہ ہوا کہ وہ ماں کا حق ادا کرنے لگا لیکن ضرر بھی ہوا کہ ساری عمر اسی جہل میں مبتلا رہے گا۔ ایسے ہی ایک شخص ایک مولوی صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ مولوی صاحب تم کہتے ہو کہ قرآن میں سب چیزوں کا ذکر ہے۔ یہ تو بتلاؤ کہ قرآن میں باؤ مرہٹہ کا بھی ذکر ہے مولوی صاحب نے کہا ہاں ہے اور مذمت کے ساتھ ذکر ہے وباءو بغضب من اللہ کہ باؤ اللہ کے غضب میں ہے یہ نکات ہیں۔ بلکہ نکات بھی انکو نہیں کہہ سکتے اسلئے کہ نکتہ وہ ہے کہ جس سے تفسیر نہ بدلے یہاں تو تفسیر ہی بدل جاتی ہے۔

لطائف اور نکات بھی وہ ہی مقبول ہیں کہ انطباق بھی ہو جائے اور تفسیر نہ بدلے اس واسطے میں ان دونوں قصوں کے جواب کو ناپسند کرتا ہوں۔ پس اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا کہ نہ تو شیخ اکبر اور دیگر صوفیہ قدس اسرارہم پر کچھ اعتراض ہو سکتا ہے اور مفسرین نے جو تفسیر اور مدلول قرآنی بیان کیا ہے نہ اس میں کچھ شبہ ہے ہاں اعتراض اہل غلو پر ہے جو انکا یا انکا انکار کرتے ہیں خواہ وہ اہل غلو برنگ جہلاء ہوں یا بہیئت علماء ہوں۔ یہ مفصل گفتگو تھی۔ بعض اشارات و لطائف قرآنیہ کے متعلق جو جملہ معترضہ کے طور پر آ گئی۔

مسائل دینیہ میں منافع دنیوی پر نظر

اب مضمون مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ قرآن نے ہم کو اس مقام پر مسائل تمدن میں سے ایک مفید مسئلہ اتفاق کی تعلیم بھی فرمائی پس وہ اس وجہ سے شریعت میں مامور بہ ہے اور دنیا دین دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے اور اصلاح دین بھی اس سے ہوتی ہے اور اصلاح دنیا بھی جو لوگ دیندار ہیں ان کی نظر تو اس کے منافع دین

پر ہے اور جو دُنیا دار ہیں اُن کی نظر اُس کے منافع دنیا پر ہے۔ خصوص ہمارے زمانہ کے ترقّی خواہ بھائیوں کے نزدیک تو بڑا قبلہ و کعبہ دنیا ہی ہے۔ حتّٰی کہ اُن کے نزدیک تو خالص دینی کام میں بھی دنیا ہی کی مصلحت پیشِ نظر رہتی ہے اور اُس کی وقعت اُسی مصلحت دنیوی کے سبب ہوتی ہے اور یہ مذاق اہلِ یورپ سے ماخوذ ہے چنانچہ ایک جرمنی ڈاکٹر نے نماز کے منافع لکھے ہیں کہ نماز ایسی اچھی ورزش ہے کہ اِس کے ہوتے ہوئے کسی ورزش کی ضرورت نہیں اور صحت خوب قائم رہتی ہے۔

اُس بھلے مانس نے نماز کو اتنا ہی سمجھا آگے ذہن ہی نہیں گیا۔ جیسے کسی مولوی صاحب نے ایک گنوار کو نصیحت کی کہ نماز پڑھا کر کہا بہت اچھا۔ چند روز کے بعد مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی جی نواج (نماز) بہت پھائدے (فائدے) کی چیج (چیز) ہے۔ مجھے بائی (ریاح) کی بیماری تھی جب مونْدھا (اوندھا) پڑوں جب ہی بادی نکڑی (نکلتی ہے) جیسے اُس گدھے نے نماز کا یہی فائدہ سمجھا تھا ایسے ہی اس جرمنی محقق نے نماز کا فائدہ اتنا ہی سمجھا۔ مگر ہمارے ترقّی یافتہ بھائی ایسی باتوں سے خوش ہوتے ہیں اور ریجھے جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی ہم سے پوچھے تو ہم تو یہ کہیں گے کہ اس جرمنی کی اس تحقیق کی ایسی مثال ہے کہ

جیسے کسی کے پاس پانچسو ۵۰۰ روپیہ کا دوشالہ ہو اور وہ اُس کے منافع یہ بیان کرے کہ یہ دوشالہ بہت اچھی شے ہے سفر میں اگر کہیں سوختہ نہ ملے تو اس کو جلا کر چائے پکا سکتے ہیں۔ تو فی نفسہ یہ صحیح ہے کہ چائے اُس سے پک سکتی ہے لیکن کیا اس شخص کو یہ نہ کہا جاوے گا کہ اس شخص اس دوشالہ کی قدر نہیں جانتی۔

نماز کے فائدے ہم سے پوچھو اور ہم سے کیا۔ ہم کیا چیز ہیں۔ حق تعالیٰ سے پوچھو اور "ہم سے پوچھو" میں نے اس لیے کہدیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ درحقیقت حق تعالیٰ کا کہا ہوا ہے ہماری تو وہ مثال ہے سہ

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

سو نماز کا فائدہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ یعنی سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ پس نماز کا اصلی مقصود قرب ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

قرب تر پستی بہ بالا رفتن است بلکہ قرب از قید ہستی رستن ست

یعنی قرب اس کا نام نہیں ہے کہ نیچے سے اوپر کو چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ قید ہستی سے چھوٹ جاؤ اس لیے کہ اوپر جانا قرب جب ہوتا کہ خدا تعالیٰ کا مکان اوپر ہوتا۔ خدا تعالیٰ مکان سے پاک ہے پس اُس کا قرب یہی ہے کہ اپنی ہستی کو خاک میں ملا دو اسی کو وصل کہتے ہیں۔

بعض لوگ وصل کے خدا جانے کیا کیا معنی سمجھتے ہیں وصل کے معنی اہل فن سے پوچھیے شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

تعلق حجاب ست و بے حاصلی چو پیوندہا بگسلی واصلی

یعنی غیر کے ساتھ کے علاقے جب قطع کر دو گے واصل ہو جاؤ گے۔ یہی تعلق حجاب ہے، پس سجدہ کی غرض اپنی اس ہستی و تعلق کو مٹانا اور ہستی کا مٹانا یہ نہیں ہے کہ سنکھیا کھا کر مر رہو۔ مطلب یہ ہے کہ دعوے اور انانیت دماغ میں سے نکالو یہ سجدہ اُسی کا سامان ہے اس لیے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور پھر تمام اعضاء انسان کے اندر اشرف چہرہ ہے اسی واسطے چہرہ پر مارنا حرام ہے۔

حکم ہے کہ مجرم کے بھی چہرہ پر مت مارو قتل کرنا جائز اور چہرہ پر مارنا ناجائز۔ اسلیے کہ چہرہ معظم ہے تو ایسے شریف عضو کو حکم ہے کہ ارذل الاشیاء کے ساتھ ملصق کر دو یعنی زمین کے ساتھ جو بہت سے وجوہ سے اور نیز باعتبار حیز کے پست ترین مخلوق ہے تو یہ کاہے کی تعلیم ہے اسی کی تعلیم ہے کہ اپنے کو مٹا دو اور ہستی کو کھو دو کہ تمہاری ہستی تمہارا حجاب بن رہی ہے حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست ÷ تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

پس یہ نماز کی یہ حکمت ہے۔ مگر جرمنی صاحب نے چونکہ ورزش اس کی حکمت بیان کی ہے تو ہمارے بھائی اس تحقیق پر غش ہیں۔

یاد رکھو! شارع علیہ السلام نے یہ حکمت نماز کی کہیں بیان نہیں کی اور جو چیز شریعت میں نہیں ہے وہ سب ہیچ ہے گو اس جرمنی کی زبان سے اتنا نکلنا بھی غنیمت ہے لیکن اے بھائیو! تم کو کیا ہو گیا کہ واسجد واقترب کے ہوتے ہوئے ایک جرمنی کافر کی تحقیقات کو پسند ہی نہیں بلکہ اُس پہ ناز کرتے ہو کیوں خواہ مخواہ گداگری کرتے ہو؟ تمہارے یہاں سب کچھ ہے آپ لوگوں کی وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

یک سبد پُر نان ترا بر فرق سر ÷ تو ہمی جوئی لبِ ناں در بدر

تا بزانوئے میاں قعرِ آب ÷ وز عطش وز جوع گشتی خراب

اے صاحبو! آپ کے یہاں ساری دولتیں موجود ہیں کیوں فقیروں سے مانگتے ہو کیوں جرمنیوں کی کاسہ لیسی کرتے ہو۔

الحاصل! اتفاق بھی ایسی ہی شے ہے کہ اہل یورپ کو للدنیا مطلوب ہے اور ہم کو للدین مطلوب ہے۔ مگر اُس کا ایک ضروری مسئلہ متفق علیہا ہونا تو ثابت ہوا۔ اب اس آیت میں غور کیجئے کہ اس میں سے اس مسئلہ کے متعلق کیا تحقیق ہے۔ اس کے لیے ایک چھوٹی سی تمہید کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ساری دنیا اتفاق اتفاق پکار رہی ہے مگر اُس کے جو اسباب ہیں اُن سے بالکل ناواقفیت ہے بالکل اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص چھت پر جانا چاہتا ہے مگر زینہ سے نہیں جاتا اُوچک کر جانا چاہتا ہے اور ایک جست لگاتا ہے اور گر پڑتا ہے

اسی طرح پھر جست لگاتا ہے اور پھر گرتا ہے تو یہ شخص چھت پر کیوں نہیں پہنچا اس لیے کہ جو طریق ہے جانے کا اُس سے نہیں گیا یعنی اس پر عمل نہیں کیا ہے

اطلبوا الارزاق من اسبابها   وادخلوا الابیات من ابوابها

اس واسطے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی کہ مطلقاً اسباب چھوڑ دو۔ بلکہ اس کا حکم کیا ہے کہ جس شئے کے جو اسباب پیدا کئے گئے ہیں اُس کو اُن ہی سے طلب کرو۔ اس پر بعضے لوگ خوش ہوئے ہونگے کہ اس سے تو وہی بات ثابت ہوئی جو اہل دنیا کا مطلب ہے یعنی تدبیر پرستی۔ چنانچہ اسی بنا پر لوگ اہل اللہ پر ہنستے ہیں اور ان کو اہدیوں کی پلٹن اور گرانی کا سبب اور قوم پر بار قرار دیتے ہیں۔

ایک شخص بزعم خود مفسر قرآن ہیں اور لوگ اُن کے ترجمہ پر فریفتہ ہیں اسلیئے کہ محاورہ کے موافق ہے۔ صاحبو! محاورہ کے موافق تو ہے لیکن قرآن کے موافق نہیں ہے ایسے ہی محاورہ کا شوق ہے تو چہار درویش اور حاتم طائی کی عبارت بہت ہی بامحاورہ ہے اور اگر یہ کہا جاوے کہ وہ تو قرآن نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ وہ ترجمہ بھی بہت مقامات میں قرآن نہیں ہے اس لیے کہ ایسے ایسے مسائل نکالے ہیں کہ وہ قرآن کا مدلول نہیں ہے چنانچہ آیت وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ کی تفسیر میں حاشیہ پر لکھا ہے کہ یہ جو بعض لوگ دنیا کے تمام دھندے چھوڑ کر چھاڑ کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں ان کو کیا حق حاصل ہے کہ قوم کی آمدنی کھائیں جب کچھ حق نہیں تو باطل ہے اور باطل ہے تو اس آیت سے حرام ہے لوگ اس استدلال پر فریفتہ ہیں مرے جاتے ہیں میں اس استدلال کی حقیقت کھولتا ہوں کہ یہ جو باطل جس کا ترجمہ ناحق ہے اس ناحق میں جو حق ہے اس سے کیا مُراد ہے حق واجب یا جائز۔ اگر حق واجب مراد ہے تو ہم مفسر صاحب سے پوچھتے ہیں کہ تم کو کیا حق حاصل ہے کہ ایک کتاب تصنیف کردی اور سرکار سے ہزار روپیہ انعام کے لے لیئے۔ کیا سرکار پر یہ حق واجب ہے اور ان مفسر صاحب

کو کوئی ہدیتہً روپیہ دے تو اُس کے قبول کرنے کا ان کو کیا حق حاصل ہے۔

خوب یاد رکھو! کہ اس ناحق میں حق سے مراد حق جائز ہے پس ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بدوں حق جائز کے مت کھاؤ یعنی جس شئے کا لینا جائز نہ ہو وہ مت کھاؤ۔ اور اگر محبت سے کوئی کچھ دے تو یہ ناجائز نہیں ہے مفسر صاحب نے حق سے مراد حق واجب لے کر اپنے اوپر بھی سینکڑوں اعتراض لے لئے

غرض! یہ حضرات اہل توکل کی تحقیر اسی ترک اسباب پر کرتے ہیں تو شاید میرے اس کہنے سے کہ اسباب سے مسببات کو حاصل کرو۔ ان معترضین کو اپنی تائید کا شبہ ہوا ہوگا۔ خوب سمجھ لو کہ ترک اسباب میں تفصیل ہے جو عنقریب آتی ہے اُس کے نہ جاننے ہی سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ متوکلین نے پھر اسباب کو کیوں چھوڑا جب کہ تم کہتے ہو کہ شریعت نے ترک اسباب کی اجازت نہیں دی۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ اعتراض ناتمام علم سے پیدا ہوا ہے۔

جیسے ایک حکیم جی تھے اُن کے ایک صاحب زادہ بھی تھے مگر تھے عقل سے کورے اُن کو حکیم صاحب نے طب پڑھائی اور مطب میں بھی وہ ساتھ رہتے تھے حکیم جی ایک مریض کو دیکھنے گئے نبض دیکھ کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نارنگی کھائی ہے جس سے تمہاری حالت کل کے اعتبار سے بگڑی ہوئی ہے۔ مریض نے اقرار کیا صاحب زادہ صاحب کو حیرت ہوئی کہ ابا جان نے یہ کیسے پہچانا کہ نارنگی کھائی ہے جب وہاں سے آئے۔ تو پوچھا حکیم صاحب نے کہا کہ بھائی قرائن اور علامات اور نبض سے اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ کسی بارد شئے کا استعمال کیا ہے چارپائی کے نیچے نارنگی کے چھلکے پڑے تھے اس سے اس کی تعیین بھی ہو گئی۔ اب صاحب زادہ صاحب کو ایک قاعدہ ہاتھ آگیا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے پڑی ہوئی ہوتی ہے مریض اُسی کو کھا کر بیمار ہو جاتا ہے۔ بڑے حکیم نے تو رحلت فرمائی اب چھوٹے حکیم جی کا دَور دَورہ ہوا۔ ایک مریض کی شامت

آ ئی اُن کو بُلایا - اُس کو دیکھنے گئے نبض دیکھی چارپائی کے نیچے جھانکے وہاں نمدہ پڑا ہوا تھا کہنے لگے کہ ہم کو معلوم ہوگیا کہ تمہاری جو یہ حالت ہے اُس کا ایک خاص سبب ہے کہ وہ یہ کہ تم نے نمدہ کھایا ہے سب لوگ ہنس پڑے کہ نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے اور حکیم جی کو نکلوا دیا - سچ ہے -

نیم مُلّا خطرۂ ایماں نیم حکیم خطرۂ جاں

اسباب کی اقسام

پس ایسے ہی ہمارے معترضین ہیں کہ جب سُنا کہ شریعت نے ترک اسباب سے منع کیا ہے علم تو تھا نہیں تمام اسباب کو اُس میں داخل کر کے متوکلین اور تارکین اسباب پر ایک اعتراض جڑ دیا - خوب سمجھ لو کہ اسباب کی تین قسمیں ہیں اسباب قطعیہ ظنیہ وہمیہ - سبب قطعی کسی شے کا تو وہ ہے کہ عادۃً وہ اُس شئے کا موقوف علیہ ہے اگر وہ سبب نہ ہو تو اُس شے کا تحقق بھی نہ ہو جیسے کھانا کھانا پیٹ بھرنے کے لیے پانی پینا سیرابی کے واسطے - سو رہنا آرام کے واسطے - ان اسباب کو چھوڑنا تو حرام ہے اگر کوئی چھوڑ دے اور اسی میں مر رہے تو حرام موت مرے گا - حتیٰ کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اہل توکل بھی خلوت میں ایسی جگہ نہ بیٹھے جہاں کسی کا نہ گذر ہو اور نہ کسی کو اسکے حال کی اطلاع ہو -

دوسرے اسباب وہمیہ ہیں وہ یہ ہیں کہ مسبّب کے ان پر مرتب ہونے کا بہت بعید احتمال ہو جیسے کوئی خیالات پکا دے کہ میں تحصیلدار ہو جاؤں گا پھر ڈپٹی کلکٹر ہوں گا بہت سی میری اولاد ہو جائے گی جب زیادہ مال ہوگا تمام ضلع مظفر نگر کو خریدوں گا - غرض جہاں جہاں تک ذہن پہنچا یا اسی طرح تجارت میں بعید بعید صورتیں سوچے اور اُن کے اسباب میں مشغول ہو - ایسے اسباب وہمیہ واجب الترک ہیں اسی کو دنیا کے اندر کھپ جانا کہتے ہیں - تیسرے اسباب ظنیہ ہیں کہ مسبّب ان پر غالباً مرتب ہو جاتا ہے

اور کبھی بلا ان اسباب کے بھی وہ مسبب حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے تجارت سے بہ ضرورت کے موافق روپیہ ملنا زراعت سے غلہ حاصل ہونا کہ مسبب ان پر اکثر تو مرتب ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا۔ اور کبھی بلا ان اسباب کے بھی مسبّب حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جو لوگ ان اسباب میں مشغول نہیں ہیں اُن کو بھی یہ چیزیں ملتی ہیں۔ پس ان اسباب ظنیہ کے ترک کو اصطلاح میں توکل کہتے ہیں اور اس میں تفصیل یہ ہے کہ ضعیف النفس کے لیے جائز نہیں اور قوی النفس کے لیے جائز بلکہ مستحسن و مستحب ہے۔

توکل میں نیت کی درستگی

لیکن اس نیت سے توکل جائز نہیں کہ یہ بھی ایک طریق ہے روپیہ ملنے کا ـــــ جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ مولوی صاحب سے وعظ میں سُن لیا کہ جو خدا پر توکل کرے اللہ تعالیٰ اُس کو ضرور رزق پہنچاتے ہیں اور یہ بھی اُس نے سُنا تھا کہ ایسی جگہ بیٹھنا جائز نہیں جہاں کسی کا گذر نہ ہو۔ جنگل میں جاکر ایک کنوئیں کے قریب آپ جا بیٹھے اور منتظر رہے کہ اب میرے واسطے خوان لگ کر آئیگا۔ چنانچہ دو تین روز گذر گئے اتفاق سے اُدھر سے کسی کا گذر بھی نہ ہوا۔ کئی روز کے بعد ایک مسافر آیا سمجھا کہ مجھے بھی کچھ دیگا اُس مسافر نے اس کی طرف تو پشت کی اور (حسب عادت) راستہ کی طرف منہ کیا کہ آتے جاتے کو دیکھیں گے اور روٹی کھا کر چلا گیا اس کی اُس کو خبر بھی نہ ہوئی اسی طرح ایک اور آیا وہ بھی اسی طرح بیٹھ کر اور کھا کر چلا گیا۔ اُسنے اپنی جی میں کہا کہ یہ تو بُری رسم نکلی ہے تیسرا آیا تو آپ فرماتے ہیں اُھوں اُھوں (صوت ہے جو حکایت ہے کھنکارنے کی) اُسنے جو مڑ کر دیکھا کہ ایک آدمی فاقہ سے ضعیف نحیف ہو کر پڑا ہے اُس کو رحم آیا اُسکو بلا کر اُس کو روٹی کھلائی خوش خوش مولوی صاحب کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ مولوی صاحب توکل برحق مگر آپنے تعلیم میں کسر کبھی اتنی بات رکھ

لی یہ نہ کہا کر کھنکارنا بھی پڑتا ہے۔ تو بعضے آدمی ہاتھ پاؤں توڑ کر اسلئے بھی بیٹھ جاتے ہیں کہ میاں بے فکری سے کھانے کو ملے گا۔ چین سے رہیں گے کچھ کرنا نہ پڑے گا تو کوئی قابل قدر نہیں۔ خدا کے نزدیک بھی اسکی کوئی قدر نہیں کمال نہیں۔

انعام بقدرِ قربانی

حضرت سلطان ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت لکھی ہے کہ جب بلخ کی سلطنت چھوڑ کر نکلے ہیں تو اوّل ہی دن ایک جنگل میں پہنچے وہاں شام ہوگئی۔ ایک مقام پر لیٹ رہے بھوکے پیاسے تھے۔ اور قریب ہی ایک اور دُرویش بھی رہتا تھا۔ شب کے وقت اُن کے واسطے غیب سے ایک خوان آیا کہ کھانوں کی خوشبو سے تمام جنگل مہک اُٹھا۔ اور اُس درویش کے واسطے دو روٹی جو کی آیا کرتی تھیں۔ حسب معمول وہی آئی وہ دُرویش یہ دیکھ کر جل گیا۔ اور حق تعالےٰ کی جناب میں عرض کیا کہ مجھے تو یہاں پڑے ہوئے اتنے سال ہوگئے میرے واسطے تو یہی جو کی روٹی ہے آج تک ترقی نہ ہوئی اور یہ آج ہی آیا۔ اسکے واسطے ایسے کھانے بھیجے۔ ہاتف کے ذریعہ سے ندا آئی کہ یاد کر کہ تو کون تھا۔ اور اس کو دیکھ! یہ کون ہے تو ایک گھس کھدا تھا اس قابل نہ تھا پہلے صبح سے شام تک مصیبت بھرتا تھا۔ اب بے مشقت اُس سے زیادہ ملتا ہے غنیمت نہیں سمجھتا۔ اگر پسند نہیں۔ فلاں درخت کے نیچے تیرا کھرپہ جالی رکھا ہے نکل اور گھاس کھودنا شروع کر۔

غرض توکل میں تو نے کون سا کمال کیا۔ کمال تو اُس شخص کا ہے کہ سلطنت اور حشم خدم کو ہمارے واسطے اسنے چھوڑ دیا۔ بہرحال اگر تجھ کو سیدھی طرح کھانا ہے کھا۔ ورنہ کھرپا جالی تیرا رکھا ہے جا! اور سنبھال! یہ سُن کر لرز گیا اور بہت توبہ استغفار کی پس روٹیوں کے واسطے گوشہ اختیار کرنا توکل نہیں شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ۔

نان از برائے کنج عبادت گرفتہ اند صاحبدلاں نہ کنج عبادت برائے نان

یعنی روٹی اس واسطے لیتے ہیں کہ اللہ اللہ کریں نہ کہ اللہ اللہ اس لئے کریں کہ روٹی ملے یہ خداع اور مکاری ہے کہ جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ؎

گہ بگہ آہے دونفے میزنی از برائے مکر و دوغے میزنی
خلق راگیرم کہ بفریبی تمام در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا باخلق آری جملہ راست باخدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار با او راست باید داشتن رایت اخلاص و صدق افراشتن۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس ترک اسباب کی شریعت میں ممانعت ہے وہ اسباب قطعیہ ہیں اُن کا چھوڑنا حرام ہے اور اسباب وہمیہ کا ترک خود مامور بہ ہے اور اسباب ظنیہ میں یہ تفصیل ہے جو ابھی عرض کی گئی۔ اور یہ سب تفصیل مسببات دنیویہ کے متعلق ہے۔

مدارِ اتفاق

اور جو مسببات دینیہ ہیں چونکہ وہ مطلقاً محمود و مطلوب ہیں اُن کے اسباب ہر درجے میں محمود ہوں گے۔ بشرطیکہ کسی ضروری امر میں خلل نہ ہو پس اتفاق جو ایک شئے ہے اُس کے لیے بھی کوئی سبب ضرور ہے اور چونکہ وہ محمود ہے اُس کے اسباب بھی قابل اہتمام ہوں گے۔ سو اُس سبب کی ہمارے عقلاء نے تحقیق نہیں کی۔ بلکہ جو اُس کے اسباب نہیں ہیں اُن کو سبب قرار دیا اسی لیے اتفاق متحقق نہیں ہوتا۔ پس یہ امر مجوث فیہ اور قابل تفحص ہوا کہ سبب اتفاق کا کیا ہے تاکہ اُس کو اختیار کرنے سے اتفاق پیدا ہو۔ سو اس کی تفحص میں ہم کو بفضلہ تعالیٰ دریوزہ گری کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس تو قرآن ہے اُس میں اُس کے متعلق ارشاد ہے هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۔ یعنی خدا تعالیٰ کی وہ

وہ شان ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ جس نے اپنی مدد اور مومنین کے ساتھ آپ کو قوت دی۔ اور ان کے دلوں میں باہم اُلفت ڈال دی۔ اگر آپ رُوئے زمین کا تمام مال خرچ کرتے تو آپ ان کے قلوب میں الفت نہ ڈال سکتے لیکن اللہ ہی نے ان کے درمیان الفت ڈال دی۔ بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

دیکھئے! جہاں حضور جیسے مدبر عاقل حکیم دور اندیش ہوں کہ جن کی عقل کے کامل ہونے پر تمام جہاں کا اتفاق اور تدبیر یہ کہ تمام رُوئے زمین کے خزانے اتفاق کے لیے خرچ کریں اور نتیجہ کیا ہے مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ اس کیا پتہ لگتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسباب ظاہرہ جیسے کوئی فنڈ اسلامی بنانا یا لیکچر دینا، رسالوں میں مضامین اتفاق کے شائع کرنا اس سے اتفاق پیدا نہیں ہوتا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدار اتفاق کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ دلوں میں الفت پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ مجھ کو چاہیں۔ میں آپ کو چاہوں ہر ایک دوسرے کے نزدیک محبوب ہے۔

مدارِ محبت

اب یہ بات رہی کہ وہ الفت اور محبت خدا تعالیٰ کس طرح سے پیدا کر دیتے ہیں اس کا سبب کیا ہے۔ یہ بھی حق تعالیٰ ہی سے پوچھو۔ چنانچہ اس محبت پیدا کرنے کے واسطے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے جو میں نے اول تلاوت کی ہے اور تبرکاً و تذکیراً پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا یعنی ایمان اور عمل صالح سے حق تعالیٰ ان لوگوں کی محبت بمعنی محبوبیت پیدا کر دیتے ہیں۔

اب اہلِ علم کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ میں نے وُدًّا کو مصدر مبنی للمفعول کیوں لیا۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کی یہ خاصیت بیان فرمائی ہے کہ اس کے اختیار کرنے والے قلوب میں محبوب ہو جاتے ہیں۔ پس جب کہ ایک جماعت کی جماعت ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے تو ان میں

ایسا اتفاق پیدا ہوگا کہ کبھی نہ جائے گا "لایزال ولم یزل" ہوجائیگا۔ پس سبب اصلی اتفاق کا ایمان اور عمل صالح ٹھیرا۔ اب فرمایئے! کہ دنیا میں کتنے عاقل ہیں جنہوں نے یہ راز سمجھا ہو۔

ہاں اتفاق اتفاق سب گاتے ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اتفاق کا نام بھی نہ لو۔ مگر ایمان اور عمل صالح اختیار کر لیجئے۔ اتفاق آپ کی لونڈی ہے وہ دست بستہ آپ کے سامنے آکر کھڑی ہوجائے گی۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں کہ آپ لیکچر دیں یا مضمون لکھیں اور پھر اتفاق بھی ایسا ہوگا کہ مرنے تک اور مرنے کے بعد جنت میں بھی نہ جائے گا۔ اور دعوے سے کہا جاتا ہے۔ کہ یہی ہے وہ محبت جو قائم رہنے والی ہے۔ باقی محبتیں سب زائل ہونے والی ہیں۔ میں اُس کا نمونہ دکھلاتا ہوں۔

دیکھئے! پیر سے جو محبت ہوتی ہے وہ کیسی ہوتی ہے کہ کبھی نہیں جاتی اور اگر کسی امرد سے محبت ہوگئی ہے تو وہ جب ہی تک ہے جب تک اُس کے چہرے پر داڑھی نہ آجاوے یا جھریاں نہ پڑیں ؎

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود	ایں فساد از خوردن گندم بود
عشق با مردہ نباشد پائیدار	عشق را با حی و با قیوم دار
عشق ہائے کز پئے رنگے بود	عشق نبود عاقبت ننگے بود
عاشقی با مردگاں پائندہ نیست	زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

اور پیر کے ساتھ جو عشق ہے اس کی کیفیت سنئے! کہ پیر صاحب پر تو روز بروز بڑھاپا آتا جاتا ہے اور ان کا ان پر عشق بڑھتا جاتا ہے ؎

خود قوی تر مے شود خمر کہن ؛؛ خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

آخر پیر میں کیا شے ہے کہ اس سے ایسی محبت ہوجاتی ہے کہ اگر وہ جان بھی مانگے اسے بھی انکار نہیں۔ اس کا کیا سبب ہے۔ اس کا سبب وہی ایمان اور عمل

صالح ہے چونکہ اس ایمان اور عمل صالح سے یہ اعتقاد ہے کہ یہ حق تعالیٰ کا مقرب ہے، اس لیے طبعاً اس کی محبت ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات پیر اس سے ناخوش بھی ہوتا ہے مارتا بھی ہے کبھی کبھی نکال بھی دیتا ہے اور طرح طرح کی خدمتیں لیتا ہے مگر ان کی کیفیت یہ ہے کہ پیچھے جاتے ہیں مرے جاتے ہیں۔ یہ نمونہ آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ اب موجود ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید بیان کرتے تھے کہ حضرت ایک مرتبہ حرم میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دوسرے کو مار رہا ہے ہم لوگ سمجھتے تھے یہ کوئی نوکر ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ پیر مرید ہیں اور فرمایا دیکھو! پیر ایسے ہوتے ہیں کبھی ہم نے بھی تم لوگوں کو مارا ہے۔ واقعی حضرت کو اس قدر رحمت اور شفقت تھی کہ کہیں نہ دیکھی نہ سُنی ہے

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں جانیں کیا چشمِ غضبناک کو ہم

میں نے حضرت کو دیکھا ہے کہ اپنے مریدوں کے ساتھ وہ برتاؤ فرماتے تھے جیسا کہ لوگ اپنے پیروں کے ساتھ کرتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت سے فیض زیادہ ہوا۔ خیر یہ تو حضرت کی خاص حالت تھی۔ مگر مقصود اس وقت مجھ کو ان حضرت پیر کے قصہ سے استدلال کرنا ہے کہ وہ مرید بڑی خوشی سے پٹ رہا تھا۔ جو بدوں محبت کامل کے اپنے اختیار سے کوئی انسان اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اور اس محبت کا منشا صرف یہی امر ہے کہ اس کو للہ والا و بلفظ دیگراں کامل الایمان۔ کامل العمل سمجھتے ہیں۔

حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک مولوی صاحب فرماتے تھے کہ خدا جانے یہ فقیر کیا گھول کر پلا دیتے ہیں۔ ہم طالب علموں کو کھلاتے ہیں پہناتے ہیں، سبق پڑھاتے ہیں۔ کتاب اپنے پاس سے دیتے ہیں۔ ان کے تمام ناز نخرے اٹھاتے ہیں اور جب پڑھ لکھ کر چلے جاتے ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں اور ان فقیروں کے پاس جو آتا ہے منہ سے

بولتے تک نہیں وہ خانقاہ میں پڑے ہیں اور ان کی خبر بھی نہیں ہے کبھی شاہ صاحب ہنس پڑے تو عید آ گئی جیسے کسی عورت کو اس کا خاوند منہ نہ لگاتا تھا۔ ایک روز اس نے گاجر کھا کر پلیندی عورت کے ماردی۔ تو اس نے اپنی ماں کو کسی کے ہاتھ کہلا کر بھیجا کہ کھائی تھی گاجر۔ ماری تھی پلیندی اماں سے کہنا کہ کچھ کچھ سہاگ بہوڑا ہے (آیا ہے) ایسے ہی یہ مرید صاحب بھی پیر صاحب کے ہنسنے سے پھولے نہیں سماتے۔ برسوں کے بعد اگر کچھ بتلا دیا تو بہت ہی خوش ہیں۔ حالانکہ پیر صاحب پر کون سی محنت پڑی ذرا زبان ہلا دی۔ ساری محنت مرید ہی کرتا ہے۔

پھر حالت یہ ہے کہ نہ اس کے کھانے کی خبر نہ پینے کی خبر اور خدمتیں کرو۔ وہ علیحدہ اور اگر پیر صاحب کے یہاں بھینس بھی ہے تو سانی کرو چارہ لاؤ بھینس کو چراؤ دودھ نکالو اور جب چاہیں بھینس کی وجہ سے مرید کو نکال دیں۔ جب چاہیں مار لیں مگر وہ ہے کہ ٹلتا ہی نہیں زندگی تک تو یہ حال رہتا ہے اور جب پیر صاحب مر گئے بیوی بچوں کو چھوڑ۔ ان کی قبر کا مجاور ہو گیا۔ غرض خدا جانے کیا پلا دیتے ہیں کہ سرِشش ہو کر لپٹ جاتا ہے۔ حضرت ان کے پاس ایک مقناطیس ہے وہ اس کو جذب کرتے ہیں وہ کیا ہے وہی خدا تعالیٰ کی اطاعت شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ　　　　که گردن نه پیچد ز حکم تو ہیچ

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید　　　　ترسد ازوے جن و انس و ہر چہ دید

یہ خوف اور محبت کا جمع ہونا بھی نہایت عجیب غریب ہے۔ دیکھئے! اس قسم کے نمونے موجود ہیں۔ کہ مدار محبوبیت کا ایمان اور عمل ہی ہے۔ اب مجھے اس دعوے پر دلائل کی ضرورت نہیں اسلئے کہ جب کہ میں مشاہدہ کرا رہا ہوں۔ تو دلیل کی اب

کیا ضرورت ہے۔

محبوبیت کا باطنی سبب

مگر تبرعاً اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں کہ ایمان و عمل صالح کی وجہ سے محبت کیوں ہوتی ہے۔ اصل وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں خاصیت ہی یہ رکھ دی ہے۔ جیسے بعض دوائیں بالخاصہ موثر ہوتی ہیں۔ ایسے ہی یہ بھی ہے لیکن یہ زمانہ ہے تحقیقات کا۔ اس لیے اس پر اکتفا نہ کیا جاویگا۔ اس لیے میں اس کی دو وجہ بیان کرتا ہوں۔ ایک تو راز ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی کو اول بیان کرتا ہوں حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو حق تعالیٰ اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ تمام ملائکہ میں پکار دو کہ فلاں بندہ سے ہم کو محبت ہے تم بھی اسکو دوست رکھو پھر حکم ہوتا ہے کہ دُنیا میں بھی پکار دو۔ اگر کوئی کہے کہ ہم کو کسی کی نسبت بھی اعلان نہیں۔

سنیئے بات یہ ہے کہ فرشتوں کا اعلان قلوب میں ہوتا ہے اور وہ یہی کہ اسکی محبت قلوب میں پڑجاتی ہے۔ چنانچہ زمین پر یہ اعلان کیا جاتا ہے۔ فیوضع لہ القبول فی الارض پس وہ سب کی نظروں میں مقبول ہوتا ہے اسکے بعد حضور نے استشہاد میں یہ آیت پڑھی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا حضور کا یہ آیت پڑھنا صریح دال ہے اس پر کہ وُدًّا یہاں پر مصدر مبنی للمفعول ہے۔ اور میرا اس مضمون کو اس آیت سے استنباط کرنا صحیح ہے۔ دوسرا راز باطنی یہ ہے کہ محل محبت کا قلب ہے اور قلوب حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں جب وہ قلوب میں کسی کی محبت پیدا کرنا چاہیں گے بالاضطرار اسکے سامنے جھک جانا ہی پڑے گا۔ اس کے سامنے پھر کسی کا حوصلہ نہیں ہے کہ ٹیڑھا چلے۔ ایک مقام پر ایک بزرگ سے کوئی شخص اُلجھا دونوں

طرف خشک خشک جواب تو ہوئے ان بزرگ کے پاس گئے وہ شخص پچاس قدم بھی نہ گیا ہو گا کہ دل میں ایک چوٹ سی لگی اور قدم آگے نہ بڑھا۔ اور واپس آکر ہاتھ جوڑے کہ خدا کے واسطے میرا قصور معاف کر دو۔ اور یہ کہا کہ خدا جانے مجھ کو کیا ہو گیا کہ میں قدم آگے بڑھاتا تھا۔ اور وہ پیچھے کو ہٹتا تھا۔ وہ بات کیا تھی یہ نہیں کہ اُن بزرگ نے کچھ تصرف کیا ہو۔ بلکہ اس پر ایک سرکاری پیادہ مسلط ہو گیا۔ اور کشاں کشاں اس کو پکڑ لیا۔ غرض! ان بزرگ نے جب قصور معاف کیا اس وقت وُہ گیا اس سے معلوم ہوا کہ قلب میں کوئی بات خدا تعالیٰ پیدا کر دیتے ہیں۔ غرض راز باطنی تو اس کا یہ ہے۔

محبت کے اسباب ظاہرہ

اور راز ظاہری یہ ہے کہ محبت کے کُل تین سبب ہوا کرتے ہیں۔ نوال، کمال، جمال یعنی عطا و احسان سبب محبت کا ہوتا ہے۔ چنانچہ محسن کے اسی بنا پر محبت ہوتی ہے اور عطا ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کی خطا معاف کر دی جائے یا کسی کا کام کر دیا جائے کسی کی بیہودگی پر درگذر کی جائے۔ کبھی کمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے خواہ علمی ہو یا عملی یا اخلاقی۔ مثلاً اہل علم سے محبت اسی واسطے ہوتی ہے کہ ان میں کمال علم ہے اگرچہ اس کے علم سے اپنے کو بھی نفع نہ ہو اور جیسے حاتم کی سخاوت سُن کر اس کی طرف ایک میلان ہوتا ہے۔ اور جیسے رستم سے اسی واسطے محبت ہے کہ اس میں شجاعت کا کمال ہے۔ مجھ کو یاد ہے کہ بچپن میں اُردو شاہنامہ دیکھا کرتا تھا جب کسی لڑائی کا قصہ آتا تو جی سے تمنا ہوتی تھی۔ کہ خدا کرے یہ لکھا ہو کہ رستم جیت گیا۔ حالانکہ اگر وہ جیت گیا یا ہار جاوے تو ہم کو کیا نفع ہے مگر اس کے کمال کی وجہ سے کان اس بات کو نہیں سُن سکتے تھے کہ ہار گیا۔

تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کے اندر شجاعت کا کمال تھا۔ اس زمانہ میں جو بہت

واقعات لڑائی کے ہوتے تو مسلمانوں کے غلبہ کو سُن کر مسلمانوں کا دل تو خوش ہوتا ہی تھا۔ مگر بہت سے ہنود کو بھی دیکھا کہ وہ ان کے غلبہ کو سنکر خوش ہوتے تھے۔ اس کا سبب بھی وہ ہی محبت ہے۔ ترکوں سے بسبب ان کے کمال شجاعت کے اور اس کے علاوہ ایک سبب ترکوں سے محبت کا ان کی مظلومیت بھی تھی کہ یہ بھی کمال میں داخل ہے۔ اس لیے کمال یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے اور جب اس پر ظلم ہو تو مستقل رہے۔ تیسرا سبب محبت کا جمال ہوتا ہے۔ جیسے کوئی حسین جمیل ہے اس سے بالطبع محبت ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ گورے چٹے کو جمیل نہیں کہتے یہ تو پوست پرستوں کا مذہب ہے کہ ان کے یہاں محبت جمال صورت ہی سے ہے۔ عقلاء کے نزدیک اصلی جمال یہ ہے کہ اخلاق میں تناسب و اعتدال ہو اور اسی سے کشش ہوتی ہے قلوب کو اگر اس کے ساتھ صورت بھی کچھ اچھی ہو تو بہت ہی کچھ کشش ہوتی ہے یہ ہیں طبعی اسباب محبت کے۔

مطیعانِ شریعت میں اسبابِ محبت

اب دیکھئے مطیعانِ شریعت میں یہ امور کس درجے کے ہوتے ہیں کیونکہ خود تعلیم شریعت ہی ان کی جامع ہے۔ چنانچہ نوال کی تو کیفیت ہے کہ ایثار، جود، کرم، عطا، انسان ہی کے ساتھ نہیں۔ بلکہ جانوروں تک کے ساتھ کرنے کا حکم فرمایا ہے جو ہمدردی شریعت نے تعلیم کی ہے کیا کوئی اس کا مقابلہ کرسکتا ہے اور اس پر ممکن ہے کہ کوئی ایسا شخص جو سانپ وغیرہ کو بھی نہیں مارتا یہ کہے کہ شریعت نے تو موذی جانوروں کے مارنے کا حکم دیا ہے۔ یہ کیا ہمدردی ہے اور ہم تو موذی جانوروں کو بھی نہیں ستاتے۔

صاحبو! ہر شے کا ایک مصرف ہے رحم اور ہمدردی کا بھی موقع ہے اگر اس موقع پر کی جائیگی تو مدح کے قابل ہوگی۔ ورنہ ہمدردی نہ ہوگی۔ دیکھو! پیار محبت

بہت اچھی شے ہے ۔ مگر کسی ساتھ اپنے بچوں کے ساتھ بیوی کے ساتھ ۔ اگر کوئی ... بیہودہ معمول کر لے کہ جب گھر آیا کرے اماں جان کو پیار کیا کرے تو اُس کو سب مسخرہ اور بیوقوف اور بے ادب کہیں گے ۔

اسی طرح مثلاً باپ کو برخوردار، نورِ چشم لکھنے لگے تو معیوب ہوگا ۔ غرض ہر شے کے اندر اعتدال ہونا چاہیئے ورنہ پھر وہ اپنی حد سے نکل کر اپنی ضد میں جا پہنچتی ہے ۔ بقول اہلِ تحقیق الشیئ اذا خرج عن حدود الحق ینضد مثلاً ترحم ہی ہے ۔ اس میں اگر اعتدال نہ ہوا مثلاً چوہوں کو نہیں مارا تو اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انہوں نے آدمیوں کو مارا کیونکہ وہ آدمیوں کو تکلیف دیں گے ۔ کیا اچھا رحم ہُوا کہ چوہوں پر تو رحم کیا اور اپنی بنی نوع کا نقصان کیا ۔ اسلام نے اخلاق کی تعدیل کی ہے ۔ یہ تو نوال میں گفتگو تھی ۔ اب کمال کو لیجئے ۔ بڑا کمال علم ہے شریعت میں اُس کے حاصل کرنے کی بہت ہی تاکید ہے ۔ سخاوت اور شجاعت بھی کمال ہیں ۔ شریعت نے ان دونوں کا بھی ایسا اہتمام کیا ہے کہ کوئی اس کی نظیر نہیں دکھلا سکتا ۔ اب رہ گیا جمال! تو اس کا مدار ہے اخلاق پر اس لیے کہ اخلاقِ جمیلہ میں جو کشش ہے حسنِ صورت میں اس قدر نہیں ہے اگر کسی میں اخلاق جمیل ہوں اگرچہ ترکیب اعضاء کے قاعدے سے عرفاً وہ حسین نہ ہو ۔ مگر اس کے اندر ایک دلربائی چہرہ پر حلاوت اور نور ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے حسینوں میں وہ بات نہیں ہوتی ۔

بازاری عورتیں اپنے کو بہت بناتی ہیں مگر چونکہ اخلاق ذمیمہ ان کے اندر ہوتے ہیں اس لیے چہرہ پر پھٹکار برستی ہے ۔ بھولا پن نہیں ہوتا ۔ بخلاف عفیف عورتوں کے کہ کیسی ہی میلی کچیلی کالی کولی ہوں ۔ مگر ان کے اوپر ایک نور اور کشش ہوتی ہے ۔ سو اعمال صالحہ میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جمال بڑھ جاتا ہے ۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی ـــ نیک بیں باشی اگر اہلِ دلی

کسی نے خوب ترجمہ کیا ہے ؎

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور ـــ کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

اور اگر کسی کا ذہن اتنا عمیق نہ ہو اور غایت بلاہت سے وہ حسن متعارف ہی میں جمال کو منحصر سمجھتا ہو تب بھی ظاہر ہے کہ محبوبیت کاملہ کے لیے اس کا مدار ہونا مشروط ہوگا اس حسین الصورت کے حسین السیرت ہونے پر۔ جس سے پھر اصل مداریت ایمان و عمل صالح ہی کے لیے ثابت رہی ورنہ اگر اس کی سیرت اچھی نہ ہوئی تو بعض کو اس سے محبت ہی نہ ہوگی۔ اور اگر کسی کو ہوگی۔ کامل نہ ہوگی۔ یعنی ضعیف ہوگی۔ یا جلدی زائل ہو جاویگی۔ یعنی جب یہ حسن جاتا رہے گا تو محبوبیت بھی جاتی رہیگی اور حسن سیرت پر جو محبوبیت ہوگی وہ مدت العمر باقی رہے گی۔

علاوہ اسکے اگر اس سے بھی قطع نظر کی جاوے تب بھی محبوبیت کے لیے مجموعہ اسباب کا جمع ہونا ضروری نہیں اگر مومن و عامل صالحات میں جمال بھی نہ ہو تب بھی دوسرے اسباب تو قوت کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ بھی محبوبیت کے لیے کافی ہیں اور اگر کسی کافر میں محبوبیت پائی جاوے تو اگر وہ اخلاق اسلامی میں سے کسی خلق کے پائے جانے سے ہے تب تو اس کا سبب وہی عمل صالح ٹھیرا باقی یہ بات کہ پھر مومن کی کیا تخصیص ہوئی۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ وہ خلق بھی غیر مومن میں اس کمال کے ساتھ ہرگز نہ پایا جاویگا۔ جیسا مومن میں کیونکہ مومن میں اس کا مقتضی مضبوط ہوگا یعنی ابتغاء مرضات حق۔ جس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ بخلاف کافر کے کہ اس کا جو منشاء ہوگا وہ متبدل ہوگا۔ اور اسکی تبدل سے وہ خلق متبدل ہو سکتا ہے پس کمال محبوبیت مومن ہی میں رہی۔ اور اگر اخلاق کے علاوہ اور کوئی امر ہے جیسے

حسن صورت وغیرہ تو وہ عام محبوبیت کا سبب نہ ہوگا۔ چنانچہ مسلم و مشہور ہے ؎

معشوق من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت ست

بخلاف اسباب تعلیم فرمودۂ شریعت کے کہ اُس میں یہ اثر عام ہے۔ البتہ جس کے مدرکات ہی ٹھیک نہ رہے ہوں یا اُس کی کوئی غرض فوت ہوتی ہو اُس کا اعتبار ہی نہیں۔ یہ مضمون آئندہ مقصوداً بھی آتا ہے۔

خوبیٔ معاشرہ

اور لیجئے ایک سبب محبت کا خوش معاملگی و خوبیٔ معاشرت ہے جو مفہوم کلی کمال میں داخل ہوسکتی ہے۔ شریعت نے اس کی یہاں تک تعلیم کی ہے کہ دُور دُور تک کے احتمالات تک پر نظر فرمائی ہے۔ کہ کسی کے مال میں بلا اجازت تصرف نہ کرو۔ کسی کے خلوت خانہ میں بلا اجازت نہ جاؤ۔ اگر جاؤ تو اجازت لے کر جاؤ۔ اور اس کا طریقہ کیسا اچھا تعلیم فرمایا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر کہو السلام علیکم أدخل۔ یعنی میں آؤں۔ تین بار کہنے پر اگر جواب نہ ملے تو واپس چلے جاؤ۔ کواڑ مت کھٹکھٹاؤ۔ ممکن ہے کہ اس وقت ملنے سے کچھ عذر ہو۔ سوتا ہو یا جی نہ چاہتا ہو۔ اُس کو معذور سمجھ کر واپس چلے آؤ۔ اور اگر اندر سے یہ کہہ دیا جائے کہ اس وقت واپس جاؤ تو واپس چلے آؤ۔ بُرا مت مانو۔

چنانچہ ارشاد ہے ھُوَ اَزْکیٰ لَکُمْ کہ یہ زیادہ صفائی کی بات ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ یعنی اس میں ملاقات صاف رہتی ہے ـــــ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے وہ عوالی میں رہتے تھے۔ بعض عوالی کئی کئی میل کے فاصلہ پر تھے۔ اور السلام علیکم أَنا أدخل تین بار فرمایا۔ جب تینوں مرتبہ جواب نہ آیا تو آپ واپس تشریف لے جانے لگے۔ حضرت سعد بن عبادہ دوڑے کہ یَا رَسُولَ اللّٰہ! آپ کہاں چلے فرمایا کہ تین مرتبہ کے بعد انتظار کرنا نہ چاہیئے۔ سعد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تو برابر سنتا

رہا مگر اس لیے نہیں بولا کہ اچھا ہے یہ دعائیہ کلمات جو اس زبان مبارک سے نکل رہے ہیں جتنے مل جائیں غنیمت ہیں۔

افسوس ہے! کہ آجکل بجائے السلام علیکم کے جو تمام دعاؤں اور ادب کو جامع ہے آداب کو رنشات نکلا ہے۔ آداب کے معنی تو میرے نزدیک یہ ہیں کہ آپ پاؤں داب یہ ادب ہوا کہ دوسرے کو حکم پاؤں دابنے کا کر رہے ہیں ـــــ بعض لوگ بندگی کرتے ہیں۔ میں جب کانپور اوّل اوّل گیا تو وہاں مسلمانوں میں بھی اس لفظ بندگی کا رواج دیکھا ہے۔ اب جو کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے تو وہ بندگی کہتا ہے مجھ کو غصہ آیا کہا کہ میں کیا ہندو ہوں جو بندگی مجھکو کہتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں نے کہا کہ یہاں کا رواج ہی یہ ہے۔

یاد رکھو! یہ لفظ سب خرافات ہیں اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے تمام دعاؤں کو جامع ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کو ان لوگوں کو اس کی برکات سے محروم کرنا ہے۔ اس لیے ان کو توفیق ہی اسکی نہیں ہوتی۔ غرض! حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ حضورؐ کو پھر لائے۔ دیکھئے! حضورؐ نے بھی خود اپنے اوپر اس قانون کو جاری کیا۔ اور پھر کمال اخلاق یہ ہے کہ شکایت حکایت نہیں یہاں تو کوئی ادنیٰ آدمی بھی ہو تو کہنے لگتا ہے کہ تم بڑے مغرور ہو ہم پکارتے رہے چلاتے رہے سُنا ہی نہیں۔

شریعت میں تمدن کی رعایت

اور اس باب میں شرع نے یہاں تک رعایت کی ہے کہ ارشاد ہے لا یتناجی اثنان دون الثالث۔ یعنی اگر تین آدمی بیٹھے ہوں تو دو آپس میں سرگوشی نہ کریں۔ اسلئے کہ اس کا دل دکھے گا کہ بس میں ہی غیر تھا مجھ سے چھپانا منظور تھا کہاں ہیں تمدن کے مدعی۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ شریعت نے تمدن

کی اس قدر رعایت کی ہے کہ اتنی کوئی کرتا۔ تو کیا اس کے دقائق اور اسکی علل سمجھنے کے لیے بھی بڑے دماغ کی ضرورت ہے۔ افسوس! شریعت جیسے دلبر رعنا کو لوگ ڈائن سمجھتے ہیں۔ ارے! شریعت تو وہ محبوب ہے کہ جیسا کسی نے کہا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم — کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

جس ادا کو دیکھوں دل کھینچتا ہے۔ اے صاحبو! اپنے گھر کی دولت چھوڑ کر کیوں دوسروں سے چھوٹی کوڑیاں مانگتے ہو۔ تمہاری معاشرت تمہارے کھانے پینے تمہارے اخلاق تمہاری سیاست و انتظام شریعت نے کسی بات کو بھی تو نہیں چھوڑا۔ افسوس ہے اور ہزار افسوس ہے کہ ایسی محبوبہ کو چھوڑ کر چڑیلوں پر گرتے ہو کیونکہ شریعت کے سامنے تہذیب جدید کو بالکل یہی نسبت ہے۔ اور طرفہ یہ کہ شریعت میں دین کی راحت تو ہے ہی دنیا کی بھی پوری آسائش ہے۔

قید آزادی

اور اسی طرح اس تہذیب مخترع میں دین کا تو جو کچھ بھی ضرر ہو۔ خود دنیا کی بھی تکلفیں ہیں۔ چنانچہ مقابلہ اور امتحان ہی کے طور پر دیکھ لو۔ مثلاً آجکل ہمارے ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں۔ اور شریعت کو قید بتلاتے ہیں۔ ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں۔ کہ یہ لوگ مقید ہیں اور ہم آزاد ہیں۔

ایک صاحب کانپور میں کوٹ پتلون بوٹ سوٹ سے کسئے میرے پاس آئے وہ بیٹھنا چاہتے تھے۔ کرسی پر تو وہ سہولت سے بیٹھ جاتے لیکن ہم غریبوں کے پاس کرسی کہاں۔ ہمارے لیے تو چٹائی پہ بیٹھنا فخر ہے۔ اب وہ کھڑے ہیں لیکن کھڑے کھڑے بات کیسے کریں۔ ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھی۔ چھڑی پہ سہارا دیکر ادر تاک لگاکر بھد سے گر پڑے مجھے بڑی ہنسی آئی۔ بتلائیے! یہ تہذیب ہے یا تعذیب۔ یہ آزادی ہے یا قید کہ بیٹھنا تو مصیبت تھا ہی اور اٹھنا اور بھی زیادہ؟

مصیبت ہوا۔ اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں۔ تو بس وہاں ہی پڑے رہتے ہوں گے۔

اور لیجئے! اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجاوے تو ہم تو دانہ بھی چبا سکتے ہیں۔ اور روٹی ہو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ اور ان کے لیئے میز ہو کرسی ہو۔ کانٹا ہو چھری ہو۔ جب یہ کھانا تناول فرمائیں۔ کپڑوں میں ہمارے یہ حالت ہے کہ پاجامہ نہ ہو۔ لنگی باندھ لیں گے اچکن نہ ہو کرتہ کافی ہے۔ عمامہ نہ ہو ٹوپی ہی سہی۔ پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو بجز حدود شرعیہ کے کوئی قید نہیں اگر وہ بھی نہ ہو تو ننگے سر رہیں گے اور پھر اچکن اگر بانات کا ہو تو اس کی قید نہیں کہ پاجامہ کشمیرہ کا ہو لٹھ کا ہو۔ گاڑھے گزی کا ہو کسی شے کا ہو نہ ہو لنگی بھی کفایت کرتی ہے۔ اُن کو یہ مصیبت ہے کہ اگر پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو قمیص بھی اُس کے مناسب ہو ورنہ فیشن کے خلاف ہے۔

کیوں صاحبو! یہ آزادی تو بڑی بھاری قید ہے۔ ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا اور رسول سے آزاد ہیں باقی نہ کھانے میں آزاد نہ پینے میں آزاد نہ پہننے میں آزاد۔ ہر بات میں مقید ہیں اگر آزاد ہیں تو خدا و رسول سے آزاد ہیں تو خاک پڑے ایسی آزادی پر اور بھاڑ میں جائے ایسی مطلق العنانی۔

حیوۃ طیبہ

اور مبارک رہے ہم کو یہ قید اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو حالت یہ ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی زبند
شکارش نجوید خلاص از کمند

اور یہ وہ قید ہے ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلف آں نگار مقبلم۔

اور ہماری ایسی قید ہے کہ مدتوں کے بعد محبوب کسی کو ملا ہو اور وہ اپنے لطف

وکرم سے اُس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر عاشق کو اپنے پاس بٹھلا لے اور اُس کو نہ چھوڑے تو اُس عاشق کی اُس وقت کیا حالت ہوگی۔ اس کی تو غیبت میں یہ حالت تھی کہ کہا کرتا تھا ؎

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم ۔۔۔ کہ شاید دست من بار دگر جانِ من گیرد

بھلا اب کیا حال ہوگا۔ بلکہ اگر وہ محبوب یہ کہے کہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے میں تکلیف ہو۔ تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں تو وہ عاشق یہ کہے گا کہ میرا ہاتھ کیا جان بھی نہ چھوڑو اور یہ کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔ سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

پس جن کو خدا اور رسول کے ساتھ اس درجہ محبت ہے کیا وہ اس قید کو ناگوار سمجھے گا۔ ہرگز نہیں جس کو کسی سے کبھی محبت ہوئی ہوگی وہ ہی اُس کا لطف جانتا ہے ہاں! جس قلب میں محبت کا مذاق ہی نہ ہو۔ وہ کیا جانے کہ اس میں کیا لطف ہے نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہوتا ہے ورنہ اگر مذاق ہے تو خدا جانتا ہے کہ ساری قیدیں آسان ہیں وہ چولہے میں ڈالے گا۔ ان قیدوں سے آزاد ہونے کو اور بھاڑ میں ڈالے گا۔ ایسی عقل کو اور سر پہ رکھے گا دیوانگی کو اسی دیوانگی کی نسبت مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم ۔۔۔ مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہو نا داری ہو بیماری ہو افلاس ہو اُس کو سب گوارا ہیں اور اول تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی اور بالفرض اگر ہوں بھی تو اُس کو اس حالت میں بھی چین ہے سکون ہے اطمینان ہے اُس کی زندگی.. لطف کی زندگی ہے خواہ کسی حالت میں ہو حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً

طَیِّبَۃً یعنی جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اُس کو ہم پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں۔ اُن کی ہر وقت تسلی کی جاتی ہے اُن کے قلب میں سکون اور چین کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اُن کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے ؎

سوئے نومیدی مرو کامیدہاست　　سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ تعب بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں۔ اور ایسی قید کے مقابلہ میں جو آزادی ہے وہ نری مہمل ہے اور سراسر خسران ہے حرمان ہے اور یہ آزادی بس خدا و رسول سے آزادی ہے ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ اسلام نے ہم کو کیسی آسائش کی معاشرت سکھلائی ہے اور حقوق کی کہاں تک رعایت کی ہے۔

باہمی محبت کا راز

اور لیجئے اسلام کی تعلیم ہے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ ہو۔ اور یہ جڑ ہے محبوبیت باہم دگر کی چنانچہ...

ارشاد ہے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں یعنی کسی کو اس سے ضرر و اذیت نہ پہنچے یہ تو کلیہ ہے پھر اس کی جزئیات کی عملی اور علمی طور سے ایسی تعلیم فرمائی ہے کہ انتہا کو پہنچا دیا ہے چنانچہ تعلیم ہے کہ اگر کوئی بھائی مسلمان سوتا ہو اور تم کو اٹھنے اور کہیں جانے کی ضرورت ہو تو آہستہ سے اٹھو اور آہستہ سے جوتے پہنو، آہستہ سے کواڑ کھولو اگر بات کرو آہستہ سے کرو۔ یہ سب حضور ﷺ نے کر کے دکھلا دیا۔

جیسے نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے لیلۃ البراءۃ کے قصہ میں مذکور ہے وقت کم ہے ورنہ ایک ایک جزئی کے متعلق میں قصے بیان کر دیتا۔ میں نے ایک کتاب آداب المعاشرت لکھی ہے۔ اس میں یہ دکھلا دیا ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ دینے کی شارع علیہ السلام نے کتنی رعایت کی ہے آجکل جو دیندار کہلاتے ہیں۔ وہ دینداری کو ان

چند باتوں میں منحصر سمجھتے ہیں کہ پائینچے ٹخنے سے اوپر کر لیے ڈاڑھی بڑھالی نماز پڑھ لی۔ بس دیندار ہوگئے۔ باقی نہ اخلاق کو جزو دین سمجھتے ہیں نہ معاشرت کا دین سے کچھ تعلق جانتے ہیں نہ معاملات اُن کے شریعت کے موافق ہیں کسی کو ستالیا کسی کی غیبت کرلی کسی کو حقیر سمجھ لیا کسی کی آبروریزی کرلی اور پھر دیندار کے دیندار۔ اس کی وہ مثال ہے جو مولانا یا اور کوئی مصلح فرماتے ہیں ؎

از بروں چوں گور کافر پر حُلل و اندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید وز درونت ننگ میدارد یزید

ایسے دینداروں کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ بس دیندار ایسے ہی ہوتے ہیں اور شریعت کی یہی تعلیم ہے۔

صاحبو! یاد رکھو! کہ دین نام صرف ظاہر ہی کے درست کرنے کا نہیں گو ظاہر کی اصلاح بھی دین میں مامور بہ ہے مگر صرف اُس سے پورا دیندار نہیں ہوتا۔ پورا دیندار وہ ہے جو شریعت کے ہر ہر حکم پر عمل کرے۔ ظاہر کے متعلق بھی اور باطن کے متعلق بھی حسین اُس کو کہیں گے جو سر سے پاؤں تک حسین ہو اور اگر سب اعضاء خوب صورت ہوں اور آنکھیں پھوٹی ہوئی ہوں تو وہ حسین نہیں ہے پس جس کے اندر ایک بات بھی دین کے خلاف ہو۔ گو وہ ہم سے اچھا ہے لیکن اسکو نمونہ دین کیوں سمجھتے ہو۔

اور دیکھئے شریعت کی تعلیم ہے کہ سفارش سے بھی کسی کو تکلیف نہ دو۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے حضرت مغیثؓ کی سفارش کی۔ جو اوّل اُن کے شوہر تھے اور انہوں نے خیار عتق کی بناء پر تفریق کرلی تھی۔ اُن سے نکاح کرنے کے لیے فرمایا وہ پوچھتی ہیں کہ آپ کیا حکم فرماتے ہیں یا سفارش۔ آپ نے فرمایا سفارش! کہنے لگیں مجھ کو منظور نہیں آپ ناخوش نہیں ہوئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سفارش وہی ہے جس میں کسی پر زور نہ ڈالا جائے تو اتنی تکلیف بھی کسی کو گوارا نہیں کی گئی۔ اسی طرح دین کے اندر صفائی کا

حکم ہے۔ دیکھئے! اگر معاملات کو صاف رکھیں تو ممکن نہیں کہ دلوں میں فرق آوے

بہر حال شریعت کا جو حکم معاملہ و معاشرت و اخلاق کے متعلق لیجئے اُس کی تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس تمام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ ہو۔

الحاصل! جو اسباب محبت کے ہیں نوال جمال کمال شریعت نے اُن کی بابلغ وجہ تعلیم فرمائی ہے پس جو شخص شریعت پر عمل کریگا جو کہ عملوا الصّٰلحٰت کا مدلول ہے وہ بالطبع محبوب ہو جائیگا۔ اور اپنی قوم میں تو محبوب ہو ہی گا۔ غیر قوموں میں بھی اس کا اعتبار ہو گا۔ اسکے بعض اعمال صالحہ کا دوستی میں دخل ہونا۔ سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ جو کہ باب معاملہ و معاشرت و اخلاق سے ہے

ایمان و عمل صالح کا محبوبیت میں دخل

اب یہ بات رہ گئی کہ ایمان اور نماز روزہ کو کیا دخل ہے محبوبیت میں سو اُس کی نسبت سُنو کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ کوئی کام ہو اول اُس کا قلب میں ارادہ پیدا ہوتا ہے پھر اُس کا جوارح سے ظہور ہوتا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ کسی امر پر نباہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اُس کا تقاضا شدید قلب میں راسخ ہو جائے اور اُس کے اضداد و موانع قلب سے مرتفع ہو جائیں ورنہ ارادہ ہو گا۔ مگر غیر راسخ جب راسخ نہیں تو اکثر ارادہ بھی نہ ہو گا تو عمل بھی نہ ہو گا پس ثابت ہوا کہ مداومت و استقامت بدوں تقاضائے قلب کے نہیں ہوتا۔ پس اس قاعدہ کے موافق اخلاق و معاملات و معاشرت کی درستی بھی جس کا دخیل ہونا محبوبیت میں مسلم ہو چکا ہے جب ہی نبھ سکتی ہے کہ ان چیزوں کا قلب میں تقاضا و رسوخ ہو اور وہ تقاضا و رسوخ بغیر ایمان اور روزہ نماز کے نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ تمام قواعد متعلقہ بصدق و معاملات اللہ و رسول نے ہی ہم کو تعلیم فرمائی ہیں۔ تو جب تک تصدیق اللہ و رسول کی قلب

میں راسخ نہ ہوگی تو اُن تعلیمات پر استقامت نہ ہوگی۔ یہ تو ایمان کا دخل ہُوا اور روزہ نماز کو یہ دخل ہے کہ یہ کیفیت قلبی تقاضے کی موقوف ہے قلب کی صفائی پر۔ اور قلب کی صفائی بغیر روزہ نماز نہیں ہوتی روزہ سے تو اس طرح کہ اُس سے قوت بہیمیہ کا انکسار ہوتا ہے۔ اور نماز سے تواضع پیدا ہوتی ہے تکبر ٹوٹتا ہے اور تکبر و بہیمیۃ ہی اصل ہے بہت سے اخلاق ذمیمہ کی۔ پس صوم و صلوٰۃ سے اُس کی اصلاح ہوگی۔ اور اُس کی اصلاح سے معاملات وغیرہ درست ہوں گے جو مدار ہے محبوبیت کا اور مسبّب کا سبب سبب ہے۔ پس نماز و روزہ سبب ہوا محبوبیت کا۔ مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ایمان اور صلوٰۃ و صوم کا موضوع لہ صرف یہی ہے اصلی موضوع لہ۔ تو اُن کا قرب الٰہی ہے لیکن یہ محبوبیت بھی اور بہیر خاصہ لازمہ کے طور پر مرتب ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہاں بیان تھا محبوبیت و مودۃ کا۔ اس لیے اس کا بھی اُس میں دخل بیان کر دیا گیا۔

نصیحت یا محبت

اب دو سوال رہ گئے۔ ایک سوال تو یہ ہے کہ ہم بعضے دینداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ شریعت کی پورے پابند ہیں اور ساری دنیا کو نصیحت کرتے ہیں لیکن سب سے اُنکی لڑائی رہتی ہے۔ لوگ اُن کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے ہیں۔ وہاں محبوبیت کا ترتب کیوں نہیں ہوتا جواب اس کا یہ ہے ؎

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

یہ سوال آپ کا کم فہمی سے پیدا ہُوا ہے۔ صاحبو! نصیحت کا بھی شارع نے قانون مقرر کیا ہے۔ جب کوئی شخص اُس قانون کے خلاف کریگا تو وہ اپنے کمال ایمان و عمل صالح کے اس ثمرہ مودت و محبوبیت سے ضرور محروم رہے گا۔ اس وہ شبہ جاتا رہا اور قانون یہ ہے کہ نصیحت خیر خواہی اور محبت اور ہمدردی سے ہو لغسانیت

سکا اُس میں شائبہ نہ ہو تو جو شخص اس قانون کے موافق عمل کریگا۔ اُس کی کسی سے مخالفت ہو ہی نہیں سکتی۔ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجلس وعظ میں ایک شخص کو دیکھا کہ اُس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہے۔ کوئی اور مولوی صاحب ہوتے تو بُلا کر ملامت کرتے۔ بُرا بھلا کہتے۔ سچ یہ ہے کہ ہم لوگ نام کے مولوی ہیں اور نرے الفاظ پرست ہیں۔ حالانکہ الفاظ یاد کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک حال نہ ہو۔ مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مردِ حال شو — پیشِ مردِ کاملے پامال شو

پس اگر کوئی نرا مولوی ہوتا تو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آیات واحادیث پر اس طرح عمل کرتے کہ بلا کر اُس کو بُرا بھلا کہتے اب عداوت و نفرت جانبین میں ہوتی۔ اور اس کو دیکھ کر بے شک یہ شبہ پیدا ہوتا کہ تم تو کہتے ہو کہ شریعت پر عمل کرنے سے محبوب ہو جاتا ہے۔ اور اُس پر لوگ پروانوں کی طرح گرتے ہیں لیکن ہم تو دیکھتے ہیں کہ بجائے دوستی کے اور اُلٹی عداوت اور نفرت ہو گئی۔ لیکن شاہ صاحب نے یہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جایئے آپ سے مشورہ کرنا ہے وہ ٹھہر گیا بعد فراغت کے فرمایا کہ بھائی اپنا عیب آدمی کو معلوم نہیں ہوتا مجھے اپنے اندر ایک عیب کا شبہ ہے وہ یہ کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے اور اس پر ایسی ایسی وعیدیں آئی ہیں تو آپ ذرا دیکھ لیں کہ واقعی میرا شبہ صحیح ہے یا نہیں وہ شخص پانی پانی ہو گیا اور عرض کیا کہ حضور آپ کا پاجامہ کیوں لٹکتا۔ میرا البتہ لٹک رہا ہے اور اُسی وقت اُس کو جا کر درست کر لیا۔ اور ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔ پس اگر محبت اور حکمت عملی سے کہا جائے تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی بُرا مانے۔

شرطِ وعظِ عام

اسی واسطے امر بالمعروف اور وعظ عام کی ہر شخص کو اجازت نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

یعنی چاہیئے کہ ایک جماعت تم میں سے ایسی ہو کہ جو خیر کی طرف داعی ہوں اور نیک بات کا حکم کریں اور بُری بات سے منع کریں۔

دیکھئے! یہ نہیں فرمایا کہ تم سب امر بالمعروف کرو۔ بلکہ یہ فرمایا کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہونا چاہیئے کہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف کا ہر شخص اہل نہیں ہے۔ ہر شخص کو اجازت نہیں ہے کہ وہ وعظ عام اور خطاب عام کرے البتہ جن پر پوری قدرت ہے جیسے اپنے اہل و عیال وہاں اصلاح کا ہر شخص مکلّف ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا۔ غرض ہر کام تدبیر سے ہوتا ہے میرا معمول ہے جب میں کہیں سفر میں ہوتا ہوں مجھ سے فرمائش ہوتی ہے کہ وعظ میں فلاں بات کا ذکر کرنا۔ میں صاف انکار کر دیتا ہوں بعضے ایسے بھولے بھالے ہوتے ہیں کہ منبر پر بیٹھ کر وہی سبق گاتے ہیں جو اُن کو پڑھایا جاتا ہے۔ لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لایا گیا کہہ رہے ہیں اس سے اثر ضعیف ہو جاتا ہے اور لوگوں کو ناگوار بھی ہوتا ہے میں ایسی فرمائش پر ہرگز عمل نہیں کرتا۔ حتٰی کہ نواب صاحب ڈھاکہ نے مجھ کو بلایا تھا میں نے پہلے یہ شرط کر لی تھی کہ آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ مجھ سے کسی خاص بات کے وعظ میں بیان کرنے کی فرمائش کریں۔ چنانچہ انہوں نے موافق شرط کے کسی بات کی فرمائش نہیں کی۔ میں نے وعظ میں جو چاہا بیان کیا کسی نے بھی بُرا نہیں مانا۔ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے۔ کہ فرمائشی وعظ کا اور رنگ ہوتا ہے اور خود کہنے میں اور بات ہوتی ہے۔ پس شریعت کا قانون ہے کہ نصیحت و تذکیر میں آداب احتساب کی رعایت کرو۔ اور اگر کوئی باوجود آداب کی رعایت کرنے کے بُرا مانے۔ اس پر شبہ واقع نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ صفراوی کو مٹھائی کڑوی معلوم ہو رہی گی۔ اسلیئے کہ اس کا مزاج ہی خراب ہے امر بالمعروف کی خاصیت میں کچھ خرابی نہیں اُس کا خلاصہ تو یہ ہے کہ ممنون ہونا چاہیئے۔ ہمارے امراض اس شخص نے معلوم کرائے ایک اعتراض تو یہ تھا

جس کا جواب ہو گیا۔

تاثیر اخلاق حسنہ

دوسرا سوال یہ ہے کہ بعض دیندار بھی نہیں ہوتے اور پھر بھی وہ محبوب ہوتے ہیں تو پھر محبوبیت صرف دینداری کا خاصہ کیا ہُوا۔ میں اُس کا راز بتلاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جب کوئی محبوب ہو۔ اور وہ دیندار نہ ہو تو یہ دیکھو کہ علت اُس کی محبوبیت کی کیا ہے۔ سو علت اُس کی اکثر تو وہی شے نکلے گی جس کا شریعت نے حکم کیا ہے۔ مثلاً کوئی کافر سخی ہے یا عادل ہے تو اُس سے اُس کی سخاوت اور عدل کی وجہ سے محبت ہوتی ہے اور سخاوت اور عدل دونوں کی شریعت نے تعلیم کی ہے کفر کے ساتھ مل کر بھی اُنہوں نے اپنا اثر دکھلایا ؎

جُرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند صاف گر باشد ندانم چوں کُند

شراب کا گھونٹ مٹی میں مل کر جب مست بنا دیتا ہے تو خالص شراب تو کیا کچھ نہ کرے گی اسی طرح اعمالِ شرعیہ کفر کی نجاست کی آلودگی کے ساتھ بھی جب اپنا کام کر رہے ہیں اگر ایمان کے ساتھ ملیں گے تو دیکھو کیا رنگ لاتے ہیں۔ ایک جواب تو یہ ہوا دوسرا جواب یہ ہے کہ محبوبیت مطلقہ یعنی من کل الوجوہ میں گفتگو ہے ہر شخص کے نزدیک محبوب بنا دے۔ یہ بجز مومن کامل کے کسی کو نصیب نہیں۔ اگر کوئی کافر کسی خلق حسن کے ساتھ متصف ہے تو وہ بعض کے نزدیک محبوب ہے اور بعض کے نزدیک نہیں۔ بلکہ کُفر یا بعض اخلاق ذمیمہ کی وجہ سے مبغوض ہے۔ اب شبہ جاتا رہا۔ اور اگر حسن وغیرہ علت ہو تو اُس کا جواب اوپر آ چکا ہے۔ اب ایک اعتراض اور باقی رہا۔ وہ یہ ہے کہ ایک مومن جو شریعت کا پُورا پابند ہے اس کا کسی سے مقدمہ ہو اور اُس میں وہ مومن ہی حق پر ہے۔ تب بھی فریق مقابل اسکو نظر غیظ سے دیکھتا ہے نظر محبت سے ہرگز نہیں دیکھتا۔ اب وہ خاصہ کہاں گیا جواب اس کا یہ ہے کہ ہر شے کی خاصیت کے ظاہر ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی معارض نہ ہو۔ اگر معارض ہو تو یوں کہیں گے کہ شے اپنے اثر سے

مختلف ہوگئی تو یہاں یہ معارض ہے کہ اس کو اس کے زعم میں حضرت سے بغض رہا ہے اس لیے یہ شخص اگر نظر غیظ سے دیکھے تو ہمارے دعوے کے کچھ منافی نہیں ہے ہاں عام طور سے دیکھو کہ دوسرے لوگ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ سو یقینی بات ہے کہ ایسے موقع پر عام طور پر سب یہی چاہا کرتے ہیں کہ خدا کرے یہ جیت جائے۔ اسی طرح اگر غیر مومن اگر مظلوم ہو تو سب کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی فتح ہو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفر سبب مودۃ کا ہے یہاں اسکی مظلومیت اس کی مبغوضیت کے معارض ہو رہی ہے۔ دراصل وہ مبغوض ہی ہے پس خلاصہ یہ ہوا کہ محبوبیت اعمال صالحہ اور ایمان میں منحصر ہے۔

اتحادِ اغراض

اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوئی کہ جو اتفاق اور محبوبیت مودت کو اس راہ سے طلب نہیں کرتے ہیں

ترسم کہ نہ رسی بکعبہ اے اعرابی کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

چنانچہ جو لوگ اتفاق اتفاق پکار رہے ہیں اور شریعت کے خلاف کر رہے ہیں اُن کو آج تک تو کامیابی ہوئی نہیں اگر کوئی کہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض جگہ ان میں اتفاق ہے۔ صاحبو! وہ اتفاق نہیں۔ اس لیے کہ آپ کو واضح ہو گیا ہے کہ اتفاق ہوتا ہے باہمی اُلفت سے اور اُن میں الفت نہیں وہ عارضی اور اتفاق کی صورت ہے بہت جلدی زائل ہوتا ہے۔ کیونکہ منشاء اس اتفاق کا اتحاد اغراض ہے۔ جب تک اغراض متحد ہوتے ہیں وہ اتفاق کا ڈھانچہ قائم رہتا ہے اور جب اغراض میں اختلاف ہوتا ہے فوراً وہ اتفاق ٹوٹ جاتا ہے۔

اتفاقِ محکم

بخلاف مومن کے اتفاق کے۔ اس لئے کہ اسکی غرض اور مطلوب ہمیشہ اللہ رسول کی رضا ہے اور اس میں تزاحم محتمل ہی نہیں۔ اس لیے اُس کا اتفاق قائم رہتا ہے۔ دو مومن اگر جنوب و شمال میں بھی ہیں اور اُن میں کوئی سابقہ تعلقات بھی نہیں۔ اُن میں بھی اتفاق ہے۔ پس عقلی طور سے ثابت

ہوگیا کہ اتفاق اگر ہے تو مومنین میں ہے۔ اور اگر باقی رہ سکتا ہے تو اُنہی کا اتفاق باقی رہ سکتا ہے۔ اور اسی پر قیاس کر لیجئے اسکی ضد کو۔ کہ بغض اور عداوت جب ہوگا خلاف شریعت کے کرنے سے ہوگا۔ اور بغض اگر قائم رہنے والا ہے تو وہ ان میں ہی ہے جو ایمان یا عمل صالح میں خلل ڈالتے ہیں پھر بھی مومنین میں جتنا بھی ایمان ہے اسی مقدار کے موافق اُن میں مودت ومحبت لازم ہے پس اگر آپ محبوب بننا چاہتے ہیں اور اپنے آپس میں اتفاق قائم رکھنا چاہتے ہیں تو خدا و رسول کی اطاعت کیجئے ورنہ مبغوضیت کے لیے تیار ہو جائیے۔ لیکن خدا کے لیے ایمان اور عمل صالح کو اس نیت سے نہ کیجئے کہ ہم محبوب بنیں۔ بلکہ قصد تو اطاعت حق کا ہونا چاہئے۔ ہاں اس پر یہ ثمرہ بھی مرتب ہو جاتا ہے جیسے جب خانہ کعبہ کا ارادہ ہو تو بمبئی کی سیر کا ارادہ نہ کرو۔ نیت تو ہونا چاہئیے۔ حج کی ہاں راستہ میں بمبئی بھی آوے گی۔ اور سیر بھی کر لوگے۔

اور یہاں سے یہ بات یاد رکھنا چاہئیے کہ بعض لوگ جو نماز کی حکمت یا حج کی حکمت یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ نماز سے صفائی حاصل ہوتی ہے۔ اور جماعت کی حکمت یہ کہتے ہیں کہ پانچ وقت جب محلہ کے مسلمان ملیں گے تو آپس میں اتفاق ہوگا۔ اور جمعہ میں شہر کے مسلمانوں میں اتفاق ہوگا۔ اور حج میں تمام عالم کے مسلمانوں میں اتحاد ہوگا۔ میری تقریر کا اُن کی تقریر سے متحد ہونے کا شبہ نہ کیا جاوے کہ وہ بھی ان اعمال صالحہ کو مورث اتفاق بتلاتے ہیں۔ اور یہی میں نے کہا۔ سو اُن کی اور میری تقریر میں بہت بڑا فرق ہے اُن کی غرض تو یہ ہے کہ مقاصد اصلیہ ان احکام کے یہی اتحاد و اتفاق ہیں۔ اور میرا مقصود یہ ہے کہ موضوع لہٗ اصلی تو ان طاعات کا قرب الٰہی ہے اور خدا تعالےٰ کا راضی کرنا۔ ہاں جو ثمرہ اُن پر بلا قصد مرتب ہو جاتا ہے وہ یہ بھی ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ گو اُن کے لیے یہ اعمال موضوع نہیں۔ پس میری تقریر

کو اُن کی تقریر کا ہمرنگ ہرگز نہ سمجھا جاوے۔

الحاصل! اتفاق کا اتباع شریعت میں اور نااتفاقی کا شریعت کے خلاف کرنے میں منحصر ہونا ثابت ہوگیا۔ اور جس طرح سے اس تقریر سے اتفاق کے اسباب معلوم ہوگئے۔ جن کا حاصل اطاعت حق ہے۔ اسی طرح اُس سے نااتفاقی کے بھی اسباب معلوم ہوگئے ہوں گے کہ معصیت حق ہے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق عمل کی عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین

الوعظ المسمّٰی بہ

مواساۃ المصابین

﴿یہ وعظ﴾

مصیبت زدہ لوگوں کی ہمدردی اور شفقت و ترحّم کے بارے میں ہے اسکے دو جزو ہیں۔ جزوِ اوّل کا بیان ۴ رذی الحجہ ۱۳۳۰ھ کو بروز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں ہوا۔ اور جزوِ دوم کا بیان جناب منشی محمد اکبر علی صاحب مرحوم کے مکان پر جو کہ تھانہ بھون میں ہے ۵ رذی الحجہ ۱۳۳۰ھ کی شب کو ہوا۔ دونوں بیان بیٹھ کر ہوئے —— اور مولوی سعید احمد صاحب مرحوم نے انہیں قلمبند فرمایا

خُطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ۔

تمہید یہ عبارت جو میں نے پڑھی ہے ایک حدیث یعنی ارشاد نبوی ہے اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بندگانِ خدا کے ساتھ رحم اور محبت کی ترغیب و فضیلت بیان کی ہے۔ ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو طبعی طور پر رحم کرنے کو اچھا نہ سمجھتا ہو کسی کو بھی اس میں اختلاف نہیں تو ایسا امر جو سب کے نزدیک مانا ہوا ہے

اور قدرتی طور پر سب کے دل میں اس کی خوبی مسلّم ہے اگر وہ قرآن وحدیث میں بھی ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ بہت ہی مؤکد ہو گا کیونکہ شریعت کا معمول یہ ہے کہ جو امر طبعی طور پر سب کے نزدیک اچھا مانا گیا ہو اس کا زیادہ اہتمام نہیں کرتی۔ کیونکہ اس کو تو لوگ خود ہی کریں گے لیکن اگر باوجود طبعی ہونے کے اس کا اہتمام کرے تو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ بہت ہی ضروری ہے رحم بھی اسی قبیل سے ہے کہ اس کو ہر شخص طبعًا اچھا سمجھتا ہے تو حسبِ قاعدہ مذکورہ شریعت کو اہتمام کے ساتھ اس کی ترغیب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس حدیث میں بڑے اہتمام کے ساتھ حضورؐ نے اس کی ترغیب دی ہے معلوم ہوا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔

فضیلت رحم

حضورؐ فرماتے ہیں الرّاحِمُوْنَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمٰنُ کہ رحم کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ رحم کرنے والے پر حق تعالےٰ رحم فرماتے ہیں۔ دیکھو یہ تھوڑی فضیلت نہیں بہت بڑی فضیلت ہے خدا کی رحمت سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے۔ خدا تعالےٰ کی صفات دو طرح کی ہیں۔ بعض صفات کے آثار کی تمنّا تو بعض حالات میں ہوتی ہے ہر وقت نہیں ہوتی مثلاً عدل یہ بھی خدا کی ایک صفت ہے جس کے معنی ہیں کہ ہر کام کے مقتضا پر پورا حکم کرنا ظاہر ہے کہ گنہگار آدمی کو تو عدل سے ڈر لگے گا۔ اس کو عدل کی تمنّا کب ہو گی۔ لیکن یہ صفت رحمت ایسی ہے کہ اس کی تمنّا ہر وقت اور ہر شخص کو ہے طاعت میں بھی اور گناہ میں بھی۔ بلکہ گناہ میں تو اس کی بہت ہی ضرورت ہے کیونکہ یہ رحمت ہی ہے کہ باوجود اس قدر نافرمانی کے پھر بھی مواخذہ نہیں ہوتا دنیاوی حکام ذرا ذرا سی بات پر مواخذہ کرتے ہیں مگر خدا کی رحمت ہے کہ بڑے بڑے گناہوں پر بھی انعامات بند نہیں فرماتے۔ علاوہ گناہوں کے اگر ہم کوئی نیک کام بھی کرتے ہیں تو اس کو پورا پورا بجا نہیں لاتے۔ اور کسی گناہ کو چھوڑتے نہیں تو ایسے بہت کم ہیں جو خدا کے خوف سے چھوڑتے ہوں بہت لوگ خوش ہوتے ہوں گے کہ ہم ..

چوری نہیں کرتے مگر وہ اس لیے نہیں کرتے کہ تقدس و بزرگی کو بٹہ لگ جائے گا۔ یا خاندان کا نام بدنام ہو جائے گا یا انہیں اس کا داعیہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا کا خوف کر کے بچنے والے بہت کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس چوری میں بدنامی نہ ہو اس سے بچنے والے شاذ و نادر ملتے ہیں مثلاً کسی نے امانت کسی کے پاس رکھوائی اس کو خرچ کر لیتے ہیں۔ قرض لے کر ادا نہیں کرتے دوسرا شخص بے چارہ پریشان پھرتا ہے اور یہ بے حیا بن کر اس کا مال اڑاتے ہیں اکثر لوگ جو یتیموں کو پرورش کرتے ہیں بے دریغ ان کا مال خرچ کرتے ہیں اور پھر خوش ہیں کہ ہم چوری نہیں کرتے۔ اگر خدا کے خوف سے چوری نہیں کرتے تھے تو وہ خوفِ خدا ان باتوں میں کہاں چلا گیا اور جو لوگ واقعی خدا کے خوف سے گناہ چھوڑتے ہیں ان میں بھی گناہ کے ہر درجہ سے بچنے والے بہت کم نکلیں گے۔ بہت آدمی خدا کے خوف سے زنا نہیں کرتے مگر زنا کے ہر درجہ سے بچنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ حدیث نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے حضورؐ فرماتے ہیں العینان تزنیان کہ آنکھ سے بھی زنا ہوتا ہے فیصدی پانچ بھی اس سے پاک نہ ملیں گے اور جو اس سے بھی بچتے ہیں وہ کان کے زنا سے نہیں بچتے یعنی لذت کے لیے کسی محبوب کی باتیں سُننا۔ زبان سے بھی زنا ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ حضورؐ فرماتے ہیں والقلب یزنی یتمنی ویشتھی کہ دل سے بھی زنا صادر ہوتا ہے جبکہ وہ آرزو اور شہوت سے کسی کا خیال کرتا ہے کہ فلانی عورت مل جائے تو کیا اچھا ہو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو دل میں کسی کے حسن و جمال کو سوچ سوچ کر مزے لیتا ہے یہ دل کا زنا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ کہیں کہ یہ تو چھوٹا سا گناہ ہے میں کہتا ہوں کہ چھوٹی چنگاری بھی کبھی چھپر میں لگ جاتی ہے تو سب کو خاکستر کر ڈالتی ہے۔ یہ چھوٹا زنا بھی ایمان کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ بعض لوگ خوش ہوتے ہونگے کہ ہم نے قتل نہیں کیا مگر حدیث میں آیا ہے کہ اگر مسلمان سے ایک سال تک نہ بولا جائے تو قتل کا گناہ ہوتا ہے یہاں بعض آدمی ساری عمر کسی سے نہیں بولتے۔ جناب! بس رہنے ہی دیجئے

خدا کا فضل وکرم ہے کہ دن رات گناہ کرتے ہیں مگر کسی کو خبر نہیں ہوتی۔

پہلی امتوں کی حالت گناہوں کی بدولت بالکل بدل دیجاتی تھی کسی کو طوفان سے تباہ کردیا کسی کو ہوا سے ہلاک کردیا وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس وقت ہم مسلمانوں ہی میں بڑے بڑے گناہ ہو جاتے ہیں مگر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور جو ہوا بھی تو تنبیہ کے لیے چھوٹی چھوٹی بلائیں گرانی اور بیماری وغیرہ بھیجدی گئیں اور بس مگر ہماری یہ حالت ہے کہ ان مصائب سے بھی خبردار نہیں ہوتے اور خیال ہی میں نہیں لاتے کہ یہ بلائیں گناہوں کی بدولت ہیں۔

غرض! ہماری حالت مواخذہ کے قابل ہے مگر رحمت ہی ہے کہ ہم موجودہ حالت میں ہیں تو اس صفت کی ہم کو ہر وقت احتیاج ہے تو ایسی راحت کی چیز کے حاصل ہونے کا طریق بتاتے ہیں

ترغیب رحم اور فرماتے ہیں کہ اگر تم رحم کروگے خدا تم پر رحم کریگا اور یہاں اللہ کی جگہ رحمٰن فرمایا جس کے معنی ہیں بہت رحم کرنے والا جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کے پاس بڑی رحمت ہے تو وہاں سے رحمت مل جانا بعید نہ سمجھو یہ ایسا کلام ہے جیسا کہ کسی سے کہیں کہ اگر تم یہ کام کروگے تو فلاں کروڑپتی تم کو انعام دے گا۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ انعام یقینی ہے اس میں شک نہیں۔ کیونکہ وہ بڑا مالدار ہے ویسے ہی یہاں رحمٰن کا لفظ اختیار کرنے میں اشارہ ہے جزاء کے یقینی ہونے کی طرف کیونکہ خدا کی رحمت بہت بڑی ہے اس میں کچھ کمی نہیں ہے تم کو دیدینے سے بھی کمی نہ آویگی۔ یہاں تک تو رحم کی فضیلت کا بیان تھا ــــــ مگر چونکہ حضورؐ جانتے تھے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ثواب کی پرواہ نہ کریں گے اسلئے اول بصیغہ امر حکم فرماتے ہیں اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ کہ تم زمین والوں پر رحم کیا کرو اس لفظ سے رحم کو آپنے ہمارے ذمہ واجب فرمادیا اس کے بعد ترغیب دیتے ہیں کہ اگر تم رحم کروگے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ

یَرحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ کہ آسمان والا یعنی اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا۔ حق تعالیٰ زمین و آسمان سے پاک ہے اس کے لیے کوئی مکان نہیں حضورؐ کا لفظ مَنْ فِی السَّمَآءِ استعمال فرمانا بغرض اظہارِ عظمت ہے اور عظمت بیان کرنے کے لیے ہے تو اس حدیث میں فضیلت رحم اور اس کا امر اور ترغیب تینوں مجتمع ہیں اور سُنیے! اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ فرمایا جس سے حکم رحم تمام ذوی العقول کو عام ہوگیا مسلمان ہوں یا کافر اور دوسری حدیث میں جانوروں تک کے ساتھ بھی رحم کرنے کا امر وارد ہے۔ مگر اس جگہ ذوی العقول ہی کے لیے رحم کا حکم ہوتا ہے۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اگر کافروں پر رحم کرنا واجب ہے تو ان سے قتال کیوں جائز کیا گیا کیونکہ اول تو قتال ان کے شر کی سزا ہے ترک رحم مقصود نہیں بلکہ جن مستحقینِ رحم پر وہ بے رحمی کرتے تھے ان پر رحم ہے۔ دوسرے یہ حدیث مُجمل ہے اس کی تفصیل دوسری احادیث اور قواعد فقیہہ سے طلب کی جائے گی۔ چنانچہ بعض خاص اوقات میں کافر پر بھی رحم کرنے کا حکم آیا ہے۔

مثلاً ایک ہندو نابینا کنوئیں کے پاس سے جا رہا ہے اور اندیشہ اس کے گرنے کا ہے تو واجب ہے کہ اس کو بچایا جائے یہاں تک کہ اگر نماز بھی پڑھ رہے ہو تو نماز توڑ دینا ضروری ہے اور جب تمام زمین پر بسنے والوں پر رحم واجب ہے تو جتنی خصوصیات بڑھتی جائیں گی رحم کرنا زیادہ واجب ہوگا پس اگر کوئی شخص مسلمان بھی ہو جس کے بارے میں فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کہ سب مسلمان بھائی ہیں اس کے ساتھ رحم کرنا زیادہ ضروری ہوگا۔ اور اگر مسلمان ہونے کے ساتھ کوئی نسبی قرابت بھی ہو تو وہ دوسروں سے زیادہ مستحق رحم ہوگا یا قرابت کے سوا کوئی اور دوسری بات زیادہ ہو مثلاً وہ کوئی دین کا کام کرتے ہوں تو وہ اور زیادہ مستحق رحم ہوں گے دوسروں سے۔

رعایتِ حدود

مگر میرے اس کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کبھی کوئی ایسی جماعت پائی جاوے تو اس وقت اور سارے دینی اور دنیوی کام بند کرکے

اسی کو لے بیٹھو جیسا بعض نے یہاں تک غلو کیا ہے کہ بعض مواقع کے لیے یہ رائے دی کہ قربانی بھی نہ کرو۔ بلکہ قربانی کی قیمت ان کو بھیجدو۔ خوب سُن لو کہ یہ بالکل غلط ہے اس طرح قربانی ذمہ سے ادا نہ ہوگی۔ بعض لوگ دین و مذہب کو تو کچھ سمجھتے نہیں اور سمجھتے بھی ہیں تو دین کی پرواہ نہیں کرتے محض جوش ظاہر کرنے کے لیے جو کچھ جی میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں مگر یہ جوش و خروش محض بیکار ہے عقل کے بھی خلاف دین کے بھی خلاف۔ شریعت نے مصیبت کے وقت صبر و تحمل کی تعلیم دی ہے تدبیر کرو جوش سے کیا حاصل ——— تدبیر یہ ہے کہ جہاں ایسی جماعت کی امداد کا حکم ہو بقدر وُسعت ان کی امداد کرو۔ یہ نہیں کہ سارے کارخانے بند کر کے صرف اسی ایک ہی کام کے ہو رہو۔ ہم کو حکام نے چندہ بھیجنے کی اجازت دے دی ہے بلکہ خود بھی چندہ میں شرکت کی ہے۔ یہ ہمارے حکام کی مہربانی اور عنایت ہے کہ انہوں نے ہم کو شرعی امور میں اجازت دی اور روکا نہیں اور نہ وہ کبھی شرعی کام سے روکیں۔ بشرطیکہ اطمینان کے ساتھ کیا جائے اور بیکار جوش و خروش سے کام نہ لیا جائے پس شریعت اور عقل کے موافق کام کرنا چاہیئے اور قانون سے آگے نہ بڑھنا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر قربانی چھوڑنا جائز ہے تو پھر جن پر حج فرض ہے وہ حج نہ کریں حج کا روپیہ بھی چندہ میں دیدیں کیا حج ادا ہو جائے گا۔ کیا لوگوں کی عقل مسخ ہوگئی ہے کچھ نہیں سمجھتے کہ ہم جو ایک نئی بات نکال رہے ہیں اس کا اثر کہاں تک پہنچے گا۔ ہر کام کو شرعی حد کے اندر رکھ کر کرنا چاہیئے ایک حدود کے خلاف یہ حرکت ہو رہی کہ اس وقت چندہ جمع کرنے والے نابالغ بچوں سے بھی چندہ لے لیتے ہیں یہ بالکل جائز نہیں جو مال بچہ کی ملک ہے وہ اگر کسی کو خوشی سے بھی دینا چاہے نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس کا ولی دے سکتا ہے۔ البتہ اگر ماں باپ اپنی طرف سے رُپے دیں اور بچہ کی ملک نہ کریں مگر اسکے ہاتھ سے دلوائیں اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کی ملک ہو جانے کے بعد کسی کو نہ دینا جائز نہ لینا آجکل لوگ جوش میں آکر بچوں کے دیئے ہوئے پیسوں کو بڑے فخر سے لیتے ہیں اور مجمع عام

میں اس کو نیلام کرتے ہیں کہ یہ معصوم بچہ کا متبرک روپیہ ہے۔ اب وہ ایک روپیہ سو دو سو میں نیلام ہوتا ہے اس میں کئی گناہ ہوئے ایک تو ربوا اور سود کا دوسرے ریاء و نمود کا تیسرے بچہ کے مال لینے کا یاد رکھو کہ اگر ہزار روپے بھی دیئے جائیں گے تب بھی کچھ ثواب نہ ہوگا۔ وَاللّٰهِ الْعَظِيْمِ شریعت کو بدنام ان لوگوں نے کیا جو شریعت کو سمجھتے نہیں۔

—— میں پوچھتا ہوں کہ اگر اعانت مجروحین ایسی ضروری ہے کہ اس کے سامنے قربانی کی بھی ضرورت نہیں تو سب سے پہلے دنیوی ضروریات کو چھوڑنا چاہیئے۔ بیوی بچوں کا خرچ بھی چندہ میں دیدو گھر کے ملازموں کو موقوف کر کے ان کی تنخواہیں بھی چندہ میں دیدو مگر ہم تو نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کو دنیوی ضروریات کے چھوڑنے کا کبھی بھی خیال ہوا ہو اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ تو دین ہی ایسا کیوں سستا ہو گیا کہ دینی واجبات ذرا سے بہانے سے موقوف ہونے لگے۔۔

پس عقل کا مقتضا یہ ہے کہ ہر ضروری کام اپنے موقعہ میں رکھا جائے بیوی کا خرچ بھی دو حج بھی کر دو اور قربانی بھی کر دو۔ اور البتہ فضول اور زائد خرچ کو موقوف کر دینا چاہیئے مگر لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہماری خواہشیں تو اچھی طرح پوری ہوتی رہیں جیسے کہ پہلے سے ہو رہی ہیں اور کوئی دینی کام موقوف کر کے اس کی جگہ چندہ میں سو روپیہ دیدیا جائے میں اگر کسی نیک کام میں جو بہت زیادہ نہیں ہے روپیہ لگانے کی نیت ہو مثلاً کوئی شخص کنواں بنوانا چاہتا ہے ایسی جگہ جہاں ضرورت زیادہ نہیں اس کو بھی موقوف کر دینا چاہیئے۔ اور اس کی جگہ روپیہ چندہ میں دیدینا چاہیئے کیونکہ اس وقت کنواں مسجد وغیرہ بنوانے سے ان یتیموں اور رانڈوں زخمیوں کی امداد بہت زیادہ ضروری اور اس سے زیادہ موجب ثواب ہے۔ اس وقت عام طور پر لوگوں کو اس چندہ کی طرف توجہ ہو رہی ہے اور عقلمندوں نے تو یہ کیا کہ اپنے تمام غیر ضروری اخراجات بند کر دیئے اور وہ سب روپیہ چندہ میں دیدیا۔

اعانتِ مالی خیر یہ تو وہی کرتے ہیں جن کے دل میں درد ہے ہم جیسے بے حسوں سے

ایسی کہاں اُمید۔ اس لیے میں نے ایک طریقہ تجویز کیا ہے جس میں نہ بار ہو اور نہ گرہ سے کچھ
خرچ ہو وہ یہ کہ اس وقت قُربانی کا زمانہ ہے اور کھال کو بیچ کر اپنے کام میں لا نہیں سکتے
لا نا کسی کو ضرور دو گے تو بجائے دوسری جگہ دو گے وہ کھالیں اسی مد میں دیدو اور یہ ایسی مد ہے کہ اگر ایک ضلع کے آدمی بھی
متفق ہو کر ایسا کر لیں تو بہت سا روپیہ جمع ہو جائے اور جن کو زیادہ ہمت ہو وہ دوسری مدات میں بھی دیتے
رہیں مثلاً زکوٰۃ دیں، صدقات نافلہ وغیرہ سے دیں یا کچھ کپڑے دیں یا نقدی دیں یا کچھ حصہ غلہ میں نکالیں اور خیر! یہ تو ہمت
کی باتیں ہیں۔ مگر کھالوں سے تو امداد ضرور ہی کر دیں —— میں نے اشتہار بھی طبع
کرائے ہیں مگر افسوس کہ وہ ابھی آئے نہیں۔ میرا ارادہ عورتوں میں بھی بیان کرنے کا ہے کیونکہ
بعض اوقات عورتیں اپنا زیور تک دیدینا چاہتی ہیں مگر چندہ میں ایک شرط ہے اس کو ضرور
سُنیں وہ یہ کہ اس وقت اس چندہ کی ہر طرف بڑی دھوم ہے اخباروں میں بھی زبانوں پر
مگر اخبار والوں میں اور اہل علم میں یہ فرق ہے کہ اخبار والے تو کارروائی کو دیکھتے ہیں انجام کو
نہیں دیکھتے اور علماء انجام کو بھی دیکھتے ہیں لوگوں کی کوشش آجکل یہ ہوتی ہے کہ کام چلے
کارروائی ہو جائے چاہے گناہ ہو یا ثواب بلکہ آجکل انجام بینی کے لئے مالی نقصان اٹھالینا حماقت
سمجھا جاتا ہے۔ مگر خسارہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت بلال حبشی کو
خریدنے میں لوگوں کی نگاہوں میں ہوا تھا کہ اپنا ایک ہوشیار اور دانا غلام رومی مع ایک بڑی
رقم کے دیکر دنیا کے اعتبار سے ایک محض بے کار غلام کو خریدا ہے

وَقَدْ وَاسَی النَّبِیَّ بِکُلِّ فَضْلٍ۔ وَاَعْتَقَ مِنْ ذَخَائِرِہٖ بِلَالًا

مگر حضرت ابوبکر کی نظر میں ایک بلال رضؓ کے مقابلہ ہزار غلام رومی جیسے ہیچ تھے کیونکہ
یہ مُسلمان تھے اور وہ کافر تھا۔ صدیق اکبر رضؓ کی اس قدر دانی کی حقیقت خدا سے اور رسولؐ
سے اور صحابہ رضؓ سے پوچھئے جب کفار نے حضرت ابوبکر رضؓ کو اس معاملہ میں خاسر نا کام کہا
تو حق تعالیٰ نے جواب میں نازل فرمایا۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیۃ ؎ یعنی سوا ان ایمان والوں کے جو نیک کام کرتے ہیں اور

؎ پارہ عم۔ قسم ہے زمانہ کی کہ انسان ٹوٹے میں ہے بجز اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے

سارے انسان نقصان میں ہیں۔

حضرت بلال حبشی کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خرید فرما کر زبانِ حال سے گویا یہ فرماتے تھے ؎

بہائے چند دادم جاں خریدم ۔۔۔۔۔ بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم

اور ان کی تو یہ شان تھی ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ ۔۔۔۔۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

بلال وہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک بار پوچھا کہ میں جنت میں گیا تو تم کو آگے چلتا ہوا پایا یا تم کیا خاص عمل کرتے ہو۔ اُنہوں نے عرض کیا کہ میں تحیۃ الوضوء کا پابند رہوں۔ مگر اس واقعہ سے حضورؐ پر فضیلت کا شُبہ نہ کیا جاوے کیونکہ آگے چلنا ہمیشہ بڑے ہی سے نہیں ہوا کرتا خادم بھی تو آگے چلا کرتا ہے مگر یہ خدمت بھی تو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ دولت خدمت ان کو تحیۃ الوضوء سے حاصل ہوئی۔

تو اس وقت مجھے یہ بات کہنی ہے کہ کارروائی پر نظر نہ کرو جیسے اکثر لوگ دباؤ ڈال کر چندہ وصول کرتے ہیں اور میں بھی ایسا کر سکتا تھا کہ گھر گھر جا کر لیتا مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی - اور یہی بات میں عورتوں میں کہنے کا قصد کر رہا ہوں کہ اس کام میں چندہ دو مگر زیور میں نہ لُوں گا۔ کیونکہ اگر وہ زیور شوہر کا ہے تو عورتوں کو دینا کب جائز ہے اور اگر جائز بھی ہو تو تب بھی بلا مشورہ کئے دینے کی اجازت نہیں اور مشورہ کی یہ حالت ہے کہ شوہر کبھی دب کر اجازت دیتا ہے اور اگر وہ عورت کی ملک ہے تب بھی نہ لُوں گا کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چند سال تک ایک زیور پہن کر اس سے محبت نہیں رہتی دوسرے زیور کی فکر ہوتی ہے اس حالت میں گویا اسکو چندہ میں دے کر شوہر سے دوسری فرمائش کی جاویگی۔ جس کو وہ طوعاً و کرہاً مجبور ہو کر پورا کرتا ہے اس لئے زیور عُجلت کے ساتھ نہ لیا جاوے گا۔ اگر تمام مفاسد کا انتظام کر دیا جاوے تب زیور لیا جائے

گا۔ ان شرائط کے بعد اگرچہ آمدنی کم ہوگی مگر اس میں برکت بہت ہوگی۔ کیونکہ وہ خالص خدا کے لیے دیا ہُوا مال ہوگا۔ اور اخلاص کی بڑی برکت ہے۔ مغفرت کے لیے تھوڑا صدقہ بھی بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ہو کافی ہے حدیث میں ہے "اتقوا النار ولو بشق تمرۃ" اسلئے اسکی فکر نہ کیجائے کہ بہت سا ہی وصول ہو اس کی فکر ہونی چاہیئے کہ جتنا ہو جائز طور پر وصول ہو ——— یہ تو وصول یابی چندہ سے پہلے کی شرائط تھیں ایک بعد وصول یابی کے ضروری شرط ہے جس کو اکثر لوگ اس وقت نہیں دیکھتے۔ اس وقت تو لوگ یہ کر رہے ہیں کہ روپیہ وصول کر کے فوراً بمبئی بینک میں بھیج دیتے ہیں۔

تملیک شرعی

یاد رکھو! اس طریقہ پر دینے سے زکوٰۃ اور قربانی کی کھال کا روپیہ جو دیا جاتا ہے تو وہ دینے والے کے ذمہ سے اُترتا نہیں۔ دینے والے کے ذمہ زکوٰۃ وہی کی وہی واجب رہتی ہے ویسے ہی کھال کی قیمت بھی ذمہ سے ادا نہیں ہوتی۔ کیونکہ زکوٰۃ کے رُپے اور چرم قربانی کی قیمت میں شرط یہ ہے کہ جس کو دیا جائے اس کی مِلک کر دیا جائے اور ظاہر ہے کہ اس کا انتظام کوئی بھی نہیں کرتا کہ اس روپیہ کی تملیک کرائے۔ اس لیے ضروری بات ہے کہ یہاں سے ہی تملیک کرا کے بھیجا جائے۔ ورنہ دینے والوں کے ذمہ سے واجب ساقط نہ ہوگا تو اس کو خوب سُن لو اور سمجھ لو۔ میں نے اِشتہار میں بھی اس کو لکھ دیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اگر طریق تملیک سمجھ میں نہ آوے تو روپیہ میرے پاس بھیجدیں یہاں شرعی تملیک کرا دی جائیگی گو میں مالی کاموں میں کبھی نہیں پڑتا لیکن اس خیال سے کہ مسلمانوں کا مال ضائع نہ جاوے اس کام کو اپنی طبیعت کے خلاف گوارا کرتا ہوں اور وہ صورت تملیک کی یہ ہے کہ کسی غریب آدمی سے کہو کہ تم کسی کے پاس سے رُپے قرض لے کر اپنی طرف سے اس چندہ میں دیدو ہم تمہارا قرضہ ادا کر دیں گے۔ جب وہ قرض لے کر روپیہ چندہ میں دیدے تو پھر تم اس کو اپنی زکوٰۃ یا قربانی کی کھال کا روپیہ دیدو کہ لو اس کا قرض ادا کردو۔ تملیک کی یہ صورت

ہے اس کو سمجھ کر زکوٰۃ اور قربانی کی کھال کا روپیہ اس طریقے سے تملیک کرا کے بھیجنا چاہئیے۔ ایک شبہ بعض پڑھے لکھوں کو یہاں یہ ہوا کرتا ہے کہ اس صورت میں اس چندہ کا ثواب تو اس مسکین ہی کو ملے گا دینے والے کو تو قرضہ ادا کرنے کا ثواب ملیگا تو سمجھو اگر چندہ میں روپیہ تو اسی نے دیا مگر چونکہ اسکے دینے کا سبب تم ہوئے ورنہ اس غریب کی کیا ہمت تھی جو چندہ میں روپے دیتا۔ اسلئے تم کو بھی اس چندہ کا ثواب اسی کے برابر ملے گا۔ خدا تعالیٰ کے یہاں تو اس قدر رحمت ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم اپنے خزانچی کو کہو کہ ہمارے روپیہ میں سے اتنا فلاں شخص کو دیدو تو مالک کے برابر خزانچی کو بھی ثواب ملے گا۔

ترغیبِ اعانت

یہ ترکیب نہایت سہل ہے اس لئے میں نے اس کو بیان کر دیا اس کو سمجھیں اور دوسروں تک پہنچادیں اور سب کو رغبت دلائیں کہ قربانی کی کھال کی قیمت اس چندہ میں بھیجیں۔ مگر اسی طریقہ سے میں اس پر بھی راضی ہوں کہ اگر لوگ اپنے گاؤں میں یا قصبہ میں لوگوں کو جمع کر کے وعظ سُنانا چاہیں تو میں خود یا اپنے کسی عزیز کو بھیج سکتا ہوں آگے آپ خود جانیں اور آپ کا کام میں پہنچا چکا سے

ما نصیحت بجائے خود کردیم　　　روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس　　　بر رسولاں بلاغ باشد وبس

مگر یہ سمجھو کہ کسی پر جبر نہ کیا جاوے مثلاً اگر قربانی کے سات حصوں میں سے ایک حصہ والا نہ دینا چاہئیے تو اس پر دباؤ مت ڈالو۔ بلکہ کھال بیچ کر سب کے دام تقسیم کر کے اپنا اپنا حصہ دیدو۔ خدا کو کسی کے پیسہ کی ضرورت نہیں خدا کے دین کے کام کبھی رُکے نہیں رہتے یہ روپیہ اس وقت دین کے کام میں صرف ہوتا ہے اور دین کے کام میں دینا خدا کو دینا ہے اور خدا کو کسی کی کچھ ضرورت نہیں اس لئے خدا کے حکم کے خلاف مت کرو

باقی ہم کو دینے کی ترغیب اس لئے دی گئی ہے کہ اس میں ہمارا نفع ہے صدقات بڑھا دیئے جائیں گے ہمارے لئے آخرت میں خزانہ جمع ہو جائے گا ورنہ جس کا جی چاہے امتحان کر لے کہ خدا کا کام کسی دینے نہ دینے پر موقوف نہیں رہتا وہ تو ہو کر رہتا ہے البتہ نہ دینے سے تم خود خیر سے محروم رہ جاؤ گے۔

بہرحال یہ تھا اس حدیث کے متعلق ضروری مضمون میں پھر ترجمہ کئے دیتا ہوں

الرّٰحِمُوْنَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ

"رحم کرنیوالوں پر خدائے رحمٰن رحم کرتا ہے تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا خدا رحم کرے گا"

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ یہ دعا کرو۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۝

جزء دوم وعظ ملقب

بمواساۃ المصابین

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ o بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ

تمہید

یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور یہی حدیث میں نے آج جمعہ میں بعد نماز کے پڑھی تھی کیونکہ جو مضمون

بیان کیا تھا اسکی مناسب تھی اس وقت یہی خیال میں آیا کہ اسی حدیث سے بیان کو شروع کیا جائے اور غالب یہ ہے کہ بعض مضامین تو غیر مکرر رہوں گے اور جو مکرر رہوں گے ان کا بھی عنوان جدا ہوگا لہٰذا گویا یہ بیان مکرر نہیں نیز دن میں مردوں کے فہم کے موافق بیان کیا گیا تھا۔ اور اب عورتوں کے فہم کی رعایت ہوگی۔

بہر حال خلاصہ اس حدیث کا یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں فضیلت بیان فرماتے ہیں اللہ کے بندوں پر رحم کرنے کی یہ حاصل ہے اس حدیث کا جو مضمون میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں وہ اسی کے مناسب ہوگا۔ مگر حدیث کا مضمون کچھ اسی وقت کے لئے خاص طور پر مفید نہیں بلکہ تمام عمر بھر کے لیے مفید ہے لہٰذا اس حدیث میں دو قسم کے مضامین ہوئے ایک وہ جو عام ہے اور وہی مقصود اصلی ہے کیونکہ وہ ہر وقت کے مناسب ہے۔ دوسرا خاص مضمون جو اس وقت کے اعتبار سے قابل اہتمام ہے تو مناسب یہ ہے کہ پہلے عام مضمون کو بیان کردیا جائے کیونکہ وہ مقصود اصلی ہے گو کسی موقع پر کسی وجہ سے مضمون خاص رائج ہوجاتا ہے اسکے بعد خاص مضمون کو بہ تناسب مقام بیان کیا جائے۔

اجزاءِ دین کی اہمیت

تو وہ عام مضمون یہ ہے کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی مفید بات ہم کو بتلائی ہے جو ہمیشہ ہمارے لئے باعث راحت ہے اور بہت لوگ یہاں تک کہ دیندار بھی آجکل اس کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس زمانہ میں دینداری نماز روزہ حج ہی کو سمجھتے ہیں۔

یاد رکھو! کہ دینداری انہیں میں منحصر نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دین کے بڑے بڑے رکن یہی ہیں مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ اور چیزوں کو چھوڑ دیا جائے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آدمی کے سر اور ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ اگر سر کٹ جائے تو انسان ہی نہ رہے اور ہاتھ کٹ جانے سے انسان مرتا نہیں لیکن کیا کوئی شخص یہ سنکر ہاتھ

کٹ جانے کے بعد مر یگا نہیں بلکہ زندہ رہے گا یہ گوارا کریگا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے بلکہ جواب میں یہ کہے گا کہ اگرچہ ہاتھ کٹ جانے سے آدمی زندہ رہے مگر زندگی خراب ہو جاتی ہے اچھی طرح زندگی بسر نہیں ہو سکتی زندگی کے لیے ہاتھ پاؤں کی بھی ضرورت ہے اسی طرح دین کی ہر بات گو نماز روزہ کے برابر نہ ہو مگر چھوڑنے کی بھی اجازت نہیں کیونکہ کسی نہ کسی درجہ میں تو وہ بھی ضروری ہی ہے جیسا کہ ہاتھ کی ایک درجہ میں زندگی کے لیے ضرورت ہے گو سر سے کم ہے۔

لہٰذا مسلمان کو چاہیئے کہ دین کے ہر شعبہ کو دیکھتا رہے اور عمل کرتا رہے اگر ایک بات بھی چھوڑ دی تو اس کا دین ایسا ہی ہو گا جیسے بدون انگلیوں کا آدمی یا جیسے کسی کی ناک کان کاٹ دیئے گئے ہوں۔ جو لوگ نماز روزہ بھی نہیں کرتے ان کا ایمان تو ایسا ہے جیسے بیجان کی صورت اور جو لوگ نماز روزہ کرتے ہیں مگر دوسری باتوں کے پابند نہیں ان کے دین کے اندر کچھ جان تو ہے مگر قریب قریب وہ بھی بیکار ہے کیونکہ ہاتھ پاؤں اسکے بھی کٹے ہوئے ہیں اور ان میں بھی کسر باقی ہے۔

اب ذرا خیال کر کے دیکھئے کہ جس چیز میں کچھ کسر باقی ہو اسکی کیا وقعت ہوتی ہے دنیا میں آدمی ہر چیز کو ایسی بنانا چاہتا ہے کہ اس میں کوئی کسر نہ رہ جائے اور تھوڑی سی کسر کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ دیکھو اگر کوئی عورت ایک دوپٹہ بنانا چاہے اور اس میں بہت خوب صورت بیل بوٹے بھی ہوں گوٹہ بھی لگا ہوا ہو۔ مگر ایک بالشت کی جگہ خالی چھوڑ دی جائے تو کوئی بھی اس دوپٹہ کو لینا گوارا نہ کرے گا۔ بلکہ سینے والے کو احمق بنا دیں گے ——— اب میں پوچھتا ہوں کہ سینے والے کو احمق کس لیے بنایا جاتا ہے صرف اسی لیے تو کہ اسنے کچھ کسر چھوڑ دی۔ ایسے ہی دنیا کا ہر کام مثلاً پائجامہ کا ایک پائنچہ تُرپ کر دوسرا بے تُرپے چھوڑ دیا جائے۔ ایسا ہی اگر سر میں ایک طرف کنگھی کر کے دوسری طرف کنگھی نہ کی جائے۔

غرض ! کوئی چیز دُنیا کی ایسی نہ ملے گی جسمیں کسر چھوڑ دینے کو کوئی بھی گوارا کرتا ہو۔ اگر کوئی مکان بناتے ہیں تو اس میں جہاں اور تمام ضروریات کا خیال ہوتا ہے پائخانہ بھی ضرور اہتمام کے ساتھ بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ بدوں پائخانہ کے بڑے سے بڑا عالی شان مکان ناتمام ہے اور اس میں کسر باقی ہے۔ اللہ اللہ ! مکان کے لیے پائخانہ جیسی گندی چیز کی کسر تو گوارا نہ ہو اور دین میں مقدس اجزاء کی کسر رہ جانا گوارا ہو۔ کس قدر افسوسناک حالت ہے۔ لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں دین کا کام تو کرتا ہُوں نماز تو پڑھتا ہوں۔ اور جو روزہ بھی رکھتا ہو اس وقت تو اپنے کو بہت ہی کچھ سمجھتا ہے مگر جیسے ایک بالشت گوٹہ نہ ہونے سے سارا قیمتی دوپٹہ بیکار ہے ایسے ہی دین کی دوسری باتوں میں کسر ہونے کی وجہ سے ہمارا دین بھی ناتمام ہے مگر مسلمانوں کو دُنیا کی چیزوں میں تو کسر ہونا گوارا نہیں۔ اور دین کی چیزوں میں سخت افسوس ہے کہ بڑے سے بڑی کسر ہمیں گوارا ہو رہی ہے۔

صاحبو! یہ حالت سخت قابل توجہ ہے یہ تو آپ کہہ نہیں سکتے کہ ہمارے دین میں کسر نہیں ہے۔ ہے اور ضرور ہے پھر کیا وجہ ہے کہ مُسلمان ہو کر اس پر توجہ نہیں کیجاتی اور علاوہ نماز روزہ کے اور بھی ہمارے ذمہ فرائض ہیں جن کے چھوڑ دینے سے دین میں نقصان لازم آتا ہے۔

رحم میں اعتدال

انہیں میں سے رحم بھی ہے جس کو میں اس وقت بیان کرتا ہُوں ہمیں آجکل اسکی بالکل پرواہ ہی نہیں کہ دوسرے کو نفع پہنچادیں۔ ایسے بخیل اور ایسے خود غرض ہو گئے ہیں کہ اپنے لئے تو سب کچھ سامان کر لیتے ہیں جوتہ کا بھی اناج کا بھی کپڑے بھی بے گنت جمع کر لیتے ہیں۔ دوسروں کی مطلق فکر نہیں کہ مرتے ہیں یا غمگین ہیں۔ اور ہمارے دین کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ تھوڑا سا نماز روزہ کر کے جنت کے منتظر ہیں اسکی خبر نہیں

کہ دین میں کس قدر کسر باقی ہے۔ شریعت نے دوسرے کے دُکھ اور تکلیف میں مدد کرنے کا بھی تو نہایت اہتمام کے ساتھ حکم کیا ہے ایک ادنیٰ بات یہ ہے کہ باوجودیکہ حدیث میں ارشاد ہے کہ جب کسی کو بیماری وغیرہ میں مبتلا دیکھو تو خدا کا شکر کرو تم کو اس میں مبتلا نہیں کیا اور ایک دُعا بتلائی گئی ہے کہ اس کو پڑھا کرو۔ وہ یہ ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِهٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ عربی ہی میں پڑھی جائے اگر اُردو ترجمہ کر کے پڑھ لیا جائے تب بھی کافی ہے کہ خدا کا شکر ہے اور اس کی حمد کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس ابتلاء سے محفوظ رکھا اور اپنی بہت سی مخلوق پر مجھے فضیلت دی۔ مگر ساتھ ہی فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ دُعا آہستہ سے پڑھے زور سے نہ پڑھے تاکہ اس کو رنج نہ ہو۔ اب ذرا غور کیجئے کہ شریعت نے دوسروں کی ایذاء سے کس قدر روکا ہے اور کتنا خیال کیا ہے کہ اگر کسی موقع پر کلمات شکر یہ حمد سے بھی اندیشہ تکلیف کا ہو تو زور سے نہ کہو۔ بلکہ آہستہ سے پڑھو۔ تو جب اس تھوڑی سی کلفت کا خیال کرنا بھی شریعت نے لازم کیا ہے تو اگر کسی کو اور کوئی بڑی تکلیف ہو۔ اس سے بے غرضی برتنا شریعت میں کب جائز ہوگا۔ مگر اب ایسے پتھر دل ہو گئے ہیں کہ چاہے کسی پر کچھ ہی گذر جائے دل نہیں کڑھتا ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب کہاں تک رحم کریں ہزاروں قابل رحم ہیں بڑی اچھی عقل ہے یعنی اگر سب پر رحم نہ کر سکیں تو دس پر بھی نہ کریں۔ یہ سب نہ کرنے کے بہانے ہیں یہ کس نے کہا ہے کہ ساری دُنیا کا۔ اور پھر پورا پورا انتظام کرو۔ شریعت میں تو اتنا اعتدال ہے کہ جب دیکھا کہ چند نفوس ایسے بھی اللہ کے بندے ہوں گے جن کو بہت زیادہ رحم پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ بعض لوگ اپنا سارا مال ایسے موقع پر دیدیتے ہیں۔ تو شریعت نے جیسے ہر کام کے لیے ایک حد مقرر کی ہے اسی طرح رحم کے لئے بھی حد مقرر کر دی کہ نہ تو ایسا بن جائے کہ بالکل کسی پر رحم نہ آوے دل نہ دکھے اور نہ اتنا زیادہ نرم ہو جائے

کہ اپنی بھی خبر نہ لے یہ بھی شریعت کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضورؐ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کا چندہ نہیں لیا جن کے لیے خود چندہ کرنے کی ضرورت تھی تو ان حدود کے ساتھ رحم کا اہتمام کرو۔ اور رحم کی فضیلت میں حدیث میں تو میں نے پڑھی ہی ہے۔

تعلیمِ رحم مگر میں ایک بزرگ کا قصہ بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ قصہ کا طبعًا بعض پر زیادہ اثر ہوتا ہے اگرچہ یہ خواب ہی کا مضمون ہے مگر قواعدِ شرع کے موافق ہے۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے بعد وفات کے خواب میں ملاقات کی۔ پوچھا کہ کہیئے حضرت کیا گذری فرمایا کہ ارشاد ہوا کہ کوئی عمل قابلِ نجات نہیں صرف ایک عمل پر تم کو بخشتے ہیں کہ تم نے ایک بلی کے بچے کو سردی میں کانپتا ہوا دیکھا اور اس کو اپنے لحاف میں چھپاکر لٹا لیا چونکہ تم نے اس پر رحم کیا تھا ہم تم پر رحم کرتے ہیں۔

دیکھئے! بلی کی کیا حقیقت تھی مگر اسکے ساتھ بھی رحم کرنے سے مغفرت ہوگئی۔ مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ کتے بلی پالنی چاہیئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بدوں پالے ہوئے جب ان کو تکلیف میں دیکھے تو رحم کرے ——— ایک بدکار عورت کا قصہ حدیث میں آیا ہے کہ راستہ میں اسنے ایک کتے کو دیکھا کہ بہت پیاسا ہے اور مرنے کے قریب ہے اسنے اپنی اوڑھنی کو اُتار کر رسی کی جگہ باندھا۔ اور چمڑہ کا موزہ نکال کر ڈول بنایا۔ اور کنوئیں سے نکال کر اس کو پانی پلادیا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس عمل کیوجہ سے اس کو بخشدیا گیا کہ اسنے ہماری مخلوق پر رحم کیا تھا ہم نے بھی اس پر رحم کیا۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ کیا کتے کے ساتھ رحم کرنے سے بھی ہم کو ثواب ملتا ہے فرمایا ہر جاندار کے ساتھ رحم کرنے کا یہی اثر ہے۔ مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ آج سے سانپ بچھو کو بھی کھلایا پلایا کرو۔ اس کا تو مارنا ہی بہتر ہے۔ حضورؐ کی مراد جاندار سے

غیر موذی ہے اور سانپ بچھو کے ساتھ بھی دوسرا طریقہ رحم کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ جب مارو تو ترسا ترسا کر نہ مارو۔

غرض یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر جاندار کے ساتھ رحم کرنے کی تعلیم دی ہے چاہے کتا ہو یا بلی اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آدمی کے ساتھ رحم تو کیوں نہ ضروری ہوگا بہت زیادہ ضروری ہوگا یہ ہے شریعت کی تعلیم۔ مگر ہم اس سے بالکل غافل ہیں اور اگر کہیں رحم کرتے ہیں تو دُنیا کے خیال سے کرتے ہیں کہ یہ میرا عزیز ہے یہ نوکر ہے فلاں مصلحت حاصل ہو جائے گی۔ اگرچہ اس خیال سے اس عزیز یا نوکر کو فائدہ ہو جائے گا۔ مگر اس کرنے والے کو تو ثواب پورا نہ ملے گا۔ اگر اس کی نیت خالص خدا کے لیے ہوتی تو دونوں فائدے ہوتے۔ یعنی اس کو بھی نفع ہوتا اور اس کو بھی پورا ثواب ملتا ــــــ تو دیکھئے! شریعت کی خوبی کو کہ خاص نیت کرنے پر اس جگہ بھی ثواب کا وعدہ کیا۔ حالانکہ اس موقعہ پر چاہیئے تھا کہ ثواب کچھ نہ ملے کیونکہ اپنے عزیز یا دوست کو تکلیف میں دیکھ کر دل خود بخود بے چین ہوتا ہے۔ اور ہمدردی کرنے سے اس کے دل کو چین و آرام پہنچتا ہے اور یہ مجبور ہو کر ضرور ہمدردی کرتا ہے تو ساری تدبیر اپنے آرام کے لیے کی گئی۔ پھر اس میں ثواب کا کیا استحقاق۔ مگر کیا ٹھکانہ ہے رحمت کا۔ کہ نیت خالص ہونے سے ایسی جگہ بھی ثواب ملتا ہے جس میں ثواب کا کوئی حق نہیں تو دُنیا کا بھی فائدہ ہوا کہ مصلحت خود حاصل ہو گئی اور دین کا بھی فائدہ ہوا۔ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی عنایت ہے مگر ہمیں اس پر بالکل توجہ نہیں اور ان باتوں کی طرف ذرا خیال نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑی کمی ہمارے اندر ہے۔

سختی دِلی کا عِلاج

اور یہی وجہ ہے کہ ہم میں اتفاق نہیں ہے کیونکہ اتفاق ہوتا ہے دوسرے کو آرام

پہنچانے سے ۔ اگر مسلمان اس کا خیال رکھیں کہ دوسروں کو نفع پہنچایا کریں تو سب متفق ہو جاویں اب تو اپنی اپنی ڈھپلی اور اپنا اپنا راگ اور گو بعض لوگ ظاہر داری کے لیے کچھ کرتے بھی ہیں مگر دل پتھر ہیں اور اس کے لیے بھی شریعت نے علاج بتایا ہے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا دل بہت سخت ہے فرمایا کہ یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو ۔ مطلب یہ ہے کہ جو خصلت بری ہو اس کا علاج بالضد کرو یعنی اسکے خلاف کام کرو اگرچہ پہلے پہلے دشواری پیش آئے گی ۔ مگر وہ خصلتِ بد جڑ سے جاتی رہے گی تو جب کسی کو سخت دلی کا مرض ہے تو یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرنے سے رحم پیدا ہو جائے گا ۔ اور اس مسئلہ کو ہمارے صوفیہ کرام خوب سمجھے کہ اسکو متعدی کیا اور تمام امراض کا علاج اسی طرح کیا ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ جس کو بخل کا مرض ہے اسے خوب خرچ کرنا چاہیئے سخاوت پیدا ہو جائے گی ۔ اور بخل کی صفت جاتی رہے گی ۔

وعلیٰ ھذا تو اگر ہمارے دل میں رحم نہ بھی ہو اور ہم دل پر جبر کر کے رحم کا کام کرتے رہیں تو یقیناً ہمارے اندر رحم پیدا ہو جائے گا ۔ مگر ہمارے اندر نہ تو مادہ اور نہ اس کے علاج کی طرف توجہ ہے بعضے آدمی کہا کرتے ہیں کہ جب اندر سے کسی کام کا شوق نہ ہو تو ثواب کیا خاک ہوگا ــــ مگر صاحبو! اگر نیت اللہ کے واسطے ہو تو ناگواری میں بھی ثواب ہوتا ہے ۔ بلکہ اس صورت میں زیادہ ثواب ہوگا کہ دل نہیں چاہتا ۔ مگر دل پر جبر کر کے دے رہا ہے اس میں نفس کو زیادہ مشقت ہوتی ہے اور جو کام مشقت سے ہو اس میں ثواب زیادہ ہوتا ہے ۔ مگر یہ مشقت اور ناگواری اپنے اوپر ڈالنا تو جائز ہے دوسروں پر ڈالنا جائز نہیں تو چندہ جبر کے ساتھ اور دباؤ سے وصول کرنا جائز نہ ہوگا ۔ ہاں اپنے نفس پر مشقت ڈالو اس میں واقعی بہت ثواب ملے گا ۔ مگر آج کل معاملہ برعکس ہے کہ اپنے اوپر تو مشقت ڈالنا کوئی گوارا نہیں کرتا اور دوسروں پر مشقت ڈالی جاتی ہے تو اگر کسی نے بکراہت یتیم کے سر پر ہاتھ ڈالا اور دل میں نفرت ہے ۔ تو اس صورت

میں زیادہ ثواب ملے گا کہ نفس تو قبول نہ کرتا تھا۔ مگر تم نے دین کا کام سمجھ کر کیا تو اس کا خیال نہ کرو کہ اگر دل میں شگفتگی نہ ہو تو ثواب نہ ہوگا بلکہ کرو اور زبردستی کرو نفع مطلوب مرتب ہوگا۔ یہی وہ خصلت ہے کہ جس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فضیلت بھی بیان کی اور اس کا حکم بھی فرمایا ہے یعنی بندوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا ـــــ اسی کو میں اس وقت بیان کر رہا ہوں کہ جہاں اور کام دین کے ضروری ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچایا جائے جس قدر اپنے سے ہو سکے بے پرواہی نہ کریں۔ دوسروں پر احسان کرنا چاہیے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ کہ آپس میں احسان کو مت چھوڑو۔ ہاں اس میں بھی شرط یہ ہے کہ احسان موافق شریعت کے ہو۔ شریعت کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً بیوی کے پاس خاوند کا روپیہ ہے اور اس کو کسی پر رحم آجائے تو اسکو ان روپیوں میں سے دینا جائز نہیں اور اگر دیدیا گنہگار ہوگی۔ اگرچہ اس نے اپنے نزدیک بہت نیک کام کیا ہے مگر چونکہ روپیہ اس کا نہیں بلکہ شوہر کا ہے اور اس نے اجازت نہیں دی یا پوچھنے کے بعد بکراہت دی [اور یہ قرینے سے اکثر معلوم ہو جاتا ہے] اسلیئے خلاف شرع کام ہوا۔ پس ثواب بھی نہ ہوگا ـــــ بظاہر تو یہ کام بڑی ہمت کا معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے پر رحم کرنے میں اپنے گنہگار ہونے کا بھی خیال نہ کیا۔ مگر خدا کے پاس بالکل قبول نہ ہوگا۔ اور اس میں ایک راز ہے جس کی وجہ سے یہ ہمدردی معتبر نہیں اور ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے ہر حکم نہایت اعتدال سے کیا ہے۔

مدارِ حقوق

تو وہ راز یہ ہے کہ جتنا جس چیز سے تعلق زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس کا حق زیادہ ہوگا۔ اور جس قدر تعلق کم ہوگا اسی قدر حق کم ہوگا تو عدل و انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ جس چیز سے تعلق زیادہ ہو سب سے زیادہ اس کے

حق کی رعایت کی جائے۔ اسکی خلاف کرنا ظلم ہے۔

اب سمجھو کہ خلقت میں سب سے زیادہ علاقہ اپنے ساتھ ہے کہ اسکی برابر کسی سے بھی علاقہ نہیں کہ وہ اپنا عین ہوا اور حق کا مدار علاقہ پر تھا تو معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ انسان پر اپنا حق ہے۔ اسی لیے حدیث میں وارد ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ میرے پاس اگر ایک دینار ہو تو کیا کروں فرمایا اپنے اوپر خرچ کرو۔ اسکے بعد پھر اور دیناروں کے متعلق سوال کیا۔ آپنے دوسرے اہلِ حقوق پر خرچ کرنے کو فرمایا۔ تو سب سے پہلا اپنا حق ہوا اور یہاں سے ایک بات طالب علموں کے کام کی معلوم ہوئی وہ یہ کہ جب دلیل سے ثابت ہو گیا جتنا زیادہ علاقہ ہوگا اسی قدر حق زیادہ ہوگا ——— اب یہ سمجھو کہ تمام عقلاء اور انبیاء علیہم السلام اس پر متفق ہیں کہ انسان پر سب سے زیادہ حق خدا تعالیٰ کا ہے یہاں تک کہ اس کے نفس سے بھی زیادہ تو معلوم ہوا کہ انسان کو سب سے زیادہ یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی زیادہ تعلق خدا سے ہے کیونکہ بغیر زیادہ تعلق کے حق زیادہ نہیں ہو سکتا۔ تو خدا کا تعلق بندہ سے اتنا بڑا ہے کہ اس کو بھی اپنے ساتھ اس قدر نہیں کیونکہ خود اپنے سے اس کا تعلق ہونا موقوف اس پر ہے کہ اوّل خدا تعالےٰ سے اس کا تعلق ہوا اسی سے تو اس کو اپنے سے تعلق ہوا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

خلافِ شریعت ہمدردی

مقصود مقام یہ ہے کہ دنیا والوں میں سب سے زیادہ حق انسان پر اپنی جان کا ہے تو جو کوئی دوسرے کی ہمدردی میں کسی معصیت کا مرتکب ہو کر خود گنہگار بنے اس نے بڑی حماقت کی اور عدل کے خلاف کیا کہ بڑے حق کو تلف کر کے چھوٹا ادا کیا۔ اپنے کو تو خسارہ میں ڈالا مثلاً خاوند کی چوری کی اور دوسرے کو نفع پہنچایا اس لیے اس کو ہمدردی نہ کہیں گے۔ بلکہ بے وقوفی اور بے تمیزی ہوگی ——— دیکھو! کھانا اسے کہیں گے جو ہضم بھی ہو جائے اگر کوئی بے تمیز پاؤ بھر کی جگہ آدھ سیر کھالے اور اس پر بھی بس نہ کرے حتیٰ

کر ساتھ کے ساتھ نکلنے لگے تو اسکو کوئی کھانا کھیگا سب بے تیزی کہیں گے۔ اور اس کھانے کو زہر سمجھیں گے۔ کیونکہ پیٹ میں رہتا نہیں ہے اور مُضر ہوسکا ہے۔ اسی طرح یہ ہمدردی ہمدردی ہے جس میں اپنا ضرر ہو ـــــ اسلیئے میں کہتا ہوں کہ ہمدردی اگرچہ عمدہ چیز ہے مگر وہ بھی جبھی تک عمدہ ہے جب تک کہ شرع کے موافق ہے شریعت کے خلاف ہمدردی بھی مفید نہیں مثلاً کوئی عورت خاوند کے مال میں سے خیرات کرے یا کوئی اسے کسی کام میں مدد دے جو حرام ہے یہ ہمدردی نہیں۔ بلکہ تم نے اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا کہ بُرے کام میں اعانت کی۔ ہمدردی یہ تھی کہ اسکو بُرے کام سے روکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر شریعت کے خلاف کوئی بات نہ ہو تو رحم کرنا بڑی فضیلت کی بات ہے۔ اسی کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام سے تعلیم دی ہے۔ اور جن لوگوں کو دوسروں کا فکر نہیں وہ جانور ہیں۔ یہ جانور کا خاصہ ہے کہ ایک کو مرا دیکھ کر بھی بے فکری سے کھیت کھاتا رہتا ہے اسلیئے انسان پر لازم ہے کہ اپنے بھائیوں خصوصاً مصیبت والوں پر رحم کرے اور مصیبت عام ہے یہاں تک کہ جو چیز ناگوار گذرے وہ بھی مصیبت ہے۔

مفہومِ مصیبت

ایک مرتبہ دولت سرائے نبوی میں چراغ ہوا سے گُل ہوگیا۔ حضورؐ نے فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ حضورؐ! چراغ کا گُل ہونا بھی کوئی مصیبت ہے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! جو بات اپنے کو ناگوار گذرے وہی مصیبت ہے اور اس پر اناللہ پڑھنا ثواب ہے۔ اس پر ایک ضروری مضمون خیال میں آگیا ـــــ آج کل بعض عورتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی ذرا سی مصیبت پر اناللہ کہے تو سمجھتی ہیں کہ یہ سب کو مار دیگا اسی طرح سورۂ یٰسین کو بھی سمجھتی ہیں کہ یہ مُردے پر پڑھی جاتی ہے۔ اگر کوئی زندہ آدمی

پڑھ کر دم کرے تو ناگوار گذرتا ہے کہ یہ ہم کو یٰسین پڑھ کر مارنا چاہتا ہے۔

میرے ایک مریض دوست نے مجھ سے کہا کہ مجھ پر کچھ پڑھ کر دم کرو۔ میں نے سورۂ یٰسین پڑھ کر دم کر دی۔ مگر اس خوف سے کہ کہیں گھر کی عورتوں کو گراں نہ گذرے چپکے چپکے پڑھی اسی طرح ایک بات عام شکایت کی قابل یہ ہے کہ جو چیز لوگوں کے نزدیک منحوس ہوتی ہے وہ مسجد کے لیے تجویز کرتے ہیں مثلاً کیلے کا درخت یا قمری پالنا جو عوام کے زعم میں اللہ ہو کا ذکر کرتی ہے اس کے لیے مسجد تجویز کی جاتی ہے اور فی نفسہٖ ذکر اللہ ایک مبارک چیز ہے۔ مگر لوگ اس خیال سے مسجد اس کے لیے تجویز نہیں کرتے۔ بلکہ اس لیے مسجد میں کرتے ہیں کہ گھر نہ اُجڑے مسجد چاہے اُجڑ جائے عوام میں مشہور ہے کہ اُلو جلالی ذکر کرتا ہے اس لیے گھر کو اُجاڑتا ہے اللہ اکبر۔ استغفر اللہ لوگ کہاں تک بے ادب ہو گئے ہیں کہ اللہ کے نام کو بھی منحوس کہتے ہیں۔ ارے صاحبو! اللہ کا نام وہ مبارک نام ہے کہ جس کی بدولت دنیا قائم ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ جب دُنیا میں اللہ کا نام لینے والا ایک بھی نہ رہے گا جب قیامت آوے گی۔ بے وقوفوں نے یہ بات گھڑی ہے کہ اللہ کے ذکر سے مکان ویران ہوتا ہے یہ سخت بے ادبی ہے۔ اللہ کے نام میں تو ہر طرح برکت ہی برکت ہے اور سورۂ یٰسین اور انا للہ تو پوری سورت اور پوری آیت ہے جس میں وہ نام پاک بھی ہے اس میں تو اور بھی زیادہ برکت ہوگی تو انا للہ سے برکت بڑھتی ہے نہ کہ جاتی ہے۔ تو دیکھو حدیث سے معلوم ہوا کہ اتنی سی مصیبت یعنی چراغ گُل ہو جانا بھی مصیبت ہے لہٰذا کسی کو ذرا سی بھی تکلیف ہو تو اس کو بھی مصیبت کہیں گے۔ تو معلوم ہُوا کہ مصیبت کا مفہوم بہت عام ہے اس کے بہت سے افراد نکلیں گے۔ اور ہر مصیبت زدہ کا مسلمانوں پر حق ہے سب پر اس کی ہمدردی اور غمخواری واجب ہے

ہر مصیبت پر مخصوص اجر

یہاں تک کہ حدیث میں ہے کہ جو کوئی مریض کو صبح صبح جا کر پوچھے تو اس کے

لئے ستر ہزار فرشتے شام تک دعا کرتے ہیں اور شام کو پوچھے تو اتنے ہی فرشتے صبح تک دعا کرتے ہیں اور دیکھئے مریض کی عیادت کرنا بھی ایسا ہی کام ہے کہ اس میں اپنے کو بھی حظ آتا ہے تو اگرچہ یہ کام اپنی راحت کا بھی ہے مگر اس پر بھی کس قدر ثواب ہے۔ تو شریعت نے کس قدر رعایت کی ہے کہ مریض کے پوچھنے کی اس قدر ترغیب دی ہے اور اس پر اتنا ثواب دیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی بیمار کی خدمت بھی کردے تو سمجھئے کس قدر ثواب ہوگا۔ اسی لیے فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں اور یتیم کا کفیل یعنی پرورش کرنیوالا جنت میں ایسے پاس پاس ہوں گے جیسے انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی۔ مطلب یہ ہے کہ جگہ دونوں کی جنت ہوگی۔ مگر حضورؐ اس سے بڑھے ہوئے رہیں گے کیونکہ نبی ہیں جیسے کہ ایک انگشت اپنے پاس کی انگلی سے بڑھی ہوئی ہے۔ البتہ ایسے شخص کو قرب حضورؐ سے ضرور نصیب ہوگا۔ تو صاحبو! حضورؐ کا قرب کتنی بڑی دولت ہے۔ ایسے ہی حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص بیوہ عورتوں کے کاموں میں سعی کرے اس کی بڑی فضیلت ہے۔

استغفر اللہ یہ سب مضمون حدیثوں میں ہے غرض احادیث نبویہ سے ہر مصیبت پر خاص خاص اجر معلوم ہوتا ہے اور کسی جگہ سب طرح کے مصیبت زدہ جمع ہوں کہ کوئی بیمار ہے کوئی زخمی ہے کوئی یتیم ہے اور کوئی بیوہ تو ایسی جگہ امداد کرنا کس درجہ زیادہ ضروری ہوگا۔ مگر میں یہ پھر کہوں گا کہ خلاف شریعت کوئی کام نہ کریں۔ مثلاً عورتوں کو جائز نہیں ہے کہ شوہر کی چیز بلا اجازت اس چندہ میں دیں اور جو چیز ان کی ملک ہو اگرچہ اس کا بلا اجازت دینا جائز ہے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ عورت شوہر سے مشورہ کرکے دے۔ البتہ اگر عورتیں اپنے شوہر کو سمجھا کر قربانی کی کھال نافع چندوں میں داخل کرادیا کریں۔ یہ بہت بہتر ہے یا زکوۃ بھی لیکن مشروع طریقہ سے۔

تملیکِ زکوۃ

اب وہ مشروع طریقہ بتلاتا ہوں سو جو لوگ زکوۃ یا چرم قربانی کا روپیہ ایسے مواقع میں دینا چاہیں ان کے لیے ایک

خاص تدبیر ہے اور جو لوگ اسے نہ سمجھ سکیں وہ میرے پاس روپیہ بھیجدیں۔ میں درست کر کے بھیجدوں گا۔ مگر وہ طریقہ بتلائے بھی دیتا ہوں تاکہ سمجھ دار لوگ اس پر عمل کر لیں وہ تدبیر یہ ہے کہ اول کسی غریب آدمی کو ترغیب اور مشورہ دو کہ اگر مفت کا ثواب لینا چاہتے ہو تو تم دس روپے مثلاً کسی سے قرض لے کر فلاں چندہ میں دیدو پھر ہم تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔ جب وہ غریب کسی سے قرض لے کر چندہ میں دیدے تم اس غریب کو وہ زکوٰۃ کا روپیہ دیدو کہ اسکو اپنے قرضہ میں ادا کر دے تو سارا کام ہو گیا چندہ بھی جمع ہو گیا اور زکوٰۃ اور چرم قربانی کی قیمت بھی جائز طور پر ادا ہو گئی۔ یہ نہایت آسان ترکیب ہے۔ مگر کسی کی سمجھ میں اگر اب بھی نہ آئی ہو تو وہ زکوٰۃ اور قربانی کا روپیہ میرے پاس بھیجدیں۔ میں اسی ترکیب سے درست کر دوں گا۔

اور عورتوں کو میں پھر کہتا ہوں کہ اول تو اپنی گنجائش دیکھ کر اس اعانت میں حصہ لیں۔ دوسرے اپنے شوہروں کو راضی کر لیں مگر دباؤ ڈال کر نہیں۔ اسی لئے ہم نے یہ تجویز کیا ہے کہ اگر عورتیں زیور دیں گی تو ہم زیور لینا پسند نہ کریں گے البتہ جس کی ہمت ہو نقدی دے نقد لے لیں گے اس میں مرد کو بھی ناگوار نہ ہو گا کیونکہ نقد روپیہ تو روز ہی خرچ ہوتا ہے اور زیور کا دینا مردوں کو گراں گذرتا ہے اسی لیے میں ہر جگہ عورتوں کو نصیحت کیا کرتا ہوں کہ زیور میں بہت سخاوت نہ کیا کریں۔

اب میں مضمون کو ختم کرتا ہوں اور امداد کے طریق کی تلخیص کرتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کی تکلیف سے دل میں درد پیدا ہونا چاہیئے اور جان سے مال سے اور یہ بھی نہ ہو تو کم از کم زبان سے دعا ہی کرو اس کا ثواب بھی ان لوگوں کے حق میں جن کے پاس مال نہیں ہے۔ مال خرچ کرنے والوں سے کم نہ ہو گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس وقت یہ مضمون مجھے بیان کرنا تھا جو بیان ہو چکا اسی کو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ الرّٰحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ

يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ۔

اب دعا کیجئے کہ جس جگہ شریعت کا حکم رحم کرنے کا ہے وہاں حق تعالیٰ ہمارے دلوں میں رحم پیدا کرے اور حق پر ہمیشہ عامل رکھے آمین ثم آمین۔

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى وَسَلَّمَ عَلٰى خَيْرِ

خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا

مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى

اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ

اَجْمَعِيْنَ

بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ ٥

اشرف علی

۲۳ رجب ۱۳۵۱ھ

عمل الذرّہ

۱۸ر جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ بروز جمعہ بمقام جامع مسجد تھانہ بھون

خیر و شر اگرچہ قلیل ہو۔ حقیر نہ جاننے کے موضوع پر

۲ گھنٹہ پچیس ۲۵ منٹ تک بیٹھ کر بیان فرمایا۔ مولانا

محمد عبد اللہ مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا

سامعین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ۱۵۰ تھی

خطبۂ ماثورہ

★

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

أمّا بعدُ

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔

تمہید آج باوجود بعض احباب کی درخواست کے ہمت بیان کی نہ تھی اسلئے کہ سر میں درد کا اثر تھا۔ مگر بعض اللہ کے بندوں کے خلوص کی عجیب برکت ہوتی ہے کہ اسباب داعیہ بیان کے جمع ہو گئے۔ چنانچہ جمعہ سے قبل چند مہمان آگئے کہ جن کو ٹھہرنے کی مہلت بہت کم تھی۔ کچھ تو ان کا اشتیاق اور کچھ درخواست کنندگان احباب کے خلوص کی برکت جس کا اثر یہ ہوا کہ عین نماز کے اندر

اللہ تعالیٰ نے درد میں تخفیف فرمادی جس سے میں سمجھا کہ یہ ایک درجہ میں بیان کی ماموریت من اللہ ہے۔ مگر چونکہ سر میں درد کا اثر اب بھی موجود ہے گو خفیف ہے اسلئے جی چاہا کہ کوئی مختصر آیت اختیار کی جائے۔ اس لیے یہ آیت اختیار کی کہ گو مختصر ہے لیکن حدیثوں میں اس کی نسبت جامعہ فاذہ آیا ہے کہ اسکی جامعیت سے اختصار کا بھی تدارک ہو جائے گا۔ پس گو بیان مختصر ہو گا لیکن اس اختصار کی تلافی اس کی جامعیت کر دے گی۔ اس آیۃ کا اجمال کے درجہ میں و ترجمہ سب پڑھے گئے ہونگے اس لئے کہ مسلمانوں کو بفضلہ تعالیٰ قرآن سے فطری مناسبت ہے گو عربی نہ پڑھی ہو لیکن قرآن کا ترجمہ کچھ نہ کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ان پڑھ لوگ بعض مواقع استدلال میں قرآن کی آیتیں پڑھ دیتے ہیں۔ تو گو عوام تمام کلام اللہ کا ترجمہ نہیں سمجھتے لیکن بعض مشہور علی الالسنہ آیات کا ترجمہ اجمالاً سمجھ لیتے ہیں چنانچہ یہ آیات بھی منجملہ اُن ہی آیات کے ہے جن کو عوام سمجھتے ہیں اب میں اُس کی کچھ تفصیل اور اسکے متعلق بعض اغلاط کا ازالہ کئے دیتا ہوں۔

عذاب تطہیر

ارشاد ہے کہ جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھلائی کرے وہ اسکو دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ایک ذرہ کے برابر برائی کرے وہ بھی اسکو دیکھ لے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن نہ کسی کی خیر اگرچہ وہ ذرا ہی سی ہو ضائع جائیگی۔ اور نہ کسی کی شر اگرچہ بہت کم ہو غائب ہوگی۔ میں نے خیر کے ساتھ ضائع کا لفظ اور شر کے لیے لفظ غائب اس لیے استعمال کیا ہے کہ خیر پر تو اللہ تعالیٰ جزا دیں گے اس لئے وہ ضائع نہ ہوگی۔ بخلاف شر کے کہ گو ظاہر ضرور ہوگی اللہ تعالیٰ سے کہیں چھپے گی نہیں لیکن یہ ضرور نہیں کہ اُس پر ضرور ہی عقاب ہو۔ بلکہ اکثروں کے لیے امید یہ ہے کہ فضل و کرم سے معاف فرمادیں گے اور بعض کو سزا بھی دیں گے لیکن وہ بھی رحمت اور فضل و کرم ہی ہوگا۔ مقبولین پر دُنیا کے مصائب تو فضل و رحمت ہیں ہی کہ اُن پر اجر و ثواب ہے چنانچہ اس کو سب جانتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ مقبولین پر آخرت میں بھی

اگر کوئی کلفت ہوگی تو وہ بھی رحمت ہی ہے اس کو سُنکر شاید تعجب ہُوا ہوگا۔ لیکن قرآن سے خود اس کا اثبات ہوتا ہے چنانچہ کفار کے بارہ میں ارشاد ہے لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ یعنی اللہ تعالیٰ کفار سے قیامت کے روز نہ کلام فرماویں گے اور نہ انکو پاک کریں گے۔ مفہوم مخالف تمام علماء کے نزدیک موقع وعید میں معتبر ہے پس معلوم ہُوا کہ یہ آیۃ کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور مسلمانوں سے کلام بھی فرماویں گے اور انکو پاک بھی کریں گے پس عذاب جو ہوگا وہ محض عذاب کی صورت ہے حقیقت میں پاک کرنا مقصود ہے گناہوں سے۔ اسکی ایسی مثال ہے کہ دو شخص بادشاہ کی ملاقات کے لئے جاویں ایک نے تو نہا دھو کر پاکیزہ لباس پہنکر عطر لگاکر حاضر ہوکر بادشاہ سے سلام عرض کیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو کرسی پر بٹھلاؤ اور دوسرا شخص بدتمیز بدسلیقہ بے ادب ہے نجاست اور چکین سے آلودہ نہ غسل کیا نہ کپڑے بدلے بدن میں سے بدبُو آرہی ہے۔ ہر چند اُس کو کہا گیا کہ میاں غسل کرلو کپڑے بدل لو۔ مگر اُس بھلے آدمی نے ایک کی نہ سُنی اور لٹھ کی طرح بھُوت سا بنا ہوا آکر بادشاہ کے حضور میں آکھڑا ہوا لیکن چونکہ… بادشاہ محبوب ہے۔ بادشاہ کو اُس سے محبت ہے گو اس کو خبر بھی نہیں کہ بادشاہ کو مجھ سے محبت ہے۔ ورنہ اگر خبر ہوتی تو ایسی حالت میں نہ آتا۔ اس لئے بادشاہ نے حُکم تو نہیں دیا کہ اسکو جیل خانہ لے جاؤ۔ گو یہ مستحق اسی کا تھا اس لئے کہ اُس نے اجلاس شاہی کی حقیقت میں اہانت کی ہے کیونکہ یہ اس حالت میں اس قابل کہاں ہے کہ دربار شاہی میں حاضر ہو۔ مگر چونکہ بادشاہ کو اس سے محبت بھی ہے اسلئے بجائے اس کے کہ کرسی پہ اسکو جگہ دی جائے یا اس کو جیل خانہ بھیجا جائے راکھی بین بین یہ حکم دیا کہ اسکو حمام میں لے جاکر خوب نہلاؤ وہاں شاہی حمام موجود ہیں۔ انہوں نے مَل دَل کر نہلانا شروع کیا ان حضرت نے نہلانے میں بڑے نخرے کئے اور کہنا شروع کیا ہائے مرا، ہائے رے جلا۔ لیکن انہوں نے اسکی ایک نہ سُنی وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہے نادان اگر

ہم نے ذرا کمی کی تو میلا کچیلا رہے گا اور دربار کے لائق نہ ہوگا ؂

طفل می لرزد زنیشِ احتجام ماد رِ مشفق ازاں شد شاد کام

دیکھو! احتجام یعنی پچھنے لگنا تو سخت چیز ہے۔ بچوں کی تو جب حجامت بنتی ہے تو وہ کس قدر شور مچاتے ہیں لیکن اُن کے شور مچانے سے یہ نہیں کرتے کہ حجامت اُن کی نہ بنوائی جائے مجھ کو یاد ہے کہ میں نے بچپن میں بال رکھ لئے تھے ایک ہماری تائی یعنی بڑی چچی تھیں انہوں نے ہم کو اولاد کی طرح پرورش کیا تھا۔ سر دُھلانے سے ہم بہت بھاگتے تھے وہ یہ ترکیب کیا کرتی تھیں کہ کھلی بھگو کر رکھ لیتی تھیں جب میں گھر آتا تو دوڑ کر میرے سر پر لیپ دیتی تھیں۔ اب اس حالت میں باہر نہیں جا سکتے تھے لامحالہ بیٹھ جاتے تھے وہ سر دھوتی تھیں نہلاتی تھیں۔ اب ان کی قدر ہوتی ہے۔

بہرحال جو شخص بے حس ہوتا ہے اس کو تمیز صفائی کی نہیں ہوتی۔ پس جب نہا دھو کر صاف بھلے مانس کی شکل ہوا۔ اب دربار شاہی کے لائق ہو کر آیا تو اس کو بھی کرسی ملے گی اس وقت اُس کو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی میں اُس وقت یہاں کے قابل نہ تھا۔ اب بتلایئے کہ یہ رحمت ہے یا نہیں۔ پس آخرت کی تکالیف بھی مسلمانوں کے لیے رحمت ہے ان کے حق میں وہ جہنم نہیں ہے جہنم کفار کے لیے ہے چنانچہ اسی واسطے ارشاد ہے اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ یعنی تیار کی گئی ہے کفار کے لیے پس جہنم من حیث ھی جہنم اور عقوبت من حیث ہی عقوبت صرف کافرین ہی کے لیے ہے اور ہمارے لئے وہ تزکیہ اور تطہیر ہے باقی تکلیف اسلئے ہوگی کہ میل ہمارا بے حد ہے جب تک خوب تیز پانی سے غسل نہ دیا جاویگا میل علیحدہ نہ ہوگا۔ اور میل کے رہتے ہوئے جنت میں جانا ممکن نہیں۔ اسلئے کہ جنت کا خاصہ ہے کہ نجاست لیکر کوئی وہاں نہیں جا سکتا۔

خروجِ آدم علیہ السلام کی حکمت

بعض حضرات محققین نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام

کے جنّت سے نکلنے کا باعث حقیقتِ عتاب نہیں تھا۔ بلکہ جس درخت سے کھانے کی ممانعت فرمائی گئی تھی۔ اُس کی خاصیت یہ تھی کہ اُس کے کھانے سے فُضلہ پیدا ہوتا تھا۔ جب آدم علیہ السلام نے اُس کو کھایا تو استنجے کی ضرورت ہوئی اور وہ محل اس کا تھا نہیں اسلئے نکلنے کا حکم ہُوا اسلئے کہ جنت میں پولیس تو تھی نہیں۔ یہاں دُنیا میں پائخانہ پھرنے آئے تھے۔ واقع میں حقیقی عتاب اس کا سبب نہ ہوا تھا ــــــــ مثلاً یہاں جامع مسجد میں کسی کو پائخانہ کی ضرورت ہو تو اُس کو یہاں سے نکالیں گے۔ اس لیے کہ مسجد پائخانہ کی جگہ نہیں ایسی ہی جنّت گندی جگہ نہیں۔

اور اس پر ایک مقولہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا یاد آگیا فرماتے تھے کہ آدم علیہ السلام کا نکلنا واقع میں رحمت ہے کیونکہ اگر آدم علیہ السلام نہ نکلتے اور انکی اولاد ہوتی۔ تو اولاد میں سے ضرور ایسے ہوتے کہ وہ نکلتے اس لئے کہ جب آدم علیہ السلام ہی سے اُس کے کھانے سے صبر نہ ہوا تو اولاد سے تو بطریقِ اولےٰ نہ ہوتا۔ پھر اگر اولاد میں سے نکلتے تو ایسی حالت میں نکلتے کہ جنت بھری ہوئی ہوتی۔ وہ نکلنے والا کسی کا بیٹا ہوتا۔ کسی کا باپ ہوتا کسی کی ماں ہوتی تو اسکے نکلنے سے ایک کہرام مچ جاتا اور جنت جنت نہ رہتی بلکہ زحمت ہو جاتی۔ حق تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے کہ آدم علیہ السلام کو یہاں بھیجدیا اور اولاد کو حکم ہُوا کہ پاک ہو کر ہمارے پاس آویں۔

چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ۔ پس جس نے ان اوامر کو سمجھ لیا اور گناہوں اور شوائبِ نفس سے غسل کر کے پاک ہوگیا اور تقوےٰ کا لباس پہنا وہ پھر جنت میں جو ہمارا اصلی ٹھکانہ ہے چلا جائے گا اور جس نے غسل نہ کیا اور نہ کپڑے بدلے تو اسکو حمام ضرور کرایا جاویگا۔ تاکہ جنت میں جانے کی اہلیت اُس میں ہو جائے پس مسلمانوں کے لیے دوزخ میں جانا بھی فضل ہُوا۔

قہر ترقی الحاصل! مقبولین کو جو کلفت ہوتی ہے خواہ دُنیا میں ہو یا آخرت

ہیں وہ حقیقت میں کلفت نہیں محض صورۃً کلفت ہے۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی تو قہر ہوتا ہے بصورۃ لطف جیسے کفار پر ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو یہ ہرگز تمنا نہ ہونا چاہیئے کہ ہم بھی بڑے بڑے عہدے حاصل کریں ہم بھی فٹن پر سوار ہوں یہ فٹن نہیں فتن ہے جس کا نام لوگوں نے ترقی رکھا ہے۔ یہ فی الحقیقت قہر ہے جس کی صورت لطف کی ہے اور کبھی لطف ہوتا ہے بصورت قہر جیسے مقبولین کے مصائب۔

اسی طرح اہل ایمان کی جو شکستگی اور پستی کی حالت ہے یہ لطف ہے گو صورۃً قہر ہے۔ پس اس شکستگی کو دل و جان سے اختیار کرنا چاہیئے مولانا فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من دل فدائے یار دل رنجانِ من

یعنی جو آپ کی طرف سے ناخوشی پیش آوے وہ میرے لیے پسندیدہ ہے میرا دل میرے یار دل رنجان پر فدا ہے دل رنجان سے معلوم ہوا کہ دل کو رنج ضرور ہوتا ہے اور ایسی ہی ناخوش سے بھی معلوم ہوا کہ مصیبت جو پیش آتی ہے وہ رنج دہ ہے لیکن چونکہ اس کی نسبت آپ کی طرف ہے اسلیئے وہ مجھ کو خوش معلوم ہوتی ہے عارف کامل کی یہی شان ہوتی ہے کہ رنج کی بات سے اسکو رنج ہوتا ہے لیکن اس سے وہ راضی ہے اور اس سے کوئی تعجب نہ کرے کہ رنج اور رضا کیسے جمع ہو گئے۔

دیکھو! کریلوں کے اندر مرچیں بہت ڈالی جا دیں تو انکو کھاتے بھی ہیں اور سی سی بھی کرتے جاتے ہیں اور ناک سے اور آنکھوں سے پانی بھی بہتا جاتا ہے اور مزہ بھی آرہا ہے۔ پس جب لذت اور کلفت دونوں جمع ہو سکتی ہیں تو وہ یار گو دل رنجان ہیں مگر وہ اپنے کمالات سے ایسے ہیں کہ دل اُن پر فدا ہے۔

الحاصل! کلفت دنیا میں ہو یا آخرۃ میں وہ مسلمانوں کے لیے رحمت ہے پس صدور شر کے بعد جو کلفت ہوئی جب وہ بھی رحمت ہوئی اور کبھی بالکل ہی عفو

ہو جاتا ہے اس لیے میں نے شَرًّا یَّرَہٗ کی تفسیر میں یہ کہا کہ شر کوئی ایسا نہ ہوگا کہ غائب
ہو۔ یہ حاصل ہوا اس آیت کا۔

غیر مؤثر علم

اور یہ حاصل ایسا ہے کہ ہر مسلمان کے ذہن میں ہے اسلئے اس وقت اسکے ثابت کرنے کی حاجت نہیں یہ تو عقائد
ضروریہ میں داخل ہے ہاں اس مضمون کے سمجھنے کے متعلق جو غلطیاں واقع ہو رہی ہیں
اُن کو رفع کرنا ضروری ہے مجھ کو ہمیشہ زیادہ اہتمام اس کا رہتا ہے کہ حقائق کے سمجھنے
میں جو غلطیاں واقع ہوتی ہیں کہ جس کی سبب سے لوگ مقصود حقیقی کے حاصل ہونے سے
یا تو مایوس ہو گئے ہیں یا بہت دُور جا پڑے یا جو حاصل کر رہے ہیں وہ پریشان ہو رہے
ہیں وہ رفع ہو جاویں اور کام نہ کرنیوالے کو تو اس قدر پریشانی نہیں ہے جس قدر کہ کام
کرنے والوں کو ہے۔ اسلئے کہ احساس اُن ہی کو ہوتا ہے اس لئے اُن کی پریشانی شدید
ہے۔ منجملہ ایسے حقائق کے۔ اس آیۃ شریفہ کے معنی سمجھنے میں بھی اسی قسم کی بعض اغلاط
ہیں میں اُن اغلاط کو مختصر اور مختلط طور سے بیان کرتا ہوں۔

اس آیت کا مضمون سمجھنے میں جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ
جو اہلِ غفلت کو ہوتی ہیں۔ دوسری وہ جو اہلِ ذکر کو پیش آتی ہیں۔ پھر اہلِ ذکر میں دو
طبقے ہیں ایک اہلِ ظاہر اور دوسرے اہلِ باطن ان میں سے ہر ایک کو اس مضمون کے
متعلق غلطی ہوئی ہے۔ سو جو غلطیاں اہلِ غفلت کو ہوئی ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ غلطی ہے
کہ اس آیت کے دو جزو ہیں۔ اوّل فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ اور دوسرے
وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ ان لوگوں کی دونوں پر نظر نہیں۔ یہ بات تو
نہیں کہ اس مضمون کا اُن کو اعتقاد نہیں ہے اعتقاد اور علم تو ہے لیکن عمل سے اُن کے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اس طرف التفات نہیں ہے اس سے غفلت ہے میں اس کا
نام غفلت رکھتا ہوں ـــــ حضرات صوفیہ اسی کا نام جہل رکھتے ہیں لیکن چونکہ جہل

کے لفظ سے بگڑتے ہیں کیونکہ اپنے کو عالم اور معنیٰ شناس جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو ذی علم ہیں - ہم جاھل کدھر سے ہیں اسلئے میں نے اس لفظ کو چھوڑ کر اسکو غفلت سے تعبیر کیا ہے اور حضرات صوفیہ اسی کو جہل کہتے ہیں اُن کے نزدیک علم وہ ہے جو ملتفت الیہ اور حاضر رہ کر مؤثر ہو جائے اور اگر یہ بات نہ ہو تو وہ اُس کو جہل کہتے ہیں - اور ہم لوگ نفس علم بمعنی دانستن ہی کو علم کہتے ہیں ہمارے علم کی ایسی مثال ہے جیسے میرے ایک دوست تھے اُنہوں نے گاؤں میں جا کر وعظ کہا اور وعظ میں یہ کہدیا کہ بے نمازی سُوّر اور کُتّوں سے بدتر ہے - گاؤں کے لوگوں نے جب سُنا تو لٹھ لے لیکر مارنے کے لیے مستعد ہو گئے اُنہوں نے کہا کہ بھائی بتاؤ تو سہی مجھ سے کیا قصور ہوا کہنے لگے کہ تجھے خبر نہیں تو نے ہم کو آج وعظ میں سُوّر اور کُتّے سے بدتر کہا - ان مولوی صاحب نے کہا بتلاؤ تو میں نے کیا کہا تھا اُنہوں نے کہا تو نے یہ کہا تھا کہ بے نمازی سُوّر اور کُتّے سے بدتر ہے - مولوی صاحب بولے کہ میں نے تو بے نمازیوں کو کہا ہے تم کو تو نہیں کہا تم تو بے نمازی نہیں ہو آخر کبھی تم نے عید بقر عید کو تو نماز پڑھی ہو گی گاؤں والوں نے کہا کہ ہاں عید کی تو ضرور پڑھتے ہیں - مولوی صاحب نے کہا کہ بس عید کی نماز تم نے پڑھ لی تو تم بے نمازی کہاں رہے لفظ نمازی تم پر صادق ہے اُس وقت اُنکی جان بچی - پس جیسے یہ گاؤں کے لوگ نمازی تھے ایسے ہی اس عقیدہ کے عالم ہیں - مدرسہ میں ایک دفعہ جلالین شریف میں اس آیت کے معنی پڑھ لیئے پھر خبر بھی نہیں لی - اور نہ اُس سے کام لیا جیسے کسی جگہ لوگ عید کا چاند دیکھ رہے تھے - ایک گنوار نے کہا کہ میں نے چاند دیکھا ہے اُس سے پوچھا گیا کہ تو نماز بھی پڑھتا ہے تو اُس نے کہا کہ تواج (نماز) کی تو یوں سن - ایک مولوی مھارے (ہمارے) گام ماں (گاؤں میں) آیا تھا اُس نے یہ کہا تھا کہ جو کوئی نماز نہ پڑھے اُسکی جنازہ کی نماز نہیں ہوتی اُس بکھت (اُس وقت) ایک بر (ایک بار) پڑھ لی تھی پھر تو مھاری . .

(ہماری) تو یہ ہے ایسے ہی ہم لوگوں نے ایک دفعہ کتاب میں یہ عقیدہ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا الخ پڑھ لیا پر کبھی بھول کر بھی یاد نہیں آیا۔ بتلائیے جب اس عقیدہ کے موافق عمل نہ ہوا تو اس عقیدہ سے کیا نفع ہوا۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے صندوقچی میں روپیہ رکھ کر بھول گئے پھر اسکو یاد نہیں کیا اگر کہو کہ ہم کو تو یہ عقیدہ یاد ہے بھولے نہیں تو جناب ایسے یاد ہونے سے کیا فائدہ ہے یہ یاد کرنا ایسا ہے جیسے روپیہ صندوقچی ہی میں رکھا ہے اور اس سے کام نہ لیا جائے یاد ہونے کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ روپیہ نکال کر بازار میں اسکو بھنا کر کام میں لایا جائے ایسے ہی اس عقیدہ کے تمہارے ذہن میں ہونے سے کچھ نفع نہیں جب تک کہ اس کا یقین مؤثر ہوکر تمہاری حالت کو نہ بدل دے۔

ترغیب و ترہیب کے بازو افسوس ہے کہ ہمارے اندر دولت موجود ہے اور ہم محروم ہیں ہماری وہی حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

یک سبد پُر ناں ترا بر فرق سر　　تو ہمی جوئی لبِ ناں در بدر

اور ہمارے علم کی وہی مثل ہے جیسے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں مَثَلُ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا بوجھ ہم میں لدے پڑے ہیں اور ہم کو خبر نہیں کہ ہمارے اوپر کیا چیز ہے۔ ہمارے کام نہیں آتا۔ ہمارے چاروں طرف پانی ہے اور ہم پیاسے ہیں ؎

تا بزانوے میانِ قعرِ آب　　در عطش و رجوع گشتی خراب

سر پر روٹیوں کا ٹوکرا ہے اور ہائے رے بھوک ہائے رے بھوک چلا رہے ہیں گھٹنوں تک پانی میں غرق ہیں اور ہائے رے پیاس ہائے رے پیاس پکار رہے ہیں ارے بیخبر ذرا اوپر کو ہاتھ لے جاؤ اور روٹی اتار کر کھالو اور نیچے ہاتھ لاؤ اور خوب

پیٹ بھر کر پانی پیو تمہارے اندر ایک دولت ہے اور تم مفلس ہو رہے ہو تمہارے اندر باغ ہے اور تم دنیا کے باغ جو درحقیقت اس باغ و بہار کے سامنے کچھ نہیں متوجہ ہو رہے ہو ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ — تو ز غنچہ کم ندمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

بلکہ تمہارے اندر آسمان اور زمین ہے حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آسمانہاست در ولایت جاں — کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست و بالاہاست — کوہ ہائے بلند صحراہاست

ہم کو کچھ خبر نہیں ہے کہ ہم کیا چیز لیے بیٹھے ہیں۔ یہی عقیدہ جس کو یہ آیت شریفہ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ۔ متضمن ہے یہ ایسے دو بازو اور پر ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان دونوں کی بدولت عرش سے اوپر تک پرواز کر سکتے ہیں۔ ایک بازو ترغیب ہے اور دوسرا ترہیب ہے۔ اس ترغیب و ترہیب سے ملائکہ سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان دونوں بازوؤں کی کچھ قدر نہ کی اور ان دونوں کو کیچڑ میں ایسا سان دیا کہ اڑنا تو علیحدہ رہا اب ان سے حرکت کرنا بھی دشوار ہو گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ کوئی باز آکر شکار کر لیتا ہے یا کوئی سانپ آکر ڈس لیتا ہے یعنی شیاطین کا تسلط ہو جاتا ہے نفس غالب ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہم ان دونوں بازوؤں سے کام لیتے تو کیا مجال تھی شیطان کی۔ کہ ہم پر اس کو دسترس ہوتی۔ اسی لئے مخلصین پر اسکا قابو نہیں چلتا۔ کما قال تعالیٰ انہ لیس لہ سلطن علی الذین امنوا وعلی ربھم یتوکلون ہ اگر ہمارے بھی یہ پر ہوتے تو وہ ہمکو نہ لوچتا ہم ایسے مقام پر پہنچ جاتے کہ اس کو نہ ملتے وہ ہم کو ڈھونڈتا ہی پھرتا کسی شاعر نے کہا ہے تو مبالغہ ہی کیا ہے ؎

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست نیافت — نالہ ہر چند نشانم اوکہ در پیرہن ست

یہ اس کا شعر موت کے بارہ میں تو جہل اور نری شاعری ہے مگر ہم حقیقت میں ایسے

ضرور ہوجاتے کہ ابلیس ہم کو تلاش کرتا اور ہم نہ ملتے پس سے ہمارا اس آیت کے متعلق نرا عقیدہ ہی ہے لیکن اس سے کام نہیں لیتے۔

صلح کل کا فتنہ

اگر ہم اس سے کام لیتے تو اس سے زیادہ ہم پر کون سا وقت حاجت کا تھا کہ اس وقت ہم پر چاروں طرف سے شیاطین کا ہجوم ہو رہا ہے۔ شیاطین الجن کا علیحدہ ہجوم ہے شیاطین الانس کا اس سے زیادہ حملہ ہے کہ ہزاروں گروہ نئے نئے پیدا ہو رہے ہیں اور بدعات اور معاصی کی طرف بلا رہے ہیں اور سب سے بڑا جال حب دنیا کا ہے کہ اس کی طرف بلانے والے تو بہت ہی ہیں اور ان کی اجابت اور ان کی طرف جانے سے کوئی انکار ہی نہیں کرتا۔ بہت سے نام کے علماء اور نام کے درویش بھی حب دنیا کی طرف بہت رغبت سے جا رہے ہیں یک انار و صد بیمار کا قصہ ہو رہا ہے۔ اور اس وقت ہماری وہ مثال ہے جیسے حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ نے مثل بیان کی ہے ایک مرد کی کہ اس میں بہت سے شریک منازعت کرنے والے ہیں جیسے ایک غلام ہو اس کے بہت سے آقا ہوں تو وہ پریشان ہو جائیگا ایک اسکو حکم دیگا کہ پانی پلاؤ دوسرا کہتا ہے کہ لیٹ جاؤ اور تیسرا حکم دیتا ہے کہ نہیں بیٹھ جاؤ۔ دس آدمی دس فرمائشیں ہم لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اسکی کوشش کی کہ ہم سے سب خوش رہیں جیسے کوئی شخص تھے ہر دلعزیز بیچارے۔ ہر ایک کی دلجوئی کیا کرتے تھے —— ایک مرتبہ ایک دریا کے کنارہ پر پہنچے دیکھا کہ ایک شخص اس کنارہ پر بیٹھا ہے اور اس پار جانا چاہتا ہے اور ایک دوسرے کنارہ پر بیٹھا ہے اور وہ اس طرف آنا چاہتا ہے یہ ہر دلعزیز صاحب اس قریب والے کو کندھے پر بٹھلا کر چلے جب وسط دریا میں پہنچے تو چاہا کہ اس دوسرے کنارہ والے کو بھی اتنی ہی دور لے آؤں ورنہ اس کا جی برا ہوگا بس اسکو کندھے پر سے پٹک اسکو لینے گئے جب وسط تک اسکو لائے تو پہلا ڈوبتا ہوا دکھلائی دیا بس اس دوسرے

کو یک کر اس کو سنبھالنے چلے وہ ڈوب چکا تھا پھر اس دوسرے کی خبر لینے آئے اس کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا۔ بس یہی شیوہ اس وقت لوگوں نے اختیار کیا ہے کہ تھوڑے سے ادھر ہو گئے۔ تھوڑے سے اُدھر اس فرقہ میں گئے تو اسی قسم کی باتیں کرنے لگے اور اگر دوسرے فرقہ میں گئے تو اُن ہی کا طرز اختیار کر لیا۔

غرض! کوئی خاص مشرب نہیں ہے ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ میں تھوڑا سا غیر مقلد ہوں اور تھوڑا سا نیچری ہوں تھوڑا سا بدعتی ہوں اور شرح اسکی یہ فرمائی کہ میں ڈھولکی سُنتا ہوں اسلئے تو بدعتی ہوں اور ترقی دُنیا پر لکچر دیتا ہوں اس لئے نیچری ہوں اور ظہر و عصر ایک وقت میں پڑھتا ہوں اسلئے غیر مقلد ہوں اب جنہوں نے ان مولوی صاحب کی یہ تقریر سُنی ہو گی اُن کا تو بیڑا ہو گیا ہو گا۔ غرض چاروں طرف سے فتن ہیں اور گمراہیوں کے جال ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا ۔۔۔ ماچو مُرغانِ حریصِ بے نوا

دمبدم پابستہ دام نو ایم ۔۔۔ گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم

میرہانی ہر دمے مارا و باز ۔۔۔ سوئے دامے میرویم اے بے نیاز

وہ ہمکو نجات دیتے ہیں اور ہم پھنستے چلے جاتے ہیں ہم بار بار گرتے ہیں اور وہ سنبھالتے ہیں اور اس سب کی وجہ وہی اُن دو بازوؤں سے کام نہ لینا ہے ورنہ ہمارے پاس تو ایسے دو بازو ہیں کہ اگر ہم اُن سے کام لیتے تو واللہ نہ کوئی شیطان الانس ہم پر غالب آتا اور نہ شیطان الجن۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ

انسان کامل کی ہیبت

ایک بزرگ صاحب حال کی حکایت ہے کہ جب وہ قرآن شریف کی تلاوت کرنے بیٹھتے اور اعوذ باللہ پڑھتے تو کہتے کہ اے شیطان تو خوش مت ہونا کہ مجھ کو کچھ تو سمجھا تب تو

مجھ سے پناہ چاہتا ہے ۔ واللہ میں تجھ کو کُتّے کے برابر بھی نہیں سمجھتا اور اگر میرے مولا کا حکم اعوذ باللہ پڑھنے کا نہ ہوتا تو خدا کی قسم میں ہرگز اَعُوْذُ نہ پڑھتا ۔ ابھی تک قرآن نہیں پڑھا ابھی تک باتیں ہی کر رہے ہیں ۔ مولانا ایسے ہی حضرات کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

گفت گوئے عاشقاں در کار رب — جوششِ عشق ست نے ترکِ ادب

بات یہ ہے کہ اصل چیز معیت مع اللہ ہے جب وہ نصیب ہو جاتی ہے پھر ہر بات خواہ ہندی میں ہو یا عربی میں سب خوش ہے ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر ست — عشق را خود صد زبانِ دیگر ست

بوئے آں دلبر چو پرّاں میشود — ایں زبانہا جملہ حیراں میشوند

اُن حضرات کا وظیفہ معیت مع الحق ہے اگرچہ صورتیں اُس کی مختلف ہوں پس اگر آپ انسان کامل بن جائیں تو شیطان کا آپ پر غلبہ تو چہ معنی خود شیطان ہی آپ سے ڈرنے لگے ــــــ حدیث شریف میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نسبت وارد ہے "ما سلکت فجًّا قط الا سلک الشیطان فجاغیر فجک" یعنی اے عمر تم کسی راہ پر نہیں چلتے مگر شیطان دوسری راہ پر تمہاری راہ کے علاوہ چلنے لگتا ہے یعنی وہ راستہ چھوڑ دیتا ہے اور وجہ اُسکی یہ ہے ؎

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست — ہیبتِ ایں مردِ صاحب دلق نیست

آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اندر کیا بات تھی جو شیطان اُن سے ڈرتا تھا یہی تھا کہ وہ انسان کامل تھے آپ بھی انسان کامل بن جائیے ۔ آپ کی بھی وہی شان ہو جاویگی گو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے برابر نہ ہو گے لیکن اپنے مرتبہ کے موافق کمال نصیب ہو جائے گا ــــ یاد رکھو ! نبوت ختم ہوئی ہے ولایت ختم نہیں ہوئی غرض ہمارے اندر وہ قوت و دولت موجود ہے کہ اگر ہم اُس سے کام لیں تو ایسی حالت کے وقت وہ ہماری مدد کرے

اہلِ غفلت کی غلطی

یاد رکھو! اُس قوت سے کام یہاں ہی لے سکتے ہیں اور

مرنے کے بعد تو سب اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ اور جس حالت میں یہاں زندگی گذر رہی ہے اُسی حالت پر حشر ہوتا ہے مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ پس کیوں بازوؤں سے کام نہیں لیتے ہو جس میں اوّل بازو ترغیب ہے پس کیوں مرضیاتِ الٰہیہ کی رغبت نہیں کرتے اور دوسرا بازو ترہیب ہے پس کیوں نامرضیات سے اجتناب نہیں کرتے کیوں اُنکو بغل میں دبا کر بیٹھ رہے جیسے قرآن مجید لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں کبھی تلاوت کی توفیق نہیں ہوتی ہاں تیجہ کے روز وہ نکلتا ہے اور یا کبھی مخالفانِ اسلام سے مناظرہ کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اُس روز نکلتا ہے ایسی مثال ہے جیسے اندھا مشعلچی ہوتا ہے کہ اوروں کے پیچھے پڑے ہو اور خود حضرت مناظر صاحب کو اپنی خبر نہیں دوسروں کو رستہ دکھانا تمہارے کیا کام آئے گا۔ خُلاصہ اس غلطی کا یہ ہوا کہ نہ کسی خیر کی رغبت کی اور نہ کسی شر سے اجتناب۔ کیا عقیدہ ہی کے درجہ میں یہ مضمون رہا۔

اہلِ ظاہر کی غلطی

یہ غلطی تو اہلِ غفلت کی تھی ایک غلطی اور اہلِ ذکر کو ہوتی ہے اور اہلِ ذکر میں سے بھی اُن لوگوں کو جو اہلِ ظاہر ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اس آیت کے دونوں جزو کا فرداً فرداً حق ضائع کیا یعنی پہلے گروہ نے تو مجموعہ ہی کو نظر انداز کر دیا تھا اور دونوں سے غفلت کی تھی کہ اُس سے کام نہ لیا۔ اور انہوں نے دونوں جزو کے متعلق علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے لیے تو فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ پر نظر رکھی یعنی خود اگر تھوڑا سا عمل نیک کیا تو اُس پر نظر ہے اور دوسروں کے لیے وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ پیش نظر ہے یعنی اُن کے اعمال نیک پر نظر نہ کر کے اُن کے بُرے ہی اعمال پر نظر ہے اور سب کو حقیر جانتے ہیں۔ ایک نماز انہوں نے کیا شروع کی کہ سارے جہاں کو حقیر جاننے لگے اور خود ان حضرت کی حالت خواہ کچھ ہی ہو

چنانچہ بہت لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ نماز پڑھتے ہیں اور وظیفے گھونٹتے ہیں اور اپنے کو مقدس جانتے ہیں اور حقوق العباد ضائع کر رہے ہیں دھوکے دیکر لوگوں کے مال.. چھین رہے ہیں اور اُس پر بھی دوسروں کو حقیر جانتے ہیں حالانکہ جیسے ترکِ صلوٰۃ حرام ہے حقوق العباد ادا نہ کرنا اور دوسروں کو حقیر جاننا اور ریا بھی تو حرام فرق کیا وجہ ہے ہاں فرق یہ ہے کہ یہ حضرت تو اپنی ریا کی وجہ سے ماخوذ ہوں گے اور وہ مُبتلائے معاصی کہ جن کو یہ حقیر جانتے ہیں توبہ کی بدولت نجات پاویں گے جیسے مُلّا جامیؒ فرماتے ہیں ؎

گُناہ آمرز رنداں قدح خوار — بطاعت گیر پیران ریاکار

اسی واسطے تو عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

ترسم کہ صرفہ نبرد روز بار خواست — نانِ حلال شیخ زآبِ حرام ما

خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنے تو اعمالِ خیر پہ نظر ہے اور دوسرے کے اعمالِ شر پہ نگاہ ہے ذرا سا ایک کام کر لیا اس کو جتلاتے ہیں ہر وقت اظہار کریں گے دعوٰی کریں گے۔ غرض: ہر وقت اپنا ہی سبق یاد ہے کبھی صراحتہً دعوٰی کبھی ضمناً یاد رکھو! ریا حابطِ اعمال ہے اور اس کے اس قدر دقیق دقیق شعبے ہیں کہ اُن سے بچنا صدیقین کا کام ہے۔

ایک بزرگ کسی بزرگ کے یہاں مہمان ہوئے اُن میزبان بزرگ نے خادم سے کہا کہ اُس صُراحی میں پانی لانا جو ہم دوسرے حج میں لائے تھے اُن مہمان نے کہا کہ آپ نے ایک کلمہ میں اپنے دونوں حج غارت کیئے۔ دیکھیئے! اُنہوں نے کیسے عنوان سے اپنے عمل کو ظاہر کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ حضرت نے حج کیا اور ایک ہی نہیں دو دو حج کیئے اس کا ریا ہونا تو ظاہر میں بھی سمجھ میں آتا ہے۔

سُفیان ثوریؒ کا اخلاص اس سے بڑھ کر لیجئے حضرت سفیان ثوریؒ

اور ایک دوسرے محدث ایک رات کو جمع ہوئے اور آپس میں یہ ٹھہرا کہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی احادیث سُنا دیں جیسے آجکل ہمارے مہذبین جمع ہوتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں اور اُس کا نام تبادلہ خیالات رکھا ہے۔ یعنی تم ہمارے خیال سے منتفع ہو اور ہم تمہارے خیالات سے لیکن وہ حضرات تو علم دین کی نیت سے باتیں کرتے تھے اب علم کہاں اب تو ترقی کے لیے تبادلہ خیالات ہوتا ہے مثلاً تجارت کس طرح ہوتی ہے۔ زراعت کا کیا طریقہ ہے۔ غرض خلاصہ تمام ترسعی کا اکل و شرب ہے۔ سو جناب اگر ترقی اسی کا نام ہے تو بھی خوب ترقی کرنیوالا ہوگا۔ اور نیز سب جانوروں کو ایسی ترقی یاد ہے۔

ایک کُتے کو میں نے دیکھا کہ جب اُسکو ٹکڑا ڈالا جاتا وہ خود نہ کھاتا تھا لے جاکر ایک بھوسہ کی کوپ میں جمع کر دیتا ہے۔ پس اگر معاش ہی کے طریقہ جاننے کا نام ترقی ہے تو اسکے اندر تو وہ بڑا ماہر تھا اس کو بھی ترقی یافتہ کا معزز لقب دیں گے اسلئے کہ وہ بڑا منتظم تھا لیکن معلوم نہیں وہ سگ سگے بھائی کے لیے رکھ رہا تھا یا اپنے لیے بظاہر تو اپنے ہی لیے رکھتا ہوگا اس لیے کہ اُس میں قومی ہمدردی تو ہوتی نہیں۔ اپنے ہم جنس کو دیکھ کر بہت غُرّاتا ہے تو جناب معاش کے طریقے بہت سے یاد ہونا اور اس میں ماہر ہونا علم نہیں ہے چنانچہ ایک عاقل کہتے ہیں ؂

علم نحو وغیرہ علم عاشقی　　مابقی تلبیس ابلیس شقی

ایہا القوم الذی فی المدرسہ　　کلما حصلتموہ وسوسہ

ان اشعار کے قائل کو میں نے عاقل اس لیے کہا کہ یہ شعر نان و حلوا کے ہیں اور اُسکے مصنف کوئی بزرگ نہیں ہیں۔ بہرحال بزرگ ہوں یا نہ ہوں جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ مضمون حق ہے۔ الغرض! دونوں مُحدث شام سے بیٹھے اور احادیث بیان کرتے کرتے صُبح ہوگئی۔ صُبح کو اُن بزرگ نے سفیان ثوریؒ سے کہا کہ الحمدللہ آج کی رات

تو ہماری طاعت میں گذری۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس رات کا مواخذہ نہ ہو تو غنیمت ہے۔

غور کرو! کہ میری تمام تر سعی اس طرف تھی کہ تم کو ایسی ایسی احادیث سناؤں جو آپ نے سنی نہ ہوں اور آپ کی کوشش یہ تھی کہ ایسی حدیثیں بیان کروں کہ جو میرے کان میں نہ پڑی ہوں۔ پس ہمارا مقصود اپنا اظہار علم تھا۔ یہ سنکر دونوں رونے لگے اور اللہ سے دعا کی کہ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ اللہ اکبر! حضرت، ہم لوگ اپنے آپ کو ٹٹولتے نہیں اگر غور و فکر تو ہم کو خود محسوس ہو کہ ہمارے اندر کیا کیا بلائیں بھری ہوئی ہیں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ۔ ہم لوگ کھلم کھلا ریا میں مشغول ہیں۔

تقدیس کے پردہ میں ریاکاری

لیکن بات یہ ہے کہ اپنا عیب تو عیب نظر نہیں آتا اور دوسروں کی عیب جوئی میں لگے ہوئے ہیں۔ بلکہ دوسروں کی خیر بھی خیر نظر نہیں آتی اور جو ہم میں مقدس کہلاتے ہیں وہ بھی عجب اور ریا میں مبتلا ہیں اور عجیب پیرایہ میں اس کا اظہار ہوتا ہے چنانچہ جب طاعون یا کوئی بیماری پھیلتی ہے تو کہتے ہیں کہ میاں طاعون کیوں نہ ہو لوگوں کے اعمال تو دیکھئے کیا ہیں فلاں شراب پیتا ہے فلاں زنا میں مبتلا ہے اور جو ذرا اور زیادہ محتاط ہیں وہ نام نہیں لیتے وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رحم کرے ہم لوگ ایسے ایسے اعمال میں مبتلا ہیں لیکن مراد اس سے دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ یہ کبھی کسی کو کہتے نہیں سنا ہو گا کہ میرے اعمال خراب ہیں۔ میں نماز میں جی نہیں لگاتا یا فلاں عیب میرے اندر ہے جس کے سبب سے یہ تباہی آرہی ہے۔ جب تعجب ہوتا ہے ہمیشہ دوسروں کے اعمال سے ہوتا ہے۔ غرض ان کے سامنے ہمیشہ دو فہرستیں رہتی ہیں اپنے تو نیک اعمال کی اور دوسروں کی بداعمالیوں کی اپنے نفس کا تبریہ اور تنزیہ ان کا ہر وقت مشغلہ ہے حالانکہ جو بڑے بڑے اولیاء کرام گذرے ہیں انکی نظر ہمیشہ اپنے عیوب پر رہی ہے

اور اولیاء تو علیحدہ انبیاء علیہم السلام بھی باوجود معصوم ہونے کے اپنے نفوس کا تبرئہ نہیں فرماتے۔ دیکھئے! یوسف صدیق علیہ السلام کیا فرماتے ہیں وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔ جن کی نزاہت کی خود حق تعالیٰ گواہی دے رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ سوء کہتے ہیں صغیرہ کو اور فحشآء سے مراد کبیرہ ہے بس صاف دلالت ہے کہ یوسف علیہ السلام سے نہ صغیرہ صادر ہوا نہ کبیرہ۔ اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ارادہ گناہ کا کیا تھا۔ اور یہ آیۃ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا سے استدلال کرتے ہیں ہمارے استاذنا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وَلَقَدْ هَمَّتْ پر کلام ختم ہوگیا اور هَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ علیحدہ کلام ہے۔

حاصل آیت کا یہ ہوا کہ حضرت زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ برائی کا کیا اور یوسف علیہ السلام بھی کر لیتے اگر اپنے رب کا برہان نہ دیکھتے۔ اور اسی واسطے مولانا فرماتے تھے کہ وَهَمَّ بِهَا پر میں وقف نہیں کرتا پس اس سے هَمَّ کی نفی ہوتی ہے نہ کہ اثبات۔ اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے ارشاد ہے كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ کہ اس میں صغیرہ اور کبیرہ دونوں کی نفی ہے اور جو لوگ هَمَّ بِهَا پر وقف کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ هَمَّ کے مراتب مختلف ہیں زلیخا نے جو هَمّ کیا وہ اُن کے مرتبہ کے موافق تھا اور یوسف علیہ السلام سے جو هَمّ ہوا وہ اُن کے رُتبہ کے موافق ہے جو صغیرہ سے بھی بمراتب کم ہے۔ غرض صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہونا سب کا متفق علیہ ہے ——— یوسف علیہ السلام سے کوئی عمل ایسا کہ جس کو گناہ لکھا جاوے ظہور میں نہیں آیا۔ جمہور کی تفسیر پر وسوسہ گناہ ہوا کہ وہ گناہ نہیں ہے

وسوسۂ ریا یہاں سے ایک اور کام کی بات ہاتھ آئی وہ یہ ہے کہ شیخ نے مثلاً کسی کو بتلا دیا کہ ذکر جہر کرو اُس نے ذکر جہر شروع کیا - اگلے وقت وسوسہ آیا کہ کسی نے مجھے دیکھ لیا ہے ریا ہوگئی - شیخ سے جا کر عرض کیا کہ حضرت جی اگر ارشاد ہو تو آہستہ آہستہ کر لیا کروں - جہر سے کرنے میں تو ریا ہوتی ہے وہ ریا کس چیز کو سمجھا ہے وسوسۂ ریا کو ریا سمجھ گیا اسلئے کہ ریا تو وہ ہے جو قصداً ہو اور ریا کار تو اہتمام کیا کرتا ہے دکھلانے کا - ہاں یہ صورت ریا ہے مگر حقیقت میں ریا نہیں - یا یوں کہو کہ اصلی ریا نہیں ریا کی جھلک ہے ایسی مثال ہے جیسے کسی آئینے کے اوپر مکھی بیٹھ جاوے تو وہ حقیقت میں تو اوپر بیٹھی ہے لیکن اُس کا عکس آئینے کے اندر بھی ہے پس اسی طرح ریا قلب کے اندر نہیں ہے قلب سے باہر ہے اُس کی جھلک اندر پڑتی ہے جس سے یہ جانتا ہے کہ ریا میرے دل کے اندر ہے حالانکہ وہ باہر ہے یہ وہ مضمون ہے جس کو متنبی نے کہا ہے ؎

عذل العواذل حول قلبی التائہ   وھوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

یعنی ملامت کرنیوالیوں کی ملامت تو میرے قلب کے گرداگرد ہے اور محبت دوستوں کی سواد قلب میں ہے اُس میں ملامت کا اثر نہیں ہے - خیر! یہ ایک فائدہ زائدہ تھا - مقصود یہ ہے کہ ایک تفسیر پر وسوسۂ گناہ ہوا گناہ نہیں ہوا - یوسف علیہ السلام گناہ سے بالکل بری تھے۔

برا ءتِ یوسف علیہ السّلام کا عجیب استدلال ایک بزرگ نے عجیب لطیفہ لکھا ہے کہ اے عزیز! یوسف علیہ السلام کی آلودگی کا وہم بھی مت کر - اُن کے دامن عصمت کو ذرہ برابر بھی داغ نہیں لگا - اور اگر تجھ کو اسکی شہادت چاہیئے تو خدا تعالے فرماتے ہیں کَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ - اور اگر مخلوق کی شہادت چاہتا ہے

تو اُس شیر خوار لڑکے کی شہادت کافی ہے جس نے یوسف علیہ السلام کی برات کی گواہی دی اور اگر اسکی شہادت قبول نہیں کرتا تو خود زلیخا کی شہادت موجود ہے وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ یعنی میں نے یوسف علیہ السلام سے اُن کے نفس کی درخواست کی تھی وہ باز رہے - اور اُن کی شہادت بھی منظور نہیں تو زنانِ مصر کی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے کہا مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ یعنی ہم نے اُن پر کوئی بُرائی معلوم نہیں کی - اور اگر اُن کی شہادت بھی تیرے نزدیک قابلِ قبول نہیں تو شیطان کی شہادت موجود ہے اُس نے کہا تھا لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ہ یعنی میں ضرور اُن سب کو بہکاؤں گا مگر جو اُن میں سے تیرے مخلص بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ وہ مخلصین میں سے ہیں - چنانچہ ارشاد ہے اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ - مگر باوجود اس قدر تقدس اور پاکی کے پھر یہ فرماتے ہیں وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ یعنی میں اپنے نفس کی براءۃ کا دعوےٰ نہیں کرتا نفس تو بُرائی کا کثرت سے امر کرتا ہے - لیکن تواضع چونکہ بعض مرتبہ ناشکری کی طرف مُفضی ہو جاتی ہے اسلئے آگے بطور استثنا کے فرماتے ہیں اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ یعنی مگر وہ شخص جس پر میرا رب رحم کرے اور اُن کا مرحوم ہونا یقینی -

ضرورتِ انکسارِ نفس

اے حضرات جب یوسف علیہ السلام باوجود اس تقدس و تنزہ کے دعوےٰ نہ کریں تو ہم بے چارے تو کس شمار میں ہیں - مگر ہم میں یہ مرض موجود ہے کہ دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے نفس کی خبر نہیں ــــــ صاحبو! کاہے پر ناز ہے یاد رکھو حق تعالیٰ اُس پر قادر ہیں کہ جن کو تم حقیر سمجھتے ہو اُن کو بجائے تمہارے کر دیں اور تم کو بجائے اُن کے ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را ... در سنگلاخ بادیہ پے ہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

کا ہے کا ناز حماقت ہے عقل کے بالکل خلاف ہے اسلئے کہ اگر اپنی طاعات پہ ناز ہے تو طاعات مجاہدات فی الحقیقت معالجات ہیں تو کوئی مریض اگر نسخہ پیکر لیکچر دینے لگے اور فخر کرنے لگے ـــــ کہ دیکھو میں ایسا شخص ہوں کہ میں نے آج بنفشہ پیا ہے لوگ اس کو احمق کہیں گے کہ آپ اپنی عقل کا علاج کیجیئے ناز کس پہ کرتے ہو تم نے دوا کی۔ اپنا کچھ نفع ہوگا جتلاتے کس پر ہو۔ جب دوسرے کو اپنے سے کم بھی سمجھے بحضرت یہ انا خیر من فلان کا وہ عیب ہے کہ شیطان نے ایک مرتبہ کہا تھا اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ دیکھ لو! کیا نتیجہ ہوا تمام عمر کے لیے ملعون ہو گیا۔ اور جس کا رات دن یہی شغل ہو اَنَا خَیْرٌ مِّنْ زَیْدٍ، اَنَا خَیْرٌ مِّنْ عَمْرٍو۔ اس کے لیے کیا ہونا چاہیئے۔

بزرگانِ دین کی یہ حالت تھی کہ جیسے ہم قحط اور وبا اور طاعون کے اسباب دوسروں کے گناہ تجویز کرتے ہیں۔ وہ حضرات اپنے گناہ کو اس کا سبب جانتے تھے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ سے لوگوں نے آکر عرض کیا کہ حضرت دعا فرمایئے کہ بارش ہو فرمایا کہ میرے گناہوں کے سبب بارش نہیں ہوتی۔ مجھ کو مصر سے نکال دو۔ ان حضرات کو جب کبھی گمان ہوا ہے تو یہی ہوا کہ ہمارے اعمال کے سبب سے یہ مصیبت آئی ہے۔

ایک شخص کہتے تھے کہ ایک انگریزی کتاب میں لکھا ہے کہ انسان کے پاس دو تھیلے ہیں ایک آگے اور ایک پیچھے۔ آگے کے تھیلے میں اپنی بھلائیاں ہیں جو ہر وقت پیش نظر ہیں اور پچھلے تھیلے میں دوسروں کی بھلائیاں ہیں جو نظروں سے غائب ہیں۔ ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ ہم جو دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں تو کیا ان کے اندر کوئی خوبی کی بات نہیں ہے۔

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ یزید کیسا تھا۔ فرمایا شاعر اچھا تھا حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری ہمارے مجمع کے اکثر بزرگوں کے

اُستاد تھے۔ ایک شخص نے گستاخانہ بر رُو کلمات کہے طلبہ نے چاہا کہ اُس کی خبر لیں فرمایا کہ ساری باتیں تو اُس کی غلط نہیں کچھ تو صحیح بھی ہیں۔

کمالِ تواضع

حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید بہت تیز مشہور ہیں لیکن اپنے نفس کے لیے کسی پر تیزی نہ فرماتے تھے۔ ایک شخص نے مجمع عام میں آکر مولانا سے پوچھا کہ مولانا میں نے سُنا ہے کہ آپ حرام زادہ ہیں بہت متانت اور نرمی سے فرمایا کہ کسی نے تم سے غلط کہا ہے شریعت کا قاعدہ ہے اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ۔ سو میرے والدین کے نکاح کے گواہ بڑے بوڑھے لوگ اب تک موجود ہیں۔ ایسی باتوں کا یقین نہیں کیا کرتے وہ شخص پاؤں پر گر پڑا۔ اور کہا کہ مولانا میں نے امتحاناً ایسا کہا تھا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ آپ کی تیزی سب اللہ کے واسطے ہے اہل اللہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اُن کی ذات کو جس قدر کوئی کہے وہ اپنے کو اُس سے بدتر جانتے ہیں ——— ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی نے تکفیر کی حضرت نے سُنکر بُرا نہیں مانا اور یہ فرمایا کہ میں عنداللہ اگر مومن ہوں تو مجھ کو کسی کی تکفیر مضر نہیں اور اگر [خدانخواستہ کافر ہوں] تو بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ ذوق کے اشعار اسی مضمون میں ہیں ؎

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھکو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے پھر بُرا کہنے سے کیوں اُسکے بُرا مانتا ہے

دیکھئے! یہ اشعار بالکل نثر سے معلوم ہوتے ہیں کمال شاعری اسی کا نام ہے کہ پتہ بھی نہ لگے کہ نظم ہے یا نثر۔ اور بالکل سچا مضمون ہے ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ ذرا کوئی کچھ کہدے تو پھر دیکھئے چہرہ سُرخ ہو جائیگا رگیں پھول جائیں گی اور تاویل یہ کرینگے کہ یہ غضب فی اللہ ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اے شخص تجھکو شیطان نے دھوکہ دے رکھا ہے

او۔ بہکایا ہے کہ تو غضب فی اللہ کرتا ہے۔ اور اُس کا امتحان یہ ہے کہ جیسے تم کو تمہاری بات رُد کرنے یا تمہارے مسئلہ بیان کئے ہوئے کو رَد کرنے سے غصہ آتا ہے۔ اگر یہی مسئلہ دوسرا عالم بیان کرے اور اُس عالم میں اور تم میں مخالفت بھی ہو۔ اور کوئی شخص اُسکے مسئلہ میں مزاحمت کرے تو دیکھو تمہارا جی خوش ہوتا ہے یا نہیں۔ غالب تو یہ ہے کہ جی خوش ہوگا اسسے تم خود غور کر لو۔ کہ یہ غضب تمہارا فی اللہ تھا یا نہیں اگر فی اللہ تھا تو کیا وجہ ہے کہ تمہارے مخالف نے جب وہی مسئلہ بیان کیا۔ اور اُسسے کسی نے مزاحمت کی۔ تو تم کو اُس وقت کیوں رَدِّ حق کی وجہسے ویسا ہی جوش نہیں آیا۔ اسسے معلوم ہو گیا کہ تیرے اندر دین کی حمیت نہیں نفسانی جوش ہے یہ ایک ایسا امتحان ہے کہ اِس میں بہت کم پاس نکلیں گے۔ یہ ساری خرابی اسکی ہے کہ اپنے کمالات پر نظر ہے اور عیوب نظروں سے مُستتر ہیں ؎

ہر یکے ناصح برائے دیگراں ‏ ناصح خود کم یافتم اندر جہاں

ترکِ وعظ و اصلاح

بعضوں کو ایک اور غلطی ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نہ تو اپنی اصلاح کرتے ہیں اور نہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور اسکے ساتھ ہی دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا بھی چھوڑ دیتے ہیں گویا اپنے حق میں بھی اور دوسروں کے لیے بھی عمل فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم خود ہی عمل نہیں کرتے تو دوسروں کو کیسے نصیحت کریں اور اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ سو یہ لوگ دو فرضوں کے تارک ہوئے اور آیت کے معنی سمجھنے میں اُنکو غلطی ہوئی اسلیئے کہ آیت میں ملامت اس پر نہیں کہ خود عمل نہ کرنے کی حالت میں دوسروں کو کیوں حکم کرتے ہو۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ دوسروں کو بتانے کے ساتھ خود کیوں عمل نہیں کرتے۔ پس اگر کوئی خود عمل نہ کرے اور دوسروں کو امر کرے تو اُسکو حکم ہوسکتا ہے کہ تو جیسے

دوسروں کو بتاتا ہے خود بھی عمل کر۔ یہ حکم نہیں کہ دوسروں کو بھی وعظ و نصیحت چھوڑ دو۔ اور ان دونوں امروں میں فرق ظاہر ہے۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی مدرسہ جامع العلوم میں ایک طالب علم نے کسی دوسرے طالب علم کی کتاب کی چوری کی۔ ایک شخص کہنے لگے کہ دیکھو طالب علم بھی چوری کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہرگز طالب علم چوری نہیں کرتے وہ کہنے لگے کہ آپ انکار کرتے ہیں صریح چوری ظاہر ہوئی۔ میں نے کہا کہ طالب علم چوری نہیں کرتے۔ بلکہ بعضے چور طالب علمی کرتے ہیں جو طالب علم ہوگا وہ علم کا طالب ہوگا وہ چوری کیوں کرتا۔ حقیقت میں ذرا سا فرق ہے کہ اس کے پیش نظر ہونے سے اشتباہ ہو جاتا ہے۔ جیسے زار روس سنا ہے کہ بائیسکل سے گر کر مر گیا تھا تو ڈاکٹروں میں اختلاف ہوا کہ گر کر مرا ہے۔ یا مر کر گرا ہے۔

دعوائے قرآن فہمی

اسی طرح اَتَأمُرُونَ النَّاسَ الخ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی حالانکہ اس میں ملامت اس پر ہے کہ باوجود دوسروں کے۔ کہنے کے خود کیوں عمل نہیں کرتے۔ اس پر ملامت نہیں کہ باوجود عمل نہ کرنے کے دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ کلام اللہ کو کسی اُستاد ماہر سے حاصل کرو۔ لیکن چونکہ اُردو کے ترجمے بکثرت ہو گئے اس لئے ہر شخص قرآن و حدیث کے سمجھنے کا مدعی ہو گیا ہے۔ حالانکہ بغیر مہارت تامہ علوم درسیہ کے قرآن و حدیث سمجھ میں نہیں آتا۔ دیکھئے اُردو کے اشعار جیسے ہم لوگ سمجھ سکتے ہیں غیر زبان والے نہیں سمجھ سکتے جیسے کسی نے سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر سُن لیا تھا ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دست
در پریشان حالی و درماندگی

ایک روز کہیں ان کا کوئی دوست پٹ رہا تھا۔ اور پیٹ بھی رہا تھا۔ انہوں نے

جا کر فوراً اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ تو وہ اور زیادہ پیٹا گیا۔ جب لوگوں نے ملامت کی کہ تو نے یہ کیا کیا کہا میں نے تو شیخ کے اس شعر پر عمل کیا ہے۔ دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست۔ در پریشان حالی و در ماندگی۔ اس سے زیادہ کون پریشانی کا وقت اس پر ہوگا۔ اسلیئے اس وقت میں نے اسکے دونوں ہاتھ پکڑ لیئے۔ کاش! یہ شخص ایسی فارسی دانی سے بالکل ہی جاہل رہتا تو اچھا تھا۔ اسی طرح ہمارے مہذب لیڈر جو اُردو کے ترجمہ دیکھ کر یا عربیّت میں بغیر علوم دینیہ کے ماہر ہوئے۔ قرآن فہمی کا دعوائے کرتے ہیں کاش! اس علم سے تو یہ جاہل ہی رہتے اپنی رائے کو تو قرآن و حدیث میں دخل نہ دیتے۔ یاد رکھو! اردو ترجموں سے فن نہیں آتا۔ اسی قبیل کی ایک اور آیۃ کے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے اور وہ بعض اہل علم کو بھی ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اس آیت میں حرفِ استفہام لِمَ خود تَقُوْلُوْنَ پر داخل ہے جس سے صاف یہی سمجھا جاتا ہے کہ دوسروں کو کیوں کہتے ہو وہ بات جو خود نہیں کرتے۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ میں تو یہ بھی گنجائش تھی کہ ہمزہ استفہام کو باعتبار مجموع کے تَنْسَوْنَ پر داخل مانیں۔ یہاں تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ سو اس سے تو صاف یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اگر خود عمل نہ کرے تو دوسرے کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں ہے یہ ایک بہت باریک غلطی ہے۔ لیکن شانِ نزول معلوم ہونے سے یہ اشکال حل ہو جاتا ہے۔ شانِ نزول اس کا یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے کہا تھا کہ اگر ہم کو خبر ہو جاوے کہ فلاں عمل کو اللہ تعالے پسند کرتے ہیں تو ہم اُسکے اندر جدّ و جہد کریں گے چونکہ یہ ایک صورت ہے دعوائے کی یہ ناپسند ہوئی۔ اس لیئے اُنکو تادیب کی جاتی ہے۔ کہ ایسی بات زبان سے کیوں نکالتے ہو جو کر نہ سکو۔ پس تَقُوْلُوْنَ میں قول اخباری ہے انشائی نہیں یعنی دوسرے کو نصیحت کرنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ اپنے کمالات کا دعوائے

کرنا مُراد ہے چنانچہ آگے ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے بڑے عمل کرنے والے اور ہماری پسندیدگی کے طالب ہو تو لو ہم بتاتے ہیں کہ ہم اُن لوگوں کو دوست رکھتے ہیں جو اللہ کے رستہ میں ایسا عمل شاق کرتے ہیں۔ اگر ہماری محبت ہے تو اُس پر عمل کرو ورنہ دعوٰی نہ کرو پس اِس آیت میں امر بالمعروف کا ذکر ہی نہیں کہ جو باعث شُبہ کا ہو ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ فن کے نہ جاننے سے اب انصاف فرمایئے کہ جو حضرات صرف ترجمے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور ترجمہ بھی کون سا جو امیر ترجمہ ہو۔ غریب ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

مجھے ایک بچے کا لطیفہ یاد آیا کہ وہ کہتا تھا کہ ہم اُردو کھانے کھائیں گے۔ انگریزی کھانے ہم نہیں کھاتے۔ اسی طرح ترجمہ کی دو قسمیں ہیں۔ امیر ترجمہ اور غریب ترجمہ۔ امیر ترجمہ جو امیروں کا کیا ہوا بلکہ ڈپٹیوں کا ہے۔ اور غریب ترجمہ وہی جو غریب مولویوں کا ترجمہ ہو۔ آجکل لوگ ایسے ترجمہ پر فریفتہ ہیں یہ کہتے ہیں۔ اِس ترجمہ کی زبان اچھی ہے یاد رکھو زباں دانی سے علم نہیں آتا۔ اگر زبان دانی ہی کا نام علم ہوتا تو ابوجہل اور ابولہب بڑے عالم تھے علم اور شے ہے اور زبان شے دیگر ہے ہر شے کو اُس کے محل سے حاصل کرنا چاہیئے غیر محل سے کوئی شے حاصل نہیں ہوا کرتی۔ دیکھو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا۔

ہر گھر کا دروازہ ہے اُسی طرف سے اُس میں داخل ہونا چاہیئے۔ علم کا دروازہ علماء محققین ہیں اُن سے علم سیکھو یا اُن کی صحبت میں رہو۔ غرض یہ سخت غلطی ہے کہ خود بھی عمل نہ کریں اور دوسرے کو بھی نہ بتادیں۔

چھوٹے عمل کا اہتمام

ایک غلطی اور ہے وہ اہل غفلت سے ہوتی ہے وہ یہ ہے

کہ بعض خیر کو حقیر سمجھ کر اُس کو کرتے نہیں۔ اور بعضے شر کو حقیر جان کر اُس سے بچتے نہیں بعضے بات خیر کی ہوتی ہے شیطان بہکاتا ہے کہ جو کام بڑے بڑے کرنے کے ہیں وہ تو تم سے کئے نہیں جاتے اسکو کیا کرتے ہو۔ اسی طرح کبھی بعض گناہ کی نسبت کہتا ہے کہ جو بڑے بڑے گناہ ہیں وہ تو چھوٹتے ہی نہیں اسی کو چھوڑ کر کیا متقی ہو گے۔

یاد رکھو! کسی خیر کی بات کو ہرگز حقیر نہ جانو۔ بلکہ جب توفیق ہو جاوے فوراً اُس پر عمل کرو اور نہ کسی شر کو کم سمجھ کر اُس کا ارتکاب کرو۔ بلکہ اُس سے بچو۔ حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ! کسی خیر کو حقیر نہ جانو خدا کے یہاں اسکی جزا ہے۔ اور نہ کسی شر کو حقیر سمجھو خدا کے یہاں اُس کی سزا مقرر ہے ــــ بعضے لوگوں کی ایسی خیر پر نجات ہو گئی کہ گمان بھی نہ تھا

حدیث میں قصہ آیا ہے کہ ایک عورت مومسہ یعنی فاحشہ جنگل میں جا رہی تھی دیکھا کہ ایک کُتا پیاسا مر رہا ہے اسکو رحم آیا کنوئیں پر اُس کے پانی پلانے کے لیے گئی تو وہاں ڈول رسّی نہ تھا۔ اُسنے اپنا چرمی موزہ اُتارا اور اوڑھنی میں باندھ کر پانی نکال کر اُس کُتے کو پلایا اور اُس میں جان آ ئی تمام عمر میں اُسنے یہ عمل نیک کیا حق تعالیٰ نے اُسکو فقط اسی کی وجہ سے بخش دیا ــــــــ بعضوں کی نجات راستہ سے کانٹا ہٹا دینے کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے الایمان بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَۃً اَفْضَلُھَا قَوْلُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَدْنَاھَا اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ یعنی ایمان کی کچھ اوپر ستّر شاخیں ہیں اُن میں سے سب سے افضل تو لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ رستہ سے تکلیف کی شے ہٹا دینا ہے۔

امورِ معاشرت میں غفلت

آجکل لوگ معاشرت کے باب میں بہت غفلت کرتے ہیں۔ بعضے بات بہت چھوٹی سی ہوتی ہے لیکن نتیجہ اُس کا بہت بُرا ہوتا ہے۔ دوسروں کو بڑی تکلیف پہنچتی ہے

بعضے لوگ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں لیکن معاشرت کے بعض جزئیات کا اُن کو خیال نہیں - حالانکہ تمدن کے مُدعی ہیں اور معاشرت کے تمام آداب کا تعلق تمدن سے ہے مثلاً ایک معمولی بات ہے کہ کرسی کہیں سے اُٹھا کر دوسری جگہ جہاں راستہ ہے بچھائیں گے اور وہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے - اب کوئی اندھا اپاہج آیا وہ گر پڑتا ہے - بعضے چارپائی ایسے موقع پر چھوڑ دیتے ہیں کہ آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے - اس لیے کہ کرسی تو پھر تھوڑی جگہ میں آتی ہے اور چارپائی تو چارپایہ کی طرح پھیلتی ہے - غرض! ان لوگوں نے تو دوسروں کی تکلیف کا پورا پورا سامان کر دیا - اور یوں کوئی اپنی خوش قسمتی سے بچ جائے وہ دوسری بات ہے اس وقت اس کے حق میں یہ شعر صادق آویگا ؎

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود　　　ورنہ ہیچ از دل بیرحم تو تقصیر نبود

بعض دیہات میں ایسی چارپائیاں ہوتی ہیں کہ واقعی انکو چارپایہ ہی کہنا چاہیئے اُن میں اُلجھ کر اور زیادہ چوٹ لگتی ہے - خاصکر عورتیں ایسے میں بہت لاپرواہی کرتی ہیں اُن میں یہ مرض ہے کہ شئے کو اپنے ٹھکانے نہیں رکھتیں پیڑھی بے موقع چھوڑ دیتی ہیں جیسے چارپائی میں اُلجھ کر گرتے ہیں اسی طرح اس سے بھی تکلیف ہوتی ہے - اس لئے کہ یہ اُس کا بچہ ہے -

اس پر ایک حکایت ظرافت کی یاد آئی ایک شخص کی بھینس دریا میں گھس گئی ہر چند بُلاتے ہیں آتی نہیں - ایک شخص اس کے بچہ کو لایا اور اسکو دکھلایا وہ آگئی تھی - ایک مرتبہ چارپائی گر گئی تھی عقلمند سمجھے کہ جس طرح بھینس کو بچہ دکھلانے سے وہ آگئی تھی اسی طرح اس کا بچہ اسکو دکھائیں گے تو یہ بھی آجائے گی اُسکا بچہ پیڑھے کو تجویز کیا اب پیڑھا...

اس کو دکھلا رہے ہیں اور پکار رہے ہیں لیکن وہ تو جمادِ محض ہے وہ کیسے آتی -

تو چارپائی تو نظر بھی آجاتی ہے اُس سے تو آدمی بچ بھی جاتا ہے لیکن پیڑھا رات کو اندھیرے میں نظر بھی نہیں آتا اسکے علاوہ ہمارے یہاں کی عورتیں اور بھی بہت بدتمیزیاں کرتی ہیں - ہمارے بعضے احباب دیہاتی آتے ہیں - اور وہ ویسے ہاتی لکڑی اسی طرح

رکھ دیتے ہیں کہ ایک سرا زمین پر دوسرا سرا مسجد کی فصیل سے لگا دیتے ہیں اُن کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ چیز کو کس طرح رکھنا چاہیئے اُس میں بعض اُلجھ کر گر جاتے ہیں میری نوکری یہ بھی ہے کہ میں اسکو اُٹھا کر موقع پر رکھتا ہوں لوگ ان اُمور کو بہت خفیف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ امور بہت ضروری ہیں ؎

مباش درپے آزار ہرچہ خواہی کن   کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہی نیست

جب میں نے دیکھا کہ لوگ اس کو بہت ہلکا سمجھتے ہیں تو مجھ کو اس باب میں ایک رسالہ تصنیف کرنا پڑا۔ حالانکہ یہ اُمور ایسے نہیں تھے کہ اُن کے آگاہ کرنے کے لئے کسی کتاب کی ضرورت ہو۔ خود آدمی اپنی عقل سے سمجھ سکتا ہے لیکن جب غفلت حد سے بڑھ گئی اور اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ان امور کا خیال نہیں رہا تو اسکے متعلق بھی ایک رسالہ لکھا "آداب المعاشرت" اس کا نام ہے طبع بھی ہو گئی ہے مجھ کو ایسے ایسے جزئیات کا بہت اہتمام ہے اس لئے کہ بزرگوں کے یہاں تو بڑی بڑی باتوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور میں چونکہ چھوٹا اور سب سے ادنیٰ ہوں اسلئے میرے یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم ہوتی ہے۔

اسلامی تمدن کی جامعیت

اسی واسطے بعض احباب مجھ کو بدنام بھی کرتے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر مواخذہ کرتے ہو۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ تمہارے اندر انگریزوں کا سا انتظام ہے۔ حالانکہ یہ اُن کی یہ غلطی ہے اس لئے کہ متمدن قوموں کے یہاں جو تمدن کا کچھ حصہ ہے وہ ہمارے اسلام ہی سے لیا گیا ہے۔ اُن کا ایجاد نہیں ہے جو اعتراض ہو سکے۔

دیکھئے! استیذان کا مسئلہ ہے اُن لوگوں نے اس کو ہمارے یہاں سے لیا ہے کہ کوئی شخص اُن کے کمرہ میں بلا اجازت نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی بڑے مرتبہ کا شخص بھی چھوٹے سے چھوٹے کے یہاں جائیگا تو اوّل اجازت لیگا اور پھر بات کی صفائی اس

قدر ہے کہ اگر ملنے کی فرصت نہ ہو اور کہلا دیا جاوے کہ اس وقت ہم کو فرصت نہیں ہے تو بُرا نہیں مانتے ہم لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور اگر کوئی اس طور سے جواب دیدے کہ اس وقت ہم فارغ نہیں ہیں تو بُرا مانتے ہیں اُس کو متکبر بتاتے ہیں حالانکہ یہ مسئلہ خود قرآن مجید میں موجود ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْھَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْھَا حَتّٰی یُؤْذَنَ لَکُمْ وَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا ھُوَ اَزْکٰی لَکُمْ۔" یعنے اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں مت جاؤ یہاں تک کہ تم اجازت چاہو اور اُن گھر والوں پر سلام کرو۔ یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اس امید سے کہ تم نصیحت حاصل کرو۔ پس اگر اُن گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو اُن میں داخل مت ہو یہاں تک کہ تم کو اجازت دی جاوے اور اگر تم سے کہا جاوے کہ تم واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہ زیادہ پاکی کی بات ہے تمہارے لیئے"

ایک مولوی صاحب سے میری گفتگو ہوئی کہنے لگے کہ بُیُوْتًا سے مُراد آیت میں زنانے گھر مُراد ہیں اور اس پر مسلمانوں کا عمل ہے۔ میں نے کہا کہ بُیُوْتًا مطلق ہے اس میں کوئی تخصیص نہیں تم اپنی رائے سے کیسے تخصیص کرتے ہو۔ زنانہ اور مردانہ دونوں مکان مُراد ہیں۔ ہاں اگر مردانہ مکان اس قسم کا ہو کہ وہاں سب آتے ہیں اور قرائن سے معلوم ہے کہ کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں تو وہاں استیذان کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور اگر کوئی کمرہ میں تنہا بیٹھا ہوا اپنے کام میں مشغول ہے تو وہاں استیذان ضروری ہے پس یہ تاویل کہ زنانے گھر مُراد ہیں درست نہیں ہے۔ مولانا ایسی ہی تاویلوں کی نسبت فرماتے ہیں سے

برہوا تاویل قرآں میکنی　　　پست و کژ شد از تو معنی سنی

اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں وہ احکام بتلائے گئے ہیں کہ بغیر بتلائے لوگ اُن میں غلطی کرتے ہیں اور جو احکام ایسے ہیں کہ بے بتلائے بھی اُن پر لوگوں کا عمل ہے

ایسے احکام کو بتلانے کی کیا ضرورت ہے خود ہی اُن پر عمل ہے۔ دیکھو قرآن میں کہیں پیشاب پینے اور پائخانہ کھانے کی ممانعت نہیں ہے اسلئے کہ ہر عاقل کو اُس سے نفرت ہے اور خود رُکا ہوا ہے۔ ہاں شراب پینے کی ممانعت ہے اسلئے کہ اس میں ابتلاء ہے تو زنانے گھروں میں جانے سے لوگ خود ہی رُکے ہوئے ہیں پھر جو روکا گیا۔ اور استیذان کی شرط لگائی گئی تو مردانے ہی گھر مُراد ہوں گے۔ ہاں اگر کوئی عام ملاقات کے لیئے مردانہ میں بیٹھے وہاں ضرورتِ استیذان کی نہ ہوگی اور اگر ایک شخص نے کمرہ بند کر رکھا ہے کواڑ بند ہیں اُس کا مقصود ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ کوئی نہ آوے۔ اب اگر کوئی شخص آکر اُس کا وقت برباد کرنے لگے تو اُسکو بے شک کلفت ہوگی اور جس کام کے لیے اس نے خلوت اختیار کی تھی یقیناً اُس میں حرج ہوگا ایسے موقع پر استیذان کی ضرورت ہے اگر اجازت ہو جاوے تو ملے ورنہ واپس چلا جائے اور بُرا نہ مانے۔

غرض! آجکل اس سے کچھ بحث نہیں ہے کہ کسی کو راحت ہوگی یا کلفت جو اپنی خواہش ہوتی ہے اُسکو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ آداب المعاشرت میں میں نے حتی الوسع بہت جزئیات کو لے لیا ہے۔ دیکھنے کے قابل اور پاس رکھنے کے لائق ہے ایک نئی بات اُس میں یہ ہے کہ میں نے حُسنِ معاشرت کی ضرورت کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ معاشرت میں ہم کو غیر قوموں کی اقتدار کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے یہاں کس چیز کی کمی ہے کہ جو ہم کو غیر قوموں کی اقتدار کی ضرورت ہو۔ عقائد اعمال، معاملات معاشرت سب کچھ ہمارے گھر موجود ہے۔ بلکہ اور قومیں ہی ہماری بدولت مہذب کہلانے لگی ہیں لیکن چونکہ ہم کو اپنے گھر کی خبر نہیں اسلئے شریعت کو صرف چند چیزوں میں منحصر سمجھ لیا ہے جنت و دوزخ کا عقیدہ اور نماز روزہ کا عمل۔ حالانکہ شریعت نے ہم کو ہر شئے کی تعلیم کی ہے۔ شریعت وہ جمیل و محبوب ہے کہ اگر اس کا سراپا تم دیکھ لو تو بے اختیار یہ کہہ اٹھو سے

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم   کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

خلاصہ یہ ہے کہ اماطۃ الاذی عن الطریق وہ عمل ہے کہ اس پر بھی مغفرت ہوگی۔ اس لئے کسی نیکی اور خیر کو حقیر نہ جاننا چاہیئے۔

چھوٹے عمل کا بڑا اجر

حدیث شریف میں ایک اور قصہ آیا ہے کہ ایک شخص تھا جب اُس کا انتقال ہوا تو حکم ہوا دیکھو کوئی نیکی اسکے پاس ہے دیکھا گیا تو کوئی نیکی نہ نکلی بجز اس کے کہ اُس کی عادت یہ تھی کہ لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ اور اپنے لوگوں سے اُسنے یہ کہدیا تھا کہ وصول کرنے میں تشدد نہ کیا کرو۔ اگر کسی کے پاس نہ ہو کرے تو مہلت دیدیا کرو یا معاف کردیا کرو اور روپیہ والے کو یہ کچھ مشکل نہیں ہے حکم ہوا کہ ہمارا بندہ محتاج ہوکر جب اپنے حقوق چھوڑ دیا کرتا تھا تو ہم غنی ہوکر کیوں نہ اُسکو اپنے حقوق معاف کردیں۔

اسی طرح بعضوں کے ذمہ جو حقوق العباد رہ جاتے ہیں بعض اوقات اُن کے کسی مقبول عمل کی وجہ سے اللہ تعالےٰ قیامت میں اہلِ حقوق سے اُن کے یہ حقوق بھی معاف کرا دیںگے صورت یہ ہوگی کہ قیامت کے دن اُن اہلِ حقوق کو بڑے بڑے محل دکھلائے جاویں گے اور منادی کی جاویگی کہ کوئی ہے جو ان محلوں کو خریدے وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس ان کی قیمت کہاں۔ ارشاد ہوگا کہ ان کی قیمت بہت ہلکی ہے اور وہ تمہارے پاس موجود ہے ان کی قیمت یہ ہے کہ کسی نے کسی کو ستایا ہو یا کچھ حقوق دوسرے بھائی مسلمان کے ہوں وہ معاف کردیں۔ ہزاروں آدمی اپنے حقوق چھوڑ دیں گے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اپنے رسالہ حقیقۃ الاسلام میں یہ روایت نقل کی ہے۔ دیکھا آپنے کہ جن اعمال کو آپ چھوٹا سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں اُن کی کیسی قدر ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کو کسی نے بعد وفات کے خواب میں دیکھا پوچھا کہ آپکے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا کہ جب میں پیش کیا گیا تو پوچھا گیا کہ اے بایزید کیا لائے میں نے سوچا کہ نماز روزہ وغیرہ سب اعمال تو اس قابل نہیں کہ پیش کروں البتہ ایمان تو لفضلہ تعالیٰ لایا

ہے اس لئے عرض کیا کہ تو حید ارشاد ہوا اَمَا تذکر لیلۃ اللبن یعنی دودھ والی رات یاد نہیں ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے ایک شب پیٹ میں درد ہوگیا تو اُن کی زبان سے نکل گیا کہ دودھ پیا تھا اُس سے درد ہوگیا۔ اس پر شکایت ہوئی کہ درد کو دودھ کی طرف منسوب کیا۔ اور فاعل حقیقی کو بھول گئے حالانکہ ؎

از یار ست در ساں نیز ہم

چھوٹے عمل پر بڑے علم کا انعام

پھر ارشاد ہوا کہ اب بتلاؤ کیا لائے عرض کیا کہ اے اللہ کچھ نہیں فرمایا کہ ایک عمل تمہارا ہم کو پسند آیا ہے اُس کی وجہ سے بخشتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک بلی کا بچہ سردی میں مر رہا تھا تم نے اسکو لے کر اپنے پاس لٹا لیا۔ رہ گئی ساری بزرگی اور تمام حقائق اور دقائق و معارف سب کالعدم ہوگئے۔ آدمی کس شے پر ناز کرے اور کس عمل کو حقیر سمجھے —— یاد رکھو! بڑے سے بڑے عمل پر ناز نہ کرو اور چھوٹے سے چھوٹے عمل کو حقیر نہ سمجھو۔ حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کی حکایت یاد آئی کہ ایک مرتبہ انکو بادشاہ نے بلایا نہا دھو کر عمدہ کپڑے بدل کر شاہی دربار میں چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں دیکھا ایک نالی ہے اُس میں ایک کتے کا بچہ پھنس رہا ہے اور اُس سے نکلا نہیں جاتا۔ ایک خادم بھی ساتھ تھا حکم دیا کہ اِسکو نکال لو۔ اے حضرات! ہمدردی یہ ہے جو ان حضرات میں تھی اور جسکو لوگ آج کل ہمدردی کہتے ہیں وہ ہمدردی نہیں ہے وہ ہمہ دردی ہے فقراء اور مساکین اور صلحاء کو حقیر سمجھنے کا نام ہمدردی رکھا ہے۔ یاں بڑے بڑے لوگوں اور بڑے بڑے عہدہ داروں کے ساتھ البتہ ہمدردی ہے اسکو ہمدردی نہیں کہتے یہ تو جاہ پرستی ہے۔ ہمدردی وہ ہے کہ جو غرباء کے ساتھ ہو۔

منشی جمال الدین مدار المہام بھوپال کی ایک حکایت ایک دوست سے سنی ہے کہ اُن کے یہاں ایک تقریب میں بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ عین کھانا رکھنے کے وقت ایک

بھنگی آیا- اور اُس نے کہا کہ مجھ کو مُسلمان کر لو - مدار المہام صاحب نے فوراً سب کام چھوڑ کر اُسکو کلمہ پڑھایا- کپڑے بدلوائے اور حُکم دیا کہ اسکو بھی کھانے پر بٹھلاؤ وہ بے چارے پُرانے خیال کے سیدھے سادھے دیندار تھے اپنے اوپر سب کو قیاس کیا کہ میری طرح دوسرے لوگ بھی اسکے ساتھ معاملہ کریں گے لیکن دیکھا کہ لوگ اسکے ناک منہ چڑھانے لگے اور کوئی اُس نومُسلم کو اپنے پاس جگہ نہیں دیتا فرمایا کہ تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ ایسے شخص کے ساتھ کھانا کھاؤ کہ جو بالکل بے گناہ اور ایسا پاک صاف ہے کہ جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہُوا ہو- یہ برکت میں حاصل کروں گا- اور میں اسکے ساتھ کھانا کھاؤں گا- چنانچہ اُسکو اپنے ساتھ کھانا کھلایا- اس کا نام ہے ہمدردی اور اسکو کہتے ہیں اُخوّتِ اسلامی ـــــ آج کل ہمارے مہذبین کے مذہب میں غریب ہونا ہی جُرم ہے اور اس پر دعوےٰ ہے تہذیب کا- دعویٰ ہے ترقی اور ہمدردی کا- جناب ترقی اور ہمدردی - اور تہذیب کے نرے الفاظ ہی ہیں مدلولات کا- ان کے پتہ بھی نہیں ایسی مثال ہے جیسے کوئی مٹھائیوں کے نام لڈو، پیڑے یاد کرلے اور مٹھائی کھانے کا دعوےٰ کرے ـــــ اور ایک وہ شخص ہے جو سر سے پاؤں تک مٹھائی میں غرق ہے اُس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ مٹھائی کے نام کا وظیفہ پڑھے وہ تو خود سراپا مٹھائی بن رہا ہے- یہ کون لوگ ہیں- یہ وہ ہیں جن کو دقیانوسی خیال کا غیر مہذب بتلایا جاتا ہے باقی جدید الخیال حضرات کی تو یہ حالت ہے کہ بولیں گے بہت اور کام بہت کم کرینگے اور پرانے خیال کے حضرات کام میں ان سے کہیں زیادہ لیکن بولنا جانتے نہیں اسلئے کہ بولے گا وہی شخص جو اپنے عمل کو کچھ وقیع سمجھتا ہو یہ سب کچھ کرتے ہیں اور اسکو کچھ نہیں سمجھتے اور یہ کرتے کچھ نہیں اور دعوے اتنے بڑے بڑے کریں گے کہ زمین اور آسمان کے قُلابے ملا دیں گے - غرض ! شاہ صاحب نے حکم دیا کہ اسی حقے کے بچہ کو اُٹھا لو وہ خادم تھے ذرا چکنے چُپڑے حضرت شاہ صاحب کو فراستِ خداداد

اور قرائن سے معلوم ہُوا کہ اسکو کچھ ناگوار ہے۔ تو ان حضرات کا یہ مذاق ہے کہ اپنے کام کے لئے دوسرے کو ذرا سی تکلیف نہیں دیتے۔ فوراً آستین چڑھا کر اُس کو خود ہاتھ سے نکال لیا۔ اور حمّامی کے پاس پہنچے کہ اس کو غسل دو تم کو اس کی اُجرت ملے گی چنانچہ گرم پانی سے اُسکو غسل دیا گیا۔ وہ جاڑے کی وجہ سے ٹھٹھر رہا تھا۔ گرم پانی کے پڑنے سے اُس میں جان آ ئی۔ تولیے سے اُس کو پھر صاف کیا۔ ایسی ہی حکایت حضرت سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک کُتّا خارشتی جا رہا ہے اور خارش کی وجہ سے اسکو سخت تکلیف ہے فوراً اسکو لے کر ایک طبیب کے پاس پہنچے اور نسخہ لکھوا کر دونوں وقت اپنے ہاتھ سے اسکو دوا لگاتے تھے حتیٰ کہ وہ تندرست ہو گیا لیکن ہوئی ذہین آدمی اس سے کتّا پالنے کی اجازت کا استنباط نہ کرے۔ غرض شاہ صاحب نے جب دیکھا کہ اب یہ اچھا ہو گیا ہے اور سوکھ کر چلنے پھرنے لگا تو محلہ والوں سے فرمایا اگر کوئی اس کے کھلانے پلانے کی ذمہ داری کرے تو فبہا ورنہ ہم اسکو اپنے ساتھ لے جائیں۔ ایک شخص ذمہ دار ہو گیا۔ یہ قصّہ تو گذر چکا ــــــ اس کے بعد ایک مرتبہ شاہ صاحب ایک موقع پر تشریف لیے جا رہے تھے اور راستہ بہت چھوٹا تھا۔ صرف ایک پگڈنڈی تھی کہ جس پر بہ مشکل ایک آدمی چل سکتا تھا۔ اور اُس کے اِدھر اُدھر کیچڑ تھا۔ سامنے سے دیکھا کہ ایک کُتّا آ رہا ہے جب چلتے چلتے کُتّا کا آمنا سامنا ہُوا تو یہ منتظر کہ کُتّا نیچے اُترے تو میں آگے چلوں اور کُتّا منتظر کہ یہ نیچے اُتریں تو میں چلوں۔ جب اسی انتظار میں دیر ہو گئی تو شاہ صاحب نے کُتّے سے کہا کہ تو نیچے اُتر۔ کُتّے نے کہا افسوس! درویشی کا دعویٰ اور یہ حالت۔ پہلے درویشوں کا مذہب ایثار کا ہوتا تھا۔ اب ایسے درویش ہیں کہ اختیار کا مذہب رکھتے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تہمت نہ لگا یہ وجہ نہیں جو تو کہتا ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ میں مکلّف ہُوں۔ تو مکلّف نہیں ہے۔ میں اگر اُترا تو کپڑے سب نجس ہو جاویں گے بے دھوئے نماز کیسے

بڑھوں گا۔ اور دھونے میں بے حد کلفت ہوگی اور تو اگر اُترا تو سُوکھ کر پھر صاف ہوجائے گا۔ کُتّے نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے لیکن تمہارے اُترنے میں تو صرف ظاہری ہی نجاست میں آلودگی ہوگی جو ایک لوٹا پانی سے دُھل سکتی ہے اور اگر میں اُتر گیا تو تم کو یہ خیال ضرور پیدا ہوگا کہ میں اس کُتے سے افضل اور اشرف ہوں اور یہ گندگی وہ ہے جو ہفت قلزم سے بھی نہ جاویگی۔ اب اختیار ہے جس نجاست کو چاہو اختیار کر لو۔ شاہ صاحب پر ایک حالت طاری ہوئی۔ اور فوراً اتر پڑے اور کُتا نکل گیا۔ اسکے بعد الہام ہُوا کہ اے عبدالرحیم! کہ جو علم تم کو آج دیا گیا ہے یہ کبھی مُیسّر نہیں ہُوا تھا۔ خبر ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ تُم نے اس کُتے کی بنی نوع پر ایک مرتبہ احسان کیا تھا۔ ہم نے نہ چاہا کہ تمہارا احسان اُس پر رہے اس لیے ہم نے اُس کے ایک بھائی سے تم کو اس کا بدلہ دلوادیا۔ یہ معلوم ہُوکر اور زیادہ ان پر رقت طاری ہوئی۔ بہرحال حضرات اہل اللہ ذراسی نیکی سے بھی نہیں چُوکتے۔

شرِ قلیل سے اجتناب

غرض! کسی خیر کو حقیر نہ جانو۔ اسی غلطی کے مقابلہ میں دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ شر کو حقیر جان کر اُس سے اجتناب نہیں کرتے۔ چنانچہ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ فلاں گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے۔ بعضے خطوط میرے پاس اسی مضمون کے آیا کرتے ہیں۔ اِن سے کوئی پوچھے کہ اگر صغیرہ ہوگا تو کیا اُسکے کرنے کا ارادہ ہے البتہ صغیرہ پر جُرأت کرنا اُس شخص کو زیبا ہے جو اس کی نظیر پر عمل کر کے دکھلا دے وہ یہ ہے کہ چھوٹی سی چنگاری اس شخص کے چھپّر پر رکھ دی جاوے اگر کہا جاوے کہ وہ بڑھ جاویگی اور تمام چھپّر کو پھونک دیگی تو یہی ہم یہاں بھی کہیں گے کہ جیسے وہ چھوٹی سی چنگاری پھُونکنے کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح یہ چھوٹا گناہ بھی بڑھ کر قصرِ ایمان کے پھُونکنے کے لیے کافی ہے۔ اس لئے کہ تھوڑا سا گناہ کثیر کی طرف مُفضی ہوجاتا ہے جیسے تماکو جب

اوّل کھاتے ہیں تو بہت تھوڑا کھاتے ہیں رفتہ رفتہ وہ بڑھ جاتا ہے پھر چھوٹتا نہیں ہمارے یہاں ایک مہمان آئے تھے چاء اِسقدر پیتے تھے کہ اُس کی اُبلی ہوئی پتّی بھی پی جاتے تھے پس گناہ اگرچہ قلیل ہو مگر وہ کثیر کی طرف مُفضی ہو جاتا ہے۔ اِسی بناء پر حدیث شریف میں آیا ہے لعن اللّٰہ السارق یسرق البیضۃ فتقطع یدہ ویسرق الحبل فتقطع یدہ۔ یعنی اللہ چور پر لعنت کرے بیضہ چراتا ہے تو اُس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور رسّی چراتا ہے تو اُس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ اس حدیث کی شُرّاح حدیث نے مختلف توجیہیں کی ہیں۔ اس لیے کہ حبل اور بیضہ کے سرقہ میں کسی کے نزدیک قطع نہیں ہے اسلئے کہ ان چیزوں کی قیمت نصاب سرقہ کی برابر نہیں ہے۔ چنانچہ بعض نے کہا کہ بیضہ کے معنی متبادر نہیں ہیں بلکہ دوسرے معنی یعنے خود مراد ہے اور حبل سے کشتی کا لنگر مراد ہے کہ اُس کی قیمت قدر نصاب قطع کو پہنچ جاتی ہے۔ بعض نے اور توجیہات کی ہیں۔

ہمارے مولانا استاذ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اِس حدیث کے معنی نہایت لطیف بیان فرمائے کہ اُس میں کسی تکلّف کی ضرورت نہیں ہے وہ یہ ہیں کہ قلیل کثیر کی طرف مُفضی ہو جاتا ہے اوّل بیضہ اور رسّی چرایا تھا۔ پھر حوصلہ ہُوا کہ بڑی چیز چُرانے لگا حتیٰ کہ ہاتھ بھی کٹ گیا تو مطلب یہ ہُوا کہ چور کی بھی کیا بُری اوقات ہے کہ اُس نے اوّل بیضہ چرایا تھا جس پر قطع کا شبہ بھی نہ تھا مگر اُسکی بدولت آج یہ نوبت آئی۔

حاصل یہ ہے کہ چھوٹا گناہ بڑھ کر بڑا ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے بزرگوں نے فرمایا ہے أنتم تخافون المعاصی ونحن نخاف الکفر۔ یعنی کہ تم لوگ تو معاصی سے ڈرتے ہو۔ اور ہم کفر سے ڈرتے ہیں۔ اسلئے کہ گناہ کی سرحد کُفر کے ساتھ ملی ہوئی ہے رفتہ رفتہ کُفر کی نوبت آجاتی ہے۔ چنانچہ آدمی اوّل جب گناہ کرتا ہے تو دل پر ظلمت ہوتی ہے پھر کرتا ہے تو اور زیادہ ظلمت ہوتی ہے پھر بتدریج اس قدر ظلمت بڑھتی ہے کہ روکنے والے کے ساتھ معاداۃ اور مضادۃ ہو جاتی ہے پھر اُس گناہ کی بُرائی بالکل دل سے نکل جاتی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ شر اگرچہ قلیل ہو اُس سے بچے اور خیر بھی۔ اگرچہ قلیل ہو اُسکو حقیر نہ سمجھے۔

اہلِ باطن کی غلطی

ایک غلطی نئی قسم کی اہلِ باطن کو اُلٹی ہوتی ہے اُلٹی مَیں نے اس لیے کہا کہ اہلِ ظاہر کی غلطی کا عکس ہے اسلئے کہ اُنکی غلطی تو یہ ہے کہ اُنکی نظر دوسرُں کے عیوب پر رہتی ہے یہاں اس کا برعکس ہے کہ اپنے واسطے تو کسی خیر پہ نظر نہیں اپنے کو سراپا عیوب سمجھتے ہیں اور دوسرُں کو سراپا خیر جانتے ہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ تو بہت اچھی صفت ہے لیکن ابھی معلوم ہوگا کہ اس میں بھی ایک سخت غلطی ہے اس مقام پر صفات حسنہ اور قبیحہ ہمرنگ ہیں سے

بحرِ شیریں بحرِ تلخ وہمعناں درمیاں شاں برزخٌ لَّا یَبْغِیَانِ

یہاں گنگا اور جمنا دونوں مل کر چلتی ہیں یہ طریق باطن ایسا نازک راستہ ہے کہ اس میں طاعت اور معصیت دونوں دوش بدوش چلتی ہیں یہاں بڑے رہبر کامل کی ضرورت ہے جو حق و باطل میں تفریق کردے۔

اسی مقام میں دیکھئے کہ اول تواضع پیدا ہوتی ہے وہ بڑھتے بڑھتے حدِ کُفران سے جا ملتی ہے۔ اگر مرشد کامل نہ بتلادے تو وہ تواضع کُفران میں یقیناً داخل ہوجاوے اسلئے کہ جب ہر وقت اپنے عیوب پر ہی نظر ہوگی تو رفتہ رفتہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار پیدا ہوجاویگا تواضع ایک حد تک تواضع ہے اس سے آگے تجاوز ہوگا تو کُفران ہوجاویگا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اعمال خیر کے اندر دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ اعمال ہماری طرف منسوب ہیں اس حیثیت سے انکو کمال نہ سمجھنا چاہیے۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا عطیہ ہیں اس حیثیت سے انکو نعمتِ الٰہیہ جان کر شکر کرنا چاہیے سالک کو اس مقام پر یہ غلطی ہوتی ہے کہ یا تو عُجب کے اندر اسقدر بڑھتا ہے کہ اعمال کو اپنا کمال سمجھتا ہے یہ کبر اور عُجب ہے یہ بھی مذموم ہے اور یا تواضع کے اندر اسقدر بڑھتا ہے کہ ہر پہلو سے اعمال

کو اپنا کمال سمجھتا ہے یہ کبر اور عُجب ہے یہ بھی مذموم ہے اور یا تواضع کے اندر اس قدر بڑھتا ہے کہ ہر پہلو سے اعمال کو حقیر سمجھتا ہے یہ ناشکری کا درجہ ہے۔ بہت لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں جب انکو کچھ سرسراہٹ معلوم نہیں ہوتا تو شیخ سے جاکر ناشکری کی باتیں کرتے ہیں کہ حضرت میں تو بالکل کورا ہوں یہ غضب کی چیز ہے یہ اسکو تواضع سمجھتا ہے حالانکہ ناشکری ہی کیا یہ تھوڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کی توفیق عطا فرمائی۔ بعض کہتے ہیں کہ ہماری کیا نماز ہے یہ شیطان کا ہتھکنڈہ ہے کہ اسکو تعطل سکھلاتا ہے اس لیے کہ جب یہ دیکھے گا کہ اس ذکر و شغل اور نماز کا کچھ اثر تو ہے نہیں رفتہ رفتہ چھوڑ دیگا ایسی تواضع تواضع نہیں ہے بلکہ یہ کُفران اور ناشکری ہے۔

بے موقع تواضع اس تواضع پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ میں ایک مرتبہ الہ آباد سے آ رہا تھا گاڑی میں کچھ نو تعلیم یافتہ حضرات کا بھی مجمع تھا کچھ دیر تک وہ آپس میں علمی گفتگو کرتے رہے۔ میں تو سو رہا۔ پھر ایک ہندو وہاں آ گیا اور وہ کوئی مُنصف تھا۔ یہ لوگ آپس میں شعر پڑھ رہے تھے اُس بیچارے کی کم بختی آئی اُس نے ایک شعر کی نسبت یہ کہہ دیا کہ حضرت اس شعر کو ذرا پھر تو فرمائے ان لوگوں نے اسکو بنانا شروع کیا۔ ایک نے کہا کیوں مُنصف صاحب آپ شاعر بھی ہیں اُسنے کہا نہیں دوسرے صاحب نے کہا کہ اعادہ شعر کا کرانا سخن فہمی پر موقوف ہے اور سخن فہمی سخن گوئی پر تو آپ شاعر ضرور ہیں اُسنے کہا کہ میں تو شاعر نہیں کہنے لگے کہ جب یہ تو آپ کی تواضع ہے تیسرا بولا آہا آپ کا تخلص تو مسکین ہے ایک نے کہا کیا یہ شعر آپ ہی کا ہے ؎

مسکین خر گرچہ بے تمیز ست   چوں بار ہمی بُرد عزیز ست

اور مجھ سے بار بار عُذر کرتے ہیں کہ مولانا معاف فرمائے راستہ بدوں اسکے کٹتا نہیں اسکے بعد اُنہوں نے کھانا نکالا اور منصف صاحب سے کہا کہ جناب آئیے آپ بھی کچھ تو ھوٹوت کھا لیجئے ایک نے کہا ہائیں کھانے کی یہ بے ادبی۔ جواب دیا کہ بے ادبی نہیں ہے تواضع

ہے کیونکہ اپنے کھانے کو کھانا کہنا بھی تکبر ہے اسی لیے تو اضعاً ہم اسکو گوہ موت کہتے ہیں۔ پس جیسے ان لوگوں کی تواضع ہے ایسی ہی بعض تواضع کفران میں داخل ہو جاتی ہے۔ بعض کا کفران ہونا تو جلی ہے بعض کا خفی ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں جو مرید عرض کرتا کہ حضرت ذکر و شغل سے کوئی نفع معلوم نہیں ہوتا تو حضرت فرماتے کہ کیا یہ نفع نہیں ہے کہ خدا کا نام لیتے ہو۔

ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ اللہ اللہ کیا کرتا تھا ایک روز اسکو شیطان نے بہکایا کہ تو اتنے دنوں سے اللہ اللہ کرتا ہے اور ادھر سے نہ پیام ہے نہ جواب ہے اس سے کیا نفع ہے اسنے اس روز ذکر چھوڑ دیا۔ خضر علیہ السلام خواب میں آئے اور کہا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آج تو نے ہمارا ذکر نہیں کیا کہ حضرت اتنے دنوں سے ذکر کرتا ہوں ادھر سے نہ جواب ہے نہ پیام ہے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تیرا اللہ اللہ کہنا تو یہی ہمارا جواب ہے

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ۔۔۔ ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

ہمارے حضرت قبلہ پیر و مرشد علیہ الرحمۃ نے اسکی یہ شرح فرمائی ہے کہ دیکھو اگر تمہارے پاس آکر اگر کوئی تمہارا نام لینے لگے یا کوئی تمہاری مدح کرنے لگے تو اگر تم اس سے راضی ہو گئے تو اسکو منع نہ کرو گے اور دوسرے وقت بھی اسکو اپنے پاس آنیکی اجازت دو گے اور اگر ناراض ہو گئے تو فوراً نوکر کو کہو گے کہ اسکو نکال دو۔ اسی طرح سمجھو کہ خدا کے دربار میں حاضر ہونا بغیر توفیق حق اور بدوں رضا نہیں پس تم کو جو توفیق بار بار حاضری کی اور نام لینے کی دیتے ہیں یہ بین دلیل ہے اسکی کہ تم مقبول ہو اور تمہارا عمل مقبول ہے اور اگر مردود ہوتے تو دوبارہ ہرگز توفیق حاضری کی نہ ہوتی۔

جیسے حکایت مشہور ہے کہ ایک قصائی کا بچھڑا مسجد میں گھس آیا مسجد کا ملا ملامت کرنے لگا کہ کیسے لوگ ہیں کہ جانوروں کو کھول دیتے ہیں وہ مسجد میں گھس آتے ہیں تو وہ قصائی کہتا ہے کہ میاں کیوں بک بک لگائی ہے جانور بے سمجھ تھا چلا آیا کبھی ہم کو بھی دیکھا ہے یہ

کہ بغیر اُن کی توفیق کے اُن کے دربار میں حاضری نہیں ہو سکتی۔

عنایتِ حق ایک غلام اور آقا بازار میں جا رہے تھے غلام نمازی تھا نماز کا وقت آگیا۔ غلام نے کہا کہ میں مسجد میں نماز پڑھ آؤں آقا نے اجازت دی اُس نے جا کر مسجد میں نماز پڑھی۔ اور نماز کے بعد وظیفہ میں مشغول ہو گیا اور بہت دیر ہو گئی۔ آقا نے آواز دی کہ آؤ غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا۔ آقا نے کہا کون آنے نہیں دیتا۔ غلام نے کہا کہ جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا۔ فی الحقیقت جس کو چاہتے ہیں ہدایت فرماتے ہیں بغیر اُنکی عنایت کے کچھ نہیں ہوتا ہے

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق ۔۔۔ گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

پس دوبارہ جو نام اللہ کا لیا جاتا ہے یہ دلیل ہے اِسکی کہ پہلا نام لیا ہوا مقبول ہے اور یہی اس طرف سے لبیک ہے پس اب

گفت آں اللہ تو لبیک ماست

کے معنی خوب واضح ہو گئے اور اے حضرات بندہ کو تو یہ خیال بھی نہ آنا چاہیئے کہ مقبول ہُوا یا نہیں۔ بندہ کا کام تو ہر حال بندگی کا ہے۔ ہمارے حضرت اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

یابم اورا یا نیابم جُستجوئے میکنم ۔۔۔ حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

حضرت سرمد اسی شکایت کے بارہ میں حالانکہ مجذوب ہیں مگر کیا اچھا جواب ارشاد فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار مے باید کرد ۔۔۔ یک کار ازیں دو کار مے باید کرد

یا تن برضائے دوست میباید داد ۔۔۔ یا قطع نظر زیار مے باید کرد

افسوس ہے کہ اگر دنیا کا کوئی مقدمہ ہوتا ہے تو اُس میں ناکامی سے سعی سے بیٹھ نہیں رہتے۔ اگر سہارنپور میں کامیابی نہیں ہوتی تو اللہ آباد پہنچتے ہیں وہاں بھی

اگر ہار گئے تو لندن تک اپیل کرتے ہو۔ غرض چھوڑتے نہیں۔ اور خدائے تعالےٰ کی طلب میں تھوڑی سی سعی کے بعد دل توڑتے ہو۔ حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　　کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

کتنی ہی بے مزگی ہو اور کسی قدر بے لطفی ہو پریشان مت ہو برابر کام کئے جاؤ دُھن لگائے رکھو۔

طلبِ حق اور یہاں یہ تو سمجھو کہ کیا خدا کا تم پر اتنا بھی حق نہیں کہ وہ تم کو آزمائے کہ دیکھوں میرا بندہ ہے یا طالبِ لذت ہے بندہ کو چاہیئے کہ طالبِ مولیٰ ہو ؎

باغباں گر پنج روزے صحبتِ گل بایدش　　　　بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

بس خلاصہ یہ ہے کہ اپنی خیر کو اس حیثیت سے مت دیکھو کہ تمہاری طرف منسوب ہے بلکہ اس حیثیت سے نظر کرو کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ سمجھو کہ میں تو اس کے لائق بھی نہ تھا۔ اگر غور کرو تو واقعی ہم کچھ بھی نہیں جو کچھ ہے عطار ہی عطار ہے ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود　　　　لطف تو ناگفتۂ ما مے شنود

ثمرات کا طالب تو وہ ہوتا ہے جو اپنے کو اس اللہ اللہ کرنے سے زیادہ کا مستحق جانتا ہو اور جب ہم اسکے قابل بھی نہ تھے تو اس پر حق تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیئے اور مواجید و حالات کے ہرگز طالب نہ ہونا چاہیئے ان مواجید کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں ؎ روزہا گر رفت گو رو باک نیست　∴　تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست۔

بس ہمارے نماز روزہ کے اندر دو حیثیتیں ہیں جس حیثیت سے ہمارا عمل ہے کوئی شئے نہیں ہے اور جس اعتبار سے خدائے تعالیٰ کی طرف نسبت ہے بڑی بھاری نعمت ہے اور قابلِ شکر کے ہے۔ بلکہ خود تمہاری ذات کے اندر بھی یہی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت یہ ہے کہ تم اپنے ہو۔ اس حیثیت سے اپنے کو فنا کرو اور اس حیثیت سے کہ سرکاری چیز ہو اپنی حفاظت کرو۔ دیکھو اگر سرکار سے کوئی گھوڑا یا ہاتھی حفاظت کے لیے ہم کو ملے

تو اُسکی کسقدر حفاظت کرتے ہیں۔ اسی طرح تمہاری جان تمہاری نہیں ہے سرکاری چیز ہے اس حیثیت سے اس کی حفاظت کرو اور اپنی ملکیت کا دعویٰ نہ کرو۔ ورنہ سرکاری غاصب اور سارق بن جاؤ گے۔ عجیب تعلیم ہے تم نے بزرگوں سے صرف نفس کُشی سُنی ہوگی۔ مگر اس حیثیت سے یہاں نفس پروری کی بھی تعلیم ہورہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ان لنفسك علیك حقا و لجسدك علیك حقا وان لعینیك علیك حقا۔ یعنی زیادہ محنت مت کرو مرجاؤ گے اور اس کا جُرم تم پر عائد ہوگا۔

معرفت واقعیہ

اس لئے کہ تم اپنے نہیں ہو سرکاری چیز ہو اپنے کو ضائع مت کرو۔ یہی وجہ ہے کہ جب عارف کو اس حیثیت پر نظر ہوتی ہے تو اُسکو اپنی ذات سے بھی محبت ہوجاتی ہے چنانچہ ایک عارف کہتے ہیں

؎ نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است | افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را | کو دامنت گرفتہ بسوئم کشیدہ است

یہ ہے معرفت واقعیہ کہ جہاں ہم کو جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی ذات کی جو اپنی طرف نسبت ہے اُس کو فنا کرو اور خالق کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت کی طرف نظر کرکے اپنی حفاظت کرو۔

بعضے لوگوں سے جب پوچھا جاتا ہے کہ نماز پڑھتے ہو۔ تو کہتے ہیں کہ اجی میں اکیا میری نماز کیا۔ یہ مت کہو۔ بلکہ اس طرح کہو کہ میں کیا چیز ہوں مگر مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے اسیواسطے کہا ہے کہ محقق جامع بین الاضداد ہوتا ہے دیکھو اس طرح جواب دینے سے نماز کا بھی اظہار ہوگیا کہ وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عنایت فرمائی ہے۔ اور عُجب کا بھی احتمال نہ رہا۔ جامع الاضداد ہونے پر ایک حکایت یاد آگئی۔

ایک مرتبہ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ بلا بھی نعمت ہوتی ہے۔ ایک شخص حاضر ہوا اس کا ہاتھ گل کر سڑ گیا تھا۔ اور گلے میں رومال باندھ

اُس میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ اُس نے عرض کیا کہ حضرت دُعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو شفا عطا فرمائے ہم لوگ طالب علم تھے ہم کو احتمالات پیدا ہوئے کہ اس موقع پر حضرت کیا جواب دینگے اگر دُعا کریں گے تو ابھی بیان فرما رہے تھے کہ بلا بھی نعمت ہے، تو اس تحقیق کے خلاف ہوگا اور اگر دُعا نہ کرینگے تو ایک سائل کی حاجت روائی نہ ہوئی۔ حضرت نے ایک عجیب مضمون سے دُعا فرمائی۔ مضمون یہ تھا کہ

"اے اللہ! ہم خوب جانتے ہیں کہ بلا بھی نعمت ہے مگر ہم لوگ اپنے ضُعف کیوجہ سے اس نعمت کی برداشت نہیں کر سکتے پس اے اللہ! نعمتِ بلا کو نعمتِ شفا سے مبدل فرما دے۔"

سُبحان اللہ! کیا مضمون ہے بلا کے نعمت ہونے کو بھی محفوظ رکھا۔ اور دُعا بھی فرمائی۔ حضرات یہ ہیں علوم کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو عطا فرمائے ہیں اسی واسطے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کا کوئی بزرگی کی وجہ سے معتقد ہوا کوئی کسی وجہ سے کوئی کسی وجہ سے۔ میں تو علم کی وجہ سے معتقد ہوا ہوں۔

پس معرفت اور شکر کا مقتضیٰ یہ ہے کہ کسی پہلو کو فروگذاشت نہ کرے مثلاً کوئی پوچھے کہ تہجد پڑھا تھا تو یہ نہ کہے کہ اجی ہمارا کیا تہجد! بلکہ یہ کہے کہ اللہ کا شکر ہے پڑھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تھی یا مثلاً بیمار ہیں کسی نے پوچھا کہ کیسی طبیعت ہے تو بعض لوگ تکلف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا ہوں یہ جواب عبدیت کے خلاف ہے بلکہ پورا حال بیان کرنا چاہیئے کہ آج بخار ہے کل سے کم ہے یا زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعائے شفا کرو۔

یہ کیا واہیات ہے کہ ایک شخص تو تمہارا حال دریافت کرتا ہے اور درد مندی ظاہر کرتا ہے اور تم اس سے ظاہر نہیں کرتے۔ یہ سب چھچھورے پن کی...

باتیں ہیں ——— خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ خیر اگرچہ قلیل ہو حقیر سمجھ کر اس کو چھوڑو مت۔ اور شر بھی اگرچہ قلیل ہو۔ اُس کا ارتکاب نہ کرو۔ اس وقت اس آیت کے فہم کے متعلق اِسی قدر غلطیاں یاد آئیں۔

اُمید ہے کہ اسی قدر بیان سے اکثر غلطیوں کی اصلاح ہوگئی ہوگی اب اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ہر شر اور معصیت سے اگرچہ وہ کم درجہ کی ہو۔ بچاوے اور خیر اگرچہ کسی درجہ کی ہو۔ اس کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ

مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ

اَجْمَعِيْنَ

بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ